ماہنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ

18 — **سرِ زورشہ زور** — محی الدین نواب
دولت مکاری اور بدمعاشی جیسی رنگی قوتوں کی تباہ کاریاں جنہوں نے ہماری سیاست کو بدرنگ کر دیا!

11 — **چینی، نکتہ چینی** — مدیر اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

59 — **لبِ بام** — آصف ملک
ایک ڈائریکٹر کی اچانک کامیابی کا حال ایک معمولی مصنف نے اسے غیر معمولی کہانی دی تھی

66 — **پرواز** — طاہر جاوید مغل
ایک دلربا کی جستجو میں سحر... اداسی کے خیال میں شام کرنے والے بچاری کا احوال

107 — **جرأت مند** — مریم کے خان
ایک چور کی پیشہ ورانہ مہارت کا احوال وہ اپنی وارداتوں میں کوئی سراغ نہیں چھوڑتا تھا

118 — **شناخت** — راؤ رشید خاں
جاسوسی ڈائجسٹ کا ہنگامہ خیز سلسلہ اپنی شناخت کے متلاشی ایک شخص کی روداد

159 — **کٹھ پتلی** — رضوانہ منظر
اپنے گاہکوں کا مطلوبہ سامان لانے لے جانے پر مامور ایک ایجنٹ کی عراق یاترا کا احوال

171 — **ذریعۂ روزگار** — ثمر عباس
زندگی گزارنے کے لیے ہر شخص کوئی نہ کوئی روزگار اختیار کرتا ہے اس میں ترقی کے لیے نیک نیتی ضروری ہے

177 — **احساسِ جرم** — مدیحہ شاہ
اپنے محسن کی خبر گیری میں تاخیر کے بحران کی کیفیات اسے اپنے جرم کا شدت سے احساس تھا۔

189 — **حقِ ہمسائیگی** — بابر نعیم
جرائم پیشہ و قاتل بھی کسی نہ کسی کے پڑوسی ہوتے ہیں اور احساسِ ذمے داری بھی رکھتے ہیں۔

194 — **پسِ آئینہ** — سلطانہ خان
بڑے حوصلے کی حامل ایک ہستی کی روداد اپنے چاہنے والوں کی خیر خواہی اس کے لیے سب سے بڑھ کر تھی

213 — **تعاقب** — عمیرہ سکندر
شرلاک ہومز جاد تے اور سانحے جن کے ہم رکاب رہتے ہیں موقعوں ٹائی ٹینک کے مسافروں میں بھی شامل تھے

225 — **بنیاد** — احمد صغیر صدیقی
بیوی کی محبت میں مبتلا شوہر کی کیفیات وہ محبت اور شدت قائم رکھنے کے لیے بیوی سے علیحدگی چاہتا تھا۔

228 — **وجہِ فساد** — کاشف زبیر
شامی، تیمور نوشی، دادا!... اور فولاد خان کا مسکراہٹیں بکھیرتا ماجرا اس ماہ کا پہلا رنگ

260 — **میچ فکسنگ** — سلیم فاروقی
ایک کرائم رپورٹر کی سرگزشت اس کے گرد کسی قیامت سے ہانی کے نرغے میں تھی دوسرا رنگ

000 — **تراش خراش** — ادارہ و قارئین
اقتباسات، گدگدیاں، مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کی تفریحِ طبع اور تواضع کے لیے

مدیرہ اعلیٰ
عذرا رسول

جلد 38 • شمارہ 03 • مارچ 2009 • زرِ سالانہ 500 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 40 روپے • سعودی عرب 12 ریال یا مساوی
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 5895313 (021) فیکس 5802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

چینی، نکتہ چینی

مدیر اعلیٰ

پیارے قارئین!

السلام علیکم۔

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ ملک کی مسلسل متلاطم فضا میں اس وقت مزید ہلچل پیدا ہوگئی جب عدالت نے شریف برادران کو نااہل قرار دے دیا۔ اس فیصلے کو کھلم کھلا برا، غلط، جانبدارانہ اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہا گیا۔ ایک زمانہ تھا کہ عدالتی معاملات پر یوں حرف زنی تو کجا، رائے زنی سے بھی گریز کیا جاتا تھا کہ مبادا توہین کے مرتکب ٹھہریں۔ لیکن اب تو لگتا ہے باقاعدہ ارتکاب کی نیت سے یہ سب کچھ کیا جاتا ہے کہ ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا... اور واقعی ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ بہرحال، دیگر بے شمار غلط روایات کی طرح اب یہ بھی ہماری سیاست کا حصہ ہے اور اب ہمیں، ان ناقابلِ برداشت روایات کی طرح اسے بھی گوارا کرنا ہوگا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ قوم کی قوتِ برداشت میں اضافہ فرمائے، ساتھ ہی قوم کے رہنماؤں کو عقل اور ہوش سے کام لینے کی توفیق عطا فرمائے نیز ملک وقوم کی حفاظت فرمائے کہ تختہ باقی رہے گا تو مشقِ ستم جاری رہ سکے گی۔ ورنہ ہمارے رہنما یہ شوق کہاں جاکے پورا کریں گے!

اب جائزہ لیتے ہیں اپنی گزشتہ ماہ کی کارکردگی کا۔

عابد خان بلوچ کا تبصرہ خانیوال سے ''خوب صورت ٹائٹل دل شکن حسینہ کے ساتھ جاسوسی کی آمد ہوئی۔ سب سے پہلے چینی کے نکتہ دانوں سے کھٹی میٹھی گولیاں کھائیں۔ سب دوستوں کے خطوط اعلیٰ معیار کے تھے۔ محترم مغل صاحب دیوی کو دیوار سے لگا کر تھکن اتارے بغیر کوہرنایاب، پرواز کے ساتھ تشریف فرما ہوں گے، سوچا نہ تھا کبھی یہ سماں۔ واہ مغل صاحب! ہمیں دیہاتوں میں پھنسا کر کہہ دیا انتظار کیجیے۔ فنکار، مدیحہ شاہ کی خوب صورت تحریر تھی۔ چھوٹے قد والوں کو دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے۔ ملک صاحب کی غیرت دل کش انداز میں اختتام پذیر ہوئی۔ عقیدت کو روتا دیکھ کر ہماری بھی آنکھیں نم ہو گئیں۔ نسل پرست میں روشن خیالی کا راگ الاپنے والے امریکی معاشرے کا مکروہ چہرہ بے نقاب کیا گیا۔ شناخت میں ہم ہر کردار کی شناخت کرتے رہے۔ امید ہے یہ سلسلہ پھلے پھولے گا اور ہم اس کا پھل کھاتے رہیں گے۔ چشم تماشا ہنستی مسکراتی تحریر تھی۔ کاشف زبیر کی تحریر وجہ فساد، دنگا فساد سے بھرپور تھی۔ شبلی اور سلی کی تو موجیں ہوگئیں۔ دو اور دو چار سے دو ہاتھ کر کے خزانہ اور ٹپ ٹپ ٹاپ کے ساتھ ہاتھ صاف کیا۔ ہم شکل میں گورشیو نے بالآخر ہاری ہوئی بازی اپنی ذہانت سے جیت لی اور ساتھ میں پچاس لاکھ ڈالر! ارے واہ! اب چلتے ہیں رنگ بازی کی طرف۔ جعفری کرپشن کے پورے درد کے ساتھ موجود تھے۔ چند ٹکوں کی خاطر اپنا ایمان بیچنے والے رشوت خور آفیسر نہ جانے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اس دنیا کے بعد بھی ایک دنیا ہوگی جہاں انہیں ایک ایک اعمال کا حساب دینا پڑے گا۔ دوسرے رنگ کا ایک ایک لفظ خنجر بن کر ہمارے دل میں اتر گیا۔ میں سلام پیش کرتا ہوں بغداد کے مجاہدین کو جنہوں نے امریکا کو ٹف ٹائم دے کر ناکوں چنے چبوا دیے۔ اگر امریکا کو وہاں سخت مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑتا تو ہوسکتا تھا امریکا ایران اور پاکستان کو ہینڈز اپ کروا چکا ہوتا۔''

شرجیل شریف مغل، سبزہ زار ایف بلاک لاہور سے لکھتے ہیں ''پیارے قارئین! میں آپ نے ہمیشہ کی طرح سمندر کو کوزے میں بند کیا ہے جس کو پڑھ کر وطن کی آپ سے چاہت، محبت کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اس معاملے میں کتنے حساس ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں خصوصاً ہمارے حکمرانوں کو صحیح معنوں میں اس ملک کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ بےفکری میں گزرے وقت کے ساتھی یہی ڈائجسٹ رہے۔ تنہائیوں کے ساتھی رہے اور تو سب ساتھ چھوڑ گئے لیکن ان کی وفا نے اب تک اسیر کر رکھا ہے، شاید مرتے دم تک۔ سرورق کی حسینہ شوخ انداز والی اسٹوڈنٹ لگ رہی ہے اور پروفیسر صاحب ناک سے چھلکتے ہوئے خون سے بے پروا آنکھیں لیے حسینہ کے پوز بدلنے کے منتظر۔ مجموعی طور پر قدیم اور جدید کا امتزاج اچھا کمبی نیشن ہے۔ ذاکر صاحب حسبِ روایت سرورق کے مصنفوں کو ٹف ٹائم دینے میں کامیاب رہے۔ پرواز، مغل صاحب! آپ نے پرواز میں بہت خوب صورت مناظر سے روشناس کرایا کہ روح میں سرشاری سی بھر دی۔ میں ہمیشہ ہر ملنے والے سے اپنے دیہی علاقوں کا تذکرہ ضرور کرتا ہوں کہ یہ ہمارے کلچر کا حصہ ہیں اور ان کے بغیر ہر پاکستانی ادھورا ہے، چاہے وہ ملک میں ہو یا بیرونِ ملک۔ پہلی قسط نے آنکھوں کے ذریعے دل میں گھر کرلیا۔ غیرت، ناصر ملک صاحب مبارک کے مستحق ہیں۔ پلاٹ، منظر نگاری، مکالمے بہترین انداز سے پیش کیے۔ مگر یہ سب سمجھ میں نہ آیا کہ ایک بے غیرت کی داستان کا انجام غیرت مندوں سے بڑھ کر کیا۔ کہانی بھرپور انداز سے لکھی، داد کے مستحق ہیں۔ ابھی صرف دو کہانیاں ہی پڑھ سکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ جاسوسی، سسپنس، سرگزشت کو ہمیشہ ہمارے پیارے پیارے بک اسٹالوں پر چاند کی طرح چمکائے رکھے اور ان کی روشنی سے ہمارے دلوں کو منور رکھے، آمین۔''

حفیظ اللہ قیصرانی، ٹبی قیصرانی ضلع ڈیرہ غازی خان سے ''2 تاریخ کو صبح ساڑھے پانچ بجے بس اسٹاپ پر کھڑے فروری کی سردی کو برداشت کرتے ہوئے تقریباً آدھا گھنٹا گزرنے کو تھا جب کراچی سے آنے والی عادل شاہ کوچ نے ایک خاندانی ہارن دے کر اپنے پہنچنے کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ ٹبی قیصرانی کے لوگوں کی نیند کا بھی ستیاناس کر دیا۔ مجھے وہ ہارن ایک دل فریب موسیقی کی طرح لگا چونکہ میرا محبوب رسالہ جو ساتھ لائی تھی۔ انکل! ساڑھے چار سال بعد قسمت کے کارواں میں سفر کرنے کے شوق میں آپ کے پیارے شہر کراچی سے لامتناہی عرصے کی جدائی پا بیٹھے اور ساتھ ہی یونی ٹیک پاور سروس کمپنی کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ یہاں سب سے پہلا مسئلہ یہ درپیش آیا کہ جاسوسی کا وقت پر نہ ملنا۔ آگے خدا جانے؟ یہاں جاسوسی کی آمد 6، 7 تاریخ کو متوقع ہوتی ہے لیکن ہمیں یہ تاریخیں جاسوسی کے ساتھ رشتہ نبھانے میں رقیب کا کردار ادا کرتی ہیں۔ اس دفعہ تو ایک مخلص دوست علیم باری کی بے لوث محبت کا شکار ہوگئے کہ انہوں نے یکم کو رسالہ خرید کر بائی بس بھیج دیا۔ کیا انکل اگر ہم سالانہ خریدار بن جائیں تو 2، 3 تاریخ کو رسالہ مل جائے گا؟ (بالکل مل جائے گا۔ اس کی تفصیل آپ متعلقہ اشتہار میں پڑھ سکتے ہیں۔) اسی سوال کے جواب کے لیے 28 دن انتظار کی نیت سے ہم نے اپنی نظریں ٹائٹل پر گاڑ دیں۔ انتہائی سادہ اور انتہائی پسماندہ علاقے کی انتہائی خوب صورت حسینہ انتہائی جاذب نظر لگی۔ اپنے تبصرے کو آدھا اور ابتدائی کہانی کے چند صفحات مس پرنٹنگ میں دیکھ کر بڑے

عرصے بعد شکایات کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ انکل ایسا کیوں؟ گجرات والو! آپ لوگوں کی تعداد دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی تھی۔ کیا ضرورت تھی اتنی کثیر تعداد میں شرکت کی۔ بہرحال، مجموعے میں آپ کی گنتی شامل تھی۔ اس کے علاوہ بہت ممنون ہوں ان دوستوں کا جنہوں نے بہتر طریقے سے حوصلہ افزائی کی۔ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر پہلے مغل صاحب کی پرواز کو دیکھا پھر ادھر سے ہی پڑھنے کی ابتدا کر ڈالی۔ کہانی کی ابتدا تو اچھی لگی۔ دیکھتے ہیں خاور اور بلقیس بیگم کیا کر گزرتے ہیں۔ کیا ان کے اندر شانی اور رستم جیسے جوہر ہوں گے؟ راؤ رشید کا قلم بھی بہکتا ہی بہکتا جارہا ہے۔ اس دفعہ وکی یعنی وجی ضرور کچھ کر گزرے گا لیکن بگ باس کی شخصیت بھی اتنی سہل نہیں اور شہباز بھی سولی پر... چشم تماشا میں فریک نے کیا کیا اور رومیلا نے کیا کیا؟ دونوں ہی ہوس پرستی کی داستان تھے۔ مدیحہ شاہ کی فنکار ایک سبق آموز داستان تھی اور نسل پرست میں ایلڈر نے ماریہ کو بچا کر وفاداری کا عمدہ نمونہ پیش کیا۔ دو اور دو چار متاثر کرنے والی تحریر نہیں تھی۔ رضوانہ منظر کی تحریر خزانہ سے اس وقت دلچسپی کھو بیٹھے جب کو ماچی اپنی پیٹ پوجا کی خاطر ہمیں بھی ان کے ڈرموں تک لے گیا۔ بالکل بھی اچھی نہ لگ سکی۔ بابر نعیم ہم شکل ایلڈر کو اپنے مفادات کی خاطر اپنے ہم شکل کا استعمال بہت مہنگا پڑا۔ جس کی وجہ سے اسے اپنی موت قبول کرنا پڑی۔ بہت ہی اچھی تحریر تھی۔ سم قاتل کفیل جعفری آفرین ہے ایسے آفیسر پر۔"

ثاقب تبسم نگینہ کی مسرت علی پور چٹھہ سے "اس بار حیران کن اور خوش گوار خوشی ہوئی کہ فروری کا شمارہ 2 تاریخ کو ہی مل گیا۔ یہ خوشی آپ کی محبتوں کی وجہ سے ملی اس لیے آپ کو مبارک باد۔ ماہ فروری کے شمارے کا سرورق جاذبِ نظر تھا۔ صنفِ نازک کا تیکھا اندازِ نظر باریش انگریز کی کمزوریٔ نظر کا سبب محسوس ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ موصوف چشمہ زیبِ چشم کر کے ویسی ہی تیکھی نظروں سے حسینہ کے حسن کو ماپ رہے تھے جبکہ حسینہ زیرلب کچھ اظہار فرما رہی تھیں۔ حسینہ کے کانوں میں لٹکتی ہوئی گول بالیاں خوب جچی تھیں اور اس کے نفاست سے سلجھے بال بھی اس کے حسن میں اضافہ کررہے تھے۔ سرورق کو آنکھوں کے ذریعے دل میں اتارنے کے بعد اشتہارات کی ندی عبور کی اور دریائے مردوزن میں چھلانگ لگانے کی تیاری پکڑی۔ کنارے پر آپ کی فکر نے فکر میں ڈال دیا اور ہم محتاط ہوگئے کہ کہیں ہم بھی ڈوب ہی نہ جائیں۔ سو ہم نے فیصلہ کیا کہ دور سے ہی دریا اور اس کے تیراکوں کا نظارہ کرلیتے ہیں۔ جناب شاداب خان کو سب سے آگے دیکھ کر دل شاداب ہوا اس لیے انہیں ان کی تیز رفتاری پر مبارک ہو۔ پرواز کا جان دار آغاز اچھا لگا۔ امید ہے کہ یہ سلسلہ بھی دیرپا اور کامیاب رہے گا۔ لمبی پرواز کو مدیحہ شاہ کے فنکار نے بھی تسلیم کیا۔ بلندیٔ پرواز کے بعد پستہ قدوں کا احوال بہت خوب صورت لگا۔ ناصر ملک کی غیرت ایک سبق آموز کہانی تھی جس میں خانگی حالات کی منفرد تصویر پیش کی گئی تھی۔ اس کا اختتام بہت اچھا اور مکمل تھا۔ البتہ آصف ملک کی نسل پرست درمیانے درجے کی کہانی تھی۔ لیکن ایک اچھا پہلو یہ تھا کہ اس میں امریکا کی برائی نکھر کے سامنے آئی تھی۔ نسل پرستی کو جھاڑ پلانے کے بعد راؤ رشید کی شناخت میں آئے بغیر ہم اصل میدان میں جا پہنچے جسے ہمارے لیے مریم کے خان نے بڑے اعتماد اور خلوص سے سجایا تھا۔ اس مختصر کہانی میں محبت کی فتح اچھا تحفہ تھی۔ اسی لیے ثمر عباس بھی خوش تھے اور اسی خوشی کا اظہار ان کی چشم تماشا سے دیکھا۔ صنفِ نازک کی خاص فطرت کی عمدہ تصویر کشی سے کہانی کا حسن کئی گنا بڑھ گیا۔ حسن بڑھے تو فساد بھی بڑھتا ہے اسی لیے کاشف زبیر کی وجہ فساد بھی حسینہ پُرکار ہی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ آخر میں جیت بھی حسینہ کی ہوئی۔ ہار جیت کا یہ سلسلہ محمد ایان فیصل نے بھی جاری رکھا اور دو اور دو چار کو خوب نبھایا۔ البتہ رضوانہ منظر کا خزانہ اوسط رہی اور بابر نعیم کی ہم شکل بھی پرانے پلاٹ پر مشتمل عام کہانی تھی۔ البتہ احمد صغیر صدیقی ٹپ ٹپ کی صورت میں انتہائی مختصر کامیاب افسانوی کہانی لکھنے میں کامیاب ہوئے۔ اس شمارے کا پہلا رنگ کفیل جعفری کے تخیل سے ترتیب پایا اور پھر نکھر کے بکھرا۔ اس رنگ کو سم قاتل کا نام دیا گیا لیکن حقیقت میں یہ ایک ایسی داستان تھی جس کے حرف وسطر میں انسانیت کا احترام تھا۔ برب کعبہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ فائزہ حقی کا عراق اور افغانستان کی صورت حال پر گہرا مشاہدہ ان کی تحریر سے واضح ہوا۔ کاش مسلمانوں کی شہادتیں جلد فتح کی نوید لے کر آئیں، آمین۔"

ملک محمد انور کی تعریف میز آباد جی ٹی روڈ واہ کینٹ سے "دیوی اپنے اختتام کو بہت خوب صورت انداز میں پہنچی۔ جناب طاہر جاوید مغل صاحب کو مبارک باد۔ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ میرا یہ تبصرہ کچھ زیادہ ہی ہوگا تو معذرت، میری جاسوسی و سسپنس، سرگزشت پاکیزہ کے تمام مسلمان بہن بھائیوں قارئین سے التجا ہے کہ دیوی کے طرزِ عمل محبت خلوص اور وہ بھی دشمن سے، کو اپنا بنائیں۔ دیوی نے اپنے ہلاکو نما دشمن ڈپٹی ریاض کو موم کیا اسی طرح آپ بھی اپنے دشمنوں کو موم کرسکتے ہیں۔ طاہر جاوید صاحب کی پرواز کی پہلی قسط نے بہت متاثر کیا۔ خاور بہت اچھے انداز میں بیگم جی کے نزدیک جارہا ہے۔ ناصر ملک کی غیرت نے بہت متاثر کیا۔ جدید دور کی کہانی فی زمانہ میں یہی ہورہا ہے۔ ناصر ملک صاحب کو بہت بہت مبارک باد۔ مدیحہ شاہ کی فن کار ایک احساس محرومی کے شکار کی کہانی ہے۔ شناخت نے نیا رخ اختیار کیا اب بگ باس کا کیا انجام ہوتا ہے یہ مارچ میں پتا چلے گا۔ مریم کے خان نے اچھا ترجمہ کیا۔ اصل میدان میں آخر ریگن نے میدان مار لیا۔ چشم تماشا ثمر عباس کی اچھے انداز میں پیش کی گئی۔ فریک بے چارہ مفت میں زخمی ہوا جبکہ رومیلا اور جیکسن اپنے انجام کو پہنچے۔ وجہ فساد میں شیلی اور سیلینا نے خوب مقابلہ کیا۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ میری طرف سے معراج رسول صاحب، عذرا رسول صاحبہ، تمام مصنفین کو سلام۔"

ٹریل ایس کے اسماعیل کی دستک خیبر ایجنسی شاہ کس سے "جاسوسی ڈائجسٹ کا دیدار اس دفعہ کچھ جلدی ہوا۔ خلافِ معمول کچھ جلدی ملا۔ الفاظِ محبت جہاں تک پہنچ رہے ہیں بھی خوب صورت نظروں کو دل کی گہرائیوں سے السلام وعلیکم کہتا ہوں۔ نظر نے حسب معمول حسینہ کا دیدار کردیا۔ جو کالے لباس میں ملبوس سر کو تھوڑا سا خم دیے ہوئے اپنی کالی سبز آنکھوں سے کسی چیز کو بہت گہری نظر سے تک رہی تھی۔ صنفِ نازک کے پیچھے ایک چشمہ پوش بوڑھا رقیب چشمے کے پیچھے تیرا موازنہ کررہے تھے۔ ناک سے تھوڑا خون بھی بہا تھا۔ شاداب خان کرسیٔ صدارت مبارک۔ کہانیوں کی ابتدا شناخت سے کردی جہاں وجی وکی بن کر جبکہ وکی وجی بن کر ڈرامے رچا رہے ہیں۔ وکی نے اپنے شیطانی کرتوتوں سے شہباز اینڈ فیملی کا جینا حرام کردیا ہے۔ شیطانوں کے ساتھ شیطان ہونا بھی چاہیے۔ دوسری طرف وجی اپنی شناخت کے لیے مصیبتوں میں گھرا نظر آرہا ہے۔ غیرت میں ایک بوڑھے نے اپنا سب کچھ بیوی، بیٹی، دولت سب کچھ کسی اور کی جھولی میں پھینک دیا جس پر اس کے بھائی ڈاکا ڈالنے والے تھے۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی پرواز ایک نئی سلسلے وار کہانی دیہات اور کھیتوں سے شروع ہوئی جیسا کہ دیوی شروع ہوئی تھی۔ شاہ خاور کو اپنی مالکن سے پیار ہوجاتا ہے اور شاید مالکن بھی اس پر فدا ہورہی ہے۔ شاید نہیں بلکہ یقیناً فدا ہورہی

ہے۔ شاہ خاور کو ایک دلیر لڑکے کے طور پر پیش کیا گیا جیسا کہ رستم۔ فیکٹری والا معاملہ کیا رنگ لاتا ہے اگلے مہینے دیکھیں گے۔ پہلے رنگ میں نفیل کو ایک فرض شناس کسٹم آفیسر کے روپ میں دکھایا گیا جو اپنی حاضر دماغی سے ہیروئن کے کیسے اسمگلر گرفتار کرتا ہے اور جلد ہی لوگوں کا آئیڈیل ہوجاتا ہے۔ پاکستان میں بہت کمی ہے ایسے آفیسروں کی۔ دوسرے رنگ میں عراق کو دکھایا گیا جہاں امریکا کے بھیڑیے دیکھ کر سارا کی ہمدردی عراق والوں کے ساتھ ہوجاتی ہے۔ جنرل کی حد سے زیادہ حرکتوں سے تنگ آکر ان سب کو شوٹ کردیتی ہے اور آخر میں ایک گولی اس کو خالقِ حقیقی سے ملاتی ہے۔ فنکار میں شارق اپنے بچپن کا بدلہ سب معصوم بچوں سے لیتا ہے مگر وہ گرفتار ہو کر قانون کے ہاتھوں جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچایا جاتا ہے۔ نسل پرست میں ایک میرین نے ہمت کر کے بہت سے لوگوں کو غلامی کی زندگی سے نجات دلادی۔ اصل میدان میں ریگن ایک سیاسی مشہور شخصیت کے رازوں سے پردہ اٹھاتا ہے۔"

عائشہ منیر احمد کی حاضری کراچی سے "کیسے ہیں آپ؟ امید کرتی ہوں خیریت سے ہوں گے۔ میں بھی بالکل ٹھیک ہوں اور چھ ماہ بعد آپ سے دوبارہ مخاطب ہوں۔ ... تھوڑی فکر میں ہوں کہ کہیں آپ مجھے بھول تو نہیں گئے۔ خیر اگر بھول بھی گئے ہیں تو اس خط سے میں آپ کو یقیناً یاد آجاؤں گی، ہے نا؟ اپنی غیر حاضری کی وجوہات بتا کر آپ کا اور اپنا وقت ضائع نہیں کروں گی۔ آتی ہوں سیدھے سیدھے جاسوسی کی طرف جو کہ ملا 3 تاریخ کو۔ ٹائٹل ٹھیک ٹھاک تھا اب ذاکر انکل حیران ہوں گے کہ پہلے کیا میں بخار زدہ ٹائٹل بناتا تھا۔ تو یہ میں اس لحاظ سے کہہ رہی ہوں کہ نہ تو غیر معمولی خوب صورت تھا اور نہ ہی بہت عام سا۔ اشتہارات نظر انداز کر کے جب پہنچی اپنی محفل میں تو احساس ہوا کہ یہاں گہما گہمی تو ہے لیکن گرما گرمی نہیں ہے۔ سردی چھائی ہوئی تھی مکمل طرح سے۔ ویسے پچھلے چند ماہ سے محفل کے رنگ ایک دم پھیکے پڑ چکے ہیں۔ وکٹری اسٹینڈ پر شاداب صاحب کو دیکھا بلکہ پڑھا تو کافی حیرت ہوئی لیکن اب اگر انکل نے انہیں اعزاز بخشا ہے تو ہم کیا کرسکتے ہیں۔ بہت بہت مبارک ہو آپ کو۔ طاہر جاوید مغل کی نئی سلسلہ وار تحریر پرواز کی پہلی قسط پڑھی۔ بالکل بھی مزہ نہیں آیا۔ طاہر صاحب نے اس بار بھی محبت کو ہی موضوع بنایا ہے۔ دیوی میں بھی چودھریوں کی چودھراہٹ دکھائی گئی تھی اور اس میں بھی ایسا ہی کچھ ہے۔ دیوی میں اگر بی بی جی تھیں تو اس میں بیگم جی ہیں۔ مجھے طاہر صاحب سے کہنا ہے کہ ایک ہی طرز پر لکھی گئی ایک کہانی اگر ہٹ ہوگئی تو ضروری نہیں کہ دوسری بھی ہو گی۔ شناخت پر میں کوئی تبصرہ نہیں کرسکتی کیونکہ میں نے صرف تین قسطیں پڑھیں اور پھر بھی مجھے اس میں ذرّہ برابر دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تو میں نے مزید خود کو بور کرنا بند کردیا۔ انکل جی! آپ نے کہا تھا گوشۂ خاص عارضی طور پر بند کیا گیا ہے پھر بھی نہ تو ابھی تک اسے شروع کیا گیا ہے اور نہ ہی سرورق کے رنگوں میں تیسرے رنگ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مختصر کہانیوں میں رضوانہ منظر کی کہانی خزانہ سے ملتی جلتی ایک تحریر ابھی دو دن پہلے ہی فروری کے سسپنس میں پڑھی ہے۔ ایک جیسی کہانی اور انجام بھی ایک جیسا دردناک۔ بابر نعیم کی ہم شکل میں گورشیو پر قسمت مہربان تھی اور اس نے اپنی عقل کا بھی صحیح استعمال کیا جبکہ ایلڈر کو اس کی چالاکی ہی پھنسوا گئی۔ دو اور دو چار بھی اچھی تحریر تھی۔ چند ایک کو چھوڑ کر تمام ہی مختصر کہانیاں بہترین تھیں۔ خصوصاً وجہ فساد، ٹپ ٹپ اور اصل میدان۔ سرورق کے رنگوں میں دونوں رائٹرز کے نام میرے لیے نئے ہیں۔"

عدیل چوہدری فرام چک 38/D.N.B "فروری کا شمارہ 20 تاریخ کو ملا۔ رسالہ ہاتھ میں لیتے ہی حسینہ سے انکھیاں لڑانے کی کوشش کی مگر حسینہ کے والد کو غصے میں دیکھ کر نو دو گیارہ ہوگئے اور اشتہارات کو دیکھتے ہوئے سیدھے چینی دان میں جا گرے جہاں خان صاحب صدارت کے مزے لینے میں مصروف نظر آئے مبارکاں۔ چھڈو جی تمام دوستوں کے تبصرے اچھے تھے مگر اپنا خط دیکھ کر رونا آگیا۔ انکل اتنا سینسر! اب بات ہوجائے پرواز کی۔ بالکل دیوی کی طرح ہی لگ رہی ہے کہانی بہت اچھی ہے اور اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ اور اچھی کیوں نہ ہو آخر انکل طاہر لکھ رہے ہیں۔ غیرت ناصر ملک کی ایک یادگار تحریر تھی۔ سردار صاحب کی غیرت سمجھ میں نہیں آئی مگر اجمل صاحب ضرور فائدے میں رہے۔ چھڈو جی اس دفعہ شناخت میں کچھ تھرل تھا اور لگتا ہے اگلی قسط میں واقعی راؤ صاحب ہیرو سے کچھ مار دھاڑ کروائیں گے۔ چھڈو جی دونوں رنگ بہترین تھے۔ کفیل صاحب کی ایمان داری اور سچائی واقعی قابلِ تعریف ہے۔ فائزہ حقی کی برب کعبہ واقعی ایک زبردست کہانی تھی۔ امریکی اپنے مفاد کے لیے ہر حد سے گزر جاتے ہیں۔"

مہر محمد شاہد عالم کا خط میلسی سے "پورے ساٹھ روپے کا فول خرچ کرنے کے بعد اپنے پیارے جاسوسی کے 2 تاریخ کو ہی درشن ہوگئے۔ 80 کلومیٹر کی اسپیڈ سے گھر پہنچے اور اطمینان کے ساتھ سرورق کو ملاحظہ کیا۔ مجھے لگا کہ سرورق کی شوخ حسینہ اپنی کی خوب صورتی دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ پس منظر میں بزرگ نے ہمت بڑھائی تو نے بھی بخل نہ کیا اور مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے ہی عنایت کیا۔ اشتہارات کے فوائد پر غور کرتے ہوئے محفلِ دوستاں میں جا پہنچے۔ شاداب خان کو ٹاپ پر پایا۔ تبصرہ خوب تھا، دلی مبارک باد۔ باقی قارئین کے تبصرے بھی خوب تھے۔ سب سے پہلے کہانیوں میں سرورق کا رنگ سم قاتل پڑھی۔ ایک قابل ستائش کہانی تھی جو کہ اپنے اندر حب ایمان داری کو سموئے ہوئے تھی۔ برب کعبہ پیارے دین اسلام کی حقانیت اور اس کی روشنی کو واضح کرنے والی ایک دل نشین تحریر تھی۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی دیوی ایک یادگار اسٹوری تھی جو کہ قارئین کے دلوں پر مدتوں راج کرے گی۔ پرواز کی اسٹارٹنگ بھی بہترین ہے جس میں دو دلوں کے درمیان محبت کا خوب صورت جذبہ پروان چڑھتا نظر آیا۔ آئندہ قسط کا شدت سے انتظار لگا رہے گا۔ غیرت ایک بہت لاجواب تحریر تھی جس کی پہلی اور آخری قسط نے مجھے کہانی کے انجام تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ انگلش ترجمہ شدہ کہانی فنکار انسانی نفسیات کے گرد گھومتی نظر آئی لیکن اس نے کوئی خاص تاثر نہ چھوڑا۔ ہم شکل میں گورشیو کے ہم شکل نے جو پلان ترتیب دیا تھا وہ اس میں خود ہی جا پھنسا، جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ انکل! کسی زمانے میں جاسوسی میں خوب اور زیادہ چٹکلے ہوتے تھے لیکن اب تو سارا رسالہ کھنگالنے کے بعد کوئی ایک آدھ ہی ہاتھ چڑھتا ہے۔"

فاروق احمد، کراچی سے لکھتے ہیں "اس ماہ کا جاسوسی 2 تاریخ کو اسٹال پر چمک دمک دکھا رہا تھا۔ سرورق کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ حسینہ کچھ زیادہ جاذبِ نظر نہیں لگی۔ بہرحال کیونکہ ہمارا پسندیدہ ڈائجسٹ ہے اس لیے خریدنا ضروری ہوتا ہے۔ چینی، نکتہ چینی میں اس بار شاداب خان ٹاپ پر نظر آئے اور سفر ہی سفر میں جاسوسی کو ہضم کرلیا۔ شاداب خان صاحب! ہم آپ کے ہاضمے کی داد دیتے ہیں۔ اب آتے ہیں طاہر مغل صاحب کی پرواز کی طرف۔ ہیرو صاحب تو ایک شادی شدہ حسینہ سے دل لگائے بیٹھے ہیں۔ بلقیس صاحبہ کی اداؤں سے لگتا ہے کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ بہرحال، جناب کی پشیمانی اور کشش و بیچ اچھا لگا۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ غیرت میں مون نے ماں اور بیوی دونوں کا فرض بہ حسن و خوبی نبھا دیا اور سرخرو ٹھہری۔ اجمل کو بھی عقل آگئی۔ کافی دلچسپ کہانی تھی۔ شناخت میں بے چاری شہناز بہت بری طرح پھنسی ہوئی ہے۔ راؤ صاحب! شہناز ہمیں بہت پسند ہے۔ اس لیے بے

جاری کو اتنی سزا نہ دیں۔ ایشلے کو شہناز کی جگہ دینا ہمیں منظور نہیں۔ شہناز کو اپنے گناہوں پر نادم اور تائب کر کے سیدھے راستے پر لے آئیں۔ وجی کی اپنی بہن سے ٹیلی فونک گفتگو ہوگئی ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ سرورق کے رنگ میں ب ب کعبہ ہمیں بہت پسند آئی۔ سارہ کی عظیم قربانی ہمیشہ یادگار رہے گی۔ کاش ہم سارہ جیسے لوگوں کے نقشِ قدم پر چل سکیں۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔''

قاری عبدالماجد اشرفی الرشید، رحیم یار خان سے ''31 جنوری کو ہی جاسوسی مل گیا اور ملا بھی کہاں؟ جاسوسی کے اپنے شہر کراچی میں! کہ 31 جنوری کی صبح کو ہی ہم ایک تقریب کے سلسلے میں رحیم یار خان سے کراچی پہنچے۔ پہنچتے ہی میزبان سے تین چیزیں طلب کیں۔ چائے، اخبار اور جاسوسی۔ میزبان کی مہربانی سے تینوں چیزیں مل گئیں۔ چائے اور اخبار سے فراغت کے بعد جاسوسی کو اٹھایا۔ سرورق دیکھا تو اچھا لگا کہ سرورق کی خاتون اچھی لگ رہی تھی۔ کیوں اچھی لگ رہی تھی؟ نہ پوچھیے۔ فہرستِ رسالہ پر نگاہ کرتے اپنی محفل میں پہنچے جہاں 32 مرد و خواتین حاضر لائن جبکہ 24 حضرات و خواتین کھڈے لائن لگے ہوئے تھے۔ حاضر لائن کی اکثریت دیوی کو یاد کرتے ہوئے اداس ہو رہی تھی جبکہ کھڈے لائن حضرات کیا سوچ رہے تھے؟ یہ وہ خود ہی بتائیں گے۔ کبھی نہ کبھی۔ دیوی کے بعد طاہر جاوید سے ملاقات اور وہ بھی اتنی جلدی؟ ہمیں آپ سے اتنی پھرتی کی توقع نہ تھی۔ بہرحال بنڈل آف تھینکس کہ ہمارے پسندیدہ رائٹر کی اور دلچسپ، رومان انگیز تحریر سے ہمیں محظوظ ہونے کا موقع دیا آپ نے۔ مغل کے دربار سے نکل کر شناخت کی طرف بڑھے جہاں وکی اور وجی دونوں علیحدہ علیحدہ بگ باس کو ذلیل کر رہے تھے۔ دیکھیے، اگلی قسط میں بگ باس اور برادران میں سے کس کا پلڑا بھاری پڑتا ہے۔ غیرت کا اینڈ خوش کن حالات میں ہوا۔ سردار رب نواز نے آخر میں اجمل اور عشرت کو ملا کر جہاں دو ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کیا وہاں اپنی بے غیرتی کا... یا سمجھو کہ مجبوری کا کافی حد تک ازالہ کر دیا۔ کاشف زبیر کی وجہ فساد اس شمارے کی خاص کہانی تھی جس میں شیلی اور سکی نے اپنی عقل مندی سے نہ صرف ایک خطرناک گروہ کا خاتمہ کیا بلکہ ایک خطیر رقم کی مالک بھی بن بیٹھیں۔ رنگوں کی دنیا کے موضوع حالات پر ہونے کے علاوہ خاصے جان دار بھی تھے اس لیے پڑھتے ہوئے لطف آیا۔''

مصدق محمود دانش کا نامہ گاؤں کنگ سہالی ضلع گجرات سے ''تمام جاسوسی احباب کی خدمت میں حسبِ معمول محبت بھرا اسلام عرض۔ ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ دو فروری کو قریبی قصبہ منگووال غربی سے بہ ذریعہ کزن منگوایا۔ دل بے قرار کو کچھ تو قرار آیا۔ سرورق کی میچور لیڈی کسی قریبی منظر پہ کمنٹس دینے کے لیے لب کشائی کرنے لگی تھی۔ کالی شرٹ پر بیلیں سی تھیں جو اس کے بائیں شانے سے بھی اوپر جا رہی تھیں جو مصور کی نمایاں غلطی تھی۔ بہرحال، خاص بات جاسوسی حسینہ کے بڑے بڑے آویزے تھے۔ ساتھ ایک وحشت زدہ چہرہ گھورتا نظر آیا اور اوپر کرسی پر ایک تھکا ہارا نشئی نما بغیر چہرے کا آدمی تھا، غالباً۔ تو دوستو! یہ تھا سرورق کا پوسٹ مارٹم۔ چینی، نکتہ چینی یعنی چینی کم نمک مرچ زیادہ میں پہلے نمبر کی بازی اس دفعہ شاداب خان نے کھیلی اور جیتی بھی۔ مبارکاں بھئی مبارکاں۔ کہانیاں ترتیب وار شروع کیں۔ پہلی کہانی طاہر جاوید مغل کی پرواز شروع کی تو فوراً ہی پتا چل گیا کہ دیوی کی جگہ لینے آگئی ہے۔ شاہ خاور رستم کی جگہ اور بلقیس شاید شانی بی بی کی جگہ، طاہر جاوید مغل صاحب! دیوی میں بھی آپ نے بازاری زبان زیادہ استعمال کی اور اب پرواز میں بھی حال نظر آیا۔ غیرت اس دفعہ اچھی لگی۔ آخر اس بے غیرت کو کچھ غیرت آہی گئی اور مون کا کردار بڑا اچھا تھا۔ آصف ملک کی نسل پرست امریکا کی دہشت گردی کا ثبوت بھی ہے اور ایک انسان کی ایمان داری کا ثبوت بھی۔ شناخت میں وجی حسبِ معمول چھایا ہوا ہے۔ خان علی کا کردار بھی نمایاں ہے۔ مریم کے خان کی اصل میدان میں آخرکار ریگن کو اپنی منزل مل ہی گئی۔ ثمر عباس کی چشم تماشا پڑھی تو بے اختیار یہ فقرہ زبان سے پھسل پڑا۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ کاشف زبیر کی وجہ فساد سبق آموز تھی۔ محمد ایان فیصل کی دوا اور دو چار بلند حوصلے اور محنت سے لبریز تھی۔ خزانہ اور ٹپ ٹپ بھی ٹھیک ہی تھیں۔ سرورق کے دونوں رنگ اس دفعہ پھیکے لگے۔ کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ پائے۔''

جہانگیر اسلم گوندل، ڈسٹرکٹ جیل منڈی بہاؤالدین سے ''پورے دو ماہ بعد محفل میں حاضرِ خدمت ہوں لیکن مجال ہے کہ کسی نے بھول کر بھی یاد کیا ہو، خیر کوئی بات نہیں۔ بڑے بڑوں کے ساتھ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ ٹائٹل بس ایویں ہی تھا خوشبو لگا کے۔ مختلف اشتہاروں سے گزرتے ہوئے ٹھاہ کر کے پہنچے اپنی محفل نکتہ چینی میں۔ انکل جی! آپ کی باتیں ہنڈرڈ پرسنٹ درست ہوتی ہیں خوشبو لگا کے۔ دیوی ختم ہوگئی ہے، اس کے بارے میں کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔ طاہر جاوید مغل صاحب اتنی اچھی کہانی لکھنے پر یہی دعا ہے کہ جیو ہزاروں برس ہزار برس کا ہو ایک دن خوشبو لگا کے۔ شناخت بہت اچھی اسٹوری ہے۔ وجی کا حق بنتا تھا بگ باس پر ہاتھ اٹھانا۔ کوئی بھی انسان ماں کی اتنی توہین برداشت کر ہی نہیں سکتا، ہے نا؟ باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ میری طرف سے سب پڑھنے والوں اور جاسوسی کے تمام اسٹاف کو محبتوں بھرا اسلام اور 2009ء مبارک ہو خوشبو لگا کے۔''

محمد اجمل خان کی ڈسٹرکٹ جیل رحیم یار خان سے انٹری ''ماہنامہ جاسوسی اس بار دو فروری کو ملا اور جیسے ہی اپنے محبوب کو پایا نسوار لگا کے تو بے اختیار یہ شعر زبان پر آیا نسوار لگا کے۔

تاروں بھرے آنچل میں اک پُرنور سا چہرہ
آکاش کی وسعت میں کوئی چاند ہو جیسے

اور پھر نسوار لگا کے ایک ہی چھلانگ لگا کر اپنے پیارے اور شونے شونے محفل چینی دودھ جمع پتی میں پہنچ گئے نسوار لگا کے۔ صدقہ صدقہ... کرسی پر شاداب خان عرف گلاب خان براجمان تھے مبارک ہو بھئی مگر نسوار لگا کے۔ سب سے پہلے ناصر ملک کی غیرت پڑھی۔ بہت اچھی کہانی تھی اجمل کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں نسوار لگا کے۔ اپنی تو قسمت ہی کھوٹی ہے۔ اور پیارے انکل طاہر جاوید مغل صاحب کی پرواز تو ہے ہی اونچے پائے کی نسوار لگا کے۔ خاور کو سب کی عادت پڑ گئی ہے۔ اپنا اپنا سا لگتا ہے نسوار لگا کے۔ بیگم بلقیس کو کچھ زیادہ ہی اپنا لگا ہے۔ راؤ رشید خان صاحب بھی اب ہمیں اپنی گرفت میں لے رہے ہیں۔ شناخت کے ذریعے نسوار لگا کے۔ وجاہت علی ہر طرف سے گھرا ہوا ہے نسوار لگا کے۔ ویسے وکی بڑا شیطان ہے، شہباز اور اس کے گھر والوں کی تو نیندیں اڑا دیں نسوار لگا کے۔ بہت اچھی اور پرایکشن کہانی ہے۔ مزہ آتا ہے نسوار لگا کے۔ کاشف زبیر انکل! پلیز شاہی کو لے آئیں کہیں گم نہ ہو جائے۔ ویسے اس دفعہ آپ کی نسل پرست اچھی تحریر تھی۔ چشم تماشا بھی اچھی اور دلچسپ تحریر تھی۔ فرینک کی رنگین مزاجی عروج پر تھی مگر اچھا ہوا کہ چور کو پکڑوا گیا نسوار لگا کے۔ وجہ فساد آصف ملک صاحب کی اچھی کاوش تھی نسوار لگا کے۔ ب ب کعبہ میں فائزہ حقی نے بہت اچھے طریقے سے مسلمانوں کی شرافت اور امن پسندی کی ترجمانی کی تھی اور واقعی دہشت گرد تو خود امریکا ہے نسوار لگا کے۔''

مس ڈائنامائیٹ، تربیلا ڈیم سے ''خلافِ توقع میرا پیارا جاسوسی 4 تاریخ کو ملا۔ مس جاسوسی یعنی ٹائٹل گرل بہت پیاری تھی مگر بیک گراؤنڈ میں موجود انکل جس نے آنکھوں میں سرمہ لگایا ہوا تھا، بالکل پسند نہیں آئے۔ ذاکر انکل کیوں چاند کو گرہن لگاتے ہیں؟ مانا کہ صنفِ کرخت، کرخت ہے مگر اب اتنی بھی نہیں۔ کبھی آپ ان کی پیاری سی تصویر بنا کر ان بے چاروں کو خوش اور ہمیں حیران کریں نا۔ اشتہارات کو خاطر میں لائے بغیر چینی، نکتہ چینی پڑھی۔ شاداب انکل ٹاپ پر تھے بہت مبارک ہو۔ سب کے تبصرے اپنی جگہ پرفٹ تھے۔ کہانیوں میں طاہر جاوید مغل انکل کی پرواز پڑھی۔ ویری بیسٹ۔ کہانی میں گاؤں کا رہن سہن بہت پیارے طریقے سے بتایا گیا ہے۔ ہیرو کو تو پہلی قسط میں ہی محبت ہوگئی۔ ویسے طاہر انکل کا نام ہی اسٹوری کے بیسٹ ہونے کی ضمانت ہے۔ غیرت [illegible] سے قریب نہیں لگی۔ بچوں کے ڈائیلاگ ان کو بچے نہیں شو کرتے تھے۔ وجہ فساد میں شیلی اور سکی کے ایکشن نے بالکل متاثر نہیں کیا۔ نسل [illegible] بہت اچھی اسٹوری تھی۔ امریکی اپنے علاوہ کسی کو انسان نہیں سمجھتے۔ ب ب کعبہ میں ہزار دل سے امریکا کی غلیظ آرمی پر لعنت بھیجی اور ساتھ میں اپنے آپ کو تہذیب یافتہ کہنے والوں کی تہذیب پر بھی لعنت بھیجی۔ فنکار احساسِ کمتری کا شکار لڑکے کی کہانی تھی۔ ایسے لوگوں کے ساتھ اس قسم کے رویے اکثر مشاہدے میں آتے رہتے ہیں۔ چشم تماشا میں فرینک بے چارے کو ویسے ہی ہمدردی کے شوق میں کُٹ پڑ گئی۔ شناخت نے ابھی تک متاثر نہیں کیا۔ اصل میدان میں ہیرو کی ہمت واقعی قابلِ تعریف تھی۔ ٹپ ٹپ میں رائٹر نے غم کا COMPARISON بہت اچھے طریقے سے پانی کی ٹپ ٹپ سے کیا۔ سم قاتل میں آفیسر کی ہمت اور بہادری نے بہت متاثر کیا۔''

ایم احمد ہاشمی فرام بونیر ''بہار کے خوب صورت موسم کی آمد آمد ہے۔ ہم بہار اور محبتوں کا پیام بن کر آپ کی اس انجمن رنگ رنگ میں حاضر ہیں۔ ہم تو اپنی خوشیوں میں مگن ہیں مگر ملکی حالات انتہائی خراب ہیں۔ بالخصوص ہمارا پڑوس ضلع سوات تو نہایت ہی کشیدہ اور ناسازگار حالات کا شکار ہے۔ جاسوسی سے انتہائی سردی اور بارش میں ملاقات ہوئی۔ ٹائٹل پر صنفِ نازک مختصر کپڑوں میں براجمان تھی۔ اتنی سردی میں حسینہ کو اتنے باریک کپڑوں میں دیکھ کر بے اختیار ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔ پیچھے ایک شخص اپنی ہوس سے لبریز آنکھوں پر چشمہ لگائے تمسخرانہ انداز میں نظر آیا۔ اس کے بعد نکتہ چینی کا دروازہ کھول دیا مگر جیسے ہی اندر قدم رکھا تو شاداب خان ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ بہرحال، وکٹری اسٹینڈ پر شاداب خان جیسے لوگ سرسبز و شاداب نظر آتے ہیں۔ ڈھیروں مبارک باد قبول کیجیے جناب۔ نکتہ چینی سے ہوتے ہوئے بے اختیار نظریں غیرت کو تلاشنے میں معروف ہوگئیں۔ بالآخر اسے تلاش کیا اور ایک ہی نشست میں ختم کر ڈالا۔ بلاشبہ غیرت موجودہ حالات کے پس منظر میں لکھی گئی بہترین اور متاثر کن کہانی تھی۔ سردار رب نواز کے بھائیوں جیسے بے ضمیر، مفاد پرست اور حریصانہ ذہنیت رکھنے والے لوگ تقریباً ہر معاشرے میں موجود ہیں۔ اجمل بے چارے کو بلاوجہ حوالات کی ہوا کھانی پڑی۔ آخر میں رب نواز کی حاضر دماغی نے متاثر کیا۔ اس کے بعد پرواز کی طرف پرواز کی مگر فی الحال یہ کہانی سمجھ سے بالاتر ہے۔ چند ایک اقساط کے بعد تبصرہ کریں گے۔ مدیحہ شاہ کی فنکار عمدہ تحریر تھی۔ شارق فنکار سے زیادہ سفاک قاتل نظر آیا۔ شناخت کی یہ قسط زبردست رہی۔ کڑیوں سے کڑیاں ملتی جا رہی ہیں۔ وجی نے کچھ زیادہ ہی پھرتی دکھائی۔ عنقریب سب... بے نقاب ہونے والے ہیں۔ دوسری طرف رخشی نے بڑی بارعب انداز میں انٹری کی۔ نشیب و فراز سے تو ایسا لگتا ہے کہ کہانی ختم ہونے والی ہے۔ مریم کے خان کی اصل میدان دو دلوں کے درمیان محبت کی ایک اچھی کہانی تھی۔ رنگوں میں پہلے رنگ میں الجھاؤ کافی زیادہ تھا۔ دوسرے رنگ میں فائزہ حقی کی ایک خوب صورت تحریر تھی۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔''

لبنیٰ کنول، ڈھڈھیال، ضلع چکوال سے ''ہم سب کا دلبر جانی مجھے 3 تاریخ کو ملا۔ پیارے انکل ہر دفعہ مختلف کلر میں جاسوسی ڈائجسٹ لکھا ہوتا ہے۔ وہ کلر پورے ٹائٹل کی زینت ہوتا ہے۔ سچ کہہ رہی ہوں، مکھن نہیں لگا رہی۔ طاہر انکل سرِ فہرست نظر آئے۔ تو بس جی چھوٹی سی پرواز لگا کر طاہر انکل کے پاس۔ پہلے بی بی جی اب بیگم جی، واہ انکل۔ کہانی پڑھ کے ایسا لگا کہ دیوی کا دوسرا حصہ ہے جس میں رستم اور شانی نئے روپ میں آئے۔ پیارے انکل آپ کے خیالات پڑھے، نئے امریکی صدر اوباما کے بارے میں۔ بس ہم دعا ہی کر سکتے ہیں کہ یہ لوگ اسلامی ملکوں پر رحم کریں۔ اس دور کا فرعون امریکا ہی تو ہے۔ میری طرف سے شاداب خان کو مبارک باد۔ شناخت میں دیکھنا ہے کہ بگ باس اس دنیا فانی سے کوچ کرتا ہے یا بچ نکلتا ہے۔ رنگوں میں پہلے کفیل جعفری کی تحریر پڑھی۔ جیسے کہ جینے کے لیے زخم اٹھانے پڑتے ہیں۔ اس طرح ایمان داری کی زندگی گزارنے کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ب ب کعبہ پہلے آنٹی نے پڑھی۔ ان کے خیالات کچھ اس طرح ہیں کہ واقعی خوش نصیب لوگوں کو اس طرح کی شہادت کی موت نصیب ہوتی ہے۔ غیرت میں سردار رب نواز کے بارے میں میری سوچ غلط ثابت ہوئی۔ پہلے حصے کی نسبت دوسرا حصہ زیادہ اچھا تھا۔ چھوٹی کہانیوں میں پہلے فنکار پڑھی۔ اگر کسی میں کوئی قدرتی کمی ہے تو لوگ باتیں کیوں کرتے ہیں۔ اصل میدان میں ریگن کی اچھی سوچ سے اچھا مستقبل اور محبت مل گئی۔ تراش خراش میں حیران کرنے والی معلومات تھیں۔ دو اور دو چار میں کارٹر جیسے محنتی پولیس افسر ہوں تو کوئی مجرم بچ کے نہیں نکل سکتا اور کسی بے گناہ کو کبھی سزا نہ ہو۔ خزانہ میں پیٹ کے دوزخ کے لیے کوماچی اپنی زندگی ہار گیا۔ وجہ فساد، ٹپ ٹپ اچھی تھیں، جو آخری کہانی پڑھی وہ ہم شکل تھی۔ گورشیو نے ایلڈر کو اچھا بے وقوف بنایا۔''

آمنہ پٹھانی، فتح پور لیہ سے ''حسبِ معمول 4 فروری کو جاسوسی مل گیا۔ سرورق پر سرسری مگر ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہی فہرست کی جانب چھلانگ لگائی تو خوش گوار حیرت سے دوچار ہونا پڑا۔ اللہ! یہ تو طاہر جاوید مغل سے ابتدا میں ہی ملاقات ہوگئی۔ تھینکس انکل اینڈ مغل انکل۔ مغل بھائی آپ ہمیشہ سے ہی میرے موسٹ فیورٹ رائٹر رہے ہیں لیکن آپ کی کہانیوں پر ایک تنقید ضرور کروں گی۔ اگر آپ میری تنقید کو مثبت لیں گے تو یہ آپ کا بڑا پن ہوگا۔ طاہر جاوید بھائی آپ کی اکثر کہانیوں میں مماثلت محض اتفاقی ہوتی ہے یا آپ کے قلم میں دم ہی اتنا ہے؟''

اقبال فراز دبئی سے لکھتے ہیں ''جاسوسی ڈائجسٹ ویسے تو ہمیشہ سے ہی اچھا رہا ہے مگر اب مزید نکھار آتا جا رہا ہے۔ اس ماہ طاہر جاوید مغل کی تحریر پرواز کے بارے میں خاص طور پر بات کروں گا کہ بہت ہی شان دار تحریر تھی جس پر میں طاہر جاوید مغل کو مبارک باد دینا چاہتا ہوں، ویلڈن طاہر جاوید مغل۔ اللہ کرے ہو اور زورِ قلم زیادہ۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں جبکہ جتنی پڑھ چکا ہوں وہ بھی اچھی تھیں۔ انشاء اللہ اگلی بار تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گا۔ تمام اسٹاف کو سلام و دعا۔''

جمشید ساحل، مدیر اعلیٰ ماہنامہ لیہ ٹائمز، آفس بالمقابل ABL چوبارہ روڈ، لیہ سے "میں ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کا بہت پرانا قاری ہوں یقیناً اس وقت سے جب میں اسکول کی دنیا سے کالج کی اس فضا میں داخل ہوا جہاں سانس لینے میں کوئی قدغن نہیں لگائی جاتی تھی اور نصاب سے ہٹ کر دیگر کتابیں، رسائل اور جرائد پڑھے جا سکتے تھے۔ جاسوسی ڈائجسٹ میں شامل معیاری کہانیوں نے میری زندگی میں مثبت اور پائیدار صلاحیتوں کو فروغ دیا۔ اب سال 2009ء جنوری کے جاسوسی ڈائجسٹ کو پڑھا تو چند لفظ لکھنے کو قلم لیے آپ سے مخاطب ہوں۔ وہی معیار اور وہی طمطراق جو کسی عہد میں جاسوسی کو دیگر رسائل سے جدا کرتا تھا، پا کر مسرت ہوئی۔ ابھی اسی سحر میں ہی تھا کہ جنوری بیت گیا اور فروری کا مہینا طلوع ہوتا چلا گیا جواب نصف نہار پر پہنچ چکا ہے۔ میں کہانی غیرت پر اپنے خیالات کا اظہار کروں گا۔ ناصر ملک کی کہانی غیرت ہمارے معاشرتی رسم و رواج کی بہترین عکاسی کر رہی تھی اور جو حقیقتیں اس کہانی میں مختلف کرداروں سے بیان کروائی گئی ہیں قابل تعریف تھیں۔ دیگر کہانیاں جن میں پرواز، فنکار، نسل پرست، شناخت، اصل میدان، چشم تماشا، وجہ فساد، دو اور دو چار، خزانہ، ہم شکل، ٹپ ٹپ، سم قاتل اور رب کعبہ جاسوسی کے صفحات پر جھومر کی طرح سج رہی تھیں۔ بلاشبہ جاسوسی ڈائجسٹ میرے گزرے کل اور آج کا بہترین انتخاب ہے۔ علاوہ ازیں اس میں شامل تمام لکھاری جس عمدگی سے کہانیاں لکھ رہے ہیں وہ سب مبارک باد کے مستحق ہیں۔"

آغا فرید احمد خان، سکھر سے "حسینہ سرورق کی آنکھیں ایشوریا کی ہیں۔ ناک ٹوئنکل کی، منہ کرینہ کا، پیشانی رویتا کی ہے۔ بالی ووڈ کا مرکب بن کر جو نقشہ بنا وہ فروری کے جاسوسی کا سرورق کہلاتا ہے۔ بہت بھایا۔ خوب بھایا۔ اشتہاروں سے نمٹ کر چینی دان میں پہنچے۔ شاداب خان پہلے نمبر پر بیٹھ کر صنفِ نازک کے جلتے بھنتے وجود پر ہاتھ سینک رہے تھے۔ تبصرہ بھی شان دار تھا مبارک ہو۔ پرواز سے کہانی کا آغاز کیا۔ کسی کو محسوس ہوا ہو یا نہیں پر مجھے تحریر میں سے دیوی کی مہک آ رہی تھی۔ خاص کر خاور کا کردار رستم سے ملتا جلتا تھا۔ دوسرے حصے کا بے چینی سے انتظار ہے۔ فنکار پُرتجسس تحریر تھی۔ غیرت کا دوسرا حصہ مسحور کر گیا۔ جب تک ختم نہ ہوئی قسم سے پہلو بھی نہ بدلا اور انجام تو اتنا طمینان بخش تھا جو ہم نے سوچا بھی نہ تھا۔ شناخت اب پوری آب و تاب سے خود میں ہم کو سمائے ہوئے ہے۔ چشم تماشا اچھی تحریر تھی۔ وجہ فساد شبلی اور سلینا کو ایڈونچر مہنگا پڑ گیا۔ دو اور دو چار نے بھی دلچسپی میں اضافہ کیا۔ خزانہ بھی پُراثر تحریر تھی۔ ٹپ ٹپ رنگ نہ جما سکی۔ سرورق کے پہلے رنگ نے خاص تاثر نہ دیا البتہ دوسرے رنگ رب کعبہ بہت ہی اسمارٹ تحریر تھی۔ مسلمان مجاہدین اور ان فرنگیوں میں واضح فرق کوئی سارا سے پوچھے۔ یہ مسلمانوں کی محبت کا نتیجہ ہی تھا جو وہ جام شہادت نوش کر گئی۔ بہت ہی زبردست تحریر تھی۔"

کیوٹ اینڈ ہیپی AAZ فرام انجرا آرالیس "5 فروری کی ایک روشن نکھری نکھری صبح کو اپنے یار جاسوسی کو جھپی دی۔ ٹائٹل پر موجود الہڑسی مٹیار سیدھی دل میں اتر گئی۔ غزالی آنکھوں اور خوب صورت ہونٹوں نے تو جادو سا کر دیا۔ تھینک یو انکل ذاکر! چھکا لگا کے۔ اشتہارات کو کراس کیا اور سیدھے پہنچے جاسوسی کی جادو نگری میں۔ سب سے پہلے آپ کا پیرا پڑھا مگر تبصرے سے گریزاں ہوں۔ وننگ اسٹینڈ پر شاداب خان سرسبز و شاداب نظر آئے، مبارکاں شاداب جی مبارکاں۔ طاہر انکل کی پرواز کا مطالعہ کیا۔ یقین ہے کہ یہ بھی ایک شاہکار ثابت ہو گی۔ مدیحہ شاہ کا فنکار اچھا انسان بننے میں ناکام رہا۔ آصف ملک امریکیوں کا اصلی اور مکروہ چہرہ دکھاتے نظر آئے۔ شناخت فل اسپیڈ اچ جاری اے! اصل میدان میں آخر کار ریگن نے میدان مار ہی لیا۔ چشم تماشا واقعی اک تماشا ہی سی! موسٹ فیورٹ رائٹر کاشف زبیر کی کاوش وجہ فساد میں شبلی اور سلینا کا حوصلہ اور جرأت پسند آئی۔ کاشف انکل! پلیز پلیز... شامی اور تیمور کو جلوہ گر کریں۔ دو اور دو چار پڑھ کر یہی لگا کہ اگر ایک اور ایک گیارہ ہو سکتے ہیں تو دو اور دو بائیس بھی ہو سکتے ہیں۔ رضوانہ منظر کا خزانہ کو مانچی کے ساتھ روزا اور ملر کو بھی بہت امیر کر گیا۔ اس ماہ کی تھرلنگ اور کیوٹ سی اسٹوری ہم شکل رہی۔ گورشیو نے ایلڈر کو الو کا پٹھا بنا دیا۔ رنگوں میں پہلا رنگ لائٹ جبکہ دوسرا رنگ جاسوسی کو کلرفل کر گیا۔"

جاناں آغا، فرام گوجرانوالہ "باادب باملاحظہ ہوشیار! ہماری سواری تشریف لا رہی ہے۔ ایں، یہ کیا، ہماری شاہانہ سواری کے سامنے شاداب خان عرف لانڈھی کوتل کے بھوت کہاں سے آ گئے؟ خیر، بھوت جی مبارک باد قبول کیجیے۔ پرانے قاری زیادہ تر غائب تھے۔ آبگینے، میرب، سحاب میر اور روشانے صنم یار کہاں چلی گئی ہو آپ۔ محفل آپ کے بغیر ادھوری ہے۔ کہانیوں میں جہاں دیوی کی جدائی نے دل اداس کیا، وہیں طاہر جاوید صاحب کی پرواز نے دل خوش کر دیا۔ مصنف صاحب پلیز پلیز پلیز! پرواز کی پرواز اتنی اونچی کر دیں کہ اسٹار پلس کے ڈراموں کو پیچھے چھوڑ جائے یعنی اس سلسلے کو اتنا طویل کر دیں کہ ہم اسے پڑھتے ہی رہیں۔ ویسے دیوی جیسا شاہکار لکھنے پر دلی دلی مبارک باد قبول کریں۔ مختصر کہانیوں میں فنکار نے ہلا کر رکھ دیا۔ پستہ قد شخص کو نفسیاتی بنانے میں معاشرے کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ غیرت بلاشبہ بہترین تحریر تھی۔ بس تھوڑی تشنگی کا احساس ہوا۔ نسل پرست، اصل میدان، وجہ فساد، خزانہ اور ٹپ ٹپ جاسوسی کے عین مزاج کی تحریریں تھیں۔ ہم شکل پڑھ کر یوں محسوس ہوا جیسے اس تحریر کو پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔ پہلے رنگ میں کفیل کا کردار متاثر کن تھا۔ رب کعبہ اتنی خوب صورت تحریر تھی ہم نے اسے دو بار پڑھا ویل ڈن فائزہ جی۔ چشم تماشا اور دو اور دو چار ویری گڈ۔ شناخت بہتر سے بہترین کی طرف گامزن ہے۔ لیجیے جناب، پورا ڈائجسٹ دو دن میں ختم اب پھر مہینا بھر انتظار۔"

ندا مغل جی، مرغزار کالونی گجرات سے لکھتی ہیں "اس دفعہ بڑے بھائی جان شمارہ 3 فروری کو بک شاپ سے خرید کر لائے تو ان کی منت سماجت کی کہ پلیز! اس بار سب سے پہلے مجھے پڑھنے دیں۔ دوسرے بھائیوں کو بھی منا لیا اور یوں ریکارڈ قائم کر دیا پہلے پڑھنے کا۔ جاسوسی کے چمن یعنی چینی نکتہ چینی میں اس دفعہ میں بلیک لسٹ کی ہیٹ ٹرک کی امیدوار تھی۔ مگر کامیاب نہ ہو پائی۔ پر اول خط پر شاداب خان کا قبضہ تھا۔ مبارک ہو بھائی، تبصرہ اچھا تھا۔ سب سے پہلے غیرت پڑھی۔ اب کی بار بہت چینج اور اچھی لگی۔ دیوی کو ڈھونڈا مگر ملی نہیں۔ یاد آیا کہ وہ تو پچھلے ماہ کو ہائے ہائے کر گئی تھی۔ خیر شناخت تلاش کی۔ جلدی مل گئی۔ وجی کی محبوبہ مل ہی نہیں رہی۔ ادھر بگ باس بنت لیلیٰ کے ساتھ رہنے کا خواہاں ہے۔ شناخت کے بعد مغل انکل کی نئی کہانی پرواز پڑھی۔ اچھی لگی۔ شاہ خاور کا کردار سب سے جاندار ہے تھاہ کر کے۔ چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں اصل میدان، نسل پرست اور خزانہ اچھی تھیں۔ مدیحہ شاہ کی فنکار بالکل ہی فرضی لگی۔ سب سے آخر میں سرورق کے خوش نما دونوں رنگ باری باری پڑھے تو ان میں جو کہانی بہت زیادہ پسند آئی وہ پہلا رنگ یعنی سم قاتل تھی۔ کفیل جعفری کے مجبور قلم نے حقیقت کے پردوں کو اچھے طریقے سے بے نقاب کیا تھاہ کر کے۔"

انجم فاروق کا تبصرہ علامہ اقبال ٹاؤن لاہور سے "فروری کا جاسوسی خوش رنگ اور جاذب نظر ٹائٹل کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ خطوط کی محفل خاصی

بھر پور تھی۔ بلیک زیرو نے بعض کہانیوں کے مزاج سے مختلف ہونے کا شکوہ کیا۔ جو کسی حد تک درست ہے۔ سسپنس اور سرگزشت کے مزاج میں ایک مخصوص وسعت ہے لیکن جاسوسی کا اپنا مزاج ہے، ذائقہ ہے۔ اس کی اپنی ایک روایتی شان ہے۔ اگر لکھنے والے اس کے مزاج کا بھرپور خیال رکھیں تو پذیرائی زیادہ ہو گی۔ اس مرتبہ فہرست جو کہانیوں کا چہرہ ہے، خوب صورت ڈیزائننگ سے آراستہ تھی۔ کہانیوں میں چشم تماشا، ثمر عباس صاحب اور وجہ فساد اچھی تحریریں تھیں۔ خزانہ بھی کافی متاثر کن کہانی تھی۔ ٹپ ٹپ بھی خوب تھی۔ اصل میدان اور نسل پرست بھی اچھی تھیں۔ کچھ تحریریں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔"

ارشد محمود دستی، تحصیل کہوٹہ، نوشہ دیگل سے "ماہ فروری کا شمارہ 2 تاریخ کو 3 بج کر 20 منٹ پر راجہ بازار راولپنڈی سے لیا اور سارے کام چھوڑ کر سیدھا گھر کی طرف گیا۔ ٹائٹل واجبی سا تھا حسینہ کی ترچھی نگاہ بھی ہمیں متاثر نہ کر سکی۔ اس لیے ایڈ پر غور و خوض کرنے لگے۔ سب سے خوب صورت ایڈ کسان بن [illegible] کا تھا۔ جن کا پیغام تھا۔ "کسان اتنا خالص... جتنا پیار" اس کے بعد کہانیوں کی فہرست ملاحظہ کی جو کہ بڑی خوب صورتی سے ترتیب دی گئی تھی۔ کہانیوں کی فہرست سے فارغ ہو کر اگلے دروازے یعنی چینی، نکتہ چینی کی محفل میں آ گئے۔ سب سے پہلے آپ کا تبصرہ پڑھا جو کہ بہت اچھا تھا۔ کاش ہم بھی اپنے فیصلے خود کر سکتے تو یہ ڈرون حملے نہ ہوتے۔ اس کے بعد محفل کے شرکا پر نظر ڈالی۔ سب سے پہلے شاداب خان صاحب تشریف فرما تھے۔ تبصرہ اچھا تھا مبارک ہو۔ اس کے بعد کہانیوں میں سب سے پہلے اپنے محبوب قلم کار جناب طاہر جاوید مغل کی پرواز تھی۔ بہت اچھی کہانی ہے، بالکل دیوی کی طرح ہے۔"

بلیک زیرو فرام گجرات پاکیشیا "اس دفعہ جاسوسی ڈائجسٹ کا سرورق جاسوسی کا عکاس تھا۔ مس جاسوسی، جاسوسی کے راز سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے ہلکی سی مسکراہٹ سے کام لے کر کچھ راز ظاہر بھی کر رہی تھی۔ ان باتوں کے لیے متجسس عینک والا زخمی آدمی بھی جاسوسی کے میدان کا پرانا کھلاڑی لگتا تھا۔ کرسی پر موجود شخص جان کی بازی ہار چکا تھا۔ پتا نہیں کتنے راز لیے اور کتنے راز دیے موت اس کا مقدر بن گئی تھی۔ چینی، نکتہ چینی میں جاسوسی کے جاسوسی خطوط اور اسی طرح جاسوسی کی جاسوسی کہانیوں پر جاسوسی انداز میں جاسوسی خط/تبصرہ لکھ کر اس بار شاداب خان مسٹر جاسوسی بن بیٹھے۔ شناخت میں اب جاسوسی نمایاں نظر آ رہی ہے۔ مگر ابھی بھی کہانی حقیقت کی جاسوسی سے تھوڑے سے فاصلے پر ہے۔ غیرت کا دوسرا اور آخری حصہ سسپنس سے بھرپور تھا۔ اجمل کی جیل سے رہائی تو ڈراما تھی جو تھانے والوں اور نواب کے بھائیوں کی ملی بھگت ہے۔ مگر اس کہانی میں بلقیس کا اغوا کس نے کرایا۔ سرورق کے دونوں رنگ جاسوسی کی صحیح نشان دہی نہیں کر سکے۔ مرچ مسالا نمایاں تھا۔ مختصر طرز کی کہانیوں میں دو اور دو چار اچھی جاسوسی تحریر تھی۔ یہی سب سے زیادہ پسند آئی۔"

نوشی چودھری کی ہمت حافظ آباد سے "برستی بارش کی اس بھیگی دوپہر میں کنگ سائز چائے کا مگ اور چار عدد سینڈوچز کا ناشتا کرنے کے بعد آپ سے مخاطب ہونے کی ہمت و جسارت کر رہی ہوں۔ سرورق میں جاسوسیت ڈھونڈنے سے بھی نہ ملی۔ کم از کم نام کی لاج تو رکھیں ذاکر انکل! یہ قابل توجہ بات ہے۔ سرورق سرسری سی نظر کا حق دار ٹھہرا۔ اشتہارات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے نقار خانے یعنی محفل تک پہنچے اور بے تابی سے خود کو تلاشا۔ اپنے تبصرے کی صحت ملاحظہ کی اور آنکھیں ٹھنڈی کرنے کے بعد باقی تبصروں کو قابلِ توجہ جانا۔ پہلا تبصرہ شاداب خان کا ہے لیکن کہیں بھی انعامی تبصرے کا ٹیگ نہیں ہے۔ اس لیے مبارک باد سے گریز کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہوں۔ جاسوسی میں شدت سے مزاح کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ پلیز کاشف زبیر صاحب سے کہیں جلیل یا شامی کے ساتھ جاسوسی کی رونق کو چار چاند لگائیں۔ ڈائجسٹ پڑھنے سے پہلے تو میں ایک لحظہ کو سوچ میں پڑ گئی کہ شروعات کہاں سے کروں کیونکہ میری ابتدا ہمیشہ دیوی سے ہوتی تھی، سو مغل صاحب کو معیار کا دوسرا نام جان کر ابتدا کی۔ لیکن سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہم تو کسی شاہکار کے منتظر تھے لیکن یہاں تو دیوی پارٹ ٹو شروع ہو گئی۔ محی الدین نواب، احمد اقبال، کاشف زبیر، طاہر جاوید مغل وہ رائٹرز ہیں جن کی تحریریں میں سنبھال کے پورے پروٹوکول، محبت اور عقیدت سے پڑھتی ہوں۔ اس دفعہ کی سب سے شان دار تحریر فائزہ حقی کی رب کعبہ ہے جس کی ہر سطر پُراثر، لفظ لفظ مسحور کن، ہر بات دلنشین و سبق آموز۔"

رفیق احمد خان، میٹروول سائٹ کراچی سے لکھتے ہیں "میں جاسوسی ڈائجسٹ کا پرانا قاری ہوں لیکن خط لکھنے کی جسارت پہلی بار کر رہا ہوں۔ سلسلے وار ناولوں کا میں شروع سے شوقین ہوں۔ دیوی بہت شوق سے پڑھتا رہا ہوں۔ مغل صاحب نے واقعی کمال کر دیا۔ دیوی کی آخری قسط بھی بہت شان دار تھی۔ اس ماہ مغل صاحب کی پرواز نے اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ خاور اور بلقیس کی بے نام محبت نے مزہ دیا۔ حالانکہ اخلاقی لحاظ سے ایک شادی شدہ خاتون سے محبت کسی طور مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ خاور کو بھی اس بات کا احساس ہے لیکن بے چارہ دل کے ہاتھوں مجبور ہے۔ شناخت بھی اچھی جا رہی ہے۔ وجی کو باپ سے ملاقات کے بعد بہن سے بھی ملنے کا موقع مل رہا ہے۔ تمام اپنے ملتے جا رہے ہیں۔ شناخت ملتی جا رہی ہے۔ دوسری طرف وکی شہناز کی جان کے درپے ہے۔ ویسے میرے خیال میں شہناز کو اس کی والدہ اور بھائی کے چنگل سے نکال کر راہ راست پر لے آنا چاہیے۔ کیونکہ اصل دشمنی تو ان کی ہے۔ شہناز تو بے چاری دو پاٹوں میں بری طرح پس رہی ہے۔ خان علی کے ساتھ شہناز کی جوڑی ہی جچ رہی ہے۔ اس لیے شہناز کو خان علی کے ساتھ ہی رکھیے گا۔ باقی کہانیاں بھی اچھی ہیں۔ تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ اگلے ماہ کروں گا۔"

عبدالعزیز خان ممکوئی کا انتظار تحصیل و ضلع میانوالی سے "انکل کہتے ہیں کہ انتظار مشکل ہوتا ہے۔ بلکہ موت سے بھی بدتر ہوتا ہے لیکن جاسوسی کا انتظار ہوتا تو مشکل ہے لیکن پھر بھی دل کو یہ ڈھارس بندھی رہتی ہے کہ یہ مقولہ درست ثابت ہو جائے گا کہ دیر آید درست آید۔ ہم اسی مقولے کی خاطر انتظار کرتے ہیں اور صبر سے کام لیتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور یہ رسالہ ہے ہی ایسا کہ ہر شمارہ پہلے سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اس بار بھی حسبِ توقع رسالہ لیٹ ملا۔ اس بار جاسوسی 9 فروری کو ہمارے ہاں رونق افروز ہوا۔ آپ کے علاوہ ذاکر انکل بھی تعریف کے قابل ہیں کہ وہ ہر ماہ نئے سے نیا سرورق بناتے ہیں اور بڑی چابک دستی سے بناتے ہیں۔ اس دفعہ بھی سرورق خوب صورت تھا۔ ذاکر انکل! آپ کی مہربانی کہ آپ ہمارے لیے ہر ماہ محنت کرتے ہیں۔ ذاکر انکل! مبارک باد اینڈ شکریہ۔

ان قارئین کے نام جن کے خطوط محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

محمد اختر نیازی، گلشن راوی، لاہور۔ محمد آصف دل گداز، جعفر آباد، بلوچستان۔ ڈاکٹر عصمت حیات علوی، ہانگ کانگ۔ اخلاق احمد خان، یو ایس اے۔ ڈاکٹر تنویر عباس تابش، ڈیرہ غازی خان۔ کامران راحیل، کراچی۔ عبدالعزیز خان ممکوئی، حسین آزاد، خوشاب۔ شہزاد خان اچکزئی، پشاور۔ منظر قدوائی، ادستہ محمد، گلشن آرا، چوکی۔ نعیم اختر، کراچی۔ پرویز علی، کراچی۔ اطہر شیخ، لاہور۔ طارق محمود، راولپنڈی۔ طالب شاہ، لاڑکانہ۔

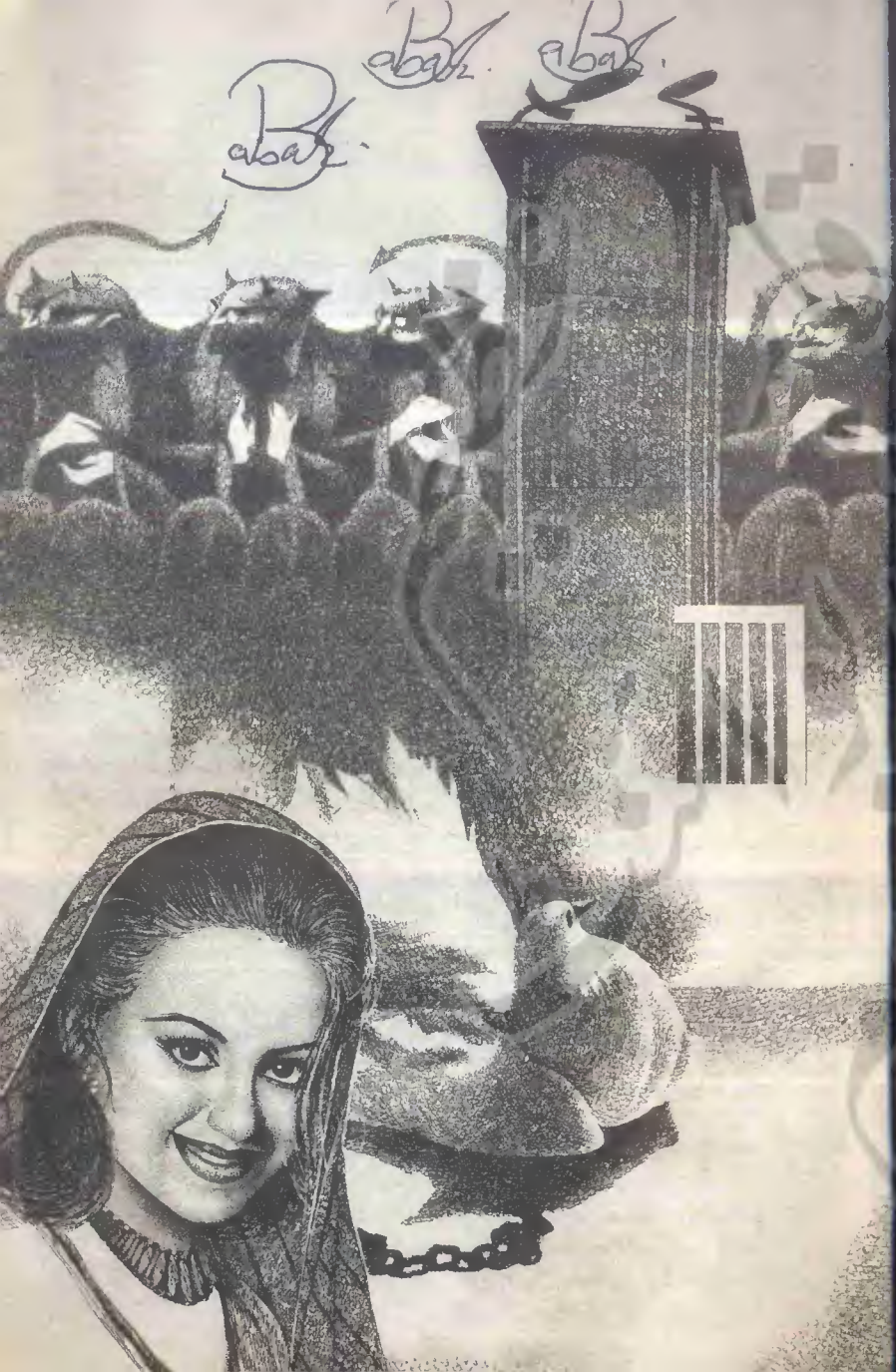

سہ زوا شہ زور

محی الدین نواب

یہ ہمارے ملک کی بد قسمتی ہے کہ چند شہ زوروں نے پوری قوم کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ چھ عشرے گزرنے کے بعد بھی یہ آثار نظر نہیں آتے کہ کبھی قانون کی حکمرانی ہو گی اور انصاف غریب کی دہلیز پر پہنچے گا۔ دولت' مکاری اور بدمعاشی پر مبنی سہ رنگی قوتوں نے ہماری سیاست کو اتنا بد رنگ اور بدہیئت کر دیا ہے کہ کوئی بھی معزز اور تعلیم یافتہ شخص اسے اپنانے پر آمادہ نہیں ہوتا... بلکہ اس سے بے زار اور متنفر نظر آتا ہے۔ زیر نظر داستان بھی ان تین بدرنگیوں کے بل پر شہ زور بن جانے والوں کی نقاب کشائی ہے جو اپنی طاقت کے نشے میں بد مست' اندھیر مچائے ہوئے تھے غریبوں اور مخالفوں کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا۔ پھر یکا یک ہی ایسے فرعونوں کی طاقت ان سے چھن گئی اور وہ مٹی کے حقیر کیڑے جیسے ہو گئے۔

آدمی بڑا ہو' قد آور' صحت مند' دولت مند اور اقبال مند ہو' اسے وسیع ذرائع اور اختیارات حاصل ہوں تو صرف ایک چھوٹے سے نام سے گزارہ نہیں ہوتا۔ وہ اس شخصیت کی مناسبت سے نام کو بھی قد آور بنانا چاہتا ہے۔

کبھی اس کا نام صرف شوکت علی تھا۔ باپ کی وفات کے بعد پورے علاقے کی ذمے داری ورثے میں ملی تو اس نے نام میں ترمیم کی۔ شوکت علی سے... شوکت اکبر علی بن گیا۔

جب الیکشن جیت کر اسمبلی میں پہنچا تو اپنے نام میں جلال الدین کا اضافہ کیا اور شوکت جلال الدین اکبر علی کہلانے لگا۔ مقدر کا ستارہ چمک رہا تھا۔ اسے ایک شعبے کی وزارت مل گئی۔ کامیابی و کامرانی کا دور دورہ تھا۔ اس نے اپنے نام میں کامرانی کا اضافہ کیا اور شوکت جلال الدین اکبر علی کامرانی بن گیا۔

وہ جاگیرداری اور سیاسی سرگرمیوں کے ذریعے مشہور و معروف ہو رہا تھا۔ لیکن نام کے حوالے سے بھی خوب نمایاں رہنا چاہتا تھا۔ اسے صرف وزارت ملی تھی... بادشاہت مل جاتی تو جہانگیر اور عالمگیر بھی کہلانے لگتا۔

ہر زمانہ اپنی حکمرانی سے پہلے غنڈا راج قائم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ غنڈوں کی مدد سے اسمبلیوں میں پہنچنا قدرے آسان ہو گیا ہے۔ اپنی طاقت منوانے کے لیے مسلح فوج بنائی جائے تو سیکڑوں ہزاروں سپاہیوں کو تنخواہیں دینی پڑتی ہیں۔ غنڈے مار پیٹ' قتل و غارت گری اور لوٹ مار کے ذریعے عوام سے اپنی تنخواہیں وصول کر لیتے ہیں۔ سیاست دانوں کو اپنی جیب سے کچھ دینا نہیں پڑتا۔ بس چھوٹ دینی پڑتی ہے۔

شوکت آباد ایک چھوٹا سا گاؤں تھا تاہم بعد میں چھوٹے سے ٹاؤن میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ترقی کی وجہ منشیات کا کاروبار تھا۔ سرحدی علاقے سے افیون' چرس اور ہیروئن آتی تھی۔ شوکت جلال الدین اکبر علی کامرانی کے حکم کے بغیر اینٹی نارکوٹکس والے ادھر چھاپا مارنے نہیں آتے تھے۔ اچانک آتے بھی تھے تو اس جاگیردار کے پالتو غنڈوں کو پہلے سے خبر ہو جاتی تھی۔

آس پاس کے بڑے بڑے شہروں سے حتیٰ کہ کراچی سے بڑی بڑی گاڑیوں میں منشیات کے خریدار آتے تھے۔ ان کے لیے رہائشی ہوٹل' شراب خانے اور خمار خانے قائم کیے گئے تھے۔ وہاں کسی کو قانون کا خوف نہیں تھا۔ وہ شوکت جلال الدین اکبر علی کامرانی کے زیرِ سایہ غنڈوں اور پولیس والوں کو بھتا دیتے تھے اور آرام سے دھندا جاری رکھتے تھے۔

ان غنڈوں کے سردار کا نام سردار خان تھا۔ پورے شوکت آباد میں وہ سردارا کے نام سے مشہور تھا۔ سیدھے سادے لوگ ہوں یا جرائم پیشہ افراد... سب ہی اس کے سامنے سر جھکاتے اور ہاتھ جوڑتے تھے۔ تھانے دار بھی اس کی اجازت کے بغیر کسی حواری پر ہاتھ نہیں ڈالتا تھا۔

سب ہی جانتے تھے کہ وہ شوکت علی کامرانی کا خاص بندہ ہے۔ اس کے تمام اہم رازوں کا امین ہے۔ شوکت علی کامرانی نے کتنے سیاسی مخالفین کو قتل کرایا ہے؟ کتنوں کی لاشیں غائب کرکے انہیں کہاں کہاں چھپایا گیا ہے؟ کتنی بہوؤں بیٹیوں کی عزتیں لوٹی گئی ہیں اور کیسے کیسے ہتھکنڈوں سے مخالفین کی زمینوں پر قبضہ جمایا گیا ہے؟ ان سب کا عینی شاہد صرف سردارا ہی تھا۔

وہاں کے سب ہی لوگ اس سے خوف زدہ رہتے تھے۔ شوکت علی کامرانی بھی اپنے طویل اور بارعب نام کے باوجود سردارا کے چٹکی بھر نام سے محتاط رہتا تھا۔ منشیات کے دھندے میں اس کی بھرپور سرپرستی کرتے ہوئے یہ بات اس کے دماغ میں ٹھونستا رہتا تھا کہ اس جاگیردار اور سیاست دان کی عنایت کے بغیر وہ ایک دن بھی اپنا دھندا نہیں چلا سکے گا۔ کسی بھی دن اینٹی نارکوٹکس فورس کے جوتوں تلے دکھائی دے گا۔

دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ خوف کئی وجوہات سے مسلط ہوتا ہے۔ اگر ایک شہ زور کا راز کسی کمزور کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس کمزور سے خوف زدہ رہنے لگتا ہے۔ یہ کہنا چاہیے کہ شوکت علی کامرانی اور سردارا دونوں ہی ایک دوسرے سے خوف زدہ رہتے تھے۔ اس لیے ایک کا ڈرگ مافیا اور دوسرے کا سیاسی دھندا کسی روک ٹوک کے بغیر چل رہا تھا۔

ویسے کوئی بھی غلط دھندا سہولت سے نہیں چلتا۔ کوئی رکاوٹ نہ ہو' تب بھی الجھنیں ضرور پیدا ہو جاتی ہیں۔ سردارا نے بشریٰ کو دیکھا تو الجھ کر رہ گیا۔

وہ دوشیزہ ایسی زبردست تھی کہ ''ٹھاہ'' کر کے سیدھی دل میں لگی تھی۔ وہ پکا عیاش تھا۔ من پسند عورتیں آسانی سے مل جاتی تھیں۔ اس نے شادی خانہ آبادی اور اپنی آئندہ نسل کے متعلق پہلے نہیں سوچا تھا مگر بشریٰ کو دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے اپنے خاص ساتھیوں سے پوچھا۔ ''یہ کڑی کس کی ہے؟''

اس کے ایک ساتھی تیمور نے کہا۔ ''استاد! کڑی کسی کی بھی ہو... آم کھانا ہے تو بول...! یہ رس بھری تیری منجھی تے آجائے گی۔''

سردارا کے تین خاص بندے تھے۔ بشارت' تیمور اور بڈھا ابلیس! اس بڈھے کا نام کچھ اور ہوگا مگر سب ہی اسے بابے ابلیس کہتے تھے۔ وہ ساٹھ برس کا صحت مند بوڑھا تھا۔ ایک شیطان کی ساری صفات اس میں موجود تھیں۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''چنگی پھڑ کان آلی اے۔ جب اے نکی کاکی تھی' تب سوچیا تھا' کسی ویلے اٹھا کے کھیتوں میں لے جاؤں گا۔''

سردارا نے اس کے سر پر چپت مارتے ہوئے کہا۔ ''بابے! تو سچ مچ ابلیس ہے۔ بچیوں پر نیت خراب کرتا ہے۔ اس کے لیے کان پکڑ لے۔ اسے کبھی گندی نظر سے نہ دیکھنا۔ میں اس مجاجن سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہائیں...!'' تینوں ماتحتوں نے اسے حیرانی اور بے یقینی سے دیکھا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''میں بیوی بچوں کے بکھیڑوں میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ پر عمر لنگ دی جاری اے۔ دھندے کو سنبھالنے کے لیے پُتر شتر تو پیدا کرنے ہی پڑیں گے نا...''

سب نے قائل ہو کر سر ہلایا۔ بابے نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ ''یعنی طوطیاں تے باجے... پلاؤ تے زردے... اوئے واہ! پھر تو ہم اسے عزت سے اٹھا کر تیرے ڈیرے پر پہنچائیں گے۔''

وہ اس کے سر پر پھر ایک چپت مارتے ہوئے بولا۔ ''اے پہلی واری سن رہا ہوں کہ کسی کو عزت سے بھی اغوا کیا جاتا ہے۔''

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ بشارت نے کہا۔ ''اودا ناں بشریٰ ہے۔ سلامت علی گجر کی دھی ہے۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں' گجر کتنے غیرت مند ہوتے ہیں۔ وہ تجھے رشتہ نہیں دیں گے۔''

وہ گھور کر بولا۔ ''او کیوں نہیں دیں گے؟''

''وہ کسی کی منگ ہے۔ چٹھی کھل چکی ہے۔ اگلے برس دسویں پاس کر لے گی تو اس کی جنج آئے گی۔''

''اس سے پہلے میری جنج وہاں پہنچ سکتی ہے۔ میں رشتہ مانگنے جاؤں گا۔''

''جانے سے پہلے یہ بات پلّے باندھ لے' اُدھر سے انکار ہی ہوگا۔ ہم بدمعاشی سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں مگر کسی بھی شریف گھرانے سے عزت حاصل نہیں کر سکتے۔''

وہ حقارت سے بولا۔ ''اونہہ... عزت کیا ہوتی ہے؟ یہی کہ لوگ ہمیں سلاماں کریں تو یہاں سب ہی سلام کرتے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہمیں

عزت سے بٹھانے کے لیے منجھی پر دھلی ہوئی چدر لا کر بچھاتے ہیں۔''

تیمور نے کہا۔ ''اوئے بھولیا! وہ ہمارے خوف سے ایسا کرتے ہیں۔''

''خوف ہی تو سب کچھ ہے۔ ماں کا خوف نہ ہو تو بچے [illegible] گالیاں دیں گے۔ استاد کا خوف نہ ہو تو سکول نہیں جائیں گے۔ پولیس اور حکمرانوں کا خوف نہ ہو تو قنون کی پابندی نہیں کریں گے۔ سدّھی سی بات ہے' رب کا خوف نہ ہو تو کوئی اس کے آگے سجدہ نہ کرے۔''

بابے ابلیس نے کہا۔ ''اور ہم نے تو پتا نہیں بچپن میں بھی نماز پڑھی تھی یا نہیں؟ مینوں تے کج یاد نئیں اے...''

وہاں کسی کو یاد نہیں تھا' کبھی نماز پڑھنے کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ خدا کا نام بھی صرف قسم کھاتے وقت زبان پر آتا تھا۔ ایسے گناہ گاروں کی بستی میں بشریٰ جوان ہوئی تھی۔

وہ دسویں جماعت میں تھی۔ اگلے برس بورڈ کے امتحانات سے گزرنے والی تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ بدنصیبی کچی عمر میں بھی کڑے امتحانات سے گزارتی ہے۔ وہ غیر معمولی ذہانت کی حامل تھی۔ سب ہی کہتے تھے' وہ بورڈ کے امتحانات میں صرف پاس نہیں ہوگی بلکہ صوبے بھر میں اول پوزیشن حاصل کرے گی۔

اس کے باپ سلامت علی کے پاس ایک سوزوکی کیری تھی۔ وہ اس گاڑی کے ذریعے درجنوں مکانوں' دکانوں اور ہوٹلوں میں دودھ سپلائی کرتا تھا۔ ایک جوان بیٹا طارق بھینسوں کے باڑے میں اور دودھ بیچنے میں اس قدر معروف رہتا تھا کہ اسے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ گھرانا بہت خوش حال تھا۔ اچانک ہی ان کی خوش حالی کو گرہن لگ گیا۔

سردارا اپنے حواریوں کے ساتھ اسی شام سلامت علی کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''بولو سردارا! ادھر کیسے آ گئے؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اب آ ہی گیا ہوں تو کیا بیٹھنے کو نہیں بولو گے؟''

''ہاں ہاں، بیٹھو اور بولو... دودھ منگواؤں یا لسّی؟ میں زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکوں گا۔ دودھ کی گاڑی لے جانی ہے۔''

وہ اپنے حواریوں کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں بھی زیادہ ٹیم نہیں لوں گا۔ دودھ اور لسّی پھر کبھی سہی۔ کام کی بات یہ ہے کہ میرا کوئی شریکے کوئی بزرگ نہیں ہے... اگر ہوتا تو وہ میرے لیے رشتہ مانگنے تمہاری چوکھٹ پر آتا۔''

یہ سنتے ہی سلامت علی ذرا تن کر بیٹھ گیا۔ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''بس اَگے گل نہ کرنا۔ ہم گجر ہیں۔ اپنی برادری میں رشتہ کرتے ہیں اور میری دھی کی بات پکی ہو چکی ہے۔''

''اپنی پھیتی انکاری نہ کرو۔ یہ دیکھو' تمہارے سامنے کون بیٹھا ہے؟ تم سے کبھی سلام دعا نہیں رہی پھر بھی مجھے جانتے ہو گے۔ میرا ناں ہوا کی طرح ہر ویڑے میں پہنچتا ہے۔ یہاں ہر سانس لینے والا مجھے جانتا ہے۔''

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے حواری بھی اٹھ گئے۔ اس نے کہا۔ ''ابھی تو جا رہا ہوں۔ کل شگن کی مٹھیائیوں کے ساتھ آؤں گا۔''

سلامت علی نے گھور کر کہا۔ ''کیا زبردستی ہے؟ جا... ادھر کا رستہ بھول جا...''

سردارا نے اسے شعلہ بار نگاہوں سے گھورا۔ پھر شانے پر پڑے ہوئے رومال کو اتار کر جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''زبردستی کرنی ہوتی تو چوکھٹ پر سوالی بن کر نہ آتا۔ ایک واری کہہ دیا' آؤں گا تو فیر آؤں گا...''

سلامت علی نے دُھتکارنے کے انداز میں کہا۔ ''اوئے جا جا! دفع ہو جا... آئے گا تو مٹھیائیوں کے ساتھ چار موںڈھوں پر جائے گا۔''

بشارت نے اپنی گن سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ ''اوئے! میں ابھی تجھے چار موںڈھوں پر چڑھا دوں گا۔''

اسی لمحے میں فائرنگ کی گونجتی ہوئی آواز کے ساتھ بشارت کے ہاتھ سے گن چھوٹ گئی۔ سلامت علی کا بیٹا طارق باپ کے پیچھے دروازے پر گن لیے کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''تم لوگوں کی بدمعاشیاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ گجروں کے منہ لگنے آئے ہو۔ پھر کبھی ادھر کا رخ کیا تو کوئی زندہ واپس نہیں جائے گا۔ چلو... شکل گم کرو۔''

سردارا غصے سے تلملا رہا تھا۔ شوکت آباد کے رہنے والے اس کے نام سے کانپتے تھے۔ کوئی اس سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ پہلی بار سلامت علی اور اس کا بیٹا اس زبردست سے زیر نہیں زبر ہو رہے تھے۔ اسے پسپا ہونے پر مجبور کر رہے تھے۔

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا اپنے ڈیرے میں واپس آ گیا۔ ایسی شکست اور ذلت اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ اس وقت ڈیرے کے باہر ایک کتا بھونک رہا تھا۔ اس نے بشارت سے رائفل لے کر اسے گولی مار دی۔ رائفل کو زمین پر پٹختے ہوئے کہا۔ ''میں ان باپ بیٹے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

تیمور نے کہا۔ ''غصہ تو ہمیں بھی آرہا ہے۔ یہ ذلت برداشت نہیں ہو رہی ہے۔''

بشارت نے کہا۔ ''تیری قسم سردارا! ہم خون کے گھونٹ پی رہے ہیں۔ تو بولے گا تو آج ہی شب خون ماریں گے۔''

بابے ابلیس نے سردارا کے قریب آکر سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''میں بولوں گا تو پھر چھیڑ پڑے گی۔ اس لیے پہلے ہی سر جھکا دیا ہے۔ سردارا! عقل کی بات یہ ہے کہ دُم ہلانے والے کتے کو کوئی مارو تو دوسرے کتے کاٹنے نہیں آتے۔ مگر سر جھکانے والی رعیت میں کوئی بھونکنے لگے تو سنبھل جانا چاہیے۔ پہلے دیکھنا سمجھنا چاہیے کہ اس کمزور کے پیچھے کون سی طاقت ہم پر بھونکنے کے لیے اُسے اُکسا رہی ہے؟''

سردارا نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر کہا۔ ''تُو بڑی دور تک سوچتا ہے۔''

''کیوں نہ سوچوں اور سمجھوں؟ جب تم ننگے سے تھے' گلیوں میں ننگے پھرتے تھے، تب میں گبرو جوان تھا۔ تب سے جانتا ہوں' اس علاقے میں کون بلی ہے اور کون چوہا...؟''

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔ ''سلامت علی چوہا ہوتا تو تجھ جیسے خونخوار بلے کے سامنے نہ غراتا۔ ہمارے ٹاؤن میں چار گجر خاندان بہت پیسے والے ہیں۔ ان کے پاس اسلحہ بھی ہے۔ آس پاس کے شہروں میں جتنے گجر ہیں، ان سے رشتے داریاں بھی ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایک سلامت علی پر آنچ آئے گی تو سب ہی ہماری جان کو آجائیں گے۔''

بشارت نے کہا۔ ''اوئے بابے کھوسٹ! کیوں بزدلوں کی طرح بول رہا ہے؟ کیا ان دودھ بیچنے والوں سے ڈر گیا ہے؟''

''یہ سمجھنے کی بات ہے کہ ہم کب ڈرتے ہیں اور کب نہیں ڈرتے؟ ہم چھوٹے بڑے دکان داروں سے بھتا لیتے ہیں۔ ڈکیتیاں بھی ڈالتے ہیں۔ غریب مزدوروں اور کسانوں کی بہو بیٹیوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ وہ روتے گڑگڑاتے تھانے کے چکر لگاتے ہیں کیونکہ وہ کمزور ہیں۔''

وہ ذرا عاجزی سے بولا۔ ''تم سب میری باتوں کو دھیان سے سنو۔ ہم طاقت کے نشے میں ایک طاقتور کے ڈیرے پر چلے گئے تھے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہم ان سے ڈر جائیں گے۔ میں تو کہتا ہوں' پہلے ان کی طاقت کا حساب کرو۔ اگر وہ سوا سیر ہوئے تو ہم کیا کریں گے؟''

تیمور نے کہا۔ ''ہم لڑتے لڑتے مر جائیں گے، پر اُن کے اَگے نہیں جھکیں گے۔''

سردارا نے کہا۔ ''اوئے! ہم یہاں لاکھوں روپے کا دھندا کر رہے ہیں۔ کیا اسے چھوڑ کر مر جائیں گے؟ یہ بابا سالا شیطان ہے۔ پر باتیں پتے کی کرتا ہے۔''

وہ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''یہ گجر پیسے والے ہیں۔ تھانے کچہری کے معاملے میں پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ پہلے یہ ملوم کرنا ہوگا کہ بات بڑھے گی تو ساڈے کامرانی صاب اور تھانے دار کیا کر سکیں گے؟''

''تو پھر آج ہی ملوم کرو۔ ہم وہاں سے کمزور بن کر آئے ہیں۔ یہ بے عزتی برداشت نہیں ہو رہی ہے۔''

سردارا چارپائی پر چاروں شانے چت ہو کر بولا۔ ''ہمیں اپنی بہت بڑی کمزوری کو ماننا ہوگا۔ ہم لاکھوں کا دھندا چوپٹ نہیں ہونے دیں گے۔''

کسی بھی پہلو سے کمزور ہونے کا مطلب ہے کہ کسی نہ کسی کے دباؤ میں آنا۔ گجر پہلوانوں کے اکھاڑے میں اترنے کے بعد یہ معلوم کرنا ضروری ہو گیا تھا کہ سیاسی پہلوان شوکت جلال الدین اکبر علی کامرانی اور قانونی پہلوان تھانے دار سلطان بگا ان گجروں کو پچھاڑ سکیں گے یا نہیں؟

شوکت علی کامرانی اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ پتا نہیں کتنے دنوں میں واپس آنے والا تھا؟ وہ سلطان بگا سے ملنے تھانے پہنچ گیا۔ تھانے دار نے اسے دیکھتے ہی کرسی سے اٹھ کر مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آؤ سردارا! تم آتے ہو یا مجھے بلاتے ہو تو جیب بھاری ہونے لگتی ہے۔''

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''کوئی نئی واردات نہیں ہے۔ پھر بھی ڈیرے پر آؤ گے تو دس ہزار مل جائیں گے۔''

''او جیو سردارا! بولو کیا پیو گے؟''

اس نے گھور کر پوچھا۔ ''خون پلاؤ گے؟''

بگا نے میز پر جھک کر پوچھا۔ ''کس کا...؟''

''سلامت علی گجر اور اس کے بیٹے کا...''

''معاملہ کیا ہے؟''

''تم نے اس کی جوان دھی کو دیکھا ہے؟''

''ہاں۔ بشریٰ تو ہمارے سامنے کی کاکی ہے۔''

''اس پر میرا دل آگیا ہے۔''

وہ ذرا پریشان ہو کر بولا۔ ''کیا بول رہے ہو؟''

''وہی جو سن رہے ہو۔ میں چاہتا تو اسے اٹھوا لیتا۔ سالی اِن لڑکیوں کو چیرنے پھاڑنے میں دیر کیا لگتی ہے؟ پر پتا نہیں' اسے دیکھ کر بیاہ رچانے کا شوق کیسے پیدا ہو گیا؟''

''بیاہ...'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم ایک شریف خاندان میں بیاہ کرنا چاہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''کمال ہے۔ زندگی میں پہلی بار اک چنگا کام کرنا چاہتا ہوں اور تم حریان ہو رہے ہو۔''

''میرے بدن پر ایس ایچ او کی یہ وردی دیکھ رہے ہو؟ اسے پہن کر شاید میں کسی شریف گھرانے میں رشتے داری کر سکوں لیکن یہ بدن سے اترے گی تو پکا بدمعاش کہلاؤں گا۔ ہم سب پہنچے ہوئے ہیں۔ کسی بھی شریف گھرانے کو لوٹ سکتے ہیں مگر کسی بھی گھرانے سے شرافت کا سرٹیفکیٹ نہیں لے سکتے۔''

''آج میرے ساتھ یہی ہوا ہے۔ سلامت علی نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اور تو اور اس کے بیٹے نے ہم پر گولی چلائی تھی۔''

''سردارا! سب ہی ترنوالے نہیں ہوتے۔ تم سب ہی کو چبائے بغیر نگل نہیں سکتے۔''

''میں انہیں چبا چبا کر نگل جاؤں گا۔''

''دانت ٹوٹ جائیں گے۔ کچھ لوگ لوہے کے چنے ہوتے ہیں۔''

''تم اُس دودھ بیچنے والے کو لوہے کا چنا کہہ رہے ہو؟''

''وہ اکیلا ہوتا تو دو کوڑی کا ہوتا۔ اس کی برادری یہاں سے دوسرے شہروں تک پھیلی ہوئی ہے۔ کسی پر بُرا وقت آتا ہے تو سب ہی دوڑے چلے آتے ہیں۔ تم خوامخواہ ان سے پھڈا نہ کرو۔''

''اگر کروں اور بات بگڑے تو تم کچھ نہیں کر پاؤ گے؟''

''صرف میری اور تمہاری بات نہیں ہے۔ کامرانی صاحب بھی مشکل میں پڑ جائیں گے۔ لاہور اور گوجرانوالہ سے اس برادری کے کئی بندے صوبائی اور قومی اسمبلیوں میں ہیں۔ ہمارے کامرانی صاحب کے لیے ان سے نمٹنا آسان نہیں ہوگا۔''

وہ سن رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ تھانے دار کے سمجھانے سے یہ بات سمجھ میں آرہی تھی کہ صرف ایک بشریٰ کو جبراً حاصل کرنے کے باعث اس کی بدمعاشی اوپر والوں تک پہنچ جائے گی۔ وہ قانون کی گرفت سے بچ نہیں پائے گا۔ منشیات کے دھندے اور لاکھوں روپے کی آمدنی سے بھی جائے گا۔

وہ وہاں سے اٹھ کر باہر آیا۔ اس کے تینوں حواری جیپ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اگلی سیٹ پر آکر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''ڈیرے چلو۔ میری کھوپڑی گھوم رہی ہے۔ وہ سالی میرے ہاتھ نہیں لگے گی۔''

تیمور نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔

بشارت نے کہا۔ ''استاد کا موڈ خراب ہے۔ پہلی دھار کا ٹھرا لاؤں گا۔ بولو تو کسی پٹاخے کو بھی نال لے آؤں؟ وہ تیرا غم غلط کرے گی۔''

''او آہو... کسی کی ایسی تیسی نہ کی تو وہ سالی کھوپڑی میں ناچتی رہے گی۔''

بابے ابلیس نے پوچھا۔ ''کچھ ملوم تو ہو تھانے دار نے کیا کہا ہے؟''

وہ جیپ کے باہر تھوکتے ہوئے بولا۔ ''ان گجروں کی رشتے داریاں دور تک ہیں۔ برادری کے دو چار بندے اسمبلیوں میں بھی ہیں۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تو کامرانی صاب بھی میرے لیے کچھ نہیں کر سکیں گے۔''

''مطلب یہ کہ وہ گجر ہم سے زیادہ ڈھاٹے ہیں۔ ہمیں ان سے ڈر کر' دب کر رہنا پڑے گا؟''

''بکواس نہ کر۔ میں ڈرتا نہیں ہوں۔ میدان کا سپاہی ہوں۔ مجبوراً دو قدم پیچھے ہٹوں گا پھر دس قدم آگے بڑھوں گا۔''

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ''وہ میرے اندر بھری ہوئی ہے۔ اسے چاہتے ہوئے بھی تھوک نہیں سکتا۔ خموشی سے نگلتا جا رہا ہوں۔ ابھی کچھ پلے نہیں پڑ رہا ہے' کیا کروں گا؟''

''آج رات خوب موجاں کرو۔ دماغ وِچ ٹھنڈ پڑے گی تو سویرنوں کوئی تدبیر آپ ہی آپ آجائے گی۔''

وہ ایک چوراہے سے گزر رہے تھے۔ ایسے ہی وقت سامنے سے آنے والی جیپ نے ان کا راستہ روک دیا۔ اس جیپ پر بشریٰ کا بھائی طارق گن لیے کھڑا تھا۔ بشارت نے فوراً ہی اٹھ کر اپنی گن سیدھی کی۔ طارق نے کہا۔ ''اوئے بدمعاشا! پچھے دیکھ...''

سردارا اور اس کے حواریوں نے سر گھما کر دیکھا۔ پیچھے ایک اور جیپ آکر رکی تھی۔ اس پر بھی کئی گن مین دکھائی دے رہے تھے۔ اس چوراہے پر اچانک ہی دہشت پھیل گئی۔ لوگ دور بھاگنے لگے۔ آس پاس کی دکانوں کے شٹر بند ہونے لگے۔ دو اور گاڑیاں قریب آکر رک گئی تھیں۔ وہاں سے بھی کئی گن مین اتر کر آرہے تھے۔ ایک تگڑے جوان نے سردارا کو گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''اپنے کتے کو بول... ہتھیار پھینک دے۔''

سردارا نے بشارت کو اشارہ کیا۔ اس نے گن پھینک دی۔ طارق نے کہا۔ ''سردارا! تُو ابھی جس کے نشانے پر ہے' یہ بشریٰ کا ہونے والا خاوند اور میرا ہونے والا بہنوئی دارا شکوہ ہے۔ تُو شگن کی مٹھائیاں لانے والا ہے۔ پر کل تو بہت دور

ہے... یہ آج ہی تجھ سے نمٹ لے گا۔''

داراشکوہ نے کہا۔ ''تم لوگ غریب عورتوں اور مردوں پر جو ظلم کرتے ہو، اسے تو ہم دیکھتے ہیں اور چپ رہتے ہیں۔ کیونکہ معاملہ قانون اور پولیس کا ہے۔ ہمارے اس ٹاؤن میں تو کیا پورے ملک میں طرح طرح کی دھاندلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ پوری قوم تماشائی ہے مگر ہم اپنے معاملے میں یہ تماشا نہیں ہونے دیں گے۔''

سردار نے کہا۔ ''او کوئی تماشا نہیں ہوگا دار یا...! ہمیں ملوم نئیں تھا کہ وہ تیری منگ ہے۔ جب ملوم ہوا تو ہم چپ چاپ وہاں سے چلے آئے۔ یہ جھگڑا یہیں مُکا دے۔ ہم کبھی تیری طرف رخ نہیں کریں گے۔''

''تُو دیکھ رہا ہے' ساری دکانیں بند ہوگئی ہیں۔ لوگ دور جا کر تجھے دیکھ رہے ہیں۔ ہم تیرا خوف ان کے دلوں سے نکال رہے ہیں۔ آج انہیں معلوم ہو رہا ہے کہ تجھے چوہا بھی بنایا جا سکتا ہے۔''

سردار اسن رہا تھا اور چپ چاپ خون کے گھونٹ پی رہا تھا۔ داراشکوہ نے کہا۔ ''آج پہلا دن ہے۔ تیری اتنی... بے عزتی کافی ہے۔ چل گاڑی سے اتر اور یہاں سے پیدل جا...''

یہ کہہ کر اس نے اپنی گن نیچی کی۔ ایک فائر کیا اور اس جیپ کے ایک پہیے کو ناکارہ بنا دیا۔ وہ چاروں بڑکیں لگانا اور سینہ تان کر چلنا بھول گئے تھے۔ چپ چاپ اتر کر وہاں سے پیدل جانے لگے۔

وہ برسوں سے اس علاقے میں اپنی طاقت کا لوہا منواتے آئے تھے۔ ان کی پشت پر پولیس والے تھے اور سر پر ایک بااختیار سیاست دان کی چھتری تھی۔ کوئی ان کے آگے منہ کھولنے اور نظریں ملانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ پلک جھپکتے ہی شیر سے کتے بن جائیں گے۔

وہ ڈیرے پر پہنچ کر اندر ہی اندر تلملا رہا تھا۔ اپنے آپ پر غصہ کرتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ ''ہم خوف کھانے والوں پر بڑے مزے سے حکومت کر رہے تھے۔ کیا ملوم تھا' اک کڑی کی ہوس ہمیں... سربازار ننگا کر دے گی؟ مجھ سے یہ ذلت برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ پر کس کو غصہ دکھاؤں؟ بھول تو مجھ سے ہوئی ہے۔''

بابے ابلیس نے کہا۔ ''تم نے جان کے غلطی نہیں کی ہے۔ ہمیں کیا ملوم تھا' یہ دودھ بیچنے والے اتنے زوردار ہیں؟ ان کے پاس اسلحہ بھی ہے۔''

بشارت نے کہا۔ ''آج ان کی طاقت کا اندازہ ہوا ہے ہم ان کی ٹکر پر کمزور نہیں ہیں۔ انہوں نے اچانک گھیر لیا اس لیے مات کھا کے آگئے۔ اگلی واری وہ منہ کی کھائیں گے۔''

اس رات وہ خوب پیتے رہے اور غالب آنے والے کے خلاف بولتے رہے۔ انہیں چیلنج کرتے رہے پھر نشے مغلوب ہو کر گہری نیند میں ڈوب گئے۔ دوسرے دن چاروں بجھے بجھے سے رہے۔ چپ چاپ اپنے دھندے لگے رہے۔ شام کو تیمور نے کہا۔ ''سردار!! ایک بات ملوم ہے۔ وہ دین محمد اجو، سیکلوں کی مرمت کرتا ہے۔ اسے جانتے ہو نا؟''

''نہیں جانتا تو جان لوں گا۔ بات کیا ہے؟''

''تم نے اس کی دھی نجو کو دیکھا تھا اور کہا تھا' کسی دن اسے پار لگائیں گے۔''

وہ جھڑکنے کے انداز میں بولا۔ ''مجھ سے کڑیوں کی باتیں نہ کر۔ ابھی ایک ہی بات دماغ میں پک رہی ہے۔ انتقام... صرف انتقام... مجھے اپنی ذلت کا بدلہ لینا ہے۔''

''بدلہ لینے کی ہی بات کر رہا ہوں۔ بشریٰ کے بھائی طارق نے دوبار ہمارا سر نیواں کیا ہے۔ نجو اس کی مشوقہ ہے۔''

سردار نے چونک کر پوچھا۔ ''تُو کیسے جانتا ہے؟''

''ہمارے ڈیرے میں کتنی ہی آتی جاتی رہتی ہیں۔ ان میں سے ایک نے بتایا ہے۔ طارق، نجو سے بیاہ رچانا چاہتا ہے۔ پر اس کا باپ سلامت علی اپنی برادری میں سے کسی کو اپنی نُوں بنانے کی ضد کر رہا ہے۔''

سردار اس کی باتیں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ تیمور نے کہا۔ ''یہ اندر کی بات ہے۔ باپ اور بیٹے میں اختلاف ہے۔ وہ دونوں نجو کے معاملے میں لڑتے رہتے ہیں۔''

وہ مونچھوں پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔ ''ہُوں... بات سمجھ میں آرہی ہے۔ ہم چاہیں تو باپ بیٹے کو ایک دوسرے کا دشمن بنا سکتے ہیں۔''

''یہی بات میرے دماغ میں بھی ہے۔ پر ان کی دشمنی پکی کیسے ہوگی؟ کچھ ایسی تدبیر کرو کہ وہ اندر سے کمزور ہو جائیں۔''

بابے ابلیس نے کہا۔ ''میری کھوپڑی کہتی ہے' نجو کو چُک لو۔ تمہیں مار کے پھینک دو۔ الزام سلامت علی پر آئے گا تو بیٹا آپ ہی اپنے پیُو کا دشمن بن جائے گا۔''

بشارت نے پوچھا۔ ''نجو کو مار کر پھینکیں گے تو الزام سلامت علی پر کیسے آئے گا؟''

بابے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی یہاں کچا ایڈیا

ہے۔اسے پکانا ہوگا۔‘‘

’’کامرانی صاب نے سختی سے تاکید کی ہے‘ ہمیں کبھی کسی قتل کے کیس میں نہیں پھنسنا چاہیے۔ نجو کو مار کر پھینکنے والی بات نہ کرو۔ ہاں۔ اسے اٹھوانے والی بات دل کو لگ رہی ہے۔‘‘

’’اسے اس طرح اغوا کرنا ہوگا کہ ہم پر کوئی الزام نہ آئے۔‘‘

’’یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ہم دوسرے علاقے کے بدمعاشوں کی مٹھیاں گرم کریں گے تو یہ کام ہو جائے گا۔ پر نجو کو مرنا نہیں چاہیے۔‘‘

بابے نے کہا۔ ’’ہم اس مالمے میں جھپتی نہ کریں۔ آرام نال ایسی کھچڑی پکائیں جسے کھانے کے بعد بدہضمی نہ ہو۔‘‘

انہیں دشمنوں کی طاقت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ لہٰذا وہ عجلت سے کام نہیں لے رہے تھے۔ خوب سوچ سمجھ کر منصوبہ بنا رہے تھے۔ پھر مطمئن ہونے کے بعد اپنے منصوبے پر عمل کرنا چاہتے تھے۔

دوسرے دن شوکت جلال الدین اکبر علی کامرانی اسلام آباد سے واپس آ گیا۔ اسکول میں عید میلاد النبی ﷺ کا جلسہ تھا۔ صدارت کے لیے اس علاقے کے منسٹر سے درخواست کی گئی تھی۔ اسی شام سردارا نے اس کی چوکھٹ پر حاضری دی۔ وہاں تھانے دار سلطان بگا منسٹر صاحب کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ وہ بھی سلام کر کے ایک طرف دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

شوکت علی کامرانی نے پوچھا۔ ’’یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ اس ٹاؤن کے گجروں نے تیرے غبارے سے ہوا نکال دی ہے؟‘‘

وہ بولا۔ ’’جناب! میں نے بگا صاب کے سمجھانے پر سوچ لیا تھا‘ ان کے منہ نہیں لگوں گا۔ پر وہ اچانک ہی مجھ پر چڑھ دوڑے۔ مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اگر میں پہلے سے ہشیار ہوتا تو اُن کے غبارے سے پھونک نکال دیتا۔‘‘

بگا نے کہا۔ ’’میں نے انہیں تنبیہہ کی ہے‘ وہ آئندہ سرِعام اسلحے کی نمائش نہیں کریں گے اور نہ ہی سردارا کو للکاریں گے۔‘‘

شوکت علی کامرانی نے بگا سے کہا۔ ’’تم نے بہ ظاہر معاملہ ٹھنڈا کر لیا ہے۔ پر میرے علاقے میں سردارا کی دہشت طاری نہیں رہے گی تو سب ہی سر چڑھ کے بولنے لگیں گے۔ ہمیں ایسا کچھ کرنا ہے کہ وہ گجر سر جھکا کے رہیں یا پریشان ہو کر گھبرا کر ادھر سے چلے جائیں۔‘‘

وہ شاہانہ طرز کی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ’’جب تک ساری طاقت ہمارے پاس نہ ہو اور ساری کمزوریاں عوام میں نہ ہوں تو حکومت مستحکم نہیں ہوتی۔ حکمرانی کا پہلا اصول یہی ہے کہ کسی کو بھی سر اٹھانے سے پہلے کچل دیا جائے۔‘‘

سلطان بگا نے کہا۔ ’’ان دودھ والوں کا کام یہاں خوب جما ہوا ہے۔ انہیں یہاں سے اکھاڑنا مشکل ہوگا۔‘‘

’’ہم سیاست دانوں کے لیے کوئی بات مشکل تو ہوتی ہے‘ پر ناممکن نہیں ہوتی۔ میں کل ہی یہ اعلان کراؤں گا کہ دودھ بائیس روپے کلو نہیں پندرہ روپے کلو فروخت کیا جائے۔ اس طرح انہیں کاروبار میں خسارہ ہوگا۔ وہ مسائل سے دوچار ہوں گے۔ پر دودھ سستا ہوگا تو مجھے عوام کی حمایت حاصل ہوگی۔‘‘

بگا نے کہا۔ ’’بے شک! یہ زبردست سیاسی مار ہوگی۔ وہ احتجاج کریں گے۔ پورے ٹاؤن میں دودھ کی سپلائی بند کر دیں گے۔‘‘

’’اپنے سپاہیوں کے ساتھ تیار رہو۔ وہ دودھ بیچنے والے قانون کو ہاتھ میں لیں گے تو میں آئی جی آف پولیس کو حکم دوں گا۔ یہاں کافی تعداد میں پولیس فورس آ کر حالات کو کنٹرول کرے گی۔‘‘

سردارا نے کہا۔ ’’یہ آپ کی طرف سے بڑے پیمانے پر زبردست حملہ ہوگا۔ وہ لوگ سنبھلنے کی کوشش کریں گے۔ پر میری طرف سے بھی بدمعاشی ہوگی تو ان کے قدم یہاں سے اکھڑ جائیں گے یا فیر وہ ہمارے مقابل کمزور بن کر رہا کریں گے۔‘‘

’’تمہاری بدمعاشی تو اُس کڑی بشریٰ کے لیے ہوگی۔‘‘

اس نے انکار میں سر ہلا کر طارق اور نجو کے معشوقے کے متعلق بتایا۔ ان کے خلاف اپنے منصوبے کا ذکر کیا کہ باپ اور بیٹے کے درمیان اختلافات کی آگ کو بھڑکانے اور انہیں اندر سے کمزور بنانے کے لیے آئندہ کیا کرنا چاہتا ہے؟

شوکت علی کامرانی نے کہا۔ ’’ان پر ہر طرف سے حملے ہوتے رہیں گے تو وہ جھاگ کی طرح بیٹھ جائیں گے۔ میں اپنے علاقے میں کسی کو سر اٹھا کر بولنے کی اجازت نہیں دوں گا۔‘‘

سردارا وہاں سے واپسی پر سلطان بگا کے ساتھ دیر تک رہا۔ ان کے درمیان یہ طے پایا کہ نجو کو اغوا کرنے کے لیے شہر سے غنڈوں کو بلایا جائے گا۔ ایسے وقت سردارا اپنے خاص حواریوں کے ساتھ ان گجروں کی نظروں میں رہے گا تاکہ اس پر کسی طرح کا شبہ نہ کیا جائے۔

دوسرے دن شوکت علی کامرانی جشنِ عید میلاد النبی ﷺ کے سلسلے میں اپنے سیکیورٹی گارڈز کے ساتھ اسکول

...یا تو وہاں اس کا شان دار استقبال کیا گیا۔ اسے اسٹیج پر ...بٹھایا گیا۔ طلبا و طالبات کے درمیان نعت خوانی اور تقاریر ...مقابلہ تھا۔ شوکت علی نے وہاں پہلی بار بشریٰ کو دیکھا۔ وہ ...حد حسین اور پُرکشش تھی۔ اس نے حسن و شباب کے ...بہت دیکھے تھے لیکن بشریٰ کی ذہانت اور صلاحیتیں ... کہ وہ ... ہا تھا اور متاثر ہو رہا تھا۔

جب وہ نعت پڑھنے اسٹیج پر آئی تو اس کی مترنم آواز نے ...پر گہرا اثر کیا۔ اس نے تقریر کرنے کے دوران موجودہ ...کے بدترین سیاسی حالات کا موازنہ حضرت محمد ﷺ کے ...اور معاشرتی دور سے کیا۔ تمام حاضرین و سامعین واہ وا ...تے رہے اور وہ شوکت علی کامرانی کے دل و دماغ میں ...ہوتی رہی۔

تقریب کے بعد ہیڈ مسٹریس اور تمام اساتذہ نے ...سے کہا کہ وہ بورڈ کے امتحان میں صوبائی سطح پر ٹاپ ...ے گی اور اول پوزیشن حاصل کرے گی۔ شوکت علی نے ...کو بلا کر اسے قریب سے دیکھا۔ باتوں کے دوران اس ...متعلق اچھی خاصی معلومات حاصل کیں۔ پھر چپ چاپ ...بار کر اپنی عالی شان کوٹھی میں آ گیا۔

اس کی ایک بیوی اور دو بچے تھے۔ بیوی تو کچھ زیادہ سیکنڈ ہینڈ ہو گئی تھی۔ پھر یہ کہ تعلیم یافتہ نہیں تھی۔ وہ اونچی ...ائٹی میں اپنے شانہ بشانہ سیاسی شعور رکھنے والی بشریٰ جیسی ...چاہتا تھا۔ دوسری شادی کے لیے کوئی روک ٹوک نہیں ...۔ مگر اُدھر یہ رکاوٹ تھی کہ اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ اس کا ...برادری سے باہر نہیں ہو سکتا تھا۔

سیاسی چالبازیاں لوگوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتی ...۔ پھر ان کی برادریاں کیا معنی رکھتی تھیں؟ اقتدار کی قوت ...آگے ساری روایات دم توڑ دیتی ہیں۔

شوکت علی کامرانی کے خیالوں میں شطرنج کی جو بساط ...ہوئی تھی، وہاں دو مہرے اہم تھے۔ ایک بشریٰ کا باپ ...ت علی اور دوسرا بشریٰ کا طلب گار دارا شکوہ...

وہ ان دونوں کو مات دے کر اپنا مقصد حاصل کر سکتا ...۔ ایسے وقت سردارا کی یہ بات دل کو لگ رہی تھی کہ پہلے ...بیٹے کے درمیان پھوٹ ڈالی جائے۔ ان کے اتحاد کو ...پارہ کر کے ہی انہیں کمزور اور اپنا مطیع و فرماں بردار بنایا ...سکے گا۔

اس نے اسی وقت سردارا کو طلب کیا۔ وہ حاضر ہو کر ...۔ ’’جی مائی باپ! حکم کریں؟‘‘

اس نے کہا۔ ’’آج میں نے بشریٰ کو دیکھا ہے۔ آئندہ اسے میلی نظر سے نہ دیکھنا۔ میں اسے شریکِ حیات بنانا چاہتا ہوں۔‘‘

سردارا نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ’’میری کیا مجال ہے؟ میں آپ کی پسند کے آگے نظریں جھکا کے رکھوں گا۔ پر آپ جانتے ہیں‘ وہ اگلے برس اپنی برادری میں بیاہی جانے والی ہے۔‘‘

’’جانتا ہوں، اسی لیے تجھے بلایا ہے۔ اس ہونے والی شادی کو خانہ آبادی نہیں... خانہ بربادی ہونا چاہیے۔ تم ان باپ بیٹے کو آپس میں لڑانے کے لیے کیا کر رہے ہو؟‘‘

’’تین بدمعاشوں سے مُک مُکا ہو چکا ہے۔ وہ کل رات واردات کریں گے۔ نجو کو اٹھا کے لے جائیں گے۔‘‘

شوکت علی کامرانی خیالی شطرنج کی بساط پر مہروں کو دیکھنے اور سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ ’’ایسے وقت وہ باپ بیٹے کہاں ہوں گے اور تم سب کہاں رہو گے؟ پہلے سے اپنی اپنی پوزیشن بنا لو۔‘‘

سردارا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ شوکت علی نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روکا پھر کہا۔ ’’کل شام کو بڑے چوک میں عید میلاد النبی ﷺ کا جلسہ کرو۔ اعلان کرو کہ میں اس جلسے میں عوام کے روبرو آؤں گا اور تقریر کروں گا۔ انہیں دودھ سستا کرنے کی خوش خبری سناؤں گا۔‘‘

وہ بولا۔ ’’بڑی اچھی تدبیر ہے سرکار! ہم سب اس جلسے میں لوگوں کے سامنے موجود رہیں گے تو نجو کے اغوا کا الزام ہم پر نہیں آئے گا۔‘‘

سیاسی چالیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ سانپ بھی مر جاتے ہیں اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹتی۔ پھر یہ کہ دودھ سستا ہونے کے بعد لاٹھی والوں کو زندہ باد کہا جانے والا تھا۔ یہ بھی طے پایا گیا کہ صرف دودھ میں ہی نہیں... آٹا‘ چاول اور دالوں کی قیمتوں میں بھی فی کلو ایک روپے کی کمی کی جائے گی اور بڑے بڑے مہاجنوں کا خسارہ پورا کرنے کے لیے انہیں ملاوٹ کی اجازت دی جائے گی۔ اس طرح مہاجن خوش رہیں گے اور لوگ ہمیشہ کی طرح اُلّو بنتے رہیں گے۔

☆☆☆

نجو آٹا گوندھ رہی تھی۔ ماں چولہے کے پاس سالن پکا رہی تھی۔ چھوٹا بھائی چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دور لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے نعت خوانی سنائی دے رہی تھی۔ اس ٹاؤن کے تقریباً سب ہی مرد وہاں کے جاگیردار اور منسٹر کی تقریر سننے کے لیے جلسے میں گئے تھے۔ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ آج انہیں بہت بڑی خوش خبری سنائی جائے گی۔ اس قوم کو کبھی کوئی

خوش خبری نہیں ملتی۔ پھر بھی وہ سننے گئے تھے۔

چونکہ جلسہ گاہ کو رنگ برنگے قمقموں سے اور تیز روشنیوں سے منور کیا گیا تھا، اس لیے مضافاتی بستیوں میں۔۔ لوڈشیڈنگ کی گئی تھی۔ وہاں کے دوسرے گھروں کی طرح نجو کے گھر میں بھی لالٹین کی پیلی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ باہر دور تک تاریکی تھی۔ ایسی تاریکی میں چار افراد منہ پر ڈھاٹا باندھے اندر چلے آئے۔ ان تینوں کو ریوالور کے نشانے پر رکھتے ہوئے دھمکی دی۔ ''کوئی بھی منہ سے آواز نکالے گا تو اسے گولی ماردی جائے گی۔ چپ رہو گے تو زندہ رہو گے۔''

ماں سہم کر ہاتھ جوڑتی ہوئی ایک کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ چھوٹا بھائی خوف سے چپ تھا۔ ایک نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے چارپائی پر گرادیا۔ نجو ان کی دھونس میں نہیں آئی۔ اس نے چیخ کر پوچھا۔ ''اوئے...! کون ہو تم لوگ؟''

وہ آگے نہ کہہ سکی۔ ریوالور کا دستہ منہ پر پڑا تھا۔ اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔ پیچھے سے ایک شخص نے گردن دبوچ لی۔ دوسرے نے جبراً اس کا منہ کھول کر ایک کپڑا ٹھونس دیا۔ اس کی ماں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ دو افراد نجو کو اٹھا کر ایک کمرے میں لے آئے۔ وہ قابو میں نہیں آرہی تھی۔ جب اسے چارپائی پر ڈال کر اچھی طرح پٹائی کی گئی تو وہ نیم مُردہ سی ہوگئی۔

ایک نے اس کا لباس پھاڑتے ہوئے کہا۔ ''سالی! گجروں کے گھرانے میں بہو بننے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ آج کے بعد کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔''

باہر آنگن میں ایک شخص اس کی ماں سے کہہ رہا تھا۔ ''بیٹا تیری دھی کو بیوی بنانا چاہتا ہے۔ سسر کو بہو پسند نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے' آج کے بعد باپ بیٹے کا جھگڑا ہی مُک جائے۔''

وہ چاروں جلدی میں تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے نجو کی عزت کا کباڑا کردیا۔ پھر کمرے میں رکھی ہوئی قینچی سے اس کے بال کاٹ کر فرار ہوگئے۔ اس تاریکی میں انہیں نہ کسی نے آتے دیکھا اور نہ جاتے۔ وہ ایسی وارداتیں کرنے میں ماہر تھے۔ اپنی مہارت دکھا چکے تھے۔

ماں بیٹے بڑی دیر تک آنگن میں چارپائیوں پر پڑے رہے۔ جب یقین ہوگیا کہ دشمن جاچکے ہیں تو ماں اٹھ کر بیٹے کے پاس آئی۔ دونوں کے ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ کھولے۔ منہ سے کپڑا نکالا۔ پھر تیزی سے چلتے ہوئے کمرے میں آئے۔ وہاں نجو کو دیکھتے ہی ماں کے حلق سے دکھ بھری چیخ نکلی۔ اس نے بیٹے کا منہ دوسری طرف پھیر دیا۔

پھٹا ہوا لباس بھی اس کے بدن پر نہیں تھا۔ وہ [illegible] تھی۔ دونوں ہاتھ چارپائی سے بندھے ہوئے تھے۔ اس [illegible] بے ہوشی طاری تھی۔ بوڑھی ماں نے بیٹے سے کہا۔ '' [illegible] سے جا۔ اپنے ابّے کو بول... یہاں قیامت آگئی ہے۔''

وہ دوڑتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ وہ بیٹی کا بدن [illegible] کر کے دوسرا لباس پہنانے لگی۔ دھاڑیں مار مار کر [illegible] لگی۔ پھر باہر آکر محلے پڑوس والوں کو آوازیں دینے لگی [illegible] سی دیر میں وہاں عورتیں جمع ہوگئیں۔ نجو پہچانی نہیں [illegible] تھی۔ اس کی لانبی چوٹی کٹ چکی تھی۔ سر پر چھوٹے چھو[illegible] بال کانٹوں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ چہرے پر ز[illegible] کے نشان کہہ رہے تھے کہ بڑی بے دردی سے اس پر [illegible] ڈھائے گئے ہیں۔

بیٹے نے جلسے میں آکر باپ کو بتایا کہ گھر میں ڈاکو [illegible] تھے۔ پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہا۔ ''سیکلیں مر[illegible] کرنے والے کے گھر میں کون سا خزانہ دبا ہوتا ہے کہ [illegible] لینے آئیں گے؟''

دین محمد نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''جوان [illegible] رانیاں کسی خزانے سے کم نہیں ہوتیں۔ یہ نہ بھولو کہ آس [illegible] کی بستیوں سے اب تک چار کڑیوں کو اغوا کیا جاچکا [illegible] میرے ساتھ آؤ۔ ضرور کوئی رپھڑ ہے۔''

اس وقت شوکت علی کامرانی تقریر کررہا تھا اور م[illegible] کم کرنے کی باتیں کررہا تھا۔ لوگوں کی دلچسپیاں بڑھ[illegible] تھیں۔ ایسے میں انہوں نے دین محمد کی طرف دیکھتے ہو[illegible] کہا۔ ''اوئے! چپ کر... منسٹر صاب کو بولنے دے۔''

ایسے وقت کتنے ہی گجر دودھ کی قیمت گرانے کے سل[illegible] میں احتجاجاً کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ مسلح سپاہی آگے بڑ[illegible] انہیں چپ رہنے یا وہاں سے جانے کا حکم دے رہے تھے۔

طارق، دین محمد اور اس کے بیٹے کے ساتھ وہاں [illegible] چلا گیا۔ شوکت علی' سلطان بگا' سردارا اور اس کے حوار[illegible] نے طارق کو ان کے ساتھ جاتے دیکھا تو سمجھ گئے کہ [illegible] ہوچکا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہی طارق اور دین محمد نے جلسے میں آ[illegible] شوکت علی کامرانی کے سامنے دہائی دی۔ چیخ چیخ کر بتایا [illegible] دین محمد کے گھر میں ابھی چار ڈاکو آئے تھے۔ انہوں نے [illegible] کی بیٹی نجو کو تباہ و برباد کردیا ہے۔

شوکت علی نے مائیک کے سامنے آکر بڑے جذ[illegible] سے کہا۔ ''نجو ہم سب کی بہن اور بیٹی ہے۔ ہم مجرموں کو [illegible] نہیں ہونے دیں گے۔ میں سلطان بگا کو حکم دیتا ہوں ک[illegible] [illegible] مجرموں کا سراغ لگائے۔''

سلطان بگا کئی مسلح سپاہیوں کے ساتھ مستعدی دکھانے [illegible] کے لیے وہاں سے جاتے ہوئے بولا۔ ''پہلے نجو کا بیان لینا ہوگا۔ [illegible] بتائے گی کہ آنے والے کون تھے اور کس حلیے میں تھے؟''

پولیس والوں کے ساتھ دیگر افراد بھی قافلے کی صورت [illegible] پہنچے آئے۔ نجو کی حالت افسوس ناک تھی۔ اس کے [illegible] چھوٹے چھوٹے کانٹے دار بال ایسے تھے کہ وہ ایک اجڑی [illegible] پاگل سی لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔ بُری طرح لٹنے کے [illegible] باوجود اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ وہ ایک ایک کو گھور [illegible] کر دیکھ رہی تھی جیسے دشمنوں کو ڈھونڈ رہی ہو۔ پھر اس کی گھومتی [illegible] ہوئی نظریں سلامت علی پر آکر ٹھہر گئیں۔

سلامت علی نے ایک بار اس سے کہا تھا۔ ''میرے پتر کا [illegible] پیچھا چھوڑ دے۔ تُو میرے گھر میں کبھی بہو بن کر نہیں آسکے گی۔''

سلطان بگا نے پوچھا۔ ''تم نے ان لٹیروں کی صورت [illegible] دیکھی ہوگی۔ مجھے ان کا حلیہ بتاؤ؟''

نجو نے پھر سلامت علی کو گھور کر دیکھا۔ وہ پریشان ہو کر [illegible] بولا۔ ''مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہے؟''

طارق نے کہا۔ ''نجو! حوصلہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ [illegible] ہوں۔ تھانے دار کی باتوں کا جواب دو۔''

اس کی نظریں بہ دستور سلامت علی پر جمی ہوئی تھیں۔ سلطان بگا نے اس کی ماں سے پوچھا۔ ''تم نے ان لوگوں کو [illegible] دیکھا ہوگا؟''

ماں نے روتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے منہ پر [illegible] ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔ صرف آنکھیں دکھائی دے [illegible] رہی تھیں۔ ان میں سے ایک نے کہا تھا کہ بیٹا تیری دھی کو [illegible] بیوی بنانا چاہتا ہے۔ سسر کو بہو پسند نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے' [illegible] آج کے بعد باپ بیٹے کا جھگڑا ہی مُک جائے۔''

سلامت علی نے غصے سے کہا۔ ''یہ کیا بکواس کر رہی [illegible] ہے؟ ہم باپ بیٹے کا اپنا معاملہ ہے۔ وہ ڈاکو ایسی بات...''

سلطان بگا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سخت لہجے [illegible] میں کہا۔ ''بکواس تم کر رہے ہو۔ اس عورت کو بیان دینے [illegible] سے روک رہے ہو۔ یہاں سے باہر جاؤ۔ اپنے بیٹے کو بھی [illegible] لے جاؤ۔ میں پہلے ماں بیٹی کا بیان لکھوں گا۔ یہ اپنے انگوٹھوں [illegible] کے نشان لگائیں گی، اس کے بعد تمہارا محاسبہ کیا جائے گا۔''

طارق اپنے باپ کو ناگواری سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ابا...! باہر چلو۔''

پھر وہ نجو سے بولا۔ ''میں باہر ہوں۔ وہی بیان دو جو [illegible] سچ ہے۔ کسی سے نہ ڈرو۔ میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔''

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ اِنشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع وشہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں

دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

وہ باہر آیا تو باپ نے کہا۔ ''دیکھ...! ایوئیں شبہ نہ کر۔ اس کی عزت لٹ چکی ہے۔ وہ تیری ہمدردی حاصل کرنے کے لیے میرے خلاف بول رہی ہے۔''

طارق نے کہا۔ ''وہ تو چپ ہے۔ اس نے تمہارے خلاف کچھ نہیں کہا ہے۔''

''اس کی ماں تو کہہ رہی ہے۔ وہ ہمیں آپس میں لڑا کر اپنی دھی کو تیرے گلے میں ڈھولک کی طرح لٹکانا چاہتی ہے۔ عقل سے کام لے۔ اب وہ ڈھول کا پول ہوگئی ہے۔''

''اور تم جو چاہتے تھے' وہ ہوگیا ہے۔''

''بکواس نہ کر۔ میں ایسا کچھ نہیں چاہتا تھا۔ میری بھی جوان بیٹی ہے۔ میں سوہنے ربّ سے ڈرتا ہوں۔''

''سب ہی خدا سے ڈرتے ہیں۔ پر گناہ کرتے وقت سارا ڈر دل سے نکل جاتا ہے۔''

''او، کھوتے دیا پُترا! کس عقل سے سمجھ رہا ہے کہ یہ گناہ میں نے کیا ہے؟''

''تم نے ایک دن کہا تھا' میں نجو کے خیال سے باز نہ آیا تو تم اسے بازار میں پہنچا دو گے۔''

''وہ تو میں نے غصے سے کہا تھا۔''

''یہ بھی تم نے غصے سے ہی کیا ہے... یعنی کہ کرایا ہے۔ یہ بات چھپنے والی نہیں ہے۔ سچ سچ بتا دو' وہ کون لوگ تھے؟''

سلامت علی نے اچانک ہی ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''لعنت ہے تجھ پر... دور ہو جا میری نظروں سے... نہیں تو میں تیرا گلا دبا دوں گا...''

''دیکھو ابا! باپ بن کر مارو گے تو سر جھکا تا رہوں گا۔ پر آگے جا کے یہ ثابت ہوگا کہ میری نجو کو تم نے برباد کرایا ہے تو میں رشتہ بھول جاؤں گا۔ پھر پتا نہیں' کیا کر بیٹھوں گا؟''

''اوئے...! جا دفع ہو جا... میں نے اس لڑکی سے کوئی دشمنی نہیں کی ہے۔ پر میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی ہے۔ اب وہ پھوٹی ہانڈی میرے ویڑے میں نہیں آئے گی۔''

سلطان بگا نے باہر آ کر کہا۔ ''ماں بیٹی نے جو بیان دیا ہے' اس کے مطابق واقعی تمہارے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی ہوگی۔''

پھر اس نے سپاہیوں سے کہا۔ ''اسے ہتھکڑی لگاؤ اور تھانے لے جاؤ۔ وہاں اس کا بیان لیا جائے گا۔''

طارق نے پریشان ہو کر کہا۔ ''ابا کو ہتھکڑی نہ لگاؤ۔ میں اس سے سچ اگلوا رہا ہوں۔ ربّ دی سوں... نجو سے ناانصافی نہیں ہونے دوں گا۔''

وہ بولا۔ ''مجھے قانونی کارروائی کرنے دو۔ قانون کی مدد کرنا چاہتے ہو تو تھانے آ کر باپ کو سچ بولنے پر مجبور کرو۔''

چار سپاہی سلامت علی کو ہتھکڑیاں پہنا کر لے جانے لگے۔ طارق تذبذب میں پڑ گیا کہ ایسے وقت کیا کرے؟ باپ کے پیچھے جائے یا محبوبہ کی دل جوئی کرے؟ وہ بُری طرح ٹوٹ چکی تھی۔ ظالموں نے سر کے بال کاٹ کر مزید تماشا بنا دیا تھا۔ بگا نے کہا۔ ''مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ مشوقہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی ہے اور باپ کو تم عدالت سے بچا نہیں سکو گے۔ میں کامرانی صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔ اپنی کارکردگی دکھاؤں گا کہ چٹکی بجاتے ہی مجرم گرفت میں آ گیا ہے۔''

وہ وہاں سے اپنی جیپ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ طارق باپ کو ناراضی ضرور دکھا رہا تھا مگر یہ بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ اسے عدالت سے سزا سنائی جائے۔ یوں اس کا پورا خاندان بدنام ہونے والا تھا۔ باپ نے کوئی جرم کیا ہو یا نہ کیا ہو، فی الحال اسے تھانے کچہری کے چکر سے نکالنا ضروری تھا۔

اور باپ کو الزام سے بچانا کچھ مشکل نہ تھا۔ نجو اور اس کی ماں کا بیان بدل دیا جاتا۔ عارضی طور پر سمجھوتا ہو جاتا تو بازی پلٹ سکتی تھی۔ پھر بعد میں وہ باپ کا محاسبہ کرتا۔ یہ سوچتا ہوا دروازہ کھول کر اس کمرے میں آیا جہاں نجو اور اس کی ماں کے سامنے سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔

اس نے طارق کو دیکھتے ہی دوپٹے میں منہ چھپا لیا۔ اب وہ فخر کرنے والا منہ نہیں رہا تھا کہ میں صرف تمہارے لیے کنواری ہوں۔ کسی نے اب تک مجھے ہاتھ نہیں لگایا۔ اس کا یہ مان، یہ خودداری اور انا مر چکی تھی۔ طارق کے آتے ہی بوڑھے ماں باپ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ وہ چارپائی کے سرے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اب تک تمہیں روتے نہیں دیکھا ہے۔ تم بہت حوصلے والی ہو۔ میں تمہارے مزاج کو سمجھتا ہوں۔ تمہیں ان ظالموں پر غصہ آ رہا ہوگا۔ تم ان پر تھوک دینے اور انہیں مار ڈالنے کے بارے میں سوچ رہی ہوگی۔ یقین کرو' تم ایسا ضرور کرو گی۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔''

وہ بولی۔ ''اب میں تمہارے قابل نہیں رہی۔ مجھ سے محبت نہ کرو۔ صرف ہمدردی کرو۔ صرف اتنا کرو کہ میں ظالموں کو اپنی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھ سکوں۔''

''میں ان دشمنوں کو سزا سے بچنے نہیں دوں گا۔ تم میرے لیے پہلے جیسی ہو۔ میں تمہیں اپنی شریکِ حیات ضرور بناؤں گا۔''

''جوش میں آ کر نہ بولو۔ تمہاری برادری والے مجھے قبول نہیں کریں گے۔ مجھ سے بیاہ کی بات نہ کرو۔ صرف یہ بتاؤ کہ انتقام کس سے لو گے اور کب لو گے؟''

وہ اس کی طرف منہ اٹھا کر بول رہی تھی۔ چہرہ دوپٹے میں چھپا ہوا تھا۔ وہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اسے تو ہٹاؤ۔''

وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''نہیں۔ پہلے میرے سوال کا جواب دو۔ انتقام کس سے لو گے؟''

''ابھی کیسے کہہ سکتا ہوں؟ پہلے گناہ گار کا سراغ لگانے دو۔''

''سراغ مل گیا ہے۔ میں اس کے خلاف بیان دے چکی ہوں۔''

''دیکھو نجو! میرے ابا پر شبہ ضرور کرو۔ پر یقین کے ساتھ اپنے بیان پر قائم نہ رہو۔ میں جلد ہی اصل مجرموں کو ڈھونڈ نکالوں گا۔''

''اگر تمہارے ابا مجرم ثابت ہوئے تو فیر کیا کرو گے؟''

''جیسا تم چاہو گی' اس کے ساتھ ویسا سلوک کیا جائے گا۔''

اس نے دوپٹے کو ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''پھر تو میں منہ دکھانے کے قابل رہوں گی۔ فخر کروں گی کہ تم نے میری خاطر باپ کے رشتے کا لحاظ نہیں کیا۔ میرے ساتھ انصاف کیا ہے۔''

وہ وہاں سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں ابھی تھانے جا کر ابا سے بات کرتا ہوں۔ اگر اس کا کوئی قصور نہ ہوا تو اس کی حمایت کروں گا۔ اسے قانون کی بے جا گرفت سے نکالنا میرا فرض ہے۔''

وہ وہاں سے سیدھا تھانے پہنچا۔ بشریٰ کا منگیتر دارا شکوہ بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے کہا۔ ''یار طارق! تیری مت ماری گئی ہے؟ ابا جی پر شبہ کر رہا ہے۔''

اس نے کہا۔ ''نجو اور اس کی ماں کا بیان ایسا ہے کہ سب ہی شبہ کریں گے۔ میں ابا سے حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ پر اس کا دماغ تو ہمیشہ چولہے پر چڑھا رہتا ہے۔ وہ سیدھے منہ بات نہیں کر رہا ہے۔''

''میں نے بات کی ہے۔ اس نے غنڈوں سے ایسی کوئی واردات نہیں کرائی ہے۔ وہ ماں بیٹی جھوٹ بول رہی ہیں۔''

''میں نہیں مانتا... وہ جھوٹ کیوں بولیں گی؟''

''اس لیے کہ سلامت چاچا اسے اپنی بہو بنانے سے انکار کرتے آ رہے ہیں۔ اب وہ باپ بیٹے میں جھگڑا بڑھا رہی ہیں۔''

سلامت علی آہنی سلاخوں کے پیچھے کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے بیٹے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''یہ بات

قارئین متوجہ ہوں

قرآنِ حکیم کی مقدس آیات و احادیثِ نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

اس کھوتے کی عقل میں نہیں آئے گی۔ وہ کُڑی اس کی نظروں میں سچی ہے اور یہ باپ جھوٹا ہے۔''

''یہ بات نہیں ہے ابا! وہ جھوٹی ہے یا سچی... یہ بعد میں ملوم ہوگا۔ ابھی ہم سب کے لیے شرم کی بات یہ ہے کہ ایک شریف لڑکی کی عزت لوٹی گئی ہے۔ میری بہن بشریٰ جوان ہے۔ خدانخواستہ اس کے ساتھ ایسا ہوتا تو ہم خون کی ندیاں بہا دیتے۔ کیا میں نجو کے معاملے میں اس لیے چپ رہوں کہ وہ ایک غریب سیکل والے کی دھی ہے؟''

دارا شکوہ نے کہا۔ ''ہم اس کے مجرموں کو ڈھونڈنے کے لیے پولیس والوں کی مدد کریں گے۔''

''جب انہیں ڈھونڈیں گے اور گرفتار کریں گے تو اصل مجرموں کے سامنے ابا کی بے گناہی ثابت ہو جائے گی۔''

دارا شکوہ نے اپنے سسر سلامت علی کی جانب دیکھا۔ پھر کہا۔ ''یہ درست کہتا ہے۔ اصل مجرم سامنے آئیں گے تو ماں بیٹی کا بیان غلط ہو جائے گا۔ ہم ان مجرموں تک پہنچنے کے لیے جی جان سے کوششیں کرتے رہیں گے۔''

سلامت نے سلاخوں کے پیچھے سے کہا۔ ''کوششیں کرتے رہنا۔ پہلے مجھے یہاں سے تو نکالو۔''

''ہم تھانے دار کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ آئیں گے تو رہائی ملے گی۔''

مگر آسانی سے رہائی ملنے والی نہیں تھی۔ تھانے دار بڑے صاحب شوکت علی کامرانی کے دربار میں حاضر تھا۔ نجو کے سلسلے میں جو واردات ہوئی تھی' اس کی تفصیلی رپورٹ پیش کر رہا تھا۔ شوکت علی نے خوش ہو کر کہا۔ ''ان تمام معاملات میں یہ بات میرے مطلب کی ہے کہ سلامت علی پر الزام آیا ہے اور وہ تمہاری حراست میں ہے۔ اس الزام کو کمزور نہیں ہونا چاہیے۔''

''ہم تابع دار ہیں۔ اس الزام کو ہر پہلو سے مضبوط کرتے رہیں گے۔''

''اور میں بشریٰ تک پہنچنے کے لیے اس ملزم باپ سے ہمدردی کرتا رہوں گا۔ پہلے اسے گردن تک دلدل میں

دھنسا دوں گا۔ پھر نکالوں گا تو وہ راضی خوشی مجھے اپنا جنوائی بنالے گا۔''

''ابھی اس کے رشتے دار رہائی دلوانے تھانے آئیں گے۔ جب تک عدالت سے ضمانت نامہ حاصل نہیں کیا جائے گا، میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟''

''اصولاً تو یہی ہونا چاہیے۔ اگر وہ لوگ رہائی کے لیے تھانے آئیں تو مجھے اطلاع دو۔ میں خود وہاں آؤں گا۔ اس طرح سلامت علی متاثر ہوگا اور میرا احسان مند رہے گا۔''

سلطان بگا تھانے آیا تو طارق اور داراشکوہ وہاں موجود تھے۔ انہوں نے سلامت کی رہائی کے لیے التجا کی۔ اس نے کہا۔ ''نجو کے ساتھ شرمناک ظلم ہوا ہے۔ اس نے اور اس کی ماں نے مجرموں کو دیکھا ہے' اُن کی باتیں سنی ہیں۔ ماں بیٹی کے بیانات کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ کوئی بڑا معتبر شخص ضمانت دے گا تو سلامت علی کو رہائی ملے گی۔ پر یہ کیس عدالت میں ضرور پہنچے گا۔''

داراشکوہ نے کہا۔ ''پورے ٹاؤن میں ہم معتبر سمجھے جاتے ہیں۔ ابھی ہزاروں لاکھوں روپے کی ضمانت دیں گے۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''سلامت علی تمہارا رشتے دار ہے۔ اس کے خلاف جرم ثابت ہوگا تو تم اسے فرار ہونے کا موقع دو گے۔ تم گجروں کی ضمانت منظور نہیں کی جائے گی۔''

اس بات پر بحث ہونے لگی۔ بگا نے کہا۔ ''میں شوکت صاحب سے بات کرتا ہوں۔ وہی شاید اس سلسلے میں کچھ کر سکیں گے۔''

داراشکوہ نے ناگواری سے کہا۔ ''وہ ہمارے لیے کچھ نہیں کریں گے۔ انہوں نے دودھ کی قیمت گرا کے جو نقصان پہنچایا ہے، اسے ہم کبھی نہیں بھلا سکتے۔''

بگا نے کہا۔ ''یہاں ان کے خلاف نہ بولو۔ کام کی بات کرو۔ اسے ضمانت پر لے جانا چاہتے ہو یا نہیں؟''

طارق نے کہا۔ ''ہم ابا کی رہائی چاہتے ہیں۔ آپ ہمارے لیے کچھ کریں۔''

وہ وہاں سے اٹھ کر تھانے کے دوسرے حصے میں آ گیا۔ وہاں فون پر شوکت علی کو اطلاع دی۔ وہ آدھے گھنٹے کے اندر سیکیورٹی گارڈز کے ساتھ تھانے پہنچا تو سب ہی الرٹ ہو گئے۔ طارق اور داراشکوہ بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ تھانے دار نے آگے بڑھ کر جھکتے ہوئے کہا۔ ''معافی چاہتا ہوں' آپ کو یہاں آنے کی زحمت دی ہے۔ بات یہ ہے کہ...''

وہ ڈانٹ کر بولا۔ ''یوشٹ اپ... تم نے سلامت علی جیسے معزز شخص کو حوالات میں رکھا ہے۔ انہیں فوراً باہر نکالو۔''

ایک سپاہی نے دوڑ کر لاک اپ کا دروازہ کھول دیا۔ شوکت علی کامرانی نے آگے بڑھ کر سلامت علی سے مصافحہ کرتے ہوئے بڑے ادب سے کہا۔ ''آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ یہ جو زیادتی ہوئی ہے، اس کے لیے آپ سے معافی چاہتا ہوں۔''

سلامت علی نے سر جھکا کر کہا۔ ''او جی! شرمندہ نہ کریں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ جیسی عظیم ہستی میری عزت افزائی کے لیے تھانے چلی آئے گی۔''

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''میں آپ کا مقدمہ لڑنے کے لیے عدالت میں بھی حاضری دوں گا۔ مجھے بگا نے بتایا ہے' معاملہ بہت سنگین ہے۔ آپ بُری طرح پھنسنے والے ہیں۔ ویسے اطمینان رکھیں اور مجھ سے ملتے رہیں۔ میں پوری کوشش کروں گا۔ آپ کو کسی بھی ہتھکنڈے سے باعزت طور پر بری کراؤں گا۔ ابھی ذرا جلدی میں ہوں۔ آپ مجھ سے کسی وقت بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔ ابھی اجازت چاہتا ہوں۔''

سلامت علی اس سے متاثر ہو چکا تھا۔ وہ مصافحہ کر کے اپنے گارڈز کے ساتھ واپس چلا گیا۔ اس نے کسی اور سے بات نہیں کی تھی۔ یہ سلامت علی کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا کہ علاقے کا جاگیردار اور منسٹر اس کی خاطر وہاں آیا تھا اور عارضی طور پر اسے رہائی دلا کر گیا تھا۔

شوکت علی کامرانی نے اپنی کوٹھی میں آ کر سردار کو بلایا۔ پھر خوش ہو کر کہا۔ ''تیری بدمعاشی کا سواد آ گیا۔ سلامت علی ملزم بن گیا ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ اصل مجرم کبھی نظروں میں نہ آئیں۔''

''جنابِ عالی! وہ کبھی نظروں میں نہیں آئیں گے۔ وہ کراچی چلے گئے ہیں۔ وہاں ان کا دھندا چلتا رہا تو لوٹ کر نہیں آئیں گے۔''

''اب ایک کانٹے کو راستے سے ہٹانا ہے۔ اس کے بعد بشریٰ تک پہنچنا آسان ہو جائے گا۔''

''سمجھ گیا سرکار! اس کا بھائی طارق رکاوٹ ہے۔''

''طارق تو اپنی محبوبہ کا ماتم کرتا رہے گا اور اپنے باپ سے جھگڑتا رہے گا۔ اصل کانٹا داراشکوہ ہے۔ وہ ختم ہو گا تو بشریٰ اس کی منگ نہیں رہے گی۔ پھر میں رشتے کی بات چلاؤں گا۔''

''سمجھ گیا جنابِ عالی! وہ کہیں نشانے پر آئے گا تو ایک کے بعد دوسری ساں نہیں لے سکے گا۔''

وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ ''واردات علاقے

سے باہر ہو تو اچھا ہے۔ تجھ پر کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہیے۔''

''میں پھنسنے والا کوئی کام نہیں کروں گا۔ وہ ہفتے دو ہفتے میں کبھی لاہور بھی فیصل آباد جاتا ہے۔ اس واری جائے گا تو واپس نہیں آئے گا۔''

اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شوکت علی نے سی ایل آئی ریسیور اٹھا کر سردار سے کہا۔ ''ڈی آئی جی کی کال ہے۔ بالکل خاموش رہنا۔''

اس نے ریسیور کو اٹھا کر کان سے لگایا۔ ''ہیلو! میں بول رہا ہوں شوکت علی کامرانی...''

''سر! یہ اینٹی نارکوٹکس والے پھر انکوائری شروع کر رہے ہیں۔''

''وہ میرے علاقے سے نشے کی ایک پڑیا بھی برآمد نہ کر سکے۔ اگر دوبارہ آتے ہیں تو آنے دو۔ پھر ناکام ہو کر جائیں گے۔''

''اس بار سی آئی اے کا ایک انسپکٹر فرمان اکبر اپنی ٹیم کے ساتھ آ رہا ہے۔''

''اس کے بارے میں کچھ بتاؤ؟''

''وہ لاہور سے آ رہا ہے۔ اس کے متعلق سنا ہے' بہت ہی ہوشیار اور چالباز ہے۔ اس کا سروس ریکارڈ بے داغ ہے۔ وہ رشوت دینے والوں کو دوڑا دوڑا کر مارتا ہے۔''

''ہُوں... کب تک آ رہا ہے؟''

''مجھے ویرے سے اطلاع ملی ہے۔ ہو سکتا ہے' وہ وہاں پہنچ گیا ہو۔ یا آج کل میں آنے والا ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں دیکھوں گا' وہ کون ہے اور کیا تیر چلانے والا ہے۔''

وہ ریسیور رکھ کر سردار سے بولا۔ ''فوراً سنبھل جاؤ۔ ایک اور مصیبت آ رہی ہے یا شاید آ چکی ہے۔ کیا تم نے سی آئی اے انسپکٹر فرمان اکبر کا نام سنا ہے؟''

''نہ سرکار! نہ سنا ہے' نہ اُسے دیکھا ہے۔''

''معلوم کرو' یہاں حال ہی میں کتنے نئے افراد ہوٹلوں اور کرائے کے مکانوں میں آ کر رہنے لگے ہیں؟ اطلاع کے مطابق وہ بہت چالاک جاسوس ہے۔ اسے ڈھونڈنا اور پہچاننا بہت ضروری ہے۔ ورنہ غفلت میں اپنی گردن پھنسا لو گے۔''

''میں ابھی جا کر معلوم کرتا ہوں۔ کل سویرے تک نئے آنے والوں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔''

وہ کوٹھی سے نکل کر اپنے حواریوں کے ساتھ شوکت آباد کے ایک ایک محلے اور ایک ایک گلی میں جا کر معلومات حاصل کرنے لگا۔ اس نے اپنے کارندوں کو سختی سے حکم دیا کہ جس

فاتح عالم

ارسطو کے ہاں مختلف شہزادے زیرِ تعلیم تھے۔ ایک روز ایک شہزادے سے ارسطو نے سوال کیا۔

''اگر تمہیں بادشاہت ملی تو میری تعلیمی خدمات کا کیا صلہ دو گے؟''

''میں تمام تر مہمات سلطنت میں آپ کے مشورے کو مقدم رکھوں گا۔''

یہی سوال ارسطو نے دوسرے شہزادے سے کیا۔ اس نے جواب دیا۔

''میں آپ کو برابر کا شریک رکھوں گا۔''

جب سکندر کی باری آئی تو اس نے عرض کیا۔

''مجھ سے اس بارے میں کچھ نہ پوچھا جائے کیونکہ اس کا فاعل حقیقی میں نہیں بلکہ خدائے برتر ہوگا۔''

ارسطو اس جواب سے بہت خوش ہوا اور کہا۔ ''تیری اس دانائی کا جواب سب پر سبقت لے گیا اور مجھے تیرے اس جواب سے تیرے فاتح عالم ہونے کی خوشبو آئی ہے۔''

کے پاس جتنی بھی چرس اور ہیروئن موجود ہے، انہیں کھیتوں اور کھلیانوں میں چھپا دیا جائے۔ باہر سے آنے والے گاہکوں سے کہہ دیں کہ عارضی طور پر یہ دھندا بند ہو چکا ہے۔

پہلے کئی بار اینٹی نارکوٹکس فورس نے اور پولیس فورس نے اس علاقے میں جگہ جگہ چھاپے مارے تھے۔ سردار اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کیا تھا۔ مگر یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ منشیات کا بھاری ذخیرہ کہاں چھپا کر رکھا جاتا ہے؟ ان گرفتار ہونے والوں کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا تو انہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔

چھپ چھپا کر پڑیا بیچنے والے دو چار کارندوں نے گرفتار ہونے کے بعد بیان دیا تھا کہ وہ آس پاس کے شہروں سے تھوڑا تھوڑا مال لا کر فروخت کرتے ہیں۔ ان کی پٹائی کی گئی تھی۔ انہوں نے چار چھ ماہ جیلوں میں گزارے پھر واپس آ کر دھندے سے لگ گئے۔

سردار نے بڑے بڑے گاہکوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ گاڑیاں لے کر شوکت آباد نہ آئیں۔ آئندہ ان کے شہروں میں مال پہنچا دیا جائے گا۔ اس طرح مختلف شہروں سے گاہکوں کی ریل پیل ختم ہو چکی تھی۔ اس ٹاؤن میں پہلے جیسی چہل پہل نہیں رہی تھی۔ یہی سمجھ میں آ رہا تھا کہ منشیات کا کاروبار وہاں سے کسی دوسرے علاقے میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

وہ دوسرا علاقہ کہاں ہے؟ یہ معلوم نہ ہو سکا۔ جب حاکم

اور پولیس والے پشت پناہی کر رہے ہوں تو سراغ لگانا ممکن نہیں ہوتا۔

فرمان اکبر نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کے اعلیٰ افسران سے کہا۔ ''میں شوکت آباد جاتا آتا رہتا ہوں۔ کبھی دو چار راتیں بھی گزاری ہیں۔ وہاں کے معزز شہری کہتے ہیں کہ اب بھی وہاں پڑیا فروخت ہوتی ہے اور اسی علاقے سے دوسرے شہروں تک مال سپلائی کیا جاتا ہے۔''

فرمان نے ایک عام شہری کی طرح وہاں رہ کر جو معلومات حاصل کی تھیں، اس رپورٹ میں یہ یقین سے کہا گیا کہ سردارا، بشارت، تیمور، بابے ابلیس اور تھانے دار سلطان بگا اس دھندے میں ملوث ہیں۔ مزید یہ کہ سلطان بگا اور سردارا اس علاقے کے جاگیردار اور منسٹر شوکت علی کامرانی کے خاص درباری ہیں۔

وہاں ان کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ معمول کے مطابق پولیس چھاپے مارے جائیں تو انہیں پہلے سے خبر ہو جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے مجرم گرفتار ہوتے ہیں پھر چھوٹ کر چلے جاتے ہیں۔

یہ رپورٹ پڑھنے کے بعد اعلیٰ افسران نے فرمان اکبر کو اجازت دی تھی کہ وہ اپنے طور پر وہاں رہ کر روائیاں کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اسے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

ادھر سردارا نے دوسری صبح تک جو معلومات حاصل کیں، ان کے مطابق چار افراد مختلف ہوٹلوں میں پچھلے کئی دنوں سے قیام کر رہے تھے اور ایک سرکاری افسر بھی تین دنوں سے ڈاک بنگلے میں آیا ہوا تھا۔ اس افسر کے نام نے سردارا کو چونکا دیا۔ اس کا نام فرمان اکبر تھا۔

اس نے تیمور سے پوچھا۔ ''کیا تُو نے فرمان اکبر کو دیکھا ہے؟''

''نہیں... میں ڈاک بنگلے کے پچھے چوکیدار کے پاس گیا تھا۔ اس نے بتایا' ہم بڑے چوک میں جو جلسہ کر رہے تھے وہاں فرمان بھی گیا تھا۔''

''پھر تو اسے نجو کے گھر ہونے والی واردات کا بھی علم ہوگا؟''

''آہو۔ کُج گڑبڑ لگ رہی ہے۔ چوکیدار نے بتایا ہے' فرمان کل رات سے ڈاک بنگلے میں واپس نہیں آیا ہے۔''

''تو پھر وہاں جا کر ملوم کر۔ شاید وہ واپس آ گیا ہو۔ یہ بھی پتا لگا کہ وہ پچھلی رات کہاں تھا؟ وہ جسوس کا بچہ نجو کے رپھڑ سے بھی دلچسپی لے سکتا ہے۔''

تیمور چلا گیا۔ سردارا رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ وہ ڈیرے پر آ کر سو گیا۔ دوپہر کو تینوں حواریوں نے آ کر اسے جگایا۔ بابے ابلیس نے کہا۔ ''ابھی پتا چلا ہے' دارا شکوہ فیصل آباد جا رہا ہے۔ بول... کی ارادے نیں...؟''

''ارادہ تو وہی ہے۔ راستے کا کانٹا صاف کرنا ہے۔ شوکت صاب خوش ہو جائیں گے۔''

''تے فیر تیاری پھڑ...''

بشارت نے کہا۔ ''ہم کو اس سے پہلے ہی فیصل آباد والے راستے کی ناکا بندی کرنی ہوگی۔''

وہ اٹھ کر حمام کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''ہم آدھے گھنٹے میں یہاں سے چل پڑیں گے۔ پر فرمان پر بھی نظر رکھنی ہوگی۔ کیا وہ ڈاک بنگلے میں ہے؟''

تیمور نے کہا۔ ''وہ کل رات سے پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے؟ اب تک واپس نہیں آیا ہے۔ ہوٹل میں رہنے والے دو بندے بھی غائب ہیں۔''

وہ تینوں باہر آ کر جیپ میں اسلحہ چھپانے لگے۔ بابے ابلیس نے کہا۔ ''کی خیال اے' اوکدھر گم ہو گئے ہیں...؟''

''کیا کہا جا سکتا ہے؟ ویسے وہ جسوس بہت گہرا ہے۔ تین دنوں سے ہماری تاک میں ہے اور ہم اس سے بے خبر پھرتے رہے۔''

اِدھر دارا شکوہ ان کے ارادوں سے بے خبر تھا۔ وہ سہ پہر تین بجے اپنے ڈرائیور کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوا۔ اسے چھ بجے تک فیصل آباد پہنچنا تھا لیکن ساٹھ کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کار کا ایک پہیا اچانک ہی ایک زوردار آواز کے ساتھ ناکارہ ہو گیا۔ ڈرائیور نے بڑی مہارت سے گاڑی کو بے قابو ہونے سے بچاتے ہوئے روک لیا۔

دارا نے پچھلی سیٹ سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ''کیا مصیبت آ گئی ہے؟ فوراً پہیا بدلو۔''

اس نے ڈرائیور کے ساتھ پہیے کو دیکھا تو ایک دم سے چونک گیا۔ وہ ازخود بے کار نہیں ہوا تھا، کسی نے گولی مار کر اسے ناکارہ بنایا تھا۔ وہ اپنا ریوالور اٹھانے کے لیے تیزی سے پچھلی سیٹ کی طرف جانا چاہتا تھا، ایسے ہی وقت ایک گولی اس کی کمر میں آ کر لگی۔ وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ گر پڑا۔ دوسری گولی نے ڈرائیور کا کام تمام کر دیا۔

وہ زمین پر گھسٹتا ہوا پچھلی سیٹ تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ سڑک کے کنارے جھاڑیوں کے پیچھے سے سردارا اپنے ساتھیوں کے ساتھ نکل کر آیا۔ دارا کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔ ''تُو نے بھرے بازار میں میری گڈی کا پہیا...

بے کار کر دیا تھا۔ سب کے سامنے ہمیں ذلیل کیا تھا۔ میرے پاس وقت نہیں ہے' ورنہ تجھے تڑپا تڑپا کے مارتا۔ جا... تجھ پر رحم کرتا ہوں۔''

اس نے دو فائر کیے۔ اس پر رحم کیا۔ آدھی جان تو نکل ہی چکی تھی، باقی آدھی بھی نکال دی۔ پھر وہ چاروں دوڑتے ہوئے ان کے پاس سے گزرتے ہوئے بہت دور ایک کچی سڑک پر کھڑی ہوئی جیپ میں آ کر بیٹھ گئے۔ موت کے کھیل کو جلد ہی نمٹا کر واپس اپنی بستی میں اس طرح پہنچے کہ کسی کو چند گھنٹوں تک ان کی عدم موجودگی کا پتا ہی نہ چلا۔

آدھی رات کے بعد گشت کرنے والے سپاہیوں کی ٹیم دو لاشیں لے کر وہاں آئی تو دارا شکوہ کے گھر میں ماتی کہرام مچ گیا۔ سلامت علی' طارق اور دوسرے تمام کمجر آ کر پوچھنے لگے کہ دارا شکوہ کو اور اس کے ڈرائیور کو کس نے قتل کیا ہے؟ وہ لاشیں کہاں سے لائی گئی ہیں؟

لانے والوں نے صرف جائے واردات کے متعلق بتایا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ سلطان بگا بھی کئی سپاہیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تھا۔ فرمان اکبر نے اسے اپنا کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''میں ہوں سی آئی اے آفیسر آن ڈیوٹی... سردارا اور اس کے ساتھیوں کو بلاؤ۔''

بگا نے دو سپاہیوں کو سردارا کے ڈیرے کی طرف دوڑایا۔ فرمان اکبر لاشیں لانے والے سپاہیوں کو ایک طرف لے جا کر ان سے سوالات کر رہا تھا۔ سردارا اپنے ساتھیوں کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر آ گیا۔ اس نے سلطان بگا کے پاس آ کر پوچھا۔ ''یہاں کیا ہو رہا ہے؟ مجھے کیوں بلایا ہے؟''

وہ سن چکا تھا کہ وہاں لاشیں لائی گئی ہیں۔ بس یونہی اَن جان بن کر پوچھ رہا تھا۔ بگا نے دھیمی سرگوشی میں کہا۔ ''سنبھل جاؤ۔ وہ جو اُدھر سپاہیوں کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا ہے، وہ سی آئی اے کا افسر ہے۔ بڑی سخت انکوائری ہونے والی ہے۔''

سردارا نے دور کھڑے فرمان کو دیکھ کر کہا۔ ''یہ... تو پہلے بھی یہاں آتا رہا ہے۔ میں نے کئی بار اسے شراب اور جوئے کے اڈے پر دیکھا ہے۔''

بابے ابلیس نے کہا۔ ''میں نے ایک سکول کے گیٹ پر اسے بشریٰ سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ ملوم ہوتا ہے' یہ گجروں کو پہلے سے جانتا ہے۔''

فرمان وہاں سے پلٹ کر ان کے پاس آ گیا۔ سردارا کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بگا صاحب نے بتایا ہوگا کہ میں کون ہوں؟''

وہ بولا۔ ''جی ہاں۔ آپ کا حکم سنتے ہی حاضر ہو گیا ہوں۔ حکم کریں...؟''

فرمان نے پوچھا۔ ''آج تم اس ٹاؤن سے باہر گئے تھے؟''

''میں تو ادھر ہی تھا۔ اپنے ڈیرے پر آرام کر رہا تھا۔''

''سوچ سمجھ کر جواب دو۔ تم جیپ میں بیٹھ کر کہیں گئے تھے؟''

''جیپ میں تو روز ہی بیٹھتا ہوں۔ آج بھی بیٹھ کر اسی ٹاؤن میں کئی جگہ گیا تھا۔ اگر کسی نے یہ سمجھا ہو کہ باہر گیا ہوں تو یہ غلط ہے۔''

''مقتول دارا شکوہ سے تمہاری دشمنی تھی؟''

''اوہ دشمنی نہیں جناب! معمولی سی رنجش تھی۔ وہ بھی جلد ہی دور ہو گئی تھی۔''

''دور نہیں ہوئی تھی اور بڑھ گئی تھی۔ مقتول نے بھرے بازار میں تمہاری بے عزتی کی تھی۔ سنا ہے' اس سے پہلے کوئی تمہارے سامنے سر اٹھا کر بولنے کی جرأت نہیں کرتا تھا؟''

''بندہ بشر ہے سرکار! کبھی عزت ملتی ہے، کبھی ذلت... میں بھی ذلت کو برداشت کر گیا۔ بات نہیں بڑھنے دی۔''

وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہُوں... بہت سمجھ دار ہو۔ خون کے گھونٹ پی کر خون اُچھالنا خوب جانتے ہو۔''

وہ عاجزی سے بولا۔ ''آپ مائی باپ ہیں۔ میرے بارے میں کچھ بھی بول سکتے ہیں۔''

فرمان نے کہا۔ ''مقتول نے تمہاری جیپ کے پہیے کو ناکارہ بنا کر تمہیں پیدل جانے پر مجبور کیا تھا۔ تم نے یہ ذلت برداشت نہیں کی۔ آج مقتول کی گاڑی کے ایک پہیے کو ناکارہ

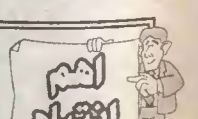

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ مشتہرین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک ضائع کر دی جاتی ہے، قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست مشتہرین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمے داری نہیں ہوگی۔

بنادیا..."

سردارا نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ "انتقام لینے کے جوش میں غلطی ہو ہی جاتی ہے۔"

وہ بولا۔ "دیکھیں جناب! آپ مجھے ناکردہ جرم کی سزا دینے آئے ہیں۔ مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہیں تو کرلیں۔ مجھے تو ابھی ادھر آکے ملوم ہوا ہے کہ داراشکوہ کو قتل کیا گیا ہے۔ آپ گھما پھرا کر باتیں کررہے ہیں۔ مجھے قاتل کہہ رہے ہیں تو یہ ناچیز بندہ کیا کہہ سکتا ہے؟ میں نے تو آج مقتول کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ اس سے آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ میں بے قصور ہوں۔ اس کے بعد آپ جیسا چاہیں مجھ سے سلوک کریں۔"

فرمان نے بگا سے کہا۔ "اسے لاک اپ میں رکھو۔ میں بعد میں اس سے سمجھوں گا۔ ان تینوں کو بھی حوالات میں ڈالو۔ پرانہیں سردارا سے دور رکھنا۔"

ان چاروں کو حراست میں لے لیا گیا۔ فرمان اکبر داراشکوہ کے مکان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ کتنی ہی عورتیں اور مرد مکان کے اندر جارہے تھے اور باہر آرہے تھے۔

اس نے دارا کے بزرگوں سے کہا۔ "آپ آخری رسومات کی تیاریاں کریں۔ تدفین کل کسی وقت ہوسکے گی۔ ایمبولینس آرہی ہے۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے فیصل آباد لے جایا جائے گا۔"

ایسے وقت اس نے بشریٰ کو دیکھا۔ وہ بڑی اداسی سے سر جھکائے مکان کے اندر جانے والی تھی۔ فرمان کو دیکھ کر رک گئی۔ ایک بزرگ نے کہا۔ "یہ ہمارے گھر کی ہونے والی بہو تھی۔ صد افسوس! سہاگن بننے سے پہلے ہی سہاگ اجڑ گیا ہے۔"

فرمان اس کے پاس آکر بولا۔ "میں نہیں جانتا' تمہارے دل پر کیا گزر رہی ہے؟ میں قاتل کو گھیرنے کی کوششیں کررہا ہوں۔ تم نے پہلے بھی مجھ سے تعاون کیا تھا، اب بھی کرسکتی ہو۔ کل اسکول میں ملوگی؟"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "شاید نہ آسکوں۔ آپ میرے گھر آجائیں۔"

وہ بولتی ہوئی مکان کے اندر چلی گئی۔ فرمان نے اپنے چند ماتحتوں سے کہا۔ "تم میں سے ایک لاش کے ساتھ فیصل آباد جائے گا۔ باقی یہاں رہیں گے۔ میں سونے جارہا ہوں۔ کل صبح ملاقات ہوگی۔"

وہ اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر جانے لگا۔ بشریٰ کا اداس چہرہ اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ وہ کبھی اسکول کے احاطے میں' کبھی تنہائی میں کئی بار اس سے مل چکا تھا۔ وہ لڑکی کھلے ذہن اور کھلی آنکھوں سے اپنے آس پاس کی دنیا کو دیکھتی تھی۔ اس نے فرمان کو بتایا تھا کہ اس علاقے میں کتنے غریب روزی روٹی حاصل کرنے کے لیے سردارا کی غلا[می] کرتے ہیں اور منشیات کا زہر پھیلاتے ہیں۔

وہ غریب عورتوں کے گھروں میں جایا کرتی تھی۔ ان عورتوں کے باپ' بھائی اور بیٹے سردارا کے کارندے بن کر روزی کماتے تھے۔ اس نے فرمان کو ایسے دو چار بندوں کے نام اور پتے بھی بتائے تھے۔ فرمان نے ان لوگوں کو اعتماد میں لے کر سردارا کے خلاف انہیں اپنا مخبر بنالیا تھا۔

ان حالات میں بشریٰ اور اس کے درمیان پہلے شناسائی ہوئی۔ پھر وہ ایک دوسرے کے لیے کشش محسوس کرنے لگے۔ لیکن کبھی زبان سے یا کسی عمل سے دل کے معاملات کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ چپ چاپ ایک دوسرے کے متعلق سوچتے رہے۔

بشریٰ مجبور تھی۔ اس کا رشتہ طے ہوچکا تھا۔ اگلے برس شادی ہونے والی تھی مگر اب تقدیر کچھ اور ہی تماشا دکھانے جارہی تھی۔

اس نے ڈاک بنگلے کے ایک کمرے میں آکر دروازے کو اندر سے بند کیا پھر بیڈ پر آکر لیٹ گیا۔ وہ پچھلی رات سے نجو کے معاملے میں جاگتا رہا تھا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ چار غنڈے اس گھر میں شرمناک واردات کرنے کے بعد فرار ہوگئے ہیں تو اس نے اپنے چاروں ماتحتوں کو مختلف سمتوں میں دوڑایا تھا اور خود فیصل آباد کی سمت موٹر سائیکل دوڑاتا چلا گیا تھا۔

وہ چاروں بہت آگے جاچکے تھے۔ اس کے ہاتھ بھی نہ آتے مگر بدقسمتی کے ہاتھوں بڑے بڑے مجرم زیر ہوجاتے ہیں۔ تقریباً سو کلومیٹر تک جانے کے بعد ان کی گاڑی اچانک ہی خراب ہوگئی تھی۔ ان میں سے کوئی مکینک نہیں تھا۔ اچانک پیدا ہونے والی خرابی کو نہ کوئی سمجھ سکتا تھا اور نہ گاڑی کو قابل استعمال بنا سکتا تھا۔

ایسے وقت فرمان نے انہیں دور سے دیکھا۔ موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹس نے بتایا کہ ان کے ہاتھوں میں اسلحہ ہے اور وہ کسی راہ گیر کے منتظر ہیں۔

وہ فوراً ہی موٹر سائیکل کو سڑک سے اتار کر کھیتوں میں چلا گیا۔ اسے راستہ بدلتا دیکھ کر انہوں نے فائرنگ کی۔ پھر کھیتوں کی طرف دوڑتے ہوئے ایک نے کہا۔ "سامنے آجاؤ... ہم تمہیں گولی نہیں ماریں گے۔"

انہیں کوئی جواب نہ ملا۔ ایک نے کہا۔ "وہ ادھر ہی چھپا ہوا ہے۔ اسے ڈھونڈو۔"

وہ چاروں کچھ فاصلہ رکھتے ہوئے اسے ادھر اُدھر تلاش کرنے لگے۔ چاند کی روشنی میں ایک جگہ موٹر سائیکل پڑی ہوئی دکھائی دی۔ اسے دیکھ کر ایک نے آواز دی۔ ''ادھر... اس کی گاڑی پڑی ہے۔''

دوسرے نے قریب آکر کہا۔ ''وہ یہیں کہیں چھپا ہوا ہے۔''

''چھپنے دو سالے کو... ہم اس گاڑی پر شہر تک جاسکتے ہیں۔''

''ہم چار ہیں۔ ایک موٹر سیکل پر کیسے جائیں گے؟''

ایک نے اپنی گن سیدھی کی۔ پھر اس کہنے والے کو گولی ماردی۔ وہ اچھل کر زمین پر گر پڑا۔ دوسرے نے دوسری گولی مارتے ہوئے کہا۔ ''اسے تو ختم کرنا ہی تھا۔ ہم چاروں کے حصے میں دس دس ہزار آنے والے تھے۔ اگر ہم دو بھائی رہ جائیں گے تو ہمارے حصے میں بیس بیس ہزار آئیں گے۔''

یہ سنتے ہی تیسرے نے چونک کر دونوں بھائیوں کو دیکھا۔ فوراً ہی اپنی گن سیدھی کی۔ مگر چونکنے اور سنبھلنے میں دیر ہوگئی تھی۔ پھر فائر کی آواز گونجی۔ ایک گولی سینے کی ہڈیاں توڑتی ہوئی آر پار چلی گئی۔ اس موٹر سائیکل کی ایک سواری اور کم ہوگئی۔ دونوں بھائیوں نے ہنستے ہوئے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ پھر جھک کر موٹر سائیکل کو وہاں سے اٹھانے لگے۔

ایک نے کہا۔ ''تُو چلا۔ میں پیچھے بیٹھوں گا۔ یہ گاڑی بڑے اچھے وقت ہاتھ لگی ہے۔''

اچانک ہی ٹھائیں کی آواز کے ساتھ وہ بولنے والا چیخ مارتا ہوا گر پڑا۔ جو باقی رہ گیا تھا' وہ ایک درخت کی آڑ لینے کے لیے بھاگنے لگا۔ وہ بھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک عام موٹر سائیکل والے کے پاس گن ہوگی۔ دوسرے فائر کی آواز کے ساتھ ہی آخری شکار کے ہاتھ سے گن نکل گئی۔ اسے گولی نہیں لگی تھی مگر وہ لڑکھڑا کر گر پڑا تھا۔

وہ اوندھے منہ زمین پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر بھائی کی لاش پڑی تھی اور دوسری طرف ہاتھ سے نکلی ہوئی گن دکھائی دے رہی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا' حملہ آور کہاں ہے؟ یہ اندیشہ تھا کہ زمین سے اٹھے گا یا گن کی طرف ہاتھ بڑھائے گا تو مارا جائے گا۔ وہ تھوڑی دیر تک چپ چاپ پڑا سوچتا رہا۔ پھر فرمان کی آواز سنائی دی۔ ''کیا تم شوکت آباد سے آرہے ہو؟''

وہ ذرا سر اٹھا کر بولا۔ ''ہاں... پر تم کون ہو؟''

''کوئی سوال نہ کرو۔ صرف جواب دو... کیا تم نے دین محمد سائیکل والے کے گھر میں واردات کی ہے؟''

وہ سمجھ گیا کہ اسے بے بس کرنے والا قانون کا کوئی محافظ ہے۔ اس نے کہا۔ ''نہیں... ہم کسی دین محمد کو نہیں جانتے۔ ہم نے کوئی واردات نہیں کی ہے۔''

''کیا تم چاروں اسلحہ لے کر اپنی ماں کی حج میں گئے تھے؟''

''سچ کہہ رہا ہوں۔ اپنی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں...''

''قسم نہ کھاؤ۔ گولی کھاؤ اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مر جاؤ یا قانون کا ساتھ دو۔ سچ اگلو گے تو میں تمہیں سزا سے بچاؤں گا۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ فرمان کی آواز سنائی دی۔ ''تمہارے تینوں ساتھی مر چکے ہیں۔ اب پورے چالیس ہزار تمہارے ہوں گے۔ زندگی کی سانسیں بھی ملیں گی۔ جلد فیصلہ کرو۔''

وہ بولا۔ ''مم... میں مرنا نہیں چاہتا۔ ہاں، ہم نے وہاں واردات کی ہے۔''

''تم چاروں کہاں سے آئے ہو؟''

''لاہور سے...''

''اس کا مطلب ہے' اتنی دور آکر کسی دوسرے کے لیے واردات کی ہے؟ چالیس ہزار کس نے دیے ہیں؟''

''یہ جان کر کیا کرو گے؟ اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ کوئی ثبوت نہیں ملے گا کہ اس نے ہم سے کام لیا تھا۔ میں ایسے بھی مارا جارہا ہوں، ویسے بھی مارا جاؤں گا۔''

''میں اصل مجرم تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ اسے قانون کے شکنجے میں لینا میرا کام ہے۔ وقت برباد نہ کرو۔ جواب دو...؟''

وہ چند لمحوں تک چپ رہا پھر بولا۔ ''سردارا کا ایک خاص بندہ بابے ایلیس آیا تھا۔ اس نے چالیس ہزار دے کر معاملات طے کیے تھے۔''

''معاملات بتاؤ... ایک غریب سائیکل والے سے سردارا کی کیا دشمنی ہے؟''

''دشمنی کیا تھی' ہم نہیں جانتے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم اس کی جوان بیٹی کی آبرو لوٹیں اور اس کا حلیہ بگاڑ کر چلے آئیں۔''

فرمان نے پوچھا۔ ''بس اتنا ہی... یا اور کچھ...؟''

''ہمیں دو چار باتیں یاد کرائی گئی تھیں اور تاکید کی تھی کہ وہ باتیں ہم ماں بیٹی سے ضرور کہیں گے۔''

''وہ باتیں کیا تھیں؟''

''میں نے اس کڑی کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر لباس پھاڑتے ہوئے کہا تھا۔ سالی! گجروں کے گھرانے میں بہو بن کر جانے کا خواب دیکھ رہی ہے۔ آج کے بعد کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔''

''ان گجروں کے نام بتاؤ...؟''

''ہم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور جاننا ضروری بھی نہیں تھا۔ انہوں نے جو سکھایا' وہی ماں بیٹی سے کہہ دیا۔''

''کوئی بات نہیں... میں معلوم کرلوں گا۔ وہ بدنصیب کس خاندان کی بہو بننا چاہتی تھی۔''

وہ آہستہ آہستہ اپنی گن کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ اسی لمحے فائر کی آواز کے ساتھ ایک گولی اس کے ہاتھ کو چھو کر گزر گئی۔ وہ چیخ کر بولا۔ ''گولی نہ چلانا۔ مم... میں چپ چاپ پڑا رہوں گا۔''

فرمان نے کہا۔ ''اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ اور موٹر سائیکل کو سڑک پر لے آؤ۔''

اس نے فوراً ہی اٹھ کر حکم کی تعمیل کی۔ وہاں سے موٹر سائیکل کو اٹھا کر سڑک پر لاتے ہوئے ایک قد آور جوان کو دیکھا۔ وہ فاتحانہ انداز میں چلتا ہوا قریب آکر بولا۔ ''بیٹھو اور اسے اسٹارٹ کرو۔''

وہ چور نظروں سے ریوالور کو دیکھتے ہوئے گاڑی پر سوار ہوگیا۔ پھر اسے اسٹارٹ کرنے لگا۔ فرمان نے پیچھے بیٹھ کر ریوالور کی نال اس کی پسلی میں لگاتے ہوئے کہا۔ ''ذرا بھی چالاکی دکھاؤ گے تو گولی چل جائے گی۔ زندہ رہنے کے لیے چپ چاپ چلتے رہو۔''

جان بہت پیاری ہوتی ہے۔ نال پسلی سے لگی ہوئی تھی۔ وہ زندگی کی سانسیں کمانے کے لیے آگے چل پڑا۔

☆☆☆

شوکت علی کامرانی عاشق مزاج نہیں تھا۔ مگر پہلی بار محسوس کررہا تھا کہ بشریٰ کے متعلق سنجیدگی سے نہ سوچنے کے باوجود وہ آپ ہی آپ اس کے خیالوں میں چلی آتی ہے۔ اہم سیاسی معاملات نمٹانے کے دوران بھی وہ کئی بار بے اختیار اس کے متعلق سوچتا رہا اور حیران ہوتا رہا کہ یہ کیسا جادو ہے جو سر چڑھ کر بول رہا ہے؟

پچھلی رات اسے خوش خبری ملی تھی کہ سردارا نے راستے کا کانٹا صاف کر دیا ہے۔ اب بشریٰ کا کوئی منگیتر نہیں رہا ہے۔ جب دارا شکوہ کا معاملہ کچھ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو وہ بشریٰ کے باپ سے اس کا رشتہ مانگے گا۔ اسے یقین تھا کہ ایک بہت بڑی سیاسی شخصیت رکھنے والے جاگیردار کو داماد بنانے پر وہ فخر کرے گا۔

دوسری صبح سلطان بگا نے حاضر ہو کر کہا۔ ''جنابِ عالی! بڑا رولا پڑ گیا ہے۔ اس نئے سی آئی اے کے افسر نے سردارا اور اس کے تینوں ساتھیوں کو لاک اپ میں رکھنے کا حکم دیا ہے اور میں نے مجبوراً تعمیل کی ہے۔''

اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے پوچھا۔ ''ان پر کیا الزام لگایا گیا ہے؟''

''دارا شکوہ کے قتل کا الزام ہے۔ فرمان اکبر نے ایک چھوٹی سی بات پکڑی ہے۔ دو دن پہلے دارا شکوہ نے سردارا کی جیپ کے ایک پہیے کو ناکارہ بنایا تھا۔ اب اس نے بھی اس کی گڈی کے ایک پہیے کو ناکارہ بنانے کے بعد اسے قتل کیا ہے جبکہ یہ سردارا کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔''

''وہ افسر بہت گہرا چالباز ہے۔ ایک چھوٹی سی بات لے کر ہمارے اہم کارندے کو گھیر رہا ہے۔''

''جنابِ عالی! سردارا مجھے پریشان کرتا ہے۔ کہتا ہے' اسے حوالات سے نکالا جائے اور آپ سے بات کرائی جائے۔''

''وہ اپنی رہائی کے سوا اور کوئی بات نہیں کرے گا۔ اسے سمجھاؤ... یہ معاملہ سی آئی اے والوں کا ہے۔ کورٹ سے آرڈر حاصل کیے بغیر رہائی ممکن نہیں ہوگی۔''

''میں اسے ہر پہلو سے سمجھا رہا ہوں۔ پر وہ خر دماغ ہے۔ ایک ہی بات کہتا ہے کہ ایسے وقت اگر آپ نے ساتھ نہ دیا تو وہ حوالات سے نکل بھاگے گا اور مجھے اس سلسلے میں اس کا ساتھ دینا ہوگا۔''

''وہ ایسی حماقت کرے گا تو میرے لیے مسائل پیدا ہوں گے۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بولا۔ ''اس سے بات کراؤ...''

بگا نے ریسیور اٹھا کر تھانے کے نمبر پنچ کیے۔ پھر رابطہ ہونے پر سپاہی سے کہا۔ ''فون سردارا کے پاس لے جاؤ۔ کامرانی صاحب بات کریں گے۔''

اس نے ذرا دیر انتظار کیا پھر کہا۔ ''ہیلو سردارا! لو... کامرانی صاحب سے بات کرو۔''

شوکت علی نے اس سے ریسیور لے کر کان سے لگایا پھر کہا۔ ''اُس افسر نے کچھ سوچ سمجھ کے ہی تمہیں حراست میں رکھا ہے۔''

''جنابِ عالی! وہ بکواس کرتا ہے۔ اس کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ایویں قنونی کارروائیاں کر کے خوف زدہ کر کے ہم سے اقبالِ جرم کرانا چاہتا ہے۔''

''او میں جانتا ہوں' تم خوف زدہ ہونے والوں میں سے نہیں ہو۔ آرام سے حوالات میں رہو۔ میرا وکیل آج ہی کورٹ سے تمہارا ضمانت نامہ لے لے گا۔ اس سی آئی اے والے سے الجھنا نہیں ہے۔ اسے اپنی کرنے دو، ہم اپنا کام

کرگزریں گے۔"

"جنابِ عالی! مینوں یقین اے' آپ مجھے جلدی یہاں سے نکال لیں گے۔ ورنہ یہ تو سمجھتے ہی ہیں کہ سی آئی اے والے اگر مجھے ٹارچر سیل وچ لے گئے تے فیر میرے پیٹ سے آپ کا کچا چٹھا بھی باہر آجائے گا۔"

وہ غصے سے بولا۔ "جانتا ہوں... جانتا ہوں۔ کتنی بار سمجھایا ہے' فون پر ایسی باتیں نہ کیا کر۔"

اس نے ریسیور کریڈل پر پٹختے ہوئے بگا کو دیکھا پھر کہا۔ "یہ کتا ڈھکے چھپے لفظوں میں دھمکی ضرور دیتا ہے۔ ہماری بھی کیا مجبوری ہے؟ سنگین معاملات میں ان غنڈوں کو اپنا راز دار بنانا اور بعد میں پچھتانا پڑتا ہے۔"

وہ ریسیور اٹھا کر نمبر پنچ کرتے ہوئے بولا۔ "میں وکیل سے بات کرتا ہوں۔ ان کتوں کی ضمانت ہو جائے گی۔"

وہ بولا۔ "مجھے اجازت دیں۔ تھانے میں رہنا ضروری ہے۔ وہ افسر کسی وقت بھی آسکتا ہے۔"

شوکت علی نے سر ہلایا۔ وہ وہاں سے چلتا ہوا کوٹھی کے باہر آگیا پھر موبائل میں بیٹھ کر سپاہیوں سے بولا۔ "تھانے چلو..."

ایسے وقت ایک سپاہی دوڑتا ہوا آیا پھر اسے سیلیوٹ کرتے ہوئے بولا۔ "سر! وہ سی آئی اے والا دین محمد کے گھر پہنچا ہوا ہے۔"

سلطان بگا نے پریشان ہو کر زیرلب کہا۔ "وہ کم بخت وہاں کیوں پہنچا ہے؟ پتا نہیں کس قسم کی معلومات حاصل کر رہا ہوگا؟ ویسے ہمارے خلاف اسے کچھ معلوم نہیں ہو سکے گا پھر بھی..."

اس نے سپاہی سے کہا۔ "چلو... دین محمد کے گھر چلو۔"

موبائل دین اُدھر چل پڑی۔ فرمان اکبر دین محمد کے گھر میں ایک چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دوسری چارپائی پر نجو اپنی ماں کے ساتھ سر جھکائے بیٹھی تھی اور فرمان کے سوالات کے جوابات دے رہی تھی۔ وہ بولا۔ "ذرا عقل سے سوچو... اگر وہ لٹیرے سلامت علی کی طرف سے آتے تو کبھی ایسی باتیں نہ کرتے جنہیں سن کر تم ماں بیٹی شبہ کر رہی ہو۔ مجرم خود کو چھپاتے ہیں، کبھی ظاہر نہیں ہوتے۔"

ماں نے پوچھا۔ "تے فیر انہوں نے ایسی باتیں کیوں کیں؟"

"انہیں یہ باتیں سکھائی گئی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ نجو کی وجہ سے ان باپ بیٹے میں نفرت اور عداوت پیدا ہو جائے۔"

"آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔"

"یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ان بدمعاشوں کے پیچھے کوئی اور ہے جو باپ بیٹے کی لڑائی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔"

طارق دروازے پر کھڑا یہ باتیں سن رہا تھا۔ کمرے میں آتے ہوئے بولا۔ "آپ کی باتیں دل کو لگ رہی ہیں۔ آپ کون ہیں؟"

فرمان نے اپنا کارڈ دکھایا۔ طارق نے اسے پڑھ کر کہا۔ "اچھا، سمجھ گیا... کل رات آپ نے ہی سردارا اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کیا ہے اور باہر آپ کے لوگ کھڑے ہوئے ہیں۔"

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میرا نام طارق ہے۔ میں سلامت علی کا بیٹا ہوں۔"

فرمان نے اس سے مصافحہ کیا۔ وہ بولا۔ "سردارا میری بہن کا رشتہ مانگنے آیا تھا۔ میں نے اس غنڈے کو اس کی اوقات سمجھائی تھی۔ تب سے وہ ہمارا دشمن بن گیا ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں' اسی نے اس گھر میں واردات کرائی ہے۔ نجو کو برباد کیا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

فرمان نے چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آرام سے بیٹھو۔ اتنا تیز نہ بھاگو' منہ کے بل گر پڑو گے۔"

"آپ اسے معمولی بات نہ سمجھیں۔ نجو اپنے دشمنوں کو تڑپ تڑپ کر مرتا دیکھنا چاہتی ہے۔ میں اس کی خواہش ضرور پوری کروں گا۔ آپ... سردارا کو میرے حوالے کر دیں۔"

فرمان نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "مطلب یہ کہ تم ہیرو بن کر اسے اپنی محبوبہ کے سامنے قتل کرنا چاہتے ہو؟"

"آہو جی۔ میں اسے گولیوں سے بھون کے رکھ دوں گا۔"

اس نے اپنے ماتحتوں کو آوازیں دیں۔ وہ سب کمرے میں چلے آئے۔ ایک نے پوچھا۔ "یس سر!"

وہ طارق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ اپنے ایک دشمن کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ اسے حراست میں لے لو۔"

طارق نے سٹپٹاتے ہوئے کہا۔ "مم... میں نے تو ابھی کوئی جرم نہیں کیا ہے جناب!"

"کرنے والے ہو۔ ہونے والی واردات کو روکنا میرا فرض ہے۔"

نجو نے کہا۔ "جناب! یہ جوش میں ایسا کہہ رہا تھا۔ اسے معافی دے دیں۔"

"جذبات اور جنون میں مبتلا ہونے والے ہی خون خرابے پر اترتے ہیں۔ تم لوگ عقل سے اور صبر و تحمل سے کام کیوں نہیں لیتے؟ یہ دیکھ رہے ہو کہ قانونی کارروائی صحیح سمت میں ہو رہی ہے پھر جوش میں آنا کیا ضروری ہے؟"

طارق نے سر جھکا کر کہا۔ "معافی چاہتا ہوں جناب! آپ درست فرماتے ہیں۔ ہمیں قنون کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔ صرف آپ جیسوں کی مدد کرنی چاہیے۔"

فرمان نے اٹھ کر اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "لڑکی اندر سے ٹوٹ گئی ہے۔ اسے سنبھالو۔ میں تمہارے باپ کو سمجھاؤں گا۔"

پھر وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ چلتا ہوا مکان سے باہر آگیا۔ ایسے وقت سلطان بگا وہاں پہنچ گیا تھا۔ موبائل سے اترتے ہوئے بولا۔ "مجھے معلوم ہوا' آپ ادھر ہیں تو چلا آیا۔ کیا یہاں واردات کرنے والوں کا سراغ مل رہا ہے؟"

"بگا صاحب! آپ تو بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ آپ نے پلک جھپکتے ہی واردات کرنے والے سلامت علی کو گرفتار کرلیا تھا؟"

"پچیس برسوں سے تھانے دار ہوں۔ کبھی ترقی نہیں ہوئی جبکہ دور ہی سے مجرموں کی بُو سونگھ لیتا ہوں۔"

"شاید اسی لیے ترقی نہیں ہوتی کہ مجرموں کو گرفتار کرنے کے بعد چھوڑ دیتے ہیں۔ سلامت علی کو بھی رہا کر دیا تھا۔"

وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "جناب شوکت علی کامرانی کا حکم تھا۔ میں نے ان کی ضمانت پر عارضی رہائی دی ہے۔ پرمقدمہ چلے گا۔"

"مجھے رہائی پر اعتراض نہیں ہے۔ آپ نے اچھا ہی کیا۔ اصل مجرم کوئی اور ہے، سلامت علی نہیں ہے۔"

اس نے چونک کر پوچھا۔ "کون ہے...؟"

"یہی تو ہمیں معلوم کرنا ہے۔ چلیں! تھانے چل کر باتیں ہوں گی۔"

فرمان پولیس موبائل میں آکر بیٹھ گیا۔ اس نے راستے میں باتیں کرتے ہوئے سلطان بگا کو قائل کیا کہ اصل مجرم نے ان چار غنڈوں کو ایسی باتیں کرنے کی تاکید کی تھی جنہیں سن کر سلامت علی پر شبہ ہوتا ہے جبکہ کوئی بھی مجرم اپنے خلاف شبہ ظاہر کرنے والی کوئی بات اور حماقت نہیں کرتا۔ سلطان بگا دل ہی دل میں قائل ہو رہا تھا کہ وہ سی آئی اے والا بڑی اونچی چیز ہے۔ واردات کی تہ تک پہنچ رہا ہے۔

وہ تھانے میں آئے تو بگا وہاں نئی پولیس فورس کو دیکھ کر چونک گیا۔ فرمان نے کہا۔ "یہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ سے آئے ہیں۔ اصل مجرموں کو اپنی کسٹڈی میں لے جائیں گے۔ آپ سردارا اور اس کے ساتھیوں کو ہتھکڑیاں پہنا کر حوالات سے باہر لائیں۔"

وہ ایک کرسی پر آرام سے بیٹھ گیا۔ سلطان بگا نے اپنے سپاہیوں سے اس کے حکم کی تعمیل کرائی۔ ان چاروں کو ہتھکڑیاں پہنا کر فرمان سے کچھ دور فرش پر اکڑوں بٹھا دیا گیا۔

سردارا نے کہا۔ "اے ساڈے نال زیادتی ہو رہی اے۔ میں جناب کامرانی صاب کا خاص ملازم ہوں۔ مجھے اپنی صفائی دینے اور ضمانت لینے کا موقع ملنا چاہیے۔"

فرمان نے کہا۔ "تم بہت بڑے جاگیردار اور منسٹر کے ملازم ہو۔ وہ تمہیں ضمانت پر رہا ضرور کرائیں گے۔ پر ابھی میرے سوالوں کے جوابات دیتے رہو۔ جیدی' بابر منگی اور جبار کو جانتے ہو؟"

وہ ذرا چونکا پھر بولا۔ "میں کسی کو نہیں جانتا سرکار...!"

"بابے ابلیس جانتا ہے۔ اس نے واردات کرانے کے لیے جیدی کو چالیس ہزار روپے دیے تھے۔"

بابے ابلیس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "رب دی سوں جناب...! نجو میری دھی جیسی ہے۔ میں نے وہاں واردات نہیں..."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی فرمان نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے منہ پر ٹھوکر ماری۔ وہ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ فرمان نے کہا۔ "میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ نجو کے گھر میں واردات کرائی گئی ہے... تُو خود ہی اگل رہا ہے۔"

سردارا' بشارت اور تیمور غصے سے گھور کر بابے کو دیکھنے لگے۔ منہ پر ایسی ٹھوکر پڑی تھی کہ وہ فرش پر گر کر تڑپ رہا تھا۔ فرمان نے سردارا کے سامنے آکر کہا۔ "جیدی سے تمہاری پرانی یاری ہے۔ ایک ساتھ جیل میں بھی رہ چکے ہو۔ ایک دوسرے کے لیے واردات کرتے رہتے ہو۔ تم نے بابے کو چالیس ہزار دے کر جیدی کے پاس بھیجا تھا۔"

وہ بولا۔ "قنون آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کوئی بھی کہانی بنا سکتے ہیں۔"

فرمان نے اس کے منہ پر بھی ایک ٹھوکر ماری تو وہ غصے سے اچھل کر کھڑا ہو گیا اور گرجتے ہوئے بولا۔ "مجھے ہتھکڑیاں پہنا کے کیا مردانگی دکھا رہے ہو؟ مرد ہو تو میرے ہتھ کھولو۔ میں تمہاری ہڈیاں توڑ کے رکھ دوں گا۔"

فرمان نے کہا۔ "جو تمہاری بے عزتی کرتا ہے، تم اس

کی ہڈیاں توڑ دیتے ہو؟''

''اوآہو...ابھی آزما کے دیکھ لو۔''

''ہاں ۔ابھی آزما کے دیکھ لو جیسے داراشکوہ کو قتل کیا...''

''ہا...میں...''

وہ کہتے کہتے سنبھل گیا۔ پھر بولا۔''میں نے داراشکوہ کو قتل نہیں کیا ہے۔ایک بات سمجھاتا ہوں۔ مجھ پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔''

''ورنہ میری ہڈیاں توڑ دو گے؟''

وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ کر ایک درندے کی طرح غرّا رہا تھا۔فرمان نے بگا سے کہا۔''اس کی ہتھکڑیاں کھول دو۔''

بگا نے تعجب سے کہا۔''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''جیدی نے اس کے خلاف بیان دیا ہے۔ وہ ہماری حراست میں ہے۔ اسے کوئی جاگیردار کوئی سیاست دان بچا نہیں سکے گا۔اس کے بچاؤ کا ایک ہی راستہ ہے۔''

بگا اور سردارا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔''یہ میری ہڈیاں توڑ کے یہاں سے جا سکتا ہے۔ایسے وقت کوئی اس کا راستہ نہیں روکے گا۔اسے فرار ہونے کا پورا موقع دیا جائے گا۔''

سب ہی کو چپ لگ گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ سردارا نے بگا کو دیکھتے ہوئے کہا۔''میری ہتھکڑیاں کھول دے تھانے دار...! میں اِنٹ دا جواب پتھر سے دوں گا۔''

بابے نے کہا۔''تیری مت ماری گئی اے... عقل سے کام لے۔ تیرا غصہ تجھے کھا جائے گا۔''

وہ بولا۔''میں بزدل نہیں ہوں۔ چوہے دانگوں پنجرے وِچ رہ کے نئیں مراں گا۔''

سلطان نے کہا۔''او بے وقوفا! لڑنا تو دور کی بات ہے، ڈیوٹی پر رہنے والے افسر پر ہاتھ بھی اٹھائے گا تو تیری ضمانت نہیں ہوگی۔''

سردارا نے یوں چونک کر فرمان کو دیکھا جیسے عقل آ گئی ہو۔ بشارت نے کہا۔''سردارا! یہ افسر بہت چالاک ہے۔ تجھ سے جان بوجھ کر مار کھائے گا اور ایک نیا کیس بنا دے گا۔ فیر جناب کامرانی صاب بھی اس کے شکنجے سے ہمیں نکال نہیں پائیں گے۔''

فرمان نے اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ رسید کرتے ہوئے کہا۔''زیادہ عقل مند بن کر سردارا کو بے وقوف نہ بنا۔ اس کی عقل مندی یہی ہوگی کہ یہ مجھ سے مقابلہ کرے گا۔ مجھے مات دے گا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں' اسے یہاں سے جانے سے کوئی نہیں روکے گا۔''

سردارا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔''مجھے معافی دے دو...آپ کی چالاکی سمجھ آ گئی ہے۔اب تو آپ مجھے ٹھوکریں ماریں گے تو اُف نہیں کروں گا۔''

فرمان نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کے سپاہیوں کو حکم ...''ان چاروں کو لے جاؤ۔ میں کل تک ہیڈ کوارٹر میں آؤں گا۔''

تھانے کے باہر قیدیوں کو لے جانے والی گاڑی کھڑی تھی۔ڈیپارٹمنٹ سے آنے والے سپاہی انہیں اس میں بٹھا کر لے جانے لگے۔تھانے کے باہر بے شمار افراد سردارا کی گرفتاری اپنی آنکھوں سے دیکھنے آئے تھے اور ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ اس بار اوپر سے انکوائری اور گرفتاری آئی ہے۔شوکت ... کے غنڈے ضرور عبرت ناک انجام کو پہنچیں گے۔

اس بھیڑ میں طارق بھی تھا۔وہ لوگوں کو فرمان اکبر کے متعلق بتا رہا تھا کہ وہ ایک فرض شناس اور ذمے دار افسر ہے۔ اس نے آتے ہی نجو پر مظالم ڈھانے والے مجرموں کو گرفتار کرایا ہے۔ اگر یہ افسر اس ٹاؤن میں رہے گا تو وہاں سے تمام غنڈے بھاگ جائیں گے۔

فرمان نے پچھلی رات بشریٰ سے بات کی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ دوسرے دن اس سے ملنے کے لیے گھر آ ... ہے۔اس نے طارق کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر اسے پاس بلا کر پوچھا۔''تمہارے والد سلامت علی کہاں ہیں؟''

اس نے کہا۔''شاید گھر میں ہیں۔''

''کیا میں تمہارے گھر جا کر ان سے مل سکتا ہوں؟''

وہ خوش ہو کر بولا۔''آہو جی... یہ ہماری عزت افزائی ہوگی۔آپ ابھی چلیں۔''

وہ اصل مجرموں کو گرفتار کرنے کے لیے پچھلے کئی روز سے دن رات مصروف رہا تھا۔ وہ بُری طرح تھکا ہوا تھا۔ طارق کے ساتھ اس کے گھر پہنچا تو بشریٰ کو دیکھتے ہی ساری تھکن اتر گئی۔ سلامت علی نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور احسان مندی سے کہا۔''آپ نے میرے گھر کو تباہ ہونے سے بچایا ہے۔اگر نجو کو تباہ کرنے والے گرفتار نہ ہوتے تو میرا پُتر ساری حیاتی مجھے دشمن سمجھتا رہتا۔''

فرمان نے سمجھایا۔''بیٹا آپ کا دشمن نہیں ہے۔غلط فہمی کے باعث ہنستے بستے گھر اجڑ جاتے ہیں۔ ربّ کا شکر ہے آپ کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔آئندہ آپ اپنے دشمنوں سے ہوشیار رہا کریں۔''

سلامت علی نے کہا۔''میں تو بہت محتاط رہنے لگا ہوں۔''

بشریٰ کسی نہ کسی کام کے بہانے آ رہی تھی' جا رہی تھی اور اپنا دیدار کرا رہی تھی۔ طارق نے باپ سے کہا۔''محتاط رہنے کے لیے دشمنوں کو پہچاننا چاہیے۔ پر تم تو شوکت علی کامرانی جیسے دشمن کا قصیدہ پڑھتے رہتے ہو۔''

سلامت نے کہا۔''کیوں نہ پڑھوں؟ وہ میری ضمانت کے لیے خود چل کر تھانے آیا تھا۔''

فرمان نے کہا۔''او بزرگو! بڑے لوگ اس وقت جھکتے ہیں جب زمین پر پڑا ہوا منافع اٹھانا لازمی ہو جاتا ہے۔ میں نہیں جانتا' وہ مغرور جاگیردار آپ کی رہائی کے لیے تھانے کیوں آیا تھا؟ جبکہ ایک فون کال کے ذریعے بھی رہائی کا حکم دے سکتا تھا۔''

سلامت نے کہا۔''سب ہی جاگیردار ظالم اور خودغرض نہیں ہوتے۔''

طارق نے کہا۔''ہوتے ہیں ابّا! وہ بہت چالباز ہے۔ اس نے دودھ کی قیمت گرا دی ہے۔ ہمارے کاروبار کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ دوسری طرف تم سے ہمدردی بھی کر رہا ہے۔ ایک معصوم اور مظلوم بچی کو لوٹ لیا گیا۔اس کی حیاتی تباہ کر دی گئی۔ پر وہ اس غریب کے سر پر ہاتھ رکھنے بھی نہیں آیا۔''

فرمان نے کہا۔''ہم مجرمانہ ہتھکنڈوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ شوکت علی کامرانی اور سلطان بگا کی سرپرستی میں یہاں منشیات کا کاروبار ہو رہا ہے۔اس لیے سردارا قانون کی گرفت سے محفوظ رہتا ہے۔ وہ جاگیردار یہ جانتا تھا کہ سردارا نے نجو کے گھر میں واردات کرائی ہے اور اسی نے آپ باپ بیٹے کے درمیان دشمنی بڑھائی ہے۔ یہ جاننے کے باوجود اس نے آپ کو حقیقت نہیں بتائی۔ آپ کو خود سمجھنا چاہیے۔ وہ سامنے سر سہلا رہا ہے اور پیچھے سے ٹھوکریں مار رہا ہے۔''

بشریٰ ٹھنڈی لسّی بنا کر لے آئی۔ فرمان نے ایک گلاس لیتے ہوئے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ پھر کہا۔''میں نے یہاں آ کر خواتین کے ذریعے بڑی اہم معلومات حاصل کیں۔ پھر رفتہ رفتہ سردارا کی گردن دبوچ لی۔ اب ایک اور اہم معلومات رہ گئی ہے۔''

طارق نے کہا۔''آپ مجھے خدمت کا موقع دیں... اور کیسی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں؟''

''اس علاقے میں کہیں منشیات کا ذخیرہ چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ میں اس خفیہ مقام تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ سردارا کے کئی کارندے میرے لیے مخبری کرتے ہیں لیکن وہ بے چارے بھی خفیہ اڈے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

طارق نے کہا۔''پھر تو ایسی جگہ کا سراغ لگانا بڑا اوکھا ہوگا۔''

''مشکل تو ہے پر ناممکن نہیں ہے۔ سردارا کے کارندے بڑے سخت جان ہیں۔ جان دینا جانتے ہیں' راز اگلنا نہیں جانتے۔ پر ان کی گھر والیاں ضرور پیٹ کی ہلکی ہوں گی۔ان سے کوئی سمجھ دار تعلیم یافتہ لڑکی دوستی کر کے بہت کچھ اگلوا سکتی ہے۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے چور نظروں سے بشریٰ کو دیکھا۔ سلامت علی نے کہا۔''آپ کے ڈیپارٹمنٹ میں ایسی زنانیاں ہوں گی؟''

''ہیں تو سہی... پر وہ ادھر آئیں گی تو مجرم اور زیادہ محتاط ہو جائیں گے۔''

طارق نے کہا۔''ہماری بشریٰ بڑی ذہین ہے۔ وہ ایسی عورتوں سے دوستی کر کے شاید کچھ ملوم کر سکے۔''

فرمان نے سلامت علی کو دیکھتے ہوئے کہا۔''اگر آپ دونوں مجھ سے تعاون کریں گے تو میرا کام آسان ہو جائے گا۔''

سلامت علی نے کہا۔''آپ ہمارے محسن ہیں۔ہم یہاں سے غنڈا راج ختم کرنے کے لیے تعاون ضرور کریں گے۔ یہ فرمائیں' ہماری دھی رانی آپ کے لیے کیا کر سکتی ہے؟''

''آپ اسے یہاں بلائیں۔ میں اس کام کے سلسلے میں کچھ اہم باتیں اسے سمجھاؤں گا۔''

اس نے بیٹی کو بلا کر کہا۔''ادھر بیٹھو اور فرمان صاب کی باتیں سنو۔ یہ تمہارے ذریعے مجرموں کی کمر توڑنا چاہتے ہیں۔''

وہ آنچل درست کرتی ہوئی دوسری چارپائی پر اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ دونوں نے اب تک دل کی باتیں ایک دوسرے کو نہیں سنائی تھیں اور نہ ہی اب سنانا چاہتے تھے۔ تنہائی میں باتیں کرنے کی خواہش بھی نہیں تھی۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہو جاتے تھے۔ پیار و محبت کی رنگین وادیوں میں بھٹکنے لگتے تھے۔

اس وقت باپ بھائی کی موجودگی میں اگرچہ کام کی باتیں کر رہے تھے، تاہم ایک دوسرے کی قربت سے محظوظ ہو رہے تھے۔

☆☆☆

بشریٰ نے خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے ایک ادارہ قائم کر لیا۔ چند غریب عورتوں کو ماہانہ دو ہزار روپے دینے کی پیشکش کی پھر ان کے ساتھ گھر گھر جا کر ناخواندہ عورتوں کو صحت و صفائی کا درس دینے لگی۔ اس طرح وہ ان کے گھروں کے اندر جا کر دیر تک رہتی تھی اور باتیں کرتی رہتی تھی۔ اتنی اپنائیت سے بولتی تھی کہ وہ اپنی گھریلو اور ازدواجی زندگی کی ڈھکی چھپی باتیں بھی اس کے سامنے اگل دیتی تھیں۔

ایسے طریقہ کار کے ذریعے منشیات کے خفیہ ذخیرے تک پہنچنے کا یقین ہوتا جارہا تھا۔ سلطان بگا کے سپاہیوں اور سردارا کے کارندوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ بشریٰ جیسی بے ضرر اور سیدھی سادی سی طالبہ درپردہ فرمان اکبر کے لیے کام کررہی ہے۔

شوکت علی کا مرانی عارضی طور پر بشریٰ کو بھول گیا تھا۔ سردارا جب بھی قانون کی گرفت میں آتا تھا تو شوکت علی کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ اسے ٹارچر سیل میں نہ لے جایا جائے۔ وہ وہاں مجبور ہوکر اس بڑے جاگیردار اور سیاست دان کے خلاف بہت کچھ اگل سکتا تھا۔

وہ سردارا کی خاطر کچھ روز کے لیے لاہور آگیا تھا۔ اسے الزامات سے بری کرانے اور رہائی دلانے کے لیے منفی سیاسی چالیں چل رہا تھا اور مجرمانہ ہتھکنڈے استعمال کررہا تھا۔ یہ تو سب ہی جانتے اور مانتے ہیں کہ سیاست دانوں سے تعلق رکھنے والے بدمعاشوں کو ڈھیل دی جاتی ہے۔ اگر وہ گرفتار ہوتے ہیں تو دو چار ماہ میں رہا ہوکر چلے آتے ہیں... یا ان کے خلاف کسی طرح کا الزام ثابت ہی نہیں ہوتا۔

نجو کے گھر میں واردات کرنے والا جیدی اس بات کا گواہ تھا کہ سردارا نے چالیس ہزار روپے دے کر وہ شرمناک واردات کرائی تھی۔ اس اہم جنسی دیدمہرے کو بڑے پُراسرار طریقے سے لاک اپ میں مار دیا گیا۔ اس کے بیانات پر مبنی پوری فائل بھی غائب کردی گئی تھی۔

فرمان اکبر نے جان پر کھیل کر مجرموں سے کاؤنٹر فائرنگ کے بعد جیدی کو قانون کے شکنجے میں لیا تھا۔ اس کے بعد سردارا سے ٹارچر سیل میں بہت کچھ اگلوایا جاسکتا تھا۔ مگر اس فرض شناس افسر کی تمام محنت پر پانی پھر گیا اور اصل مجرم کو رہائی مل گئی۔

شوکت آباد کے باشندوں نے حیرانی و پریشانی سے دیکھا۔ سردارا اور اس کے دیگر حواری فاتحانہ شان سے فائرنگ کرتے ہوئے ٹاؤن میں آگئے تھے۔ دوسرے کارندے بھی بڑے چوک پر بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ سردارا زندہ باد اور فرمان اکبر مُردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ سلطان بگا انہیں سمجھا رہا تھا کہ وہ سرکاری افسر کے خلاف کسی بھی دشمنی کا مظاہرہ نہ کریں۔ ورنہ سردارا پھر کسی مصیبت میں گرفتار ہوجائے گا۔

فرمان اسی دن شوکت آباد سے نکل کر ہیڈ کوارٹر پہنچا۔ اسے بہت صدمہ پہنچ رہا تھا۔ اس نے اپنے اعلیٰ افسر سے پوچھا۔ ''سر! یہ کیا ہوگیا؟ سردارا کو رہائی کیسے مل گئی؟''

اس نے کہا۔ ''ہمارے ملک کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں بے ایمان اور مجرمانہ ذہن رکھنے والے افراد موجود نہ ہوں۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں بھی کچھ ایسے بددیانت افسران ہیں۔ انہوں نے جیدی کو لاک اپ میں ہلاک کرایا ہے اور اس کی فائل غائب کردی ہے۔''

فرمان نے کہا۔ ''سردارا چار دنوں تک آپ کی کسٹڈی میں رہا۔ آپ اسے ٹارچر سیل میں لے جاکر اقبالِ جرم کرا سکتے تھے۔''

''مجھ سے بھی اوپر افسران ہیں۔ ان میں سے ایک نے سردارا کو اپنی کسٹڈی میں لے لیا تھا اور حکم دیا تھا کہ اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ کی جائے۔ ہم سب مجبور ہیں۔ اوپر والوں سے نہ کوئی سوال کرسکتے ہیں' نہ ان کے خلاف کچھ بول سکتے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے' میں دوبارہ ثبوت اور گواہوں کو اکٹھا کرنے کے بعد اسے گرفتار کروں گا تو اسے پھر رہا کرالیا جائے گا؟ یعنی ہمیں بڑے مجرموں پر ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ بس چھوٹے موٹے چور اُچکوں کو پکڑ کر اپنا نام اخبارات میں چھپواتے رہنا چاہیے۔''

''سمجھ میں نہیں آتا' فرعونی قوت اور ذرائع رکھنے والوں سے کیسے نمٹا جائے؟''

وہ دو روز تک وہاں رہ کر اعلیٰ افسران سے ملتا رہا۔ سب ہی پریشان تھے۔ یہی کہتے تھے کہ دو یا تین برسوں میں حکومتیں بدل جاتی ہیں۔ آنے جانے والے عارضی حکمران اس مختصر سے عرصے میں جس قدر لوٹ مار کرسکتے ہیں' کرتے ہیں پھر چلے جاتے ہیں۔ اپنے سیاسی غنڈوں کو بھی واردات کرنے اور خوب کمانے کے مواقع دیتے رہتے ہیں۔ ہم محکوم تو تنخواہ دار ملازم ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں' کرنا پڑتا ہے۔

دوسرے دن بشریٰ نے فون کے ذریعے کہا۔ ''ایک اہم اطلاع ہے۔''

اس نے پوچھا۔ ''اگر اہم اطلاع نہ ہوتی تو تم آج بھی فون نہ کرتیں؟''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''میں نے سوچا تھا' فون کروں پھر سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ سے کیا بولوں گی؟''

''تم ایک کال کرتیں۔ مجھے حوصلہ ملتا تو میں خود ہی بولتا چلا جاتا پھر تمہیں بھی بولنا آجاتا۔''

''اچھی بات ہے۔ آئندہ کوئی کام کی بات نہ ہوئی تب بھی فون کروں گی۔ اب اطلاع سناؤں؟''

''وہ تو سنا دینا... پہلے اپنے بارے میں کچھ بولو۔''

''میں... میں کیا بولوں جی...؟''

''مجھے کبھی یاد کرتی ہو؟''

''بھولنے والے کو یاد کرتے ہیں۔ ابّا اور بھائی طارق آپ کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ دن میں کئی بار ذکر ہوتا ہے۔ آپ نہ ہوتے ہوئے بھی ہمارے گھر میں موجود رہتے ہیں۔''

''صرف گھر میں...؟ دل میں نہیں...؟''

وہ ذرا سوچ کر بولی۔ ''آپ تو ہم سب کے دلوں میں رہتے ہیں۔''

''صرف اپنی بات کرو۔''

وہ چپ رہی۔ اس نے کہا۔ ''جواب دو۔''

وہ بولی۔ ''ایسے سوال کا جواب خاموشی ہے۔ آپ جو سمجھنا چاہیں' سمجھ لیں۔ اب کام کی بات کروں؟ بہت ضروری اطلاع ہے۔''

''چلو کام کے بہانے ہی میرے کانوں میں گنگناتی رہو۔''

''میرا خیال ہے' میں اس خفیہ اڈے تک پہنچ گئی ہوں جہاں وہ لوگ چرس' ہیروئین اور افیون کا ذخیرہ رکھتے ہیں۔''

''کیا واقعی...؟ یہ تو تم بہت بڑی خبر سنا رہی ہو۔ اگر ہم وہاں تک پہنچ گئے تو یہ تمہارا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ اب ذرا تفصیل بتاؤ؟''

وہ بتانے لگی۔ ''ٹاؤن کے جنوب میں غریب مزدوروں کی جھونپڑیاں ہیں۔ اس بستی کے آخری سرے پر لنگڑے لوہار کی جھونپڑی ہے۔ اس کے بعد کھلا میدان اور کھیت ہی کھیت ہیں۔ ایک حادثے میں لنگڑے کا دوسرا پاؤں بھی ناکارہ ہوگیا تھا۔ وہ کام کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ تب سے سردارا نے اس کی جوان بیٹی شنو کو اپنی داشتہ بنالیا ہے اور اس کے گھر کے ماہانہ اخراجات پورے کیا کرتا ہے۔''

بشریٰ نے اپنی حکمتِ عملی سے چند ہی دنوں میں بستی کی ساری عورتوں کو اپنا بنالیا تھا۔ کوئی اسے بیٹی کہتی تھی' کوئی بہن اور کوئی سہیلی سمجھ کر بڑی بے تکلفی سے باتیں کیا کرتی تھی۔ عورتیں بھی اس کے گھر آتی تھیں' کبھی وہ وہاں کے گھروں میں جایا کرتی تھی۔ اس طرح شنو سے بھی دوستی ہوگئی تھی۔ ایک روز بشریٰ نے اس سے کہا۔ ''وقت سے پہلے ہی تمہاری جوانی ڈھل جائے گی پھر کیا ہوگا؟ وہ سردارا کیا تمہیں منہ لگائے گا؟''

وہ بولی۔ ''میں تو ڈھل چکی ہوں۔ اب وہ مجھے نہیں پوچھتا۔ پر مہینے کی رقم ضرور دیتا ہے کیونکہ...''

بشریٰ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''کیونکہ اب اس کے ساتھی بشارت' تیمور اور بابے ابلیس مجھے نوچتے کھسوٹتے رہتے ہیں۔''

بشریٰ نے اسے بڑے دکھ سے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''پہلے میں بہت روتی تھی۔ اب مجھ پر قیامت گزرتی رہتی ہے' تب بھی میری آنکھوں میں آنسو نہیں آتے۔ مجھے دیکھو، کیا میں رو رہی ہوں؟''

اس کی آنکھیں خشک اور ویران تھیں۔ بشریٰ نے بڑی محبت اور ہمدردی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا پھر اس ہاتھ کو اپنے سینے سے لگا کر پوچھا۔ ''ان بدمعاشوں کا بھی دل بھر جائے گا۔ وہ تم سے بے زار ہوجائیں گے، تب کیا ہوگا؟''

''فیر بھی وہ مہینے کی رقم دیتا رہے گا۔''

''شنو! بدمعاش رحم دل نہیں ہوتے۔ وہ خوامخواہ کیوں رقم دے گا؟''

''اس لیے کہ ہم اس کے کارندے ہیں، وفادار ہیں۔ اس کے رازدار ہیں۔''

راز کی بات پر بشریٰ نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''تم اس کی بیوی اور بچوں کی ماں ہوتیں تو وہ تمہیں اپنے دھندے میں ساری عمر رازدار بنا کر رکھتا۔ باسی ہوجانے والی کسی عورت پر وہ ہمیشہ بھروسا نہیں کرے گا۔ تمہیں ٹھکانے لگا کر دوسری لے آئے گا۔''

''میں باسی ہوگئی ہوں۔ پر ہماری یہ جھونپڑی اس کے لیے کبھی کھنڈر نہیں بنے گی۔ ہمارا یہ کچا کوٹھا اس کے لیے تاج محل سے زیادہ قیمتی ہے۔''

''یعنی اس کے لیے تم سے زیادہ تمہارا گھر اہمیت رکھتا ہے؟''

''چھوڑیں اس بات کو... میری حیاتی تو برباد ہوچکی ہے۔ اب نہ میں کسی کی گھر والی بن سکتی ہوں' نہ کبھی ماں بن سکتی ہوں۔''

''تم بیوی بھی بن سکو گی اور ماں بھی... ابھی تو تم جوان ہو۔ میں تمہارا رشتہ کسی سے کرا سکتی ہوں۔''

''سردارا کسی کو میرا شوہر (شوہر) اور رازدار نہیں بننے دے گا۔''

''میں تمہیں اس کے شکنجے سے نکال سکتی ہوں۔''

''یہ اتنا سوکھا (آسان) نہیں ہے۔ تم اسے نہیں جانتیں۔''

''تم سے زیادہ اسے جانتی ہوں۔ ناممکن کو ممکن بنانا آتا ہے۔ اگر تم مجھ پر بھروسا کرو گی، مجھے رازدار بناؤ گی تو میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ تمہیں چپ چاپ اس ٹاؤن سے کہیں دوسری جگہ پہنچا کر تمہارا گھر بسا دوں گی۔''

اس نے بڑے جذبے سے پوچھا۔ ''کیا ایسا ہوسکتا

ہے؟ میں کہیں دور جا کر' ان بدمعاشوں سے دور جا کر ایک اچھی زندگی گزار سکتی ہوں؟"

"میں وعدہ کرتی ہوں، تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ سردارا اور اس کے ساتھی کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ تم کسی شہر میں جا کر اپنے خوابوں اور خیالوں کے مطابق زندگی گزار سکوگی۔ میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کروں گی۔ حکومت کی طرف سے بھی تمہیں انعام واکرام میں بہت بڑی رقم ملے گی۔"

"مجھے رقم کی پروا نہیں ہے۔ میں لاکھوں روپے حاصل کرسکتی ہوں۔"

بشریٰ نے چونک کر پوچھا۔ "اتنے روپے کہاں سے حاصل کرسکتی ہو؟"

وہ قریب ہو کر اس کی طرف جھک کر سرگوشی میں بولی۔ "وہ ساری چرس اور ہیروئین ہماری جھونپڑی میں چھپا کر رکھتا ہے۔ ابھی تو میں اس مال سے ایک چٹکی بھی لے کر کہیں فروخت نہیں کرسکتی۔ پر یہاں سے فرار ہوتے وقت تھیلی بھر بھر کر لاکھوں روپے کا مال لے جاسکوں گی۔"

"تمہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ قانون کی مدد کردگی تو انعام کے طور پر تمہیں بہت کچھ ملے گا۔"

تب اس نے بتایا کہ اس کی جھونپڑی کے ایک کمرے میں بہت بڑا صندوق ہے۔ اس میں لوہے کا بہت سا ٹوٹا پھوٹا سامان پڑا ہے۔ وہ اتنا بھاری ہے کہ اسے دو تین بندے زور لگا کر وہاں سے ہٹاتے ہیں۔ تب زمین کے نیچے بنے ہوئے گودام میں جانے کا راستہ نظر آتا ہے۔ وہاں پتا نہیں منشیات کا کتنا ذخیرہ رکھا ہوا ہے؟ ضرورت کے وقت سردارا کے خاص کارندے بشارت، تیمور اور بابے ابلیس وہاں سے مال نکال کر لے جاتے ہیں۔

فرمان اور بشریٰ کے درمیان فون کے ذریعے رابطہ رہتا تھا۔ اس روز بھی بشریٰ نے فون پر یہ ساری تفصیلات بتائیں۔ فرمان نے خوش ہو کر کہا۔ "تم نے تو کمال کردیا۔ اب تک وہاں کئی بار چھاپے مارے گئے ہیں۔ اسکولوں مدرسوں اور فلاحی اداروں... حتیٰ کہ تھانے دار بگا اور تمام سپاہیوں کے گھروں کی بھی تلاشی لی گئی ہے۔ ہم میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک اپاہج لوہار کے گھر میں تہ خانہ ہوگا۔ تم نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے بشریٰ! آئی لو یو۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "آپ تو کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہے ہیں۔"

"میں تم سے جی بھر کے باتیں کروں گا۔ ابھی جلد سے جلد اس زہریلے ذخیرے تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ اجازت دو پھر کسی وقت رابطہ کروں گا۔"

اس نے فوراً ہی گھر سے نکل کر اینٹی نارکوٹکس فورس کے اعلیٰ افسران سے ملاقات کی۔ ان سے کہا۔ "اس بار میں آپ کے ڈیپارٹمنٹ پر بھروسا کر کے سردارا کو لاکھوں روپے کی چرس اور ہیروئین کے ساتھ گرفتار کرانا چاہتا ہوں۔ کیا یہ کام انتہائی رازداری سے ہوسکے گا؟"

ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ "ہم کئی بار کوششیں کرچکے ہیں اور ناکام ہوتے رہے ہیں۔ اگر تم منشیات کے ذخیرے تک پہنچ سکوگے تو ہم انتہائی رازداری سے آپریشن کریں گے اور اس سے پہلے سردارا کو اس کے ساتھیوں سمیت حراست میں لے لیں گے تاکہ وہ جارحانہ انداز میں رکاوٹ نہ بنیں۔"

"وہاں شوکت علی کامرانی کا حکم چلتا ہے۔ آپ انہیں گرفتار کریں گے تو دوسرے ہی لمحے میں کامرانی کے ایک حکم سے انہیں رہا کردیا جائے گا۔ آپ ایسا کچھ نہ کریں۔ اچانک چھاپا مارا جائے گا اور جب وہ مال سمیت گرفتار ہوگا تو شوکت علی قانونی معاملات میں مداخلت نہیں کرسکے گا۔"

فرمان اس بار بہت محتاط تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ سردارا گرفتاری کے بعد کسی بھی ہتھکنڈے سے رہائی نہ پاسکے۔ اس نے اعلیٰ افسران سے کہا۔ "وہاں شنو نامی ایک جوان عورت ہے۔ اسے ہر طرح کی سیکیورٹی ملنی چاہیے۔ ہم نے وعدہ کیا ہے کہ اسے سردارا کی دسترس سے دور رکھا جائے گا۔"

بہرحال، بڑی محتاط منصوبہ بندی کے بعد اینٹی نارکوٹکس فورس نے اس جھونپڑی کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پھر شنو اور اس کے اپاہج باپ کو حراست میں لے کر اس تہ خانے تک پہنچ گئے جہاں لاکھوں روپے کی منشیات چھپا کر رکھی گئی تھی۔ یہ سردارا کی خوش بختی تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ دوسرے علاقے میں گیا ہوا تھا اور ایک بہت بڑی کامیابی کے باوجود گرفت میں نہیں آسکا تھا۔

اس کے کارندے نے آکر خطرے سے آگاہ کیا۔ سردارا نے بے یقینی سے پوچھا۔ "انہیں یہ راز کیسے معلوم ہوا کہ ہمارا مال اس جھونپڑی میں چھپایا جاتا ہے؟"

"پتا نہیں' وہ لوگ شنو اور اس کے باپ کو گرفتار کر کے کہیں لے گئے ہیں۔"

بابے نے کہا۔ "لکھ لعنت اے... ان باپ بیٹی میں سے کسی ایک نے یہ بھید کھولا ہے۔"

بشارت نے کہا۔ "جو آج تک نہ ہوا، وہ اچانک کیسے ہوگیا؟ فرمان کوئی جادوگر نہیں ہے۔ ہمیں ملوم کرنا چاہیے۔ اسے وہاں تک کس نے پہنچایا ہے؟"

سردارا اپنے ساتھیوں کے ساتھ روپوش ہوگیا تھا۔ شوکت علی نے کہا۔ "اس علاقے میں نہ آنا۔ قانون کی گرفت میں آؤ گے تو ضمانت نہیں ہوسکے گی۔"

وہ بولا۔ "اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے کہ پکڑا جانے والا مال میرا ہے۔ آپ قنون کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ مجھے [illegible]م سے بری کراسکتے ہیں۔"

"معاملہ سنگین ہے۔ شنو اور اس کے باپ نے بیان دیا ہے کہ تم اس تہ خانے میں مال چھپا کر رکھتے تھے پھر یہ کہ ہماری حکومت گرگئی ہے۔ فوج آگئی ہے۔ پتا نہیں' اسمبلیاں برقرار رہیں گی یا نہیں...؟ میری وزارت کے سلسلے میں بھی آئندہ معلوم ہوگا۔"

سردارا نے اپنے چند ساتھیوں سے کہا۔ "ہم بُرے وقت میں دربدر ہوئے ہیں۔ اگر پکڑے گئے تو فوجی ہمیں الٹا لٹکا کر ایسی پھینٹیاں لگائیں گے کہ ہم خود ہی اپنا کچا چٹھا کھول کے رکھ دیں گے۔"

بابے نے کہا۔ "فرمان اکبر نوں اے یقین اے کہ دارا شکوہ کو ہم نے قتل کیا ہے۔ وہ ٹارچر سیل میں اس جرم کا بھی اقرار کرالے گا۔"

وہ چاروں اپنے دھندے سے ٹوٹ کر اپنے علاقے سے چھوٹ کر بے یارومددگار ہوگئے تھے۔ اگر دربدر ہوجانے والی بات پہلے سے معلوم ہوتی تو وہ تہ خانے سے اپنا مال ضرور لے آتے جسے بیچ کر آسانی سے گزارہ کرتے رہتے۔ اب تو کسی دوسرے شہر کی طرف جانے سے گرفتار ہونے کا اندیشہ تھا۔ وہ جلد ہی فاقے کرنے والے تھے۔

انہیں ایک کارندے نے آکر بتایا کہ شنو آج کہیں سے فرمان کے ساتھ آئی ہے۔ بڑی خوش ہے۔ سرکار کی طرف سے اسے دو لاکھ روپے ملے ہیں۔ وہ کسی دوسرے علاقے میں رہنے کے لیے جارہی ہے۔

سردارا نے ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا۔ "اس کتیا نے ہم سے غداری کی ہے۔ ملوم کرو' وہ کس علاقے میں جا کے مرے گی؟ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اس مخبر نے کہا۔ "صرف شنو نے نہیں، سلامت علی کی بیٹی بشریٰ نے بھی مخبری کی ہے۔ میری گھر والی کہہ رہی تھی کہ بشریٰ فرمان کی معشوقہ ہے۔ اب تک اس کے لیے مخبری کرتی رہی اور ہمیں خبر بھی نہ ہوئی۔"

بابے ابلیس نے کہا۔ "فرمان نے بڑا لمبا چکر چلایا ہے۔ سردارا! پہلے تم نے بشریٰ کو گھر والی بنانا چاہا پھر اسے دیکھ کر کامرانی صاب کی رال ٹپکنے لگی۔ ان کی خاطر تم نے دارا کو قتل کیا۔ پر نہ تو وہ ان کے ہاتھ لگی' نہ تیرے ہاتھ آئی۔ سالا وہ سی آئی اے والا مزے لوٹ رہا ہے۔"

سردارا مٹھیاں بھینچ رہا تھا، دانت پیس رہا تھا۔ اس نے عادتاً ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ سکول میں پڑھنے والی کڑی ہم سب کو ٹھینگا دکھائے گی اور ہمیں اس جنجال میں ڈالے گی۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ اس کی بوٹی بوٹی سے حساب لوں گا۔ ہم سب مل کر اس کی دھجیاں اڑائیں گے۔ پھر اس کی لاش فرمان کے لیے چھوڑ کر یہاں سے چلے جائیں گے۔"

تیمور نے کہا۔ "ابھی تو دال روٹی کی سوچو۔ اَج رات نہ کھانا ہے... نہ شراب ہے۔"

"ہم سوچنے کے لیے نہیں' چھیننے جھپٹنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اَج رات چودھری شمشاد کی حویلی میں ڈکیتی ڈالیں گے۔"

وہ موجودہ حالات میں اسی طرح گزارہ کرسکتے تھے۔ رات کی تاریکی پھیلتے ہی وہاں سے چل پڑے۔ تقریباً چالیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے آدھی رات کو حویلی میں پہنچے۔ انہوں نے وہاں کے چوکیدار اور ملازموں کو نشانے پر رکھ کر انہیں بے بس کیا۔ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک طرف ڈال دیا۔ پھر حویلی میں گھس کر چودھری کی خواب گاہ میں پہنچ گئے۔ اسے اور چودھرائن کو بھی قابو میں کرلیا۔

چودھری نے کہا۔ "سردارا! تُو جانتا ہے' شوکت علی کامرانی میرا بہنوئی ہے۔ پھر بھی تُو ڈاکو بن کے آیا ہے۔ مجھ سے بول... کیا چاہتا ہے۔ میں خود تجھے دوں گا۔"

وہ بولا۔ "مانگنے سے مٹھی دو مٹھی ملے گی پر چھیننے سے پوری تجوری ملے گی۔ وقت برباد نہ کر۔ فوراً تجوری کھول۔"

اس نے سیف کے پاس آکر اسے کھولا۔ زیورات کے علاوہ نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ سامنے ہی بھرا ہوا پستول رکھا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے اسے اٹھاتے ہوئے گولی چلائی۔ پہلا نشانہ تیمور بنا' دوسرے کو نشانہ بنانے سے پہلے ہی ایک گولی اس کے سینے میں آکر پیوست ہوگئی۔ اس نے تیمور کی لاش کے قریب گرتے ہی دم توڑ دیا۔

سردارا کو اپنے ساتھی کی موت کا افسوس تھا مگر وہ ماتم کرنے میں وقت ضائع نہیں کرسکتے تھے۔ تجوری کے زیورات اور نقدی بیگ میں بھر کر چودھرائن سے بولے۔ "ہمارے ساتھ باورچی خانے میں چلو۔ جو پکایا ہے' وہ نکال کے لے آؤ۔"

وہ چودھری کی موت پر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

ان کے ساتھ کچن میں آ کر ان کی دعوت کرنے لگی۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔ ”مجھے جان سے تو نہیں مارو گے؟ تم جو کہو گے‘ وہ کرتی رہوں گی۔ تمہارے جانے کے بعد تھانے میں بھی بیان نہیں دوں گی۔“

بابے نے کہا۔ ”چودھری نشہ کرتا تھا۔ ادھر بوتلیں ضرور ہوں گی؟“

”میں نے کہا نا... جو مانگو گے‘ وہ دوں گی۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ ربّ دا واسطہ... جلدی چلے جاؤ۔“

اس نے ایک الماری کھولی۔ اس میں شراب کی بوتلیں بھری ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر تینوں کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ پینے اور کھانے لگے۔ مجبوری تھی، تمام بوتلیں اٹھا کر نہیں لے جا سکتے تھے۔ پھر بھی جتنا وزن اٹھا سکتے تھے، واپسی پر اٹھا لائے۔ چودھرائن کو رسیوں سے باندھ کر آئے تاکہ وہ فوراً ہی پولیس کو انفارم نہ کر سکے۔

دوسرے دن شوکت علی نے فون پر کہا۔ ”سردارا! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ تم نے میرے سالے کو قتل کیا ہے اور اس کی تجوری بھی صاف کر دی ہے؟“

وہ بولا۔ ”آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ چودھری کے ساتھ ہمارے ایک وفادار ساتھی کی لاش ملی ہے؟ میں نے حساب برابر کیا ہے۔ اگر آپ شکایت کرو گے کہ میں نے آپ کے ایک قریبی رشتے دار کو مار ڈالا ہے تو مجھے بھی شکایت ہے‘ آپ مجھے قتوں کے شکنجے سے نکالنے کے لیے کچھ نہیں کر رہے ہو۔ ہم بھوکے نہیں رہ سکتے۔ بھیک نہیں مانگ سکتے۔ واردات نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟“

”تم جانتے ہو‘ میں تمہاری سلامتی کو اپنی سلامتی سمجھتا ہوں۔ تم پکڑے گئے تو اپنے باپ کو بھی نہیں چھوڑو گے۔ میرے خلاف خوب بولو گے۔ ابھی حالات ایسے ہیں کہ تمہارے لیے کچھ کر نہیں پا رہا ہوں۔“

”آخر کب تک ایسے حالات رہیں گے؟“

”یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے‘ تمہیں اس ملک سے باہر بھیج دوں۔ جب حالات بہتر ہوں گے تو واپس بلا لوں گا۔“

”میں یہاں سے ہائی وے کی طرف نہیں جا سکتا۔ سارے شہروں کے ائرپورٹ پر میری تصویریں پہنچائی گئی ہیں اور پھر میرا اسپورٹ ڈیرے پر رکھا ہوا ہے۔ میں ملک سے باہر کیسے جا سکتا ہوں؟“

”تم کراچی کے ساحل سے ایک لانچ کے ذریعے مڈل ایسٹ جاؤ گے۔ وہاں تمہیں نیا پاسپورٹ اور ضروری کاغذات ملیں گے۔ میں سارے انتظامات کر رہا ہوں۔ دو چار دنوں میں سلطان بگا گاڑی لے کر آئے گا اور تمہیں کراچی لے جائے گا۔“

”جنابِ عالی! سلطان بگا نہیں‘ آپ خود مجھے کراچی لے جاؤ گے۔“

”کیا بکواس کرتے ہو؟ میرے پاس ہائی وے سے سفر کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں بہت مصروف ہوں۔“

”او جی! صرف میری نہیں‘ آپ کی بھی سلامتی کا تقاضا ہے۔ ساری مصروفیات ختم کرو۔ آپ کی گاڑی پر پاک پرچم لہراتا رہتا ہے۔ میں اس میں چھپا رہوں گا تو کوئی اسے روک کر چیک نہیں کرے گا۔“

”فضول باتیں نہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکوں گا۔“

”فیر تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔ کہیں جا کر حرام موت مرنے سے بہتر ہے، اپنے ساتھیوں کے ساتھ جیتا رہوں یا مرتا رہوں۔ جب گرفتاری ہوگی اور ڈوبنے کا وقت آئے گا تو آپ کو بھی لے ڈوبوں گا۔ آپ اچھی طرح سوچ لو۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ شوکت علی نے جھنجھلا کر ریسیور رکھتے ہوئے بگا کو دیکھا پھر کہا۔ ”اس کتے نے فون بند کر دیا ہے جیسے میں اس کا محتاج ہوں۔ ایسی چھوٹی ذات کے لوگوں کو اپنا راز دار نہیں بنانا چاہیے۔“

بگا نے کہا۔ ”آپ غصہ نہ کریں۔ اس کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ وہ جلد ہی حرام موت مرے گا۔“

”پتا نہیں کب مرے گا؟ مجھے رپورٹ مل رہی ہے‘ اسے جلد ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔ اگر وہ پکڑا گیا تو میری نیندیں حرام ہو جائیں گی۔“

”آپ اطمینان رکھو۔ میں گرفتاری سے پہلے ہی اسے ٹھکانے لگا دوں گا۔“

”وہ تمہارے ساتھ نہیں‘ میرے ساتھ کراچی جانا چاہتا ہے۔“

”آپ راضی ہو جائیں۔ حقیقتاً ہمیں کراچی نہیں جانا ہے۔ بس ایک بار اس سے سامنا ہو جائے‘ وہ جہاں ملے گا وہیں گولی مار دی جائے گی۔“

وہ بگا کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ ”مجھ پر بھروسا کریں۔ ہمارے ساتھ پکے نشانے باز سپاہی ہوں گے۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”کاؤنٹر فائرنگ ہوگی تو گولی مجھے بھی لگ سکتی ہے۔“

”ہم ایسا کچھ نہیں کریں گے۔ پہلے دوستانہ رویہ رکھیں گے۔ پھر موقع پا کر اسے نہتا کرنے کے بعد گولی چلائیں گے۔“

وہ اس معاملے کے ہر پہلو پر غور کرنے لگا پھر بولا۔ ”کل صبح اسلام آباد جا رہا ہوں۔ دوسرے دن واپس آ جاؤں گا۔ پرسوں شام کو وہ جہاں بھی ہے‘ وہاں اس کا کام تمام کرنے جائیں گے۔“

”آل رائٹ سر! پرسوں وہ مصیبت آپ کے سر سے ٹل جائے گی۔“

کامرانی نے ریسیور اٹھا کر نمبر پنچ کیے۔ پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ ”ہیلو سردارا! میں نے تمہارے مطالبے پر غور کیا ہے۔ تم درست کہتے ہو۔ میری گاڑی میں سفر کرو گے تو نہ چیکنگ ہوگی نہ تمہاری گرفتاری کا اندیشہ رہے گا۔“

”بڑی میربانی جناب! اس طرح آپ اعتماد قائم کر رہے ہیں۔ یہ بتائیں‘ کب آ رہے ہیں؟“

”میں پرسوں شام سلطان بگا اور سپاہیوں کے ساتھ آؤں گا۔ یہ بتاؤ‘ تم کہاں ہو؟“

”جب آپ وہاں سے روانہ ہوں گے‘ تب بتاؤں گا۔ برا نہ مانیں‘ میں ذرا محتاط رہنا چاہتا ہوں۔“

”اچھی بات ہے۔ میں پرسوں فون کروں گا۔“

شوکت علی کامرانی نے ریسیور رکھ کر کہا۔ ”بہت چالاک بن رہا ہے۔ ہمیں پرسوں اپنے خفیہ اڈے کے بارے میں بتائے گا۔ تم پوری طرح تیار رہو۔“

سردارا کا ایک ساتھی مارا گیا تھا۔ اب دورہ گئے تھے۔ وہ فون پر ہونے والی باتیں سنتے رہتے تھے۔ انہوں نے مایوس ہو کر سردارا سے پوچھا۔ ”کیا تم ہمیں چھوڑ کر ملک سے باہر چلے جاؤ گے؟“

اس نے پوچھا۔ ”تمہارا دل کیا کہتا ہے؟“

انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سردارا نے کہا۔ ”تم سب میرے لیے جان کی بازی لگاتے رہے۔ کیا میں اپنی جان بچانے کے لیے تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا جاؤں گا؟“

بابے نے کہا۔ ”ساڈا دل کہتا ہے‘ تم ساتھ نہیں چھوڑو گے۔ پر ہم سمجھتے ہیں‘ فی الحال تمہیں گرفتاری سے بچنے کے لیے جانا چاہیے۔ جب حالات سازگار ہوں گے تو واپس آ جانا۔“

وہ ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”ہم ایک ساتھ جئیں گے، ایک ساتھ مریں گے۔ اگر جاؤں گا تو تم دونوں کے ساتھ... ورنہ جانے سے انکار کر دوں گا۔“

وہ دونوں خوش ہو کر اس سے لپٹ گئے۔ دوسرے دن مخبر نے آ کر کہا۔ ”فرمان کے ساتھ جتنے سپاہی اور افسران لاہور سے آئے تھے‘ وہ سب واپس چلے گئے ہیں۔“

بابے نے پوچھا۔ ”کیا فرمان بھی چلا گیا ہے؟“

”ہاں۔ اب ہمارے ٹاؤن میں صرف بگا اور اس کے سپاہی ہیں۔“

بشارت نے کہا۔ ”فرمان تو بشریٰ کا یار ہے۔ اسے چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ دیکھ لینا... دوسرے ہی دن واپس آئے گا۔“

سردارا نے کہا۔ ”دوسرا دن ابھی دور ہے۔ آج چھٹی ہے۔ ہم بشریٰ کو اٹھا کے لا سکتے ہیں۔“

بشارت نے کہا۔ ”فرمان کے چار ماتحت وہاں ہوں گے۔“

مخبر نے کہا۔ ”کوئی نہیں ہے۔ سب جا چکے ہیں۔ وہ سمجھ گئے ہیں‘ تم لوگ کبھی واپس نہیں آؤ گے۔ گرفتاری سے بچنے کے لیے سرحدی علاقے میں چلے گئے ہو۔ میں نے تھانے دار کو بھی یہی کہتے سنا ہے۔“

بابے نے کہا۔ ”یعنی ساڈے واسطے راستہ صاف اے۔ تھانے دار نے بھی لوگوں کو یقین دلایا ہے کہ ہم ادھر نہیں ہیں۔ بشریٰ کو چک کے لائیں گے تو کوئی ہم پر شبہ نہیں کرے گا۔“

انہوں نے طے کیا کہ آدھی رات کو بشریٰ کے گھر میں گھس کر اسے اٹھا لیا جائے گا اور مزاحمت کرنے والے باپ بھائی کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔ وہ وہاں اپنے خلاف کوئی ثبوت چھوڑ کر نہیں آئیں گے۔

پچھلی رات شوکت علی کو فون پر اطلاع دی گئی تھی کہ اسلام آباد میں ہونے والی میٹنگ ملتوی کر دی گئی ہے۔ وہاں جانا ضروری نہیں تھا۔ وہ دوسری صبح اپنی کار میں بیٹھ کر علاقے کا دورہ کرنے نکلا تو اس وقت ٹاؤن کے طلبا اور طالبات اسکول جا رہے تھے۔ بشریٰ اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ ہنستی بولتی جا رہی تھی۔ شوکت علی کامرانی نے اس کے قریب آ کر گاڑی روکی۔ اسے مخاطب کیا۔ ”بشریٰ! جسٹ آ منٹ... میری بات سنو۔“

وہ سہیلیوں کے جھرمٹ سے نکل کر اس کے پاس آ گئی۔ اسے دیکھ کر دل مچلنے لگا تھا۔ اس نے اپنے حالات سے مجبور ہو کر پچھلے دنوں اسے نظر انداز کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کے دل و دماغ سے ایک لمحے کے لیے اوجھل نہیں ہوئی تھی۔

اس نے کہا۔ ''میں تمہارے ابّا سے ملنا چاہتا ہوں۔ ان سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے؟''

اس نے مختصر سا جواب دے کر جانا چاہا۔ ''وہ گھر میں ہیں۔''

اس نے کہا۔ ''ہوا کے گھوڑے پر سوار نہ رہو۔ ذرا میری بات تو سنو۔''

وہ علاقے کا جاگیردار تھا۔ وہ بات کرنے سے انکار نہیں کرسکتی تھی۔ دور و نزدیک آنے جانے والے افراد رک گئے تھے۔ جو دکانوں کے اندر اور باہر بیٹھے تھے، وہ ادب سے کھڑے ہو گئے تھے۔ بشریٰ نے ایک قدم آگے بڑھ کر پوچھا۔ ''فرمائیں...؟''

کامرانی نے پوچھا۔ ''میں نے تمہارے اور فرمان اکبر کے متعلق کچھ افواہیں سنی ہیں۔ یہ کہاں تک درست ہیں؟''

''افواہوں پر بے وقوف اور ناخواندہ لوگ کان دھرتے ہیں۔ آپ تو ایجوکیٹڈ ہیں۔''

''یعنی یہ غلط ہے؟''

''میں آپ کو جواب دے چکی ہوں۔ پھر یہ کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ ایسا کوئی سوال نہ کریں۔''

وہ مسکرا کر مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ ''آج کے بعد یہ تمہارا ذاتی معاملہ نہیں رہے گا۔ میں تمہارا رشتہ مانگنے جا رہا ہوں۔ تمہارے ابّا تمہیں چودھرائن بنانے سے انکار نہیں کریں گے۔''

وہ ہنستا ہوا کار اسٹارٹ کر کے وہاں سے جانے لگا۔ بشریٰ اسے غصے سے دیکھتی رہی۔ پھر اسکول بیگ سے موبائل فون نکال کر فرمان سے رابطہ کرنے لگی۔ کامرانی سوچ رہا تھا کہ فرمان اور بشریٰ کے متعلق جو افواہیں گردش کر رہی ہیں، ان میں صداقت نہیں۔ وہ اسے سنجیدگی سے اپنی دوسری شریکِ حیات بنانا چاہتا تھا۔

سلامت علی نے اسے دیکھ کر سلام کیا پھر کہا۔ ''آپ نے کیوں میرے دروازے پر آنے کی زحمت کی... ہم تو حکم کے بندے ہیں، حاضری دینے آپ کے در پر چلے آتے۔''

وہ کار سے اترتے ہوئے بولا۔ ''بڑی پرانی کہاوت ہے کہ پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے۔ میں پیاسا ہوں... اس لیے آیا ہوں۔''

وہ سلامت علی کے ساتھ چھوٹی سی بیٹھک میں آ کر بیٹھ گیا پھر بولا۔ ''میری بیوی اَن پڑھ جاہل عورت ہے۔ چچا کی بیٹی تھی۔ اس کی جائیداد سنبھالنے کے لیے شادی کرلی۔ پر میں اپنی پھیلی ہوئی جائیداد کو سنبھالنے کے لیے ایک تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جو دوسری آئے گی، وہی میری دولت اور جائیداد سے کھیلتی رہے گی۔ ساری حیاتی عیش کرتی رہے گی۔''

سلامت علی نے کہا۔ ''اور آپ کے بچے؟''

''اُن کا کیا ہے؟ لندن میں پڑھ لکھ رہے ہیں۔ ان کے نام تھوڑی سی جائیداد لکھ دوں گا۔ میری دوسری بیوی سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔''

''پھر تو آپ دوسری شادی کرنے کا حق رکھتے ہیں... ضرور کریں۔''

''اسی لیے آپ کے دروازے پر آیا ہوں۔''

سلامت علی نے کہا۔ ''جب آپ نے بات شروع کی تھی، میں تب ہی سمجھ گیا تھا کہ راجہ بھوج ہم جیسے گنگو تیلی کے گھر کیوں آیا ہے؟''

''اونا جی نا! آپ خود کو گنگو تیلی نہ کہیں۔ میں آپ کو اپنے برابر کا سمجھ کر رشتہ مانگنے آیا ہوں۔''

''پر اس کا رشتہ تو ہو چکا ہے۔''

اس نے چونک کر اسے دیکھا پھر کہا۔ ''وہ بات تو ختم ہو چکی ہے۔ جس سے ہوا تھا، وہ مر چکا ہے۔''

''ہماری برادری میں جوان اور قابل لڑکوں کی کمی نہیں ہے۔''

''بے شک، کمی نہیں ہوگی... پر میری طرح کوئی دولت مند بلند مرتبے والا نہیں ہوگا۔''

''جسے لڑکی چاہے، اس کا مرتبہ بلند ہو جاتا ہے۔ میں اپنی دھی رانی کی پسند کے مطابق سی آئی اے کے افسر فرمان اکبر سے اس کا رشتہ کرنے والا ہوں۔ آپ اس بات کو یہیں ختم کردیں۔''

فرمان کا نام سن کر کامرانی کے ذہن کو ذرا جھٹکا سا لگا۔ وہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا پھر بولا۔ ''آپ نے دنیا دیکھی ہے۔ کڑی کی پسند نہ دیکھیں۔ وہ تو نادان ہے۔''

''آپ اپنی پہلی بیوی کو بھی بے وقوف کہہ چکے ہیں۔ میری بیٹی بھی بے وقوف اور نادان ہے۔ آپ یہاں رشتہ کرنے کی غلطی نہ کریں۔ اپنے برابر والوں میں جائیں۔''

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں جا رہا ہوں اور آپ کی بہتری کے لیے سمجھا رہا ہوں کہ مجھے جنوائی بنالیں۔ ہر طرح سے فائدے میں رہیں گے۔''

وہ اپنی تذلیل محسوس کر رہا تھا۔ غصے کو چھپانے کے باوجود پاؤں پٹختا ہوا باہر آ کر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ پھر اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے فون پر بگا سے بولا۔ ''میں کوٹھی میں ہوں، فوراً آؤ۔''

وہ حکم سنتے ہی تھانے سے نکل کر گاڑی دوڑاتا ہوا کوٹھی میں پہنچ گیا۔ کامرانی غصے سے ٹہل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر بولا۔ ''میں نے سردارا کو بشریٰ کی عزت لوٹنے سے باز رکھا۔ اسے حاصل کرنے کے لیے دارا شکوہ کو قتل کرایا پھر بھی سالی ہتھ نہیں آ رہی ہے۔''

بگا نے سر ہلا کر کہا۔ ''پورے علاقے میں چرچا ہو رہا ہے، وہ فرمان کی منگ ہے۔ آپ نے فرمایا تھا، اسے اپنی شریکِ حیات بنائیں گے۔ پر اپنے عاشق کے پیچھے بدنام ہونے والی سے کیا اب آپ شادی کرنا چاہیں گے؟''

''اب میں اس کی عزت پر تھوکنا چاہتا ہوں۔ اس کے باپ نے میری توہین کی ہے۔ کچھ بھی کرو، اس کتیا کو اٹھا کے میری شکارگاہ میں لے آؤ۔''

بگا سر جھکا کر سوچنے لگا۔ شوکت نے کہا۔ ''کل سردارا کو بھی ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔ تم نے کہا تھا، اس کی جگہ ایک بہت ہی شاطر غنڈے کو تیار کیا گیا ہے۔ یہ اسے آزمانے کا وقت ہے۔ کیا وہ بشریٰ کو اغوا کر سکے گا؟''

''جی جنابِ عالی! وہ بڑی بڑی وارداتیں کر چکا ہے۔ پکا واردا تیا ہے۔ میں یہی سوچ رہا ہوں۔ فرمان اور اس کے ماتحت یہاں ہیں۔ اگر آج بشریٰ کو اٹھایا جائے گا تو اس کا الزام سردارا پر آئے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ الزام سے انکار کرے، ہم اسے جہنم میں پہنچا دیں گے۔''

شوکت علی نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''یہی ہونا چاہیے۔ آج کسی بھی وقت بشریٰ کو اٹھاؤ اور کل سردارا سے پنچھا چھڑاؤ۔ میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر جائے گا۔ تمہیں ہر مہینے پچیس ہزار روپے ملتے رہتے ہیں۔ اس بار ایک لاکھ روپے دوں گا۔''

وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کا خادم ہوں جنابِ عالی! سمجھیں... کام ہوگیا۔ میں فون پر اطلاع دوں گا، آپ شکارگاہ میں چلے آئیں۔''

وہ غلام تھانے دار ایک نئے مشن کی تکمیل کے لیے وہاں سے چلا گیا۔ کامرانی قدِ آدم آئینے کے سامنے آ کر خود کو دیکھنے لگا۔ کچھ بوڑھا سا لگ رہا تھا۔ وہ سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے اندر ایک گیت گونجنے لگا۔ ابھی تو میں جوان ہوں...

جب تک ہستی میں مستی رہے اور مستی کے لیے کم سن دوشیزائیں ملتی رہیں، تب تک کوئی عیاش خود کو بوڑھا تسلیم نہیں کرتا۔ وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگا۔

☆☆☆

رات کے نو بجے طارق اور سلامت علی روٹی کھانے کے بعد سونے جا رہے تھے۔ ایک سپاہی نے آ کر انہیں آواز دی۔ طارق نے دروازہ کھول کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

وہ بولا۔ ''ابھی تمہاری اور سلامت چاچا کی حاضری ہے۔ بگا صاحب نے بلایا ہے۔''

اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''اتنی رات کو...؟ معاملہ کیا ہے؟''

''وہی نجو کے گھر والا معاملہ ہے۔ آگے میں نہیں جانتا۔ خود ہی جا کے معلوم کرو۔ ابھی فوراً چلو۔''

''ٹھیک ہے۔ ابّا کا جانا ضروری نہیں ہے، میں چلتا ہوں۔''

''او تم سے کہا نا... دونوں کی حاضری ہے۔ بحث نہ کرو، دونوں ابھی چلو۔''

سلامت نے کہا۔ ''چلُ پتر! چل کے دیکھتے ہیں، تھانے دار یہاں کا بے تاج بادشاہ ہے۔ حکم تو ماننا ہی پڑے گا۔''

انہوں نے بشریٰ کو تاکید کی کہ وہ دروازہ اندر سے بند رکھے۔ کوئی پوچھنے آئے تو کہہ دے، وہ دونوں تھانے میں ہیں۔

وہ باپ بیٹا وہاں سے تھانے پہنچ گئے۔ سلطان بگا نے کہا۔ ''آؤ جی آؤ! کسی مجرم کو کرسی پر بٹھایا نہیں جاتا۔ پر تم بزرگ ہو، عزت دار ہو۔ آؤ بیٹھو۔''

وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سلامت نے پوچھا۔ ''مجھے مجرم کیوں کہہ رہے ہو؟ نجو کے گھر واردات کرانے والا سردارا تو پکڑا گیا تھا؟''

وہ بولا۔ ''یہی تو بات ہے جی! سردارا کے خلاف کوئی ثبوت یا گواہ نہیں تھا۔ وہ چھوٹ کر آ گیا تھا۔ اب تو نجو اور اس کی ماں کے بیان کے مطابق تم ہی مجرم ہو۔''

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ اصل مجرم کو چھوڑ دیا گیا، اب پھر مجھے پھانسا جا رہا ہے۔''

''ہم نہیں پھانس رہے ہیں۔ عدالت میں ان کا بیان تسلیم کیا جائے گا جن پر ظلم ہوا ہے۔''

''آپ نجو اور اس کی ماں کو بلاؤ۔ وہ میرے خلاف نہیں بولیں گی۔''

طارق نے کہا۔ ''ابّا! تم نے کبھی نجو کے سر پر محبت اور ہمدردی سے ہاتھ نہیں رکھا۔ وہ کبھی تمہارے حق میں نہیں بولے گی۔''

سلامت علی نے بیٹے سے کہا۔ ''تُو پھر اس بات پر آ رہا ہے کہ میں اس سے ہمدردی کروں۔ اسے اپنی نوں (بہو) بنالوں۔''

اس بات پر دونوں باپ بیٹے مَیں، تُو تُو میں میں،

ہونے لگی۔ بگا نے کہا۔ ''او بزرگو! عقل سے کام لو۔ بیٹا اس کا دیوانہ ہے اور وہ دیوانہ بنانے والی آپ کو الزام سے بری کرا سکتی ہے۔''

سلامت علی نے پریشان ہو کر کہا۔ ''میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ دو چار برسوں کی سزا ہو گی تو جیل چلا جاؤں گا۔ پر جس کی عزت نہیں ہے' اسے اپنے خاندان کی عزت نہیں بناؤں گا۔''

''ابا! بڑھاپے میں تیری مت ماری گئی ہے۔ تُو دو برسوں کے لیے بھی جیل جائے گا تو میں نجو سے بیاہ کرلوں گا۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہو گا۔ تیرے واپس آنے تک بچے بھی ہو جائیں گے۔''

اس بات پر سلامت علی بھڑک گیا۔ کرسی سے اٹھ کر بولا۔ ''میں تجھے گھر سے نکال دوں گا۔ برادری والے بھی تجھ پر تھوتھو کریں گے۔''

''وہ تب بھی تھوکیں گے جب تُو مجرم کہلائے گا اور قید بامشقت کی سزا سنے گا۔''

بگا نے کہا۔ ''عقل تو یہی کہتی ہے' نجو کو بہو بنا کر اس کا منہ بند کرو اور عزت سے رہو۔''

تھانے دار سمجھ گیا تھا کہ وہ بوڑھا کبھی نجو کو بہو نہیں بنائے گا۔ اس لیے وہ باپ بیٹے میں لڑائی کروا کر ٹائم پاس کر رہا تھا۔ دو گھنٹے بعد ہی ایک سپاہی دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے بگا سے کہا۔ ''سر! سلامت چاچا کے گھر واردات ہوئی ہے۔ ڈاکو وہاں سے آئے تھے۔ وہ بشریٰ کو اٹھا کے لے گئے ہیں۔''

یہ سنتے ہی دونوں باپ بیٹے اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ وہاں سے دوڑتے ہوئے جانے لگے۔ بگا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کیپ پہنتے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''چلیں... اب ضابطے کی کارروائی کریں۔ محلے پڑوس والوں کے بیانات لیں۔ دو چار کو مشکوک بنا کر حوالات میں بند کریں۔ ہم تو خدمت گزار ہیں۔ یہی کر سکتے ہیں۔''

وہ تھانے سے باہر آ کر سپاہیوں کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔ فون کے ذریعے اس غنڈے سے رابطہ کیا جسے سردارا کی جگہ استعمال کیا جا رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کام ہو گیا؟''

''آہو جناب! اسے شکارگاہ میں پہنچا دیا گیا ہے۔''

''واردات کے دوران کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟''

''او نہ جناب! ہم سمجھ رہے تھے کہ وہ چیخے گی' چلّائے گی... پر اس نے بندوق کے سامنے چپ چاپ ہاتھ پاؤں بندھوا لیے۔ بس ایک دروازہ توڑ کر اندر گھسنے میں تھوڑا وقت لگا تھا۔ ہم نے فائرنگ کی تو کوئی مقابلے پر نہیں آیا۔''

''شاباش! کامرانی صاحب خوش ہو جائیں گے۔ تمہیں انعام دیں گے۔ میں انہیں اطلاع کر رہا ہوں۔ وہ کسی بھی وقت وہاں آ سکتے ہیں۔''

اس نے فون بند کیا پھر نمبر پنچ کرنے لگا۔ رابطہ ہونے پر کہا۔ ''جنابِ عالی! کام ہو چکا ہے۔ آپ کی چیز شکارگاہ میں پہنچ گئی ہے۔ آپ وہاں کب تک جائیں گے؟''

''تم کہاں ہو؟''

''میں تو بشریٰ کے گھر والوں سے ہمدردی کر رہا ہوں۔ اپنے طور پر تفتیش کرنے جا رہا ہوں۔ ان سے نمٹنے کے بعد حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ اطمینان سے جائیں۔ ہمارے مسلح بندے سادہ لباس میں وہاں پہرا دے رہے ہیں۔''

ابھی معاملات الجھنے والے تھے۔ سردارا جو واردات کرنے والا تھا' وہ پہلے ہو چکی تھی۔ آدھی رات کو وہ دونوں ساتھیوں کے ساتھ ادھر آیا تو ٹاؤن کے باہر ہی اس کے مخبر نے کہا۔ ''کدھر جا رہے ہو؟ تمہاری چڑیا اڑ چکی ہے۔ بستی میں سب ہی لوگ جان گئے ہیں کہ چار ڈاکو آئے تھے، وہ بشریٰ کو اٹھا کے لے گئے ہیں۔''

اس نے حیرانی اور بے یقینی سے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہا ہے؟ ہمارے سوا ایسی واردات کرنے کی جرأت کون کرے گا؟''

وہ بولا۔ ''سب یہی کہہ رہے ہیں' بشریٰ کو تم لے گئے ہو۔ تھانے دار بگا بھی یہی کہتا ہے۔''

''وہ تو دوغلا ہے۔ اپنے باپ کا نہیں ہے... میرا کیا ہو گا؟''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے تمہارے غریب کارندوں کو گرفتار کر رہا ہے۔''

بابے ابلیس نے کہا۔ ''سردارا! یہ تو ہم جیسے بدمعاش جانتے ہیں کہ تھانے دار کی سرپرستی کے بغیر اس کے علاقے میں کوئی واردات نہیں ہوتی۔ اس کم بخت کو ملوم ہو گا کہ بشریٰ کو کون لے گیا ہے؟''

وہ سوچتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ ''یہ کیا چکر ہے؟ جسے ہم اڑانا چاہتے تھے، اسے کوئی دوسرا اڑا کے لے گیا ہے۔ ہمارے ٹاؤن میں کئی خوبصورت کڑیاں ہیں۔ فیر بشریٰ ہی کو کیوں اٹھایا گیا ہے؟''

وہ بابے کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''تُو ٹھیک کہتا ہے۔ اس کمینے تھانے دار سے ملوم ہو سکتا ہے کہ بشریٰ ابھی کہاں ہو گی؟''

بشارت نے پوچھا۔ ''تے فیر کی ارادے نیں...؟''

سردارا نے کہا۔ ''میں ان کے ارادے اچھی طرح سمجھ

گیا ہوں۔ کامرانی صاب کبھی میری گرفتاری نہیں چاہیں گے۔ ایسا ویلا آنے سے پہلے ہی مجھے مار ڈالیں گے اور وہ یہ کام بگا سے لیں گے۔''

وہ چپ ہو کر سوچنے لگا۔ بابے نے کہا۔ ''بگا نہیں رہے گا تو کامرانی صاب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ تم سے خوف زدہ رہیں گے۔''

''آہو! اصل چیز خوف ہے۔ شیر بھی نرغے میں آجائے تو خوف کے مارے جھاڑیوں میں چھپتا پھرتا ہے۔ ہم بھی چھپتے پھر رہے ہیں۔ کامرانی صاب کی بھی یہی حالت ہوگی۔''

اس نے مخبر سے کہا۔ ''تُو تھانے کی طرف جا۔ میں کامرانی صاب کی کوٹھی کے سامنے نہیں چھپا رہوں گا۔ بگا ادھر آئے گا تو اس سے نمٹ لوں گا۔ اگر وہ تھانے میں آئے تو مجھے خبر دینا۔ وہی ہمیں بشریٰ کے بارے میں بہت کچھ بتا سکے گا۔''

مخبر وہاں سے چلا گیا۔ سردارا اپنے ساتھیوں کے ساتھ کوٹھی کے قریب آگیا۔ مخبر کے ذریعے معلوم ہوا تھا کہ کامرانی کسی وجہ سے اسلام آباد نہیں گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد کوٹھی کا مالی ایک چادر لپیٹے کھانستا ہوا احاطے کے گیٹ سے باہر آیا پھر ایک طرف جانے لگا۔ آگے جا کر سردارا اور اس کے ساتھیوں نے اسے گھیر لیا۔

ایک نے پوچھا۔ ''اتنی رات کو کدھر جا رہے ہے؟''

اس نے گھبرا کر انہیں دیکھا پھر کہا۔ ''مینوں ہتھ لا کے دیکھو... بخارا ہے۔ کھانس رہا ہوں۔ اسپتال سے دوا لینے جا رہا ہوں۔''

''کیا جناب عالی کوٹھی میں ہیں؟''

''نہیں... ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنی گڈی میں کدھرے گئے نیں۔''

سردارا نے حیرانی سے پوچھا۔ ''ایس ویلے...؟''

بابے نے کہا۔ ''فیصل آباد گئے ہوں گے۔''

مالی نے کہا۔ ''اونہیں نہیں۔ اتنی دور جاتے تو محافظوں کو نال لے کے جاتے۔ وہ تو کلّے (اکیلے) گئے ہیں۔''

بابے نے کہا۔ ''کلّا (اکیلا) تے شیطان کدھرے جاتا ہے... وہ کہاں گیا ہوگا؟''

بشارت سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ''کوئی لمبا چکر چل رہا ہے۔''

سردارا نے کہا۔ ''کیا چکر ہے؟ یہ تو بگا جیسا شیطان ہی بتائے گا۔ چلو... چلو ادھر سے...''

وہ وہاں سے چلتے ہوئے تھانے کی طرف آگئے۔ ایسے وقت بگا سپاہیوں کے ساتھ اپنی جیپ میں وہاں پہنچ گیا۔ بابے اور بشارت چھپ چھپ کر تھانے کے اندر جھانکتے ہوئے معلومات حاصل کرنے لگے۔ پھر سردارا کے پاس آکر بولے۔ ''اندر آٹھ سپاہی ہیں۔ تین مسلح ہیں۔ حوالات میں ہمارے کارندوں کو بند کیا گیا ہے۔''

وہ تینوں تاریکی میں چھپتے ہوئے تھانے کے بیرونی دروازے پر آئے۔ وہاں دو سپاہی موجود تھے۔ انہوں نے ان پر حملہ کر کے ہتھیار چھین لیے۔ بگا اپنی کرسی پر بیٹھا لاک اپ کی طرف دیکھتے ہوئے کارندوں سے کہہ رہا تھا۔ ''تم میں جو سردارا کا پتا بتائے گا، اسے رہائی بھی ملے گی اور انعام بھی ملے گا۔''

سردارا نے اندر آتے ہی ایک مسلح سپاہی کو گولی مار کر زخمی کیا۔ بگا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکالنا چاہتا تھا۔ سردارا نے اس کی کرسی پر گولی مارتے ہوئے کہا۔ ''دوسری گولی تمہیں لگے گی بگا صاب...!''

وہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟ ہم تو یار بیلی ہیں۔ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔''

''جب فون پر ملاقات طے ہو گئی تھی، کامرانی صاب بھی آنے والے تھے تو ان بے چاروں سے میرا پتا کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''وہ... وہ میں تم سے اکیلے میں ملنا چاہتا تھا۔''

''اچھا جی۔ تو مجھ سے ملنے کے لیے ان کارندوں کو رہائی کا اور انعام کا لالچ دے رہے ہو؟''

''اس لیے کہ لالچ کے بغیر مجھے کوئی تمہارے پاس نہ پہنچاتا۔''

''چلو، میں آگیا ہوں۔ اب بولو... کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

بشارت نے پاس آکر اس کے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔ وہ بولا۔ ''سردارا! یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔''

''میرے لیے اچھے رہو گے تو زندہ رہو گے۔ مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ یہ بتاؤ بشریٰ کہاں ہے؟''

''یہی معلوم کرنے کے لیے تم سے ملنا چاہتا تھا۔''

سردارا نے فائر کیا۔ گولی بگا کے سامنے میز کی سطح سے لگ کر دوسری طرف چلی گئی۔ اس نے بڑی سفاکی سے پوچھا۔ ''کیا حرام موت مرنا چاہتے ہو؟ سچ بولو! میری عقل کہتی ہے کہ تم نے اسے اغوا کرایا ہے۔ وہ شکارگاہ میں ہے اور کامرانی صاب اتنی رات کو وہیں گئے ہیں۔''

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''کیسی باتیں کرتے ہو؟ کامرانی صاحب اتنی رات کو باہر نہیں نکلتے۔ پتا نہیں بشریٰ کو

کس نے...''

بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دھیرے دھیرے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک گولی اس کے شانے کی ہڈی کو توڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔

بابے البیلے نے کہا۔ ''اوئے تھانے دارا! اب بھی سچ نہیں بول سکتا ہے۔ سچ بول دے۔''

سردارا نے اسے نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر بتا دے کیا کامرانی صاب شکارگاہ میں ہیں؟''

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ سردارا نے کہا۔ ''مجھے تمہارے جھوٹ سچ پر اعتبار نہیں ہے۔ فوراً کامرانی صاب سے بات کراؤ۔''

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے ریسیور اٹھانا چاہتا تھا۔ سردارا نے کہا۔ ''رک جاؤ۔ موبائل فون سے بات کرو۔''

اس نے بے بسی سے دیکھا۔ پھر میز پر رکھے ہوئے فون کو اٹھا کر نمبر پنچ کرنے لگا۔ دوسری طرف دیر تک بیل جاتی رہی پھر کامرانی کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو! کیا بات ہے؟ بولو...!''

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ ''جنابِ عالی! سردارا میرے سامنے ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

سردارا نے اس سے فون چھین کر کان سے لگایا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ ''تمہیں کیا ہوا ہے؟ میں کراہنے کی آوازیں سن رہا ہوں؟''

''آپ درست سن رہے ہیں۔ ابھی یہ زخمی ہوا ہے۔ اگر میرا مطالبہ پورا نہ کیا گیا تو اس کے ساتھ آپ کی بھی نمازِ جنازہ پڑھائی جائے گی۔''

''تمہارا مطالبہ کیا ہے؟''

''مجھے اور میرے ساتھیوں کو ابھی اپنی گاڑی میں پشاور لے جاؤ گے اور سرحد پار کراؤ گے۔''

''مجھے منظور ہے۔ ابھی شکارگاہ میں چلے آؤ۔''

''آتو رہا ہوں... پر یاد رکھو ایک ذرا بھی چالاکی دکھاؤ گے تو میں تمہاری لاش گرائے بغیر نہیں مروں گا۔ اچھی طرح سوچ لو... میں آرہا ہوں۔''

اس نے فون بند کر کے ساتھیوں سے کہا۔ ''اپنے کارندوں کو لاک اپ سے نکالو۔''

پھر اس نے بگا کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے جیسے پولیس والوں کی یہی کم بختی ہوتی ہے، کبھی قانون کے پھندے میں نہیں آتے۔ اپنے ہی پالتو بدمعاشوں کے ہاتھوں مارے جاتے ہو۔''

یہ کہتے ہی اس نے دو فائر کیے۔ وہ کرسی سے گر کر فرش پر پہنچا پھر وہیں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

☆☆☆

شوکت علی کامرانی کی ہوس پوری ہونے والی تھی۔ جس کا رشتہ دینے سے انکار کیا گیا تھا، وہ اس کی عزت کی دھجیاں اڑانے والا تھا۔ یہ طے پایا تھا کہ جب تک دل نہیں بھرے گا، تب تک وہ ہوس کا کھیل جاری رکھے گا۔ اس کے بعد اسے بگا کے حوالے کر دے گا۔ پھر اس کی لاش کسی کو نہیں ملے گی۔

وہ اپنی شکارگاہ میں پہنچا۔ احاطے کے گیٹ پر دو مسلح بندے پہرا دے رہے تھے۔ انہوں نے بڑے آہنی دروازے کو کھول کر سیلیوٹ کیا۔ وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا عیش کدے کے بیرونی دروازے کے سامنے آگیا۔ وہاں بھی دو مسلح افراد نے اسے سیلیوٹ کیا۔ سلطان بگا نے اس کی سیکیورٹی کے لیے خاطر خواہ انتظامات کیے تھے۔ وہ کار سے اتر کر فاتحانہ انداز میں چلتا ہوا چار دیواری کے اندر آیا۔ کوئی اسے روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔

خواب گاہ کا دروازہ بند تھا مگر مقفل نہیں تھا۔ وہ اسے کھول کر اندر نہیں گیا۔ وہیں رُک کر مسکراتے ہوئے مونچھوں پر تاؤ دینے لگا۔ بیڈ کے سرے پر بشریٰ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی۔

وہ قریب آتے ہوئے بولا۔ ''آرام سے بیٹھو۔ اب تو تمہیں اسی چار دیواری میں جینا اور مرنا ہے۔''

وہ سہمی ہوئی سی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''شوکت کامرانی صاحب! آپ مجھ سے دشمنی کیوں کر رہے ہیں؟''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''میں تو دوستی اور رشتے داری چاہتا تھا۔ دشمنی تمہارے باپ نے کی ہے۔ مجھ سے پہلے سردارا تمہیں طلب کرنے گیا تھا۔ سلامت علی نے صاف کہہ دیا کہ تمہارا رشتہ دارا شکوہ سے طے ہو چکا ہے۔ تمہاری شادی خاندان سے باہر نہیں ہوگی۔ پھر میں تمہارا طلب گار بن گیا۔''

وہ قریب آکر اس کے رخسار کو چھوتے ہوئے بولا۔ ''تم ایسی سوہنی ہو کہ تمہیں دیکھتے ہی رال ٹپکنے لگتی ہے۔''

بشریٰ اس کے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے ایک قدم پیچھے چلی گئی۔ وہ بولا۔ ''پھر میں نے سوچا 'بانس نہیں رہے گا تو بانسری بھی نہیں بجے گی۔ نہ دارا شکوہ رہے گا' نہ تمہارا باپ مجھے جنوائی بنانے سے انکار کرے گا۔ اس لیے میں نے تمہارے منگیتر کو ہمیشہ کے لیے اوپر پہنچا دیا۔''

اس نے گھور کر پوچھا۔ ''کیا آپ نے دارا شکوہ کو قتل

کیا تھا؟''

''ایسے کام سردارا میرے لیے کرتا ہے۔ اس نے میری مشکل آسان کردی۔ پھر بھی تمہارے باپ نے یہ کہہ کر میری توہین کی۔ مجھے غصہ دلایا کہ وہ تمہاری جوانی کو فرمان اکبر کی جھولی میں ڈالنے والا ہے۔''

وہ بولی۔ ''اور تم نے توہین برداشت نہیں کی۔ مجھے بازاری چیز سمجھ کر میرے گھر سے اٹھوالیا۔ اپنی اس شکارگاہ میں لے آئے۔ اس کا مطلب ہے' تم ہی نے سردارا کو قانون کی نظروں سے چھپا رکھا ہے؟ اسی سے یہ واردات کرائی ہے؟''

''او نہ نہ۔ وہ کتا تو کہیں لُک چھپ گیا ہے۔ یہ واردات تو میں...''

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''خوامخواہ پولیس والوں کی طرح سوالات نہ کرو۔ آؤ... میری آغوش میں آجاؤ۔''

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا چاہتا تھا۔ بشریٰ نے زوردار طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''کتے... کمینے! جا کر اپنی ماں کو آغوش میں لے۔ سوالات اس لیے کررہی ہوں کہ یہاں جوابات کی ریکارڈنگ ہورہی ہے۔''

وہ اس توہین کو بھول گیا کہ ایک لڑکی نے طمانچہ مارا ہے۔ ایک دم سے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سامنے ہی بیڈ پر بڑا سا ٹیپ ریکارڈر رکھا ہوا تھا۔ وہ فوراً ہی ادھر لپکا۔ اس ریکارڈر میں سے کیسٹ نکال کر اسے ضائع کرنا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت پیچھے سے ایک لات پڑی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے جاتا ہوا اوندھے منہ گر پڑا۔ پھر غصے سے پلٹ کر دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ سامنے فرمان اکبر کھڑا ہوا تھا۔

وہ فرش سے اٹھنا چاہتا تھا۔ فرمان نے منہ پر ایک ٹھوکر ماری۔ وہ پھر گر پڑا۔ اس کی باچھوں سے لہو رسنے لگا تھا۔ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''یہ... یہ تم اچھا نہیں کررہے ہو۔ میرے اعلیٰ مرتبے کا لحاظ کرو۔ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔''

''ابھی تو معمولی آدمی تم سے افضل اور برتر ہے... کیونکہ وہ تمہاری طرح لات جوتے نہیں کھا رہا ہے۔ کیا حیثیت ہے تمہاری؟ نالی کے کیڑے کی طرح فرش پر پڑے ہو۔''

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ فرمان نے کہا۔ ''ہاں سوچو... تمہارے پالتو غنڈے مدد کے لیے کیوں نہیں آرہے ہیں؟''

اس نے پھر کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔

فرمان نے کہا۔ ''تم سپاہیوں کو نہیں پہچانتے اس لیے دھوکا کھا گئے۔ غلط فہمی میں مبتلا ہوکر یہاں چلے آئے۔ باہر بگا کے نہیں، میرے ماتحت کھڑے ہیں۔''

وہ فرش پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''مجھ سے سمجھوتا کرلو۔ جتنی رقم چاہوگے ملے گی۔''

''تم مجھے کتنی رقم دے کر خرید سکتے ہو؟''

''جو مانگوگے دوں گا۔ پانچ لاکھ... دس لاکھ!''

''صحیح بولی لگاؤ۔ ہماری باتیں ریکارڈ ہورہی ہیں۔''

اس نے گھبرا کر ٹیپ ریکارڈر کی طرف دیکھا۔ فرمان نے کہا۔ ''میں بول رہا ہوں، تم سنو۔ میں تمہارے ٹاؤن سے نہیں گیا تھا، جانے کا ڈراما کیا تھا تاکہ تم سب کو کھل کر کھیلنے کے لیے کھلا میدان مل جائے۔ میرا خیال تھا' سردارا تم سے اور بگا سے ملنے آئے گا۔ بشریٰ اور شنو کی مخبری سے منشیات کا دھندا چوپٹ ہوگیا ہے۔ اسے فرار ہونا پڑا۔ مجھے یقین تھا' وہ مخبری کرنے والیوں سے انتقام لینے ضرور آئے گا۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''اور ایسا ہی کچھ ہوا۔ جب اغوا کرنے والے میرے گھر کا دروازہ توڑ رہے تھے تو میں نے فون پر فرمان کو اطلاع دی تھی۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ میں راضی خوشی مجرموں کے ساتھ چلی جاؤں۔''

فرمان نے کہا۔ ''میں سمجھ رہا تھا' سردارا واردات کرنے آیا ہے۔ میں اس کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک پہنچا تو پتا چلا' تم نے کسی دوسرے بدمعاش کی خدمات حاصل کی ہیں۔ وہ نیا بدمعاش اپنے ساتھیوں سمیت ہماری حراست میں ہے۔''

کامرانی نے ریکارڈر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پلیز! اسے بند کردو۔''

اسی وقت کھٹ کی آواز کے ساتھ ریکارڈر رک گیا۔ بشریٰ نے کہا۔ ''ایک سائیڈ پوری ریکارڈ ہوچکی ہے۔ میں سائیڈ بدل رہی ہوں۔''

کامرانی نے جلدی سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''خدا کے لیے میری بات مانو۔ اسے آن نہ کرو۔ کسی بھی شرط پر مجھ سے سمجھوتا کرلو۔''

''تم یہی کہتے رہوگے اور میں انکار کرتا رہوں گا۔ جب تمہارے خلاف قانونی کارروائی شروع کروں گا تو یقین کرلوگے کہ میں پتھر ہوں۔ مجھے بڑے سے بڑا لالچ دے کر پگھلا نہیں سکوگے۔''

وہ پریشان تھا۔ یہ یقین ہورہا تھا کہ فرمان کے شکنجے سے نکل نہیں پائے گا۔ اس نے کہا۔ ''کم از کم ایک بات مان لو۔ مجھے بگا سے فون پر بات کرنے دو۔''

''ہُوں۔ مجھے اس سے بھی نمٹنا ہے۔ تم اسے اپنے موجودہ حالات نہیں بتاؤگے۔ اسے یہاں بلاؤگے اور باتیں کروگے۔ فون پر میری مرضی کے خلاف کچھ بولوگے تو میں...''

''میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گا۔ زیادہ باتیں نہیں کروں گا۔''

ایسے ہی وقت اس کے فون سے ٹون سنائی دینے لگی۔ فرمان نے آگے بڑھ کر اس کی جیب سے فون نکال لیا۔ اسکرین پر سلطان بگا کا نام دکھائی دے رہا تھا۔ وہ فون اسے دیتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری خواہش پوری ہورہی ہے۔ بگا سے زیادہ بات نہ کرنا۔ اسے فوراً یہاں آنے کو کہو۔''

وہ بٹن دبا کر فون کو کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''ہیلو! کیا بات ہے؟ بولو...!''

ادھر سے بگا کی کراہتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ کامرانی سے بول رہا تھا کہ سردارا اس کے سامنے ہے اور اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ پھر چند لمحوں بعد سردارا کی آواز سنائی دی۔ معلوم ہوا' اس نے بگا کی پٹائی کی ہے۔ وہ بگا کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ ابھی وہ زخمی ہوا ہے۔ اگر اس کا مطالبہ پورا نہ ہوا تو بگا کے ساتھ اس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھائی جائے گی۔ پھر اس نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

فرمان نے فون کا اسپیکر آن رکھا تھا، اس لیے وہ تمام باتیں سن رہا تھا۔ اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے کامرانی سے کہا۔ ''اس سے کہو' مطالبہ پورا کیا جائے گا۔ اسے ابھی یہاں بلاؤ۔''

کامرانی نے سردارا سے یہی کہا۔ سردارا نے جواب دے کر فون بند کردیا۔ ادھر فرمان نے کامرانی کا فون اپنی تحویل میں لے کر ایک ماتحت کو بلا کر کہا۔ ''سردارا ابھی یہاں پہنچنے والا ہے۔ یقیناً اس کے ساتھ مسلح ساتھی بھی ہوں گے۔ انہیں بہت سوچ سمجھ کر ٹریپ کرنا ہے۔''

پھر وہ پلاننگ کرنے لگے۔ دوسرے ماتحتوں کو بھی بلا لیا گیا۔ ان سب نے سمجھ لیا کہ آنے والوں سے کس طرح نمٹنا ہے۔ کامرانی فرش پر بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے وہاں سے اٹھنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس کی ایسی تذلیل ہورہی تھی۔ وہ اس وقت فرمان کے رحم و کرم پر تھا۔

اسے یقین تھا کہ وقتی طور پر یہ ذلت برداشت کرلے گا تو بعد میں فرمان اسے دوسرے افسران کے حوالے کردے گا۔ پھر وہاں سے نجات حاصل کرنے کے بعد ہی وہ فرمان کے خلاف کچھ کرسکے گا۔ وہ اقتدار کی اونچی کرسی پر بیٹھنے والا فی الحال زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔

فرمان کے ماتحت جاچکے تھے۔ اس نے بشریٰ سے کہا۔ ''تم دوسرے کمرے میں جا کر دروازہ اور کھڑکی بند کرلو۔ جب تک میں آواز نہ دوں' دروازہ نہ کھولنا۔''

وہ وہاں سے چلی گئی۔ وہ کامرانی سے بولا۔ ''تم بہت شہ زور ہو۔ یہ ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ تمہارے جیسے چند شہ زوروں نے پوری قوم کو کمزور بنا رکھا ہے۔ ساٹھ برس گزرنے کے بعد بھی ایسے آثار نظر نہیں آتے کہ کبھی قانون کی حکمرانی ہوگی اور انصاف غریب کی دہلیز تک پہنچے گا۔''

وہ ٹہلنے کے انداز میں ادھر سے اُدھر جاتے ہوئے بولا۔ ''تم لوگ صرف اس لیے طاقتور ہو کہ تمہارے پاس دولت' سیاسی مکاری اور مسلح گارڈز ہیں۔ انہی کے بل بوتے پر تم اقتدار کا ننگا ناچ ناچتے ہو۔ یہ تین چیزیں چھین لی جائیں تو تم مٹی کے کیڑے بن جاؤگے۔ جیسے ابھی کیڑے کی طرح زمین پر بیٹھے ہوئے ہو۔''

وہ ایک جگہ رک کر بولا۔ ''سہ زوری... یعنی تین قوتیں... دولت' سیاسی مکاری اور مسلح فورس... یہی سہ زوری تمہیں شہ زور بناتی ہے۔ مرنے کے بعد کچھ نہیں رہتا۔ آج مرنے سے پہلے تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔''

اس کے ماتحت نے فون پر اطلاع دی۔ ''سر! وہ تینوں بڑے محتاط انداز میں چھپتے ہوئے آرہے ہیں۔ اس شکارگاہ کا جائزہ لے رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آرہا ہوں۔''

اس نے کامرانی سے کہا۔ ''اس کھڑکی کے باہر میرا ایک گن مین ہے۔ تم اس کے نشانے پر رہوگے۔ ٹیپ ریکارڈر کو بند نہیں کروگے اور سردارا سے کھل کر باتیں کروگے۔''

وہ ریکارڈر کو آن کرکے خواب گاہ سے باہر چلا گیا۔ کامرانی نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک گن مین موجود تھا۔ اس نے ایک ریوالور کامرانی کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ ''اس میں صرف ایک گولی ہے۔ اسے اپنے بچاؤ کے لیے استعمال کرسکتے ہو۔''

وہ پریشان ہوکر بولا۔ ''سردارا کے ساتھ اس کے مسلح ساتھی بھی ہوں گے؟''

اسے جواب نہیں ملا۔ کھڑکی بند ہوگئی۔ باہر حدِ نظر تک تاریکی تھی۔ صرف شکارگاہ کی چار دیواری میں ایک کمرا اور کوریڈور روشن تھا۔ وہ تینوں ایک جگہ رک گئے۔ ایک نے کہا۔ ''باہر کامرانی صاحب کے گارڈز یا ملازم نہیں ہیں۔ اندر ایسی

خموشی ہے جیسے وہاں کوئی نہ ہو۔"

سردارا فون نکال کر کامرانی سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اسی لمحے وہ تینوں اسپاٹ لائٹ کی روشنی میں نہا گئے۔ انہوں نے ایک دم سے اچھل کر اپنی گنیں سنبھالیں۔ روشنی کے دائرے سے باہر جانا چاہا مگر تڑاتڑ گولیوں کی بوچھاڑ نے بشارت اور بابے کو اوندھے منہ گرا دیا۔

سردارا نے فوراً ہی گن پھینک کر چیختے ہوئے کہا۔ "میں نہتا ہوں۔ گولی نہ چلاؤ۔"

فائرنگ بند ہو گئی۔ سردارا کو فون کا بزر سنائی دیا۔ اس نے جیب سے فون نکال کر بٹن دباتے ہوئے کان سے لگایا۔ "ہیلو...!"

فرمان کی آواز سنائی دی۔ "کامرانی صاحب انتظار کر رہے ہیں۔ اندر جاؤ۔"

وہ بولا۔ "سر! میں گرفتاری پیش کر رہا ہوں۔ آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں..."

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "شٹ اپ۔ اندر جاؤ گے یا یہیں مرو گے؟ کم آن... اندر جاؤ۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا عیش کدے کے بیرونی دروازے پر آیا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے کوریڈور میں آ کر لباس کے اندر سے ریوالور نکال لیا۔ مرنا تو تھا ہی مگر وہ دو چار کو مار کر مرنا چاہتا تھا۔ سامنے خواب گاہ کا دروازہ ایک ذرا سا کھلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں سے کامرانی کی آواز سنائی دی۔ "آ جاؤ... میں تمہارا مطالبہ پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

وہ بولا۔ "آپ باہر آئیں۔"

فون کا بزر سنائی دیا۔ اس نے اسے کان سے لگا کر سنا۔ فرمان نے سخت لہجے میں کہا۔ "وقت برباد نہ کرو۔ اندر جاؤ۔"

وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "نہ جاؤں تو کیا فرق پڑے گا؟ وہاں بھی موت ہے... یہاں بھی موت!"

فون بند ہو گیا۔ چند لمحوں بعد پھر تڑاتڑ کی آوازوں کے ساتھ گولیاں چلنے لگیں۔ وہ گولیاں اس کے قدموں کے پاس فرش پر لگ رہی تھیں۔ ان سے بچنے کے لیے وہ باہر نہیں جا سکتا تھا۔ دوڑتا ہوا خواب گاہ میں آ گیا۔ شکار کو اسی طرح ہانکتے ہوئے صحیح ٹارگٹ تک پہنچایا جاتا ہے۔

کامرانی بیڈ کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ دروازے کی طرف نشانہ لگائے بیٹھا تھا۔ ایک ہی گولی تھی جو اسے زندگی... اور دشمن کو موت دے سکتی تھی۔

سردارا جیسے ہی اندر آیا، اس نے بڑی مہارت اور ہوشیاری سے ٹریگر دبایا۔ اکلوتی گولی کام آ گئی اور سردارا کے سینے میں جا کر پیوست ہو گئی۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی زمین بوس ہو گیا۔

کامرانی کو جیسے نئی زندگی مل گئی تھی۔ وہ بیڈ کے پیچھے سے نکل کر تیزی سے چلتا ہوا سردارا کے ریوالور کی طرف آیا۔ وہ اسے اٹھانا چاہتا تھا مگر اٹھا نہ سکا۔ ایک گولی اس کے ہاتھ پر آ کر لگی۔ وہ پیچھے چلا گیا۔ فرمان کو دیکھنے لگا۔ فرمان نے جھک کر سردارا کا معائنہ کیا۔ اس میں جان تھی۔ وہ زندہ رہنے کے لیے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

فرمان نے اسے سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "اپنا ریوالور اٹھاؤ۔ تم میں اتنی جان ہے کہ انتقام لے سکتے ہو۔"

کامرانی نے سہم کر پیچھے ہٹتے ہوئے پوچھا۔ "یہ... یہ کیا کہہ رہے ہو؟ یہ کیا کر رہے ہو؟"

"مجھے یہ کرنا ہوگا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہارے خلاف جو ثبوت جمع کیے ہیں، انہیں عدالت تک پہنچنے سے پہلے ہی ضائع کر دیا جائے گا۔ شیطان کبھی نہیں مرتا۔ تمہارے جیسے سیاست دان بھی نہیں مرتے۔ یہاں سہ زوری... یعنی تین طاقتوں میں سے ایک طاقت تو گئی۔ کسی بھی سیاسی مکاری سے کام نہیں لے سکو گے۔ اسلحے کی قوت بھی تمہارے پاس نہیں ہے، تمہارے کارندے کے پاس ہے۔"

سردارا کا دم نکل رہا تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ریوالور کو اٹھا لیا۔ فرمان نے کہا۔ "یہ سردارا تمہارا سب سے بڑا اور مضبوط ہتھیار تھا۔ بندہ کبھی کبھی اپنے ہی ہتھیار سے مارا جاتا ہے۔"

اس نے سردارا کا ریوالور والا ہاتھ تھام لیا۔ ایسے میں نشانہ نہیں چوک سکتا تھا۔

موت کے گونجتے ہوئے اعلان کی طرح ایک گولی چلی...

شہ زور اچھل کر فرش پر گرا... پھر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

ادھر سردارا ریوالور پر اپنی انگلیوں کے نشانات چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا تھا۔

فرمان وہاں سے چلتا ہوا دوسرے کمرے کے دروازے پر آیا۔ پھر دستک دیتے ہوئے بولا۔ "دروازہ کھولو بشریٰ! انصاف کی صبح ہو رہی ہے۔"

☆

تیسرے درجے کے ایک ڈائریکٹر کی کامیابیوں کے خواب - ایک روز اچانک اسے ایک غیر معمولی کہانی مل گئی - کہانی لانے والا ایک معمولی مصنف تھا مگر یہ اہم نکتہ وہ ڈائریکٹر نظر انداز کر بیٹھا!

لبِ بام

آصف ملک

براؤن ایڈورڈ فلم پروڈیوسر اور ڈائریکٹر تھا مگر وہ ذاتی حیثیت میں یہ کام نہیں کرتا تھا بلکہ گزشتہ بیس سال سے ایک فلم اسٹوڈیو سے منسلک تھا۔ بیس سال میں اس نے کوئی سو کے لگ بھگ فلمیں تخلیق کی تھیں مگر ان میں سے سوائے ایک دو کو چھوڑ کر باقی سب عام سی بلکہ تھکی ہوئی موویز تھیں۔ براؤن کے خیال میں قصور اس کی صلاحیتوں کا نہیں تھا۔ اسے وسائل ملتا تو وہ اعلیٰ درجے کی معیاری فلمیں بھی بنا سکتا تھا۔ قصور اسٹوڈیو کی انتظامیہ کا تھا جس نے اسے ایک مخصوص شعبہ دے رکھا تھا۔ وہ خانہ پُری کے لیے سال میں پانچ چھ فلمیں بناتا تھا۔ اسے ایک خاص بجٹ سے اوپر فلم بنانے کی اجازت نہیں تھی اور اتنے بجٹ میں ایسی فلمیں ہی بن سکتی تھیں۔ دراصل اسٹوڈیو ابھی تک پرانے انداز میں کام کر رہا تھا۔ فلم سازی کے لیے اس کے تین شعبے تھے۔ ایک میں اعلیٰ درجے کی حامل موضوعات پر مبنی فلمیں تخلیق کی جاتی تھیں، اس شعبے کا بجٹ لامحدود تھا۔ دوسرے شعبے میں تھرلز اور سسپنس پر مبنی اچھی فلمیں بنائی جاتی تھیں۔ اس شعبے کو اچھا بجٹ ملتا تھا جبکہ تیسرے شعبے میں محض اس لیے فلم سازی کی جاتی تھی کہ امریکا بھر میں پھیلے اسٹوڈیو مالکان کے ہزاروں سینماؤں کو فلمیں ملتی رہیں۔ اس شعبے میں بجٹ محدود تھا اور گھٹیا قسم کی تھرلز موویز یا سستی قسم کی جنسی جذباتیت پر مشتمل فلمیں بنائی جاتی تھیں جن میں کوئی بڑا اسٹار اس وقت کام کرنے کے لیے تیار ہوتا تھا جب وہ زوال کے بدترین دور سے گزر رہا ہو۔

ورنہ عام طور سے نئے سامنے آنے والے اداکاروں اور ایکسٹراز کی مدد سے کام چلانا پڑتا تھا۔

براؤن نے جب بیس سال پہلے اسٹوڈیو میں نوکری کی تو اس کی اولین فلم کے بعد ہی ڈائریکٹرز نے اس کے بارے میں فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ سستی اور گھٹیا ہوئی موویز کے شعبے کے لیے موزوں ہے... اوران کی یہ رائے آج تک نہیں بدلی تھی حالانکہ اس نے کئی بار کم بجٹ کے باوجود اچھی فلمیں بنا کردی تھیں جنہوں نے کاروبار بھی اچھا کیا تھا۔ براؤن کی ایک فلم نے تو گولڈن جوبلی بھی منائی تھی۔ اسے اتفاق سے ایک اچھا اسکرپٹ مل گیا تھا جس میں زیادہ اور منجھے ہوئے اداکاروں کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے اسے فلمایا بھی چابکدستی سے تھا۔ یہ ڈریکولا کے پُراسرار موضوع پر بننے والی فلم تھی۔ اس سے پہلے جب بھی اس موضوع پر فلم بنائی گئی تھی، اس میں ڈریکولا کو سب سے الگ تھلگ اور ایک کاسٹیوم قسم کا کردار دکھایا گیا تھا جس کا عام انسانوں سے صرف اتنا تعلق تھا کہ وہ ان کا خون پینے پر تلا رہتا تھا۔

براؤن نے اس موضوع کو منفرد انداز میں فلمایا جس میں ڈریکولا کو خون پینے کی جبلت کے باوجود انسانی معاشرے کا ایک حصہ دکھایا گیا تھا۔ اسے مجبور اور حریص بتایا گیا تھا۔ فلم نے اچھا بزنس کیا تھا لیکن یہ فلم بینوں کے ذہن پر کوئی دیرپا تاثر نہ چھوڑ سکی۔ البتہ براؤن کا یہ موضوع دوسرے فلم سازوں کو بھا گیا جن کے پاس وسائل بھی تھے اور تکنیک بھی... انہوں نے اس موضوع پر بلاک بسٹر موویز بنائیں... اور براؤن جس نے یہ موضوع دیا، اسے سب نے فراموش کردیا۔ اس وقت براؤن نے اسٹوڈیو انتظامیہ کو تجویز دی تھی کہ وہ اس موضوع پر سیریز میں فلمیں بنا سکتے ہیں مگر اس کے آئیڈیے پر کوئی توجہ نہیں دی گئی اور یہ تجویز بھی دوسرے لے اڑے جنہوں نے ڈریکولا کے موضوع پر متواتر فلمیں بنا کر بے پناہ شہرت اور دولت کمائی۔ بلیڈ اور انڈر ورلڈ اس کی مثال ہیں۔ براؤن دوسروں کو دولت مند اور مشہور ہوتے دیکھ کر جلتا کڑھتا رہا۔ اس کے خیال میں اس صورتِ حال کی ذمے داری اسٹوڈیو انتظامیہ پر عائد ہوتی تھی جو ابھی تک پرانے طریقوں سے چمٹی ہوئی تھی اور مقابلے کے اس دور میں بھی خود کو تبدیل کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

براؤن ان دنوں دو فلموں پر کام کررہا تھا۔ ایک بچکانا قسم کے موضوع پر تھی جس میں عجیب و غریب درندے کسی دوسری دنیا سے آکر انسانوں پر حملے کرتے ہیں۔ ان میں درندوں کے جو پٹ تھے، ان کا معیار اتنا گھٹیا تھا کہ وہ صاف کھلونے دکھائی دیتے تھے۔ براؤن نے خاصا شور کیا کہ ذرا بہتر قسم کے پٹ دیے جائیں مگر اسے بتایا گیا کہ اس میں پٹ بنانے والی کمپنی کو جتنی ادائیگی کی گئی تھی، اس میں ایسے ہی کھلونے تیار ہوسکتے تھے۔ دوسری فلم احمقانہ تھی۔ میں ایک نفسیاتی مریض کو لوگوں کا قتلِ عام کرتے دکھانا تھا جو کسی پاگل خانے سے فرار ہو جاتا ہے۔ فلم میں کہانی نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ ایسی فلمیں بناتے ہوئے براؤن کا دل کڑھتا تھا۔

دونوں فلموں کی شوٹنگ بھی بہ یک وقت چل رہی تھی اور ان کے لیے اسٹوڈیو کے سب سے معمولی فلورز اسے دے گئے تھے۔ جیسے تیسے وہ شوٹنگ بھگتا کر آیا تو اس کے دفتر میں ایک ہونق سا نوجوان بیٹھا تھا۔ براؤن اسے اچھی طرح جانتا تھا، اس لیے اسے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ناگواریت کا احساس ابھرنے لگا۔ نوجوان کا نام ایکس شا تھا۔ اصل نام کچھ اور تھا مگر وہ خود کو ایکس شا کہتا تھا۔ وہ اسکرپٹ لکھ کرلاتا تھا اور براؤن کو رضامند کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ ان پر فلمیں بنائے۔ اس کے اسکرپٹ اتنے تھکے ہوئے اور بکواس ہوتے تھے کہ براؤن بھی ان پر فلمیں بنانے کو تیار نہیں تھا، اس لیے وہ اسے جیسے تیسے ٹال دیا کرتا تھا۔

ایکس شا میں فلمی کہانیاں اور اسکرپٹ لکھنے کی صلاحیت ہو یا نہ ہو مگر اس میں ایک خوبی تھی... اور وہ تھی اس کی مستقل مزاجی! وہ ہر دوسرے تیسرے مہینے ایک عدد اسکرپٹ بغل میں دبائے آجاتا اور براؤن کا سر کھاتا تھا۔ اپنے اسکرپٹ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا تھا، اس لیے براؤن کو اس سے وعدہ کرنا پڑتا تھا کہ وہ اسکرپٹ ضرور دیکھے گا۔ یہ اور بات تھی کہ وہ چند صفحے پڑھ کر اسے اپنی سیکریٹری کے حوالے کردیتا تھا کہ وہ ایکس شا کو فون کرکے کہہ دے کہ اپنا اسکرپٹ آکر لے جائے۔

"شا! اس وقت میں بہت مصروف ہوں۔" براؤن نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"میں بھی تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔" ایکس شا نے سر ہلایا۔ "اس بار میں نے ایک شاہ کار تخلیق کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم اسے ایک نظر ضرور دیکھو گے۔"

"اسے رکھ جاؤ... میں دیکھ لوں گا۔" براؤن نے اس سے جلد جان چھڑانے کے لیے کہا۔

ایکس شا نے فولڈر اس کے سامنے رکھ دیا۔ "میں کب معلوم کرنے آؤں؟"

"تمہیں میری سیکریٹری بتا دے گی۔" براؤن نے

جواب دیا اور خود کو مصروف ظاہر کرنے لگا۔

ایکس شا دروازے تک گیا پھر اس نے مڑ کر کہا۔ "مسٹر اینڈورڈ... یہ سچ مچ شاہ کار ہے۔ تم اسے ایک بار ضرور دیکھنا۔"

"ضرور... ضرور... تم فکر مت کرو۔"

ایکس شا کے جاتے ہی براؤن اپنی کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ درحقیقت اسے کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ وہ صرف آرام چاہ رہا تھا۔ اس نے سیکریٹری سے کہہ دیا کہ جو بھی آئے، اسے ٹرخا دے اور کوئی فون اسے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ سیکریٹری نے پوچھا۔ "اور باس میں سے کسی کا فون آیا تو؟"

"میں دفتر میں نہیں ہوں۔" اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

سات بجے وہ دفتر سے نکلنے لگا تو اس نے بے خیالی میں ایکس شا کا فولڈر بھی اپنے بریف کیس میں رکھ لیا۔ براؤن کی رہائش بیوری ہلز کے ایک اپارٹمنٹ میں تھی۔ یہ اپارٹمنٹ اسے اسٹوڈیو کی طرف سے ملا تھا۔ ورنہ اس کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ اس پوش علاقے میں رہائش اختیار کرسکتا۔ اس نے دو بار شادی کی اور تین عدد گرل فرینڈز بنائیں مگر انجام یکساں ہوا۔ وہ اسے چھوڑ کر چلی گئیں کیونکہ انہوں نے اس سے جو توقعات لگائی تھیں، وہ پوری نہ ہوسکیں۔ براؤن ان کو فلمی دنیا میں متعارف نہ کرا سکا تھا۔ وہ خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیوی یا گرل فرینڈ اس کی فلم میں اس کے سامنے واہیات اور بے ہودہ سین فلم بند کرائے۔ اسی وجہ سے اس نے ان کو اپنی فلموں میں شامل کرنے سے گریز کیا۔ ہر بیوی اور گرل فرینڈ کو جلد اس کے بارے میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے اور وہ اسے چھوڑ کر تیل والے تلوں کی تلاش میں نکل جاتیں۔ فی الحال وہ اکیلا تھا۔

آنے والے گرما کے لیے فلموں کی ریلیز کے لیے دوڑ جاری تھی۔ براؤن پر بھی کام کا خاصا بوجھ تھا اور اسے اپنی زیرِ تکمیل دونوں فلمیں لازماً اپریل تک تیار کرنی تھیں۔ مسئلہ اس کا نہیں... مسئلہ فلورز کی دستیابی اور تکنیکی عملے کا تھا کیونکہ دوسرے شعبوں میں کام کا دباؤ بے پناہ تھا۔ اس لیے براؤن کے حصے میں بچے کھچے فلورز، سب سے گیا گزرا سامان اور ناتجربے کار تکنیکی عملہ آتا تھا۔ اس لیے کوشش کے باوجود فلم بندی کی رفتار سست تھی۔

گھر آکر براؤن نے اپنے لیے ڈرنک تیار کی۔ آج وہ اپنی تھکن اتارنا چاہتا تھا۔ اس نے فون اٹھا کر ایک نمبر ملایا۔ یہ ایک لڑکی تھی جسے براؤن کبھی کبھی اپنی فلموں میں چند سین کے کردار دے دیا کرتا تھا اور اس کے عوض وہ مہینے میں ایک دو بار اس کے اپارٹمنٹ میں آجاتی تھی۔

"ایولون... تم آسکتی ہو؟" براؤن نے رابطہ ہونے پر کہا۔

"سوری... آج میں ذرا مصروف ہوں۔" اس نے رکھائی سے جواب دیا۔ براؤن کو عقب سے کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟" ایولون فون رکھ رہی تھی اس لیے براؤن اس کا جملہ سننے میں کامیاب رہا۔ "وہی بڈھا گدھ ہے۔"

ایولون کسی اور کے ساتھ تھی۔ براؤن کے لیے یہ خاص بات نہیں تھی مگر ایولون کا جملہ سن کر اس کا خون کھول اٹھا۔ اس نے اسی وقت ایولون کو اپنی فہرست سے خارج کردیا پھر اس نے اینڈی کے بارے میں سوچا۔ یہ بھی معمولی درجے کی اداکارہ تھی جو بے ہودہ کردار کرنے کے لیے مشہور تھی۔ وہ بھی براؤن کے بلاوے پر آجاتی تھی۔ مگر براؤن کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ اس نے ارادہ ترک کردیا۔ اس نے ایک ڈرنک اور تیار کی اور صوفے پر دراز ہوگیا۔ اس نے ٹی وی لگایا مگر جلد بور ہو کر بند کردیا پھر اسے خیال آیا کہ وہ اسکرپٹ دیکھ لے۔ اس نے بریف کیس کھولا۔ اندر سب سے اوپر ایکس شا کا اسکرپٹ رکھا تھا۔ اس نے اسے ہی اٹھا لیا اور بے خیالی میں دیکھنے لگا۔ چند صفحے پڑھنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ ایک شان دار کہانی پر مبنی اسکرپٹ پڑھ رہا ہے۔ اسے توقع نہیں تھی کہ ایکس شا کا اسکرپٹ اتنا جان دار نکلے گا۔ اس نے اسکرپٹ ایک بار شروع کیا تو پھر اسے ختم کرکے ہی دم لیا۔ اس کے سامنے ایک کامیاب فلم کا اسکرپٹ تھا اور وہ اس پر بہت کم بجٹ میں اور آسانی سے مووی بنا سکتا تھا۔

'اتنی زبردست کہانی!' اس نے جوش سے سوچا۔

ایک کمسن اور معصوم لڑکی ایک بدصورت بدمعاش سے محبت کرنے لگتی ہے۔ بدمعاش کو صرف اس کے حسن سے دلچسپی تھی جبکہ لڑکی اس سے محبت کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ وہ جرائم کی راہ چھوڑ دے۔ یہ بہت اچھی، جذباتی اتار چڑھاؤ والی کہانی تھی۔ اسکرپٹ مکمل تھا اور براؤن نے اس سے زیادہ مکمل اسکرپٹ آج تک نہیں دیکھا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ ایکس شا جیسے گھٹیا رائٹر نے اتنا بہترین اسکرپٹ کس طرح لکھ لیا؟ مگر کبھی کبھی آدمی ایسا کام کرجاتا ہے جس کی اس سے توقع نہیں ہوتی۔ اس نے دوبارہ اسکرپٹ پڑھا اور پہلے سے زیادہ متاثر ہوا۔

اس نے سوچا کہ وہ کل ہی اسٹوڈیو کے مالکان سے بات کرکے اس فلم پر کام شروع کردے گا۔ اتفاق سے فلم کے دونوں مرکزی کردار اس کے ذہن میں تھے۔ پچھلے دنوں ایمی نامی اداکارہ نے اس کی فلم میں ایک چھوٹا سا کردار ادا کیا تھا۔ اس نے اپنے معصومانہ خدوخال اور بے ساختہ اداکاری

سے اسے متاثر کیا تھا۔ چہرے سے وہ سولہ سترہ سال سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ جسم بھی نوخیز لڑکیوں جیسا تھا... جبکہ بدمعاش کے کردار کے لیے اسٹوڈیو کا ہی ایک ملازم اداکار ٹام میرٹ تھا۔ وہ عام طور سے بدمعاشی کے کردار ادا کرتا تھا۔ اس میں بھی اداکاری کی بہترین صلاحیت تھی مگر کسی نے آج تک اسے استعمال ہی نہیں کیا تھا۔

اس نے بوتل سے اپنے لیے مزید وہسکی نکالی اور اس مسئلے کا حل سوچنے لگا۔ خاصی دیر تک سوچنے کے باوجود کوئی حل اس کے ذہن میں نہیں آیا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اسے ایکس شا سے بات کرنی ہوگی۔ اس نے فولڈر کے اندر موجود فون نمبر پر کال کی۔ ایکس شا نے فون ریسیو کیا۔

''میں براؤن ایڈورڈ بات کر رہا ہوں۔''

''جناب!'' ایکس شا کی غالباً باچھیں کھل گئی تھیں۔ ''تم نے میرا اسکرپٹ دیکھ لیا ہے؟''

''ہاں... میں اسی سلسلے میں تم سے بات کرنا چاہ رہا ہوں۔ کیا تم میرے اپارٹمنٹ پر آسکتے ہو؟''

''کیوں نہیں... مجھے پتا سمجھاؤ، میں آجاتا ہوں... لیکن ذرا دیر لگے گی۔ میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔''

''میں انتظار کر رہا ہوں۔'' براؤن نے اسے پتا سمجھا کر کہا۔ ''تم براہِ راست لفٹ سے آنا... میرے اپارٹمنٹ کے لیے الگ لفٹ ہے۔''

''میں آرہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

ایکس شا اس کی توقع سے جلد پہنچ گیا تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر انٹرکام سے کال کی تو براؤن نے لفٹ نیچے بھیج دی۔ وہ اوپر آیا۔ اس نے آتے ہی اپارٹمنٹ کا جائزہ لیا۔ ''تمہارا اپارٹمنٹ تو بہت شان دار ہے۔''

''میں نے تمہیں اسکرپٹ کے سلسلے میں بلایا ہے۔''

''تم نے اسے پڑھ لیا؟''

''ہاں، اتفاق سے گھر آنے کے بعد میں فارغ تھا۔ میں نے سوچا اسے پڑھ لوں۔ اسکرپٹ اچھا ہے اور اس پر فلم بھی بنائی جاسکتی ہے۔''

''مجھے بھی یہی امید تھی۔''

''لیکن ایک مسئلہ ہے۔'' براؤن نے اپنے ساتھ اس کے لیے بھی وہسکی نکالی اور گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔

''مجھے امید ہے کہ تم ٹھنڈے دماغ سے اس پر غور کرو گے۔'' براؤن نے آتش دان کے پاس کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا مسئلہ ہے؟''

''مسئلہ یہ ہے کہ میں نے اسے تمہارے نام سے پیش کیا تو اسٹوڈیو کے مالکان اسے مسترد کر دیں گے۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ تم ایک ناکام فلمی مصنف ہو... تم جانتے ہو گزشتہ چار سال میں تم نے بے شمار اسکرپٹ لکھے ہیں ان میں سے ایک بھی کہیں قبول نہیں کیا گیا۔''

''مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے... یہ اسکرپٹ تو اچھا ہے۔''

''میں جانتا ہوں... اسی وجہ سے تو تمہیں بلایا ہے... تمہارا نام اس کے ساتھ نتھی ہونے کا مطلب کہ یہ مسترد ہو جائے گا۔''

یہ سن کر ایکس شا کے چہرے پر سختی آگئی۔ اس براؤن کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''تو اس مسئلے کا تمہارے نزدیک کیا حل ہے؟''

براؤن ہچکچایا۔ ''اگر میں اسے اپنے نام سے پیش دوں تو یہ قبول ہو جائے گا۔''

ایکس شا نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ''تم میری محنت اپنے نام سے آگے کرنا چاہ رہے ہو؟''

''یہی ایک طریقہ ہے کہ یہ اسکرپٹ قبول ہو جائے پھر میں کوئی چکر چلا کر کہیں نہ کہیں تمہارا نام فٹ کر دوں گا۔'' براؤن نے اسکرپٹ کا فولڈر لہرا کر کہا۔

''ہرگز نہیں۔'' اس نے کہا اور براؤن سے فولڈر چھیننے کی کوشش کی۔ اس کی گرفت ذرا سخت تھی، ایکس شا کے ہاتھ کی گرفت قائم نہ رہ سکی اور فولڈر جھٹکے سے پیچھے گیا اور براؤن کے ہاتھ سے بھی نکل کر آتش دان میں جا گرا۔ اس میں گیس ہیٹر جل رہا تھا اور اس کی زبردست حدت کی وجہ سے فولڈر نے پلک جھپکتے میں آگ پکڑ لی۔ براؤن کے ساتھ ایکس شا بھی دم بہ خود رہ گیا... اور جب تک اسے ہوش آتا، فولڈر اس کے اندر رکھا اسکرپٹ جل کر خاکستر ہو گیا۔

''ذلیل شخص... یہ کیا کیا تم نے؟'' ایکس شا نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''یہ ایک ہی کاپی تھی میرے پاس۔''

''غلطی تمہاری تھی... تم نے فولڈر چھیننے کی کوشش کی تھی۔''

''تم نے میری محنت تباہ کر دی۔'' ایکس شا اس پر جھپٹا اور اسے مکا مارنے کی کوشش کی۔ براؤن نے بچتے ہوئے اسے دھکا دیا۔ دبلا سا ایکس شا اس دھکے سے آتش دان کے پاس جا گرا۔ اس کا سر پتھر کی چوکھٹ پر لگا تھا۔ خاصی زوردار آواز آئی تھی اور ایکس شا زمین پر گر کر ساکت ہو گیا۔ براؤن نے ہانپتے ہوئے اسے حکم دیا۔ ''دفع ہو جاؤ... یہاں سے۔''

مگر ایکس شا ساکت پڑا رہا۔ براؤن نے اسے ذرا تشویش سے دیکھا پھر ذرا نزدیک جا کر دیکھا۔ اس کی سانس

رکی ہوئی تھی اور جب براؤن نے لرزتے ہاتھوں سے اس کی نبض اور دل کی دھڑکن دیکھی تو وہ بھی ساکت تھیں۔ ایکس شا سو فیصد مر چکا تھا۔ وحشت کے عالم میں براؤن نے کمرے کا ایک چکر لگایا۔ ایک گلاس وہسکی نکال کر پی اور پھر سے ایکس شا کی سانس اور نبض دیکھی۔ وہ رکی ہوئی تھیں۔ ''میرے خدا! میں نے یہ کیا کیا۔'' اس نے اپنے اڑتے بال پکڑے۔ براؤن نے جلدی سے اپنے کہے کی تردید کی۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے اسے اپنے بچاؤ میں دھکا دیا۔ میری نیت اسے مارنے کی ہرگز نہیں تھی۔''

مگر ایکس شا مر گیا تھا اور اب براؤن پر قتل کا الزام لگنے والا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اسے کسی وجہ سے سزا نہ بھی ہوئی تب بھی اس کا کیریئر تباہ ہو جائے گا اور اسے کوئی اور کام نہیں آتا تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر آجاتا اور بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتا۔ اس نے سوچا کہ پولیس کو اطلاع دینے کا مطلب رضاکارانہ طور پر بجلی کی کرسی پر بیٹھنے کے مترادف ہے۔ ''نہیں... میں پولیس کو اطلاع نہیں دوں گا۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے خود کچھ کرنا ہوگا۔''

آخر براؤن فلم ڈائریکٹر تھا اور بے شمار مرتبہ ایسی صورتِ حال اپنی فلموں میں پیش کر چکا تھا، جب قاتل کو ایک لاش ٹھکانے لگانی ہوتی تھی۔ اس نے سب سے پہلے ایکس شا کے زخم کا جائزہ لیا۔ معمولی سا خون نکلا تھا جو اس کے بالوں میں جم گیا تھا۔ آتش دان کی پتھریلی دیوار پر معمولی سا خون لگا تھا جو اس نے روئی اور اسپرٹ کی مدد سے صاف کر دیا۔ اس کے علاوہ کوئی نشان نہیں تھا۔ اس نے شکر ادا کیا کہ بے تحاشا خون نہیں بہا ورنہ اسے صاف کرنا مسئلہ بن جاتا۔ اس کے بعد اس نے ایکس شا کی لاش ایک کچرا پھینکنے والے سیاہ شاپر میں ڈالی۔ یہ بے حد مضبوط تھا اور ایکس شا کا وزن برداشت کر سکتا تھا۔ اس قسم کے تھیلے ہر گھر میں پائے جاتے ہیں۔ اس میں لاش ڈالنے سے پہلے براؤن نے ایکس شا کا موبائل نکال لیا کیونکہ اس میں براؤن کے گھر کا فون نمبر تھا۔

براؤن نے پہلے نیچے جا کر اپنی کار لفٹ کے پاس کھڑی کی۔ ویسے بھی رات کا آغاز تھا اور اس وقت لوگ نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ لاش نیچے لا کر اس نے اسے کار کی ڈکی میں رکھا۔ اس نے شاپر کا منہ بند کر رکھا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے سوچا کہ لاش کہاں ٹھکانے لگائی جائے؟ پھر اسے ایک جگہ سمجھ میں آگئی۔ شہر سے کچھ فاصلے پر ایک کچرا گھر تھا جس میں کچرا جلا کر بجلی پیدا کی جاتی تھی۔ اگر براؤن، ایکس شا کی لاش اس کچرے میں ڈال دیتا اور وہ بھٹی تک جا پہنچتی تو اس کا نام و نشان مٹ جاتا۔ اسے لاش کچرے تک پہنچانے کا کام دوسروں کی نظروں میں آئے بغیر کرنا تھا۔

اس نے کار کچرا گھر سے ذرا دور روکی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے کچرے سے بھرے ٹرک اپنا کچرا ایک چلتی بیلٹ پر ڈال رہے تھے جو کچرے کو اندر بوائلر روم تک لے جا رہی تھی۔ براؤن نے کار سے لاش کا تھیلا نکالا اور اسے شانے پر لاد کر بیلٹ کی طرف بڑھا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا، ایکس شا کا وزن سو پونڈز سے بھی کم تھا۔ ورنہ اسے لے جانا ہی عذاب بن جاتا۔ اس نے ایک تاریک گوشے سے تھیلا بیلٹ پر پھینک دیا اور جلدی سے واپس آکر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اب اسے فکر نہیں تھی۔ اگر لاش جلنے کے بجائے دریافت بھی ہو جاتی تو اس کا سرا کوئی اس سے نہیں جوڑ سکتا تھا۔ گھر آکر اس نے سکون محسوس کیا۔ اس نے ایک خوف ناک مسئلے سے جان چھڑائی تھی۔ اس نے خوشی میں ایک جام اور پیا پھر اس نے آتش دان میں جمع ہونے والی راکھ صاف کی۔ اب کوئی ثبوت نہیں تھا کہ ایکس شا اس کے پاس آیا تھا۔

اسے افسوس تھا کہ فولڈر اور اسکرپٹ جل گیا تھا اور اس کی مزید اور کوئی کاپی بھی نہیں تھی۔ پھر اسے ایک خیال آیا۔ اگر اس اسکرپٹ کی واقعی کوئی کاپی نہیں تھی تو یہ بات اس کے حق میں جاتی تھی۔ سارا اسکرپٹ اس کے ذہن میں تھا۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ لیا اور اس پر اسکرپٹ تحریر کرنے لگا۔ اس کام میں اسے چار گھنٹے لگے لیکن اس کا اسکرپٹ تقریباً پچانوے فیصد ویسا ہی تھا اور اسے اعتماد تھا کہ اس نے اپنے تجربے کی بنیاد پر اسکرپٹ کو مزید بہتر بنا لیا ہے۔ اس سے پہلے بھی اس نے کہانیوں کی بنیاد پر کئی اسکرپٹ لکھے تھے اور اس کی سب سے کامیاب فلم کا اسکرپٹ بھی اس نے خود لکھا تھا۔

اگلے روز اس نے اسٹوڈیو کے اسکرپٹ ڈائریکٹر سے ملاقات کی۔ اسے اسکرپٹ دکھایا۔ ''میں اس پر فلم بنانا چاہتا ہوں۔''

''تمہارے پاس پہلے ہی دو فلمیں ہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا... میں نے بہ یک وقت چار فلمیں بھی بنائی ہیں۔''

''میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔ تم اس موضوع کو بعد کے لیے رکھ لو۔''

براؤن نے سمجھ لیا کہ اسکرپٹ ڈائریکٹر نہیں مانے گا۔ اس نے اسٹوڈیو کے مالک اسمتھ سے بات کرنے کا فیصلہ

کیا۔ وہ اس کی بات سنتا اور مانتا تھا۔ اسے ملازمت دینے والا بھی وہی تھا۔ براؤن نے اسے کال کی۔ ''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس ایک زبردست آئیڈیا ہے... بجٹ بھی کم لگے گا۔''

''تم شام کو آجانا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں دفتر میں ملوں گا۔''

براؤن نے اسے اسکرپٹ دکھایا اور چند صفحے دیکھنے کے بعد اسمتھ نے اندازہ لگا لیا کہ اس پر بہترین فلم بن سکتی ہے۔

''یہ اسکرپٹ کس کا ہے؟''

''میرا ہے۔'' براؤن نے دل کڑا کر کے کہا۔ ''میں نے کل رات اسے مکمل کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے... میری طرف سے اجازت ہے۔''

''صرف اجازت سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔''

''پھر کیا کرنا ہوگا؟'' اسمتھ نے اسے دیکھا۔

''مجھے وسائل چاہئیں... خاص طور سے اچھے آلات اور تکنیکی عملہ!''

''ابھی بڑے بجٹ کی فلموں کی شوٹنگ جاری ہے۔'' اسمتھ ہچکچایا۔

''میں وثوق سے کہتا ہوں کہ میری فلم ان بڑے بجٹ کی فلموں سے زیادہ کامیاب رہے گی۔''

ذرا سی بحث کے بعد اسمتھ نے اس کی بات مان لی اور اسے فری ہینڈ دے دیا۔ اس نے اگلے روز سے فلم کی تیاری کا کام شروع کر دیا۔ اس نے ایمی اور ٹام کو طلب کر کے فلم کے لیے سائن کر لیا۔ وہ دونوں خوش تھے۔ اس سے پہلے ان کو کبھی اتنے بڑے کردار نہیں ملے تھے۔ براؤن نے ان کو اسکرپٹ دیا کہ وہ اسے غور سے پڑھیں اور اس موضوع پر اچھی طرح غور کریں تاکہ وہ اپنا کردار اچھی طرح ادا کر سکیں۔ اسے وسائل بھی مل گئے تھے۔ اس نے زیرِ تکمیل فلموں کا کام اپنے نائب حضرات کے سپرد کر دیا تھا۔

سامان، عملہ اور فلورز ملنے کے بعد براؤن نے تیزی سے کام شروع کر دیا..... ایکس شا کی لاش نہ ملنے سے بھی اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ لاش نہ ملنے کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ اس کو بھٹی میں کچرے کے ساتھ جلا دیا گیا تھا۔ اب اس پر کوئی الزام نہیں لگا سکتا تھا۔ جب لاش ہی نہیں ملی تو قتل کے الزام کا کیا سوال؟ اس نے ایک مہینے کے اندر فلورز کی شوٹنگ مکمل کر لی۔ اس کے بعد آؤٹ ڈور شوٹنگ تھی۔ اس کے لیے اس نے اسٹوڈیو کی ملکیت ایک فارم ہاؤس کا انتخاب کیا تھا۔ اس نے ایک مہینے میں یہاں کا کام بھی مکمل کر لیا۔

مارچ کے آخر تک اس نے فلم کی ایڈیٹنگ بھی مکمل کر لی۔ اسٹوڈیو کے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ نے فلم کی تشہیر شروع کر دی تھی۔ اسمتھ کی وجہ سے اسے بڑے بجٹ کی فلموں کی طرح اہمیت دی جا رہی تھی اور اسے گرما کے آغاز میں بہ یک وقت تین سو سینما گھروں میں ریلیز کرنے کا پروگرام تھا۔ ورنہ اس سے پہلے براؤن کی کوئی فلم بہ یک وقت سو سے زیادہ سینما گھروں پر ریلیز نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اسے موسمِ گرما میں کوئی فلم ریلیز کرنے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔

فلم کا پریمیئر لندن میں ہونا تھا۔ اس کے لیے فلم کی پوری کاسٹ بمعہ براؤن کے لندن پہنچ گئی تھی۔ براؤن کی توقع کے عین مطابق پریمیئر شان دار رہا۔ اس میں برطانیہ کے شاہی خاندان کے افراد نے بھی شرکت کی تھی۔ ان کے علاوہ بے شمار معززین تھے۔ پھر فلم پر میڈیا اور پریس نے بھی اپنے تبصرے کیے اور پہلے شو کے بعد ہی اسے گرما کی بہترین فلموں میں شامل کر لیا۔ براؤن جس کامیابی کے برسوں سے خواب دیکھتا آیا تھا، وہ اسے اب ملی تھی۔ پریمیئر سے پہلے ہی اسٹوڈیو مالکان نے اسے ڈائریکٹر پروڈیوسرز کے پہلے گروپ میں شامل کر لیا تھا۔ اس کی تنخواہ تین گنا بڑھا دی گئی تھی اور اسے بونس اور رائلٹی سمیت اور بھی دوسری سہولیات دی تھیں۔ اسٹوڈیو کی جانب سے اسے ایک پینٹ ہاؤس اور ایک نئی کیڈی لاک کار دی گئی تھی مگر ان سب چیزوں سے زیادہ اس کے لیے اہم بات یہ تھی کہ وہ سکون سے اور بڑے بجٹ کی فلمیں بنا سکتا تھا۔ اسے افراتفری میں سستی اور گھٹیا فلمیں بنانے سے نجات مل گئی تھی۔

لندن کے تین دن بے حد مصروفیت میں گزرے تھے۔ تینوں دن تقریبات تھیں۔ خاص طور سے برطانیہ کے ڈائریکٹرز کی ایسوسی ایشن نے اس کے اعزاز میں شان دار پارٹی دی تھی اور اسے مشترکہ فلم سازی کی پیش کش کی تھی۔ اسے امید تھی کہ جلد اسے کسی اور ادارے کی جانب سے بہترین پیش کش ہوگی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر اسے بہتر پیش کش ہوئی تو وہ یہ ملازمت ترک کر دے گا۔ اب اسٹوڈیو کے لگے بندھے بیوروکریٹک انداز سے وحشت ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

لاس اینجلس ائرپورٹ پر خلافِ توقع اسے روک لیا گیا۔ ایک سادہ لباس شخص نے اس سے کہا۔ ''مسٹر ایڈورڈ... ایک سینئر پولیس افسر تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

''پولیس افسر!'' اس کا دل دھڑک اٹھا۔ ''کیوں... کس

سلسلے میں؟''

''یہ سب ابھی تمہارے سامنے آجائے گا۔'' سادہ لباس والے نے نرمی سے کہا۔ ''برائے مہربانی میرے ساتھ آؤ۔''

براؤن کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ وہ بادلِ ناخواستہ اس شخص کے ساتھ روانہ ہوا۔ ''میرا خیال ہے کہ کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ایک نامور پروڈیوسر ڈائریکٹر ہوں۔''

''ہمیں معلوم ہے۔'' سادہ لباس والے نے اسی لہجے میں کہا۔ ''اس کمرے میں۔''

سادہ لباس والے نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ براؤن اندر داخل ہوا۔ اندر ایک پولیس افسر موجود تھا۔ اس نے اشارے سے براؤن کو کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ براؤن اس سادہ سی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے اپنا تعارف کرایا۔ ''میں ہومی سائیڈ میں پولیس آفیسر ایڈگر بروس ہوں۔''

''آفیسر! مجھے اس طرح کیوں بلایا گیا ہے؟''

''کچھ معاملات ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں چند سوال کروں گا۔ اگر تم نے ان کے جوابات نہیں دیے تو پھر باقاعدہ کارروائی ہوگی۔''

''میں اگرچہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں مگر میں تعاون کروں گا۔'' اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

''تم ایکس شا سے واقف ہو؟ اس کا اصل نام بیری نارن ہے۔''

''ہاں، وہ کبھی کبھی میرے پاس اسکرپٹ لے کر آتا ہے۔''

''آخری بار کب اس سے ملاقات ہوئی؟''

''صحیح سے یاد نہیں... شاید چار مہینے پہلے آیا تھا۔''

''تین مہینے دس دن پہلے... اسٹوڈیو کے گیٹ پر اس کی آمد کا اندراج ہے۔ مقصد تم سے ملاقات کرنا تھی۔''

''درست ہوگا... مجھے صحیح سے یاد نہیں ہے۔''

''اس نے تمہیں کوئی اسکرپٹ دیا تھا؟''

''ہاں، دیا تھا مگر یاد نہیں میں نے کہاں رکھا تھا۔'' ایڈگر نے اسے سرد نظروں سے گھورا۔ ''او کے! تم آئن اسٹیفن نامی شخص سے واقف ہو؟''

''نہیں... میں یہ نام پہلی بار سن رہا ہوں۔''

''یہ ایک مصنف تھا اور تین مہینے سترہ دن پہلے اس کا قتل ہو گیا۔ ایکس شا اس سے ملتا تھا۔ قتل کی تفتیش سے ثابت ہوا کہ ایکس شا نے آئن کو قتل کر کے اس کے پاس سے ایک فلمی کہانی کا اسکرپٹ چرا لیا تھا۔''

براؤن کو اپنے پیٹ میں گرہ سی پڑتی محسوس ہوئی۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''مسٹر ایڈورڈ! ٹھیک وہی اسکرپٹ تم نے فلمایا ہے اور تم اس کے بارے میں نہیں جانتے؟ پولیس کے پاس آئن کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ ہے۔ وہ ہاتھ سے لکھتا تھا۔''

''میں نے کہا نا...''

''جس روز ایکس شا تم سے اسٹوڈیو میں ملنے آیا تھا، اس سے اگلے روز وہ تم سے تمہارے اپارٹمنٹ میں ملا تھا؟''

''نہیں... نہیں!'' اس نے زور سے کہا۔

''تب ہمیں تمہارے اپارٹمنٹ کے فون کے ریکارڈ میں اس کا موبائل نمبر اور لفٹ میں اس کی انگلیوں کے نشانات کیوں ملے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' اس کا لہجہ کمزور ہو گیا تھا۔

''کیا لفٹ کو کوئی تمہاری مرضی کے بغیر استعمال کر سکتا ہے؟''

''نہیں!'' اس نے مجبوراً جواب دیا۔

''تب تم اس کی کیا وضاحت کرو گے کہ لفٹ میں اس کی انگلیوں کے نشانات کہاں سے آئے؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''تمہارے فون کی سی ایل آئی میں ایکس شا کے موبائل کا نمبر کیوں ہے... اسے تم نے کال کی تھی؟''

''میں نہیں جانتا۔'' براؤن کا لہجہ بے بسی سے بھرپور تھا۔

''تمہارے پاس اس فلم کا مسودہ کہاں سے آیا... جو حقیقت میں آئن اسٹیفن نے لکھی تھی۔''

''میں نہیں جانتا۔'' براؤن چلّا اٹھا۔

''اور سب سے اہم بات جس روز تم نے اسے کال کی یا تمہارے فون سے اسے کال ہوئی، اس روز کے بعد سے وہ کسی کو نظر کیوں نہیں آیا؟''

''میں نہیں جانتا۔'' براؤن نے رونا شروع کر دیا۔

''مسٹر ایڈورڈ! میرے پاس کافی سے زیادہ وجوہات ہیں کہ میں تمہیں گرفتار کر لوں۔''

کچھ دیر بعد براؤن ہتھکڑیوں میں جکڑا پولیس کے ساتھ جا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ان شواہد کی بنا پر اسے شاید سزا تو نہ ہو مگر اس نے جو شہرت اور عزت چند دن کے لیے کمائی تھی، وہ اس سے ہمیشہ کے لیے چھننے والی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی عقل پر ماتم کرے۔ اسے پہلے ہی سوچ لینا چاہیے تھا کہ ایکس شا دوبارہ پیدا ہو جاتا تب بھی ایسا اسکرپٹ نہیں لکھ سکتا تھا۔

پرواز

طاہر جاوید مغل

ایک سیدھے سادے لیکن ہر فن مولا کی داستان ۔ اس کے بازو توانا تھے اور قدم مستحکم ۔ منطقی ذہن اس کا رہنما تھا اور نقارے بجاتا دل محبت کی تال پر دھڑکتا تھا ۔ رگوں میں خون کی جگہ جوش دوڑتا اور لبوں پر نغمے مچلتے رہتے ...پھر اس کی سماعت میں گھلنے والے رس نے اس کے لبوں کو ایک نئی تشنگی سے آشنا کیا اور وہ طلب کے منہ زور دھارے کے آگے بے دست و پا ہو گیا ۔ بے کراں طلب اور تند جذبوں کے اس بہاؤ میں وہ تنہا نہ تھا۔ وہ ہستی بھی اس کے ہم دوش تھی جس کی فقط ایک نگاہ نے اس کے دل کا فیصلہ کر دیا تھا ۔ بہاؤ کی سمت غلط تھی یا درست ، اس سے بے خبر ، اس سیلِ بلا خیز میں وہ بہے چلے جا رہے تھے !

ایک دلربا کی جستجو میں سحر... اور اسی کے خیال میں شام کرنے والے پجاری کا احوال

فرقت کی چبھن، ملن کے گداز اور محبت کے راز افشا کرتے قلم کا شاہکار

دونوں افراد کے پالش شدہ سیاہ جوتے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ان کے سفید کھڑکھڑاتے کلف لگے کپڑوں سے ایک طرح کا غرور جھلکتا تھا۔ میں نے ایک نگاہ گلزار کے زرد چہرے پر ڈالی اور اس سے پوچھا۔ ''یہ کون ہیں؟''

گلزار بولا۔ ''دائیں طرف چھوٹا موکھل ہے۔ ساتھ میں اس کے مامے کا پُتر ہے۔''

تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں مُردہ مچھلیوں کا جائزہ لیتے ہوئے ہمارے پاس پہنچ گئے۔ گلزار نے جس کو چھوٹا موکھل بتایا تھا، اس کی عمر پچیس چھبیس سال رہی ہو گی۔ اس کی آنکھیں بھوری، بال ہلکے بھورے اور جبڑا خاصا چوڑا تھا۔ اس کے ساتھی کا حلیہ بھی ملتا جلتا تھا۔ چھوٹے موکھل نے استہزائیہ نظروں سے گلزار کو دیکھا اور بولا۔ ''اوئے! یہ تمہاری رہو مچھلیوں کو کیا بیماری پڑ گئی ہے؟''

گلزار نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو سب پتا ہے چودھری صاحب!''

''اوئے! یہ کیا بات کر رہا ہے۔ یہاں کا رکھوالا تُو ہے اور پتا ہم کو ہو گا... اور سنا ہے کہ... وہ تیرا والڑی صاحب بھی یہاں آیا ہوا تھا رات کو؟''

وہ والی صاحب کو تحقیر آمیز انداز میں والڑی صاحب کہہ رہا تھا۔

گلزار نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ آپ کس کی بات کر رہے ہو؟''

چھوٹے موکھل نے مجھے بالکل نظر انداز کرتے ہوئے گلزار سے پوچھا۔ ''اوئے! یہ مانو بلی کون ہے؟'' اس کا اشارہ میری طرف تھا۔

گلزار کے بجائے چھوٹے موکھل کا ساتھی بولا۔ ''والڑی کی پالتو لگتی ہے۔ شاید نئی بھرتی کے ساتھ آئی ہو گی۔''

میرے اندر آگ سی دہکنے لگی۔ رگ پٹھے تن گئے۔ میں نے کہا۔ ''تم لوگ منہ سنبھال کر بات کرو تو اچھا ہے۔ اور یہ والڑی... والڑی تم کس کو کہہ رہے ہو؟''

چھوٹا موکھل سرخ انگارہ ہو گیا۔ تاہم بڑے اطمینان سے گلزار کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''والڑی اس کے خفیہ اتے کا نام ہے۔ کیا وہ اندر خانے تمہارا بھی کچھ لگتا ہے؟''

میں لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ہرگز نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے یہاں کی صورتِ حال کا درست علم ہی نہیں تھا مگر چھوٹے موکھل نے جو بات کہہ دی تھی، وہ بہت بڑی تھی۔ اب اس کا جواب دیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک سرخ چادر سی تن گئی۔ اس چادر میں مجھے بس چھوٹے موکھل کا چہرہ نظر آتا رہا، باقی سب کچھ بھول گیا۔

چھوٹے موکھل کے شاید وہم و گمان میں بھی نہیں تھا اس کو اتنا سخت جواب اور اتنی جلدی ملے گا۔ میرا طوفانی گھونسا اس کے تھوبڑے پر لگا تو وہ اچھل کر اپنے ہی کارخانے کے بدبودار پانی میں جا گرا۔

اس کا ساتھی پہلے تو ہکا بکا رہا پھر چنگھاڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے اس کی پسلیوں میں کہنی کی دو سخت ضربیں لگائیں۔ جونہی اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی، میں نے پلٹ کر اس کے چہرے پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ یہی وقت تھا جب میں نے دیکھا کہ کارخانے کے اندر سے نمودار ہونے والے چار پانچ بندے بھاگتے اور للکارے مارتے ہوئے میری طرف آ رہے ہیں۔ ان میں سے دو تین کے ہاتھ میں ہاکیاں تھیں۔ آناً فاناً وہ میرے سر پر پہنچ گئے۔ اگلے تین چار منٹ میں اس فش فارم کے کنارے ان سنسان کھیتوں کے درمیان زبردست رن پڑا۔ آپ نے فلموں، ڈراموں وغیرہ میں ایسے مناظر اکثر دیکھے ہوں گے اور بارہا سوچا بھی ہو گا کہ ساری افسانوی باتیں ہوتی ہیں۔ اکیلا بندہ پانچ چھ بندوں کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے؟ لیکن ایسا ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں لیکن ایک بڑی ٹھوس بات میں آپ کو بتا دوں، یہ سب کچھ سیکھنے سے یا کوشش کرنے سے نہیں مل سکتا۔ نہ ہی اپنی جسمانی طاقت بڑھانے سے یہ صلاحیت حاصل ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے، اس سے تھوڑا سا فرق پڑ جاتا ہو مگر حقیقت یہی ہے کہ لڑائی بھڑائی کی صلاحیت فطری ہوتی ہے اور اس کا تعلق اس اندرونی آگ سے ہے جو بندے کے اندر گہرائی میں جلتی ہے اور بھڑکتی ہے پھر وہ شخص چاہے دبلا پتلا ہو، فنِ حرب سے بالکل ناآشنا ہو، بے وسیلہ ہو، بے آسرا ہو مگر وہ موقع پڑنے پر لڑ پڑتا ہے، لڑ جاتا ہے۔ مر جاتا ہے اور مار بھی دیتا ہے۔ قدرت جب یہ اضافی چیز دیتی ہے تو پھر کچھ لیتی بھی ہے۔ ممکن ہے کہ ان لوگوں میں لڑائی بھڑائی کی صلاحیت نہیں ہوتی انہیں قدرت نے کچھ اور اضافی صلاحیتیں دے رکھی ہوں اور یہ صلاحیت لڑائی بھڑائی سے کہیں زیادہ اہم ہوں۔

بہرحال، تین چار منٹ کے اس گھمسان کے رن میں میں نے چھوٹے موکھل اور اس کے ساتھیوں کو دن تارے دکھا دیے۔ لڑائی کے آخری مرحلے میں، میں ایک ڈشکرے سے ہاکی چھین لی... میری گھمائی ہوئی ہاکی چوٹ جس جس کو لگی، وہ پھر وہاں ٹھہرا نہیں۔ سب سے چھوٹے موکھل کا سر پھٹا۔ وہ غلیظ گالیاں نکالتا

دھمکیاں دیتا ہوا گودام کی طرف بھاگا۔ وہ چلا رہا تھا۔ ''حرامزادو! دیکھ لوں گا... آج سب کو دیکھ لوں گا۔ آج گولیاں چلیں گی۔''

اس کے جانے کے بعد باقی افراد بھی اسی طرح گالیاں بکتے اور دھمکیاں دیتے ہوئے گودام کی طرف نکل گئے۔ ان میں سے کئی کے چہروں پر تسلی بخش چوٹیں آئی تھیں۔ راہِ فرار اختیار کرتے وقت ان کے چہرے حیرت زدہ تھے۔ یقیناً انہیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ ایک اکیلا شخص اتنی شدید مزاحمت کرے گا اور انہیں آناً فاناً آگے لگا لے گا۔

اس سارے واقعے کے دوران میں فش فارم کا چوکیدار گلزار دم بہ خود کھڑا رہا تھا... اب بھی وہ کانپ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں دہشت تھی۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ''یہ بہت بُرا ہوا ہے بھراجی۔ اب یہ لوگ ہمیں چھوڑیں گے نہیں۔''

''کیا کر لیں گے؟'' میں نے کپڑوں سے مٹی جھاڑتے ہوئے کہا۔

''یہ... یہ ابھی اسلحہ لے کر آ جائیں گے۔ ہم کو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اپنے گھوڑے کی طرف بھاگا جو ایک بیری کے نیچے بندھا ہوا تھا۔

وہ اتنا ڈر گیا تھا کہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنا بھی بھول گیا تھا۔ میں نے کمرے کو تالا لگایا اور خود بھی گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ ایک دو منٹ کے اندر ہم وہاں سے نکل گئے۔

☆☆☆

راجوال پہنچ کر میں نے رونق علی کو ساری صورتِ حال بتائی۔ اس کا رنگ بھی زرد ہو گیا۔ وہ پریشان لہجے میں بولا۔ ''یار! یہ کام خراب ہوا ہے تم سے۔ اب موکھل اس کا بڑا سخت جواب دیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم سے کہا کس نے تھا وہاں جانے کو؟''

''میں نے بتایا ہے نا، میں تو شکار کرنے اس طرف نکل گیا۔ میں نے کوئی منصوبہ تھوڑا ہی بنایا ہوا تھا۔ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ وہاں کوئی چکر چل رہا ہے۔''

''پھر بھی کسی طرح کی حرکت کرنے سے پہلے تمہیں گلزار وغیرہ سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔''

''رونق بھائی! چھوٹے موکھل نے بات ہی ایسی کر دی تھی کہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ والی جی کے بارے میں بھی سخت بدتمیزی کر رہا تھا۔''

''اچھا، تم یہیں ٹھہرو۔ میں والی جی کو بتا کے آتا ہوں ساری بات۔'' رونق علی نے کہا اور اپنی توند مٹکاتا ہوا باہر چلا گیا۔

میں وہیں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ آدھ پون گھنٹا گزر گیا مگر رونق علی واپس آیا اور نہ اندر کی صورتِ حال کا پتا چلا۔ بس ایک تبدیلی میں نے محسوس کی اور وہ یہ کہ حویلی کے بڑے پھاٹک کے پاس پہرے داروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ گھڑ بردار پہرے دار بھی اپنے کتوں کے ساتھ حویلی کے اردگرد چکر لگانے لگے۔ لگتا تھا کہ والی صاحب اور چودھری عزیز وغیرہ کچھ زیادہ ہی محتاط ہو گئے ہیں۔ انہیں اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں موکھل براہِ راست حویلی پر ہی نہ چڑھ دوڑیں۔

قریباً آدھ گھنٹا مزید گزرا اور پھر میں نے تین عدد سرپٹ گھڑسواروں کو دیکھا۔ وہ راجوال ہی کے تھے۔ ان میں سے دو کے کپڑے لہولہان ہو رہے تھے۔ تیسرے کا سر پھٹا ہوا تھا۔ یہ تیسرا شخص چاچے عسکری کا شاگردِ خاص نصر اللہ تھا۔ میں دوڑ کر پھاٹک پر پہنچا۔ ''کیا ہوا نصر اللہ؟'' میں نے پوچھا۔

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''موکھلوں نے ڈیرے پر ہلّا بولا ہے۔ تیس پینتیس بندے تھے... انہوں نے گولیاں بھی چلائی ہیں۔ ڈیرے کے دو کمروں کو آگ لگا دی ہے...''

میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ تو یہ تھا موکھلوں کا جواب!

اسی دوران میں والی جی، چودھری عزیز اور رونق وغیرہ بھی باہر آ گئے۔ والی جی کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ انہوں نے ذرا ناراض نظروں سے میری طرف دیکھا پھر نصر اللہ وغیرہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نصر اللہ نے ہانپتی ہوئی سانسوں کے ساتھ تفصیل بتائی اور آخر میں کہا۔ ''برکت کو رائفل کی گولی لگی ہے۔ شریف کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ عباس ان دونوں کو ریڑھے پر لا رہا ہے۔ ملتانی کو وہ لوگ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ پر کچھ آگے جا کر اور اس کے منہ پر کالک مل کر اسے واپس بھیج دیا ہے۔'' عباس، ملتانی وغیرہ کارندوں کے نام تھے۔

اسی دوران میں وہ ریڑھا بھی نظر آ گیا جس پر دونوں زخمی آ رہے تھے۔ ریڑھے پر روئی کا گدا بچھا کر دونوں زخمیوں کو اس پر لٹایا گیا تھا۔ برکت نامی کارندے کو رائفل کی گولی لگی تھی مگر شکر کا مقام تھا کہ بازو کا گوشت پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ ہاں، شریف کی ٹانگ ٹوٹ چکی تھی اور ریڑھے پر لگنے والے جھٹکوں نے اسے ادھ موا کر دیا تھا۔ ڈیرے داروں کی ہانڈی روٹی پکانے کے لیے ایک درمیانی عمر کی کشمیری عورت صفیہ بھی ڈیرے پر موجود تھی۔ وہ بھی ریڑھے پر آئی تھی۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ اس کے ساتھ کھینچا تانی کی گئی تھی۔ اس کے

کپڑے کئی جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ اسے کئی جگہ بے دردی سے نوچا گیا تھا۔ اس نے اپنے جسم پر نیلگوں نشان دکھائے جن میں سے خون رِس رہا تھا۔

چودھری عزیز نے نصراللہ سے پوچھا۔ ''ڈیرے کی آگ بجھائی ہے یا وہ بھی جلتی چھوڑ آئے ہو؟''

''نہیں جی، آگ تو بجھا کر آئے ہیں پر... پتا نہیں جی... کہ وہ خبیث پھر آ جائیں۔ وہ بہت غصے میں تھے اور بار بار پوچھ رہے تھے کہ وہ تمہارا وڈا بدمعاش کہاں ہے۔ اس کو سامنے لاؤ۔ ہم ابھی اس کے ٹوٹے کریں گے۔ ہمیں نہیں پتا کہ وہ کس کی بات کر رہے تھے۔ لگتا ہے کہ ہمارے کسی بندے کے ساتھ آج ان کا جھگڑا ہوا ہے۔''

چودھری عزیز نے خشمگیں نظروں سے مجھے دیکھا اور منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔

کچھ ہی دیر میں مقامی حکیم اور پہلوان وغیرہ آ گئے۔ زخمیوں کی مرہم پٹی شروع ہو گئی۔ پہلوان نے، جسے خلیفہ جی کہا جا رہا تھا، شریف کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے گرد سیدھی لکڑیاں رکھنے کے بعد پٹی لپیٹنا شروع کر دی۔

اس واقعے کے بعد حویلی میں ہلچل سی نظر آنے لگی تھی۔ چہرے سراسیمہ دکھائی دے رہے تھے۔ سرگوشیاں کی جا رہی تھیں۔ تنہائی ملتے ہی چودھری عزیز مجھ پر برس پڑا۔ ''تمہیں کیا ضرورت تھی اس معاملے میں ٹانگ اڑانے کی؟ اور اگر اتنی ہی دلیری چڑھی ہوئی تھی تو پھر وہاں سے بھاگے کیوں تھے؟ اُدھر ہی رک کر ڈانگ سوٹا کرنا تھا ان سے۔''

''میں نے رونق صاحب کو سب کچھ بتایا ہے جی۔ جو کچھ ہوا بالکل اتفاقی طور پر ہوا۔ مجھے بالکل بھی پتا نہیں تھا کہ ان لوگوں سے پہلے ہی جھگڑا وغیرہ چل رہا ہے۔ میں نے وہاں سے آتے ساتھ ہی رونق صاحب کو ساری تفصیل بتا دی تھی۔''

''دراصل، اس میں تھوڑی سی غلطی ہماری بھی ہے۔'' رونق علی نے چودھری عزیز کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ''ہم سمجھتے رہے کہ وہ لوگ حویلی کی طرف آئیں گے، پر وہ باغ والے ڈیرے کی طرف چلے گئے۔''

''سانپ کی لکیر پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ سوچو کہ اب کیا کرنا ہے۔ اس بات کو بڑھانا ہے یا یہیں پر ختم کرنے کی کوشش کرنی ہے۔'' والی جی نے کہا۔

قریباً ایک گھنٹے تک صلاح مشورہ ہوتا رہا۔ اس واقعے کی خبر بڑی تیزی سے اردگرد کے دیہات تک پہنچ گئی۔ والی جی کے عزیز، رشتے دار اور ہم خیال زمیندار حویلی پہنچنے لگے۔ پھاٹک کے سامنے کئی ایک سجے سجائے تانگے جمع ہو گئے۔ افراد کے ساتھ گن مین بھی موجود تھے۔ یہ گن مین کا... اور کوچوان احاطے میں اور پھاٹک کے اردگرد دکھائی لگے۔ ان کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے اور وہ مجمع کی... میں باتیں کر رہے تھے۔ حویلی کی بہت بڑی بیٹھک... دروازے بند کر کے کافی دیر تک صلاح مشورہ ہوتا رہا... دیر بعد چاچا عسکری باہر آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ مجھے اندر طلب کیا گیا ہے۔

میں اندر پہنچا۔ بیٹھک میں بڑے بڑے موڑھوں پر... رنگ دار پلنگوں پر اونچی پگڑیوں والے کوئی دو درجن چودھری اور زمیندار موجود تھے۔ حقے گڑگڑائے جا رہے تھے... چائے کی پیالیاں یہاں وہاں دھری تھیں۔ والی جی نے مجھے ایک موڑھے پر بیٹھنے کا حکم دیا اور کہا کہ میں واقعے کی تفصیل بتاؤں۔ میں نے وہ سب کچھ گوش گزار کر دیا جو پہلے کیا... میں نے کہا، مجھے بالکل خبر نہیں تھی کہ وہاں فش فارم پر کیا چل رہا ہے۔ ان لوگوں نے گالی دی جو مجھ سے برداشت نہ ہوئی اور میں لڑ پڑا۔ میں نے لڑائی کی ساری تفصیل بتائی... بیچ میں چودھریوں نے سوالات بھی کیے۔

آخر میں والی جی نے اپنی کرسی پر پہلو بدلا اور... سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں ہم اس معاملے کو جتنا بڑھائیں گے، بڑھتا جائے گا۔ مجھے چودھری فیاض کا مشورہ ٹھیک لگ رہا ہے کہ ہم اپنی تیاری پوری رکھیں حالات کا رخ دیکھیں۔ اگر یہ بات یہیں پر بس ہو جاتی پھر ٹھیک ہے لیکن اگر موکھلوں کی طرف سے کوئی نئی شرارت ہوتی ہے تو پھر ہم چپ نہیں رہیں گے۔ اس کا ٹھیک ٹھاک جواب دیں گے۔''

چودھری عزیز نے کہا۔ ''پر بھائیا جی! انہوں نے گولی چلائی ہے، ہمارے ڈیرے کو اگ لگائی ہے۔ ہماری ملازموں سے بدتمیزی کی ہے۔''

والی جی بولے۔ ''ٹھیک ہے کہ ان لوگوں نے زیادتی کی ہے، پر وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پہل ہماری طرف سے ہوئی ہے۔ ہمارے بندے نے مچھلی فارم پر ان کے بندوں کے... پھاڑے ہیں۔ ویسے دیکھا جائے تو ابھی تک حساب برابر ہے۔ اگر ان لوگوں نے ڈیرے پر مار کٹائی کی ہے تو ہمارے اکیلے بندے نے بھی ان کے چھ سات ڈشکروں کو آگے لگایا ہے۔ اور ان میں خیر سے چھوٹا موکھل بھی شامل تھا۔ اب یہ بات چھپی نہیں رہنی ہے کہ ان کے چھ سات بندے ایک بندے کے سامنے بھی نہ ٹھہر سکے اور بھاگ گئے۔''

''لیکن اصل جھگڑا تو پھر بھی اپنی جگہ ہے نا۔'' چودھری عزیز نے کہا۔ ''وہ آئے دن کوئی نہ کوئی حرکت کرتے رہتے ہیں۔ اب کوئی پچاس ہزار روپے کی مچھلی ضائع ہوئی ہے ان کی وجہ سے... اس سے پہلے انہوں نے...''

والی جی نے ہاتھ اٹھا کر چودھری عزیز کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولے۔ ''یہ سب کچھ ٹھیک ہے اور یہ سارا بیہودہ معاملہ ہے۔ اس کے بارے میں گل بات ہو رہی ہے۔ اگر گل بات سے معاملہ طے نہ ہوا تو پھر قانون تو ہے ہی...''

میری موجودگی میں دس پندرہ منٹ مزید بات چیت ہوئی پھر مجھے باہر بھیج دیا گیا... میرے باہر آنے سے پہلے ایک دو چودھریوں نے میری جی داری کی تعریف کی اور شاباش دی۔

گیٹ پر ایک ٹریکٹر ٹرالی کھڑی تھی۔ اس ٹرالی میں والی جی کے بڑے بیٹے اعجاز کے کارندے تھے۔ ان پندرہ بیس افراد میں سے تین چار کے پاس پکی رائفلیں تھیں۔ باقی بھی لاٹھیوں وغیرہ سے مسلح تھے۔ اعجاز، والی جی کی پہلی بیوی سے تھا اور چاول صاف کرنے کا کاروبار کرتا تھا۔

باہر آ کر میں نے مچھلی فارم کے نگران گلزار کو ڈھونڈا اور اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''یار! مجھے تفصیل سے بتاؤ، یہ سارا معاملہ ہے کیا؟''

گلزار نے کہا۔ ''بھراجی! جہاں تک مجھے پتا ہے، موکھلوں کا یہ گودام پہلے پہل چاول رکھنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہ کافی پرانی گل ہے، کوئی وی سال پہلے کی۔ ان دنوں ساتھ والی جمین بے آباد ہی تھی۔ موکھلوں کے باپ نے جو اب اللہ بخشے ہو چکا ہے، گندے پانی کا ایک پائپ ہماری جمین کے نیچے سے گزارا تھا۔ یہ پائپ آگے جا کر چھپڑ میں گرتا ہے۔ اب اسی پائپ کو بہانہ بنا کر موکھلوں نے رولا ڈالا ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جمین کے اندر سے ہمارا پائپ گزر رہا ہے... اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ہماری جمین ہے۔ دراصل بھراجی... ان کی نجر اس ساری کی ساری جمین پر ہے۔ میرے انداجے کے مطابق وہ والی جی کو اونے پونے پیسے دے کر یہ ساری جمین اپنے کارکھانے کے لیے لینا چاہتے ہیں۔''

''اس کارخانے میں یہ لوگ کرتے کیا ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ٹھیک سے پتا نہیں جی۔ ٹریکٹر ٹرالیوں میں جانوروں کی کھالیں آتی ہیں یہاں۔ بڑی بُو آتی ہے۔''

یونیورسل ہوم سروسز
آپ بھی منگوا سکتے ہیں

کتب

خوشگوار زندگی کے راز
رابرٹ ایچ شلر / ریاض محمود انجم
قیمت سروس چارجز و ڈاک خرچ -/310 روپے

روحانی خوشیاں اور کامیابی
ڈورس پوزی سٹیفن ولیمز / امجد محمود
قیمت سروس چارجز و ڈاک خرچ -/340 روپے

صحت

جگرین + جوارش زررشک + طاقت کیپسول + دوا لکھد
معدہ اور جگر کی اصلاح کر کے چہرے کی رنگت کو سرخ کرتی ہے جسم کو طاقت ور بناتی ہے
ہیپاٹائٹس اے۔ بی اور سی میں مفید اور موثر ہے
قیمت مکمل کورس بمع سروس چارجز و ڈاک خرچ -/900 روپے

وظائف

۱۔ حل المشکلات جب بہت سارے کام اور مشکلات درپیش ہوں اور کچھ سمجھ نہ آ رہی ہو کہ کیا کرنا چاہیے۔ اس وظیفہ کو 11 دن سے 40 دن تک پڑھنے سے تمام کام اللہ پاک کی رحمت سے آسان ہو جاتے ہیں اور مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم شامل حال ہوتا ہے
ہدیہ بمع سروس چارجز و ڈاک خرچ 650 روپے

۲۔ کشائش رزق کے لیے یہ دعا رزق میں اضافہ اور برکت کے لئے پڑھی جاتی ہے 11 دن سے پہلے پہلے اللہ پاک کے فضل سے رزق میں فراوانی کے آثار شروع ہو سکتے ہیں ہدیہ بمع سروس چارجز و ڈاک خرچ 450 روپے

۳۔ نصیب کشائی جن بچیوں بچوں کے رشتے نہ ہوتے ہوں یا جو والدین اپنے بچوں کے رشتوں کے لئے پریشان ہوں یہ وظیفہ صرف 4 دن پڑھنے سے اللہ پاک کی رحمت شامل حال ہو جاتی ہے
ہدیہ بمع سروس چارجز و ڈاک خرچ 450 روپے

۴۔ نجات مشکلات یہ دعا اس وقت پڑھی جاتی ہے جب خاص ضرورت یا مشکل درپیش ہو عام چھوٹی موٹی ضرورت کے لئے نہ پڑھیں
ہدیہ بمع سروس چارجز و ڈاک خرچ 786 روپے (11 دن)

۵۔ اولاد کے لیے جن لوگوں کے آنگن میں ابھی تک پھول نہیں کھلے ہیں اس وظیفہ کے وسیلہ سے اللہ پاک کی رحمت سے اولاد کی نعمت سے سرفراز ہو سکتے ہیں۔ (بیوی یا شوہر میں سے کوئی بھی یہ وظیفہ کر سکتا ہے) (7 دن)
ہدیہ بمع سروس چارجز و ڈاک خرچ 550 روپے

۶۔ نافرمان اولاد جن لوگوں کے بچے نافرمان۔ کام چور۔ بری عادتوں کے شکار یا بے روزگار ہیں یہ نوافل ان لوگوں کے لئے مخصوص ہیں۔ (صرف 11 دن کے لئے) ہدیہ بمع سروس چارجز و ڈاک خرچ 550 روپے

نوٹ منی آرڈر بنام ولید احمد معرفت پی او بکس نمبر 3006 ارسال کریں

V.P بھی منگوا سکتے ہیں

اسٹاکسٹ
ولید احمد
پوسٹ بکس نمبر 3006 لاہور
فون نمبر
0321-9420799
0300-6507997
042-7013754
ای میل Waleedjan11@yahoo.com

''کھالوں کو صاف کرتے ہیں؟''
''ہاں جی۔ ڈاکیا لطیف یہی بتا رہا تھا۔ کھالوں کو دھوتے اور سُکھاتے ہیں۔''
کچھ دیر بعد گلزار چلا گیا مگر میں بے چینی سے اپنے مختصر کمرے میں ٹہلتا رہا۔ میرا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ رگوں میں جوان خون اچھالے مار رہا تھا۔ میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ والی جی کی حالت اس تھکے ہوئے بوڑھے بادشاہ کی سی ہے جو حالات سے سمجھوتا کرنے پر مجبور ہو چکا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جتنا وقت بھی خیر و عافیت سے گزر جائے، غنیمت ہے۔ اس کی کمزوری اور مصلحت اندیشی اس کے ساتھیوں پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے اور وہ بھی حالات سے نظریں چرا رہے ہیں۔
موکھلوں نے دھمکی دی تھی کہ وہ مجھے ڈھونڈیں گے اور میں جہاں بھی ملوں گا، وہ میری ہڈی پسلی توڑ کر چارپائی پر ڈال دیں گے... تو میں کیوں اس انتظار میں رہتا کہ وہ مجھے ڈھونڈیں اور میرے ساتھ اپنا کھاتا کھولیں... کیوں نہ میں خود انہیں ڈھونڈ لیتا اور ان سے کہتا کہ، بھئی! جو سانپ تم نے نکالنا ہے، آج ہی نکال لو۔
میں نے ساری صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ اس وقت والی جی کے بہت سے عزیز اور یار دوست حویلی میں جمع تھے۔ چالیس پچاس مسلح کارندے بھی جمع ہو چکے تھے۔ والی جی کے اپنے کارندے بھی الرٹ نظر آتے تھے۔ تو جو کچھ بعد میں ہونا تھا، کیوں نہ آج ہی ہو جاتا۔ میں جو کچھ سوچ رہا تھا، اس میں والی جی اور ان کے ساتھیوں کے ناراض ہونے کا اندیشہ تو تھا، مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ خاموشی ہمیں زیادہ مہنگی پڑے گی۔
سہ پہر دو ڈھائی بجے کا وقت تھا جب میں نے عسکری سے پوچھا کہ اب باغ والے ڈیرے پر کون ہے؟
''کوئی بھی نہیں۔ سارے وہاں سے آگئے ہیں؟''
''اس طرح ڈیرا خالی چھوڑنے سے تو ان کی ہمت اور بڑھے گی۔''
''دراصل موکھلوں کا ایک کھُوہ ہمارے ڈیرے سے بس دو پیلی (کھیتی) کے فاصلے پر ہے، ابھی موکھل بھُوتے ہوئے ہیں۔ اگر ڈیرے پر ہمارے بندے ہوئے تو پھر لڑائی ہو سکتی ہے۔''
''تو لڑائی کے ڈر سے اب ڈیرا خالی رہے گا؟''
''نہیں... بس وقتی طور پر۔ کل تک معاملہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے گا تو نصر اللہ وغیرہ چلے جائیں گے۔''
''پر وہاں جو آگ لگائی گئی تھی، وہ پھر بھڑک اٹھی ہو گا؟''
''ہاں، یہ ڈر تو ہے۔'' عسکری نے کہا۔
''میں ڈیرے کا چکر لگانے جا رہا ہوں۔'' میں نے پورے عزم سے کہا۔
عسکری نے مجھے گھورا۔ ''نہیں نہیں... یہ ٹھیک نہیں، معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔''
''اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ٹھیک ہو جائے۔ آج کل رواج ہی یہ ہے۔ ڈرنے والے کو اور ڈرایا جاتا ہے... میں اپنے ڈیرے پر جا رہا ہوں، کسی دوسرے کی حد میں نہیں گھس رہا۔''
''والی جی نے بہت ناراض ہونا ہے۔''
''تو ہو جائیں ناراض۔ نوکری سے ہی نکال دیں گے۔''
''تم ان سے خود بات کر لو۔ ہو سکتا ہے، اجازت دے دیں۔''
''تم خود بات کر لو چاچا... ان سے کہنا، خاور ڈیرے کا چکر لگانے گیا ہے۔ ہوا چل رہی ہے، دیکھنے گیا ہے کہ کہیں آگ پھر نہ بھڑک اٹھے۔''
چاچا عسکری مجھے روکتا رہ گیا۔ میں آناً فاناً گھوڑی پر بیٹھا اور حویلی کے پھاٹک سے نکل آیا۔ اردگرد موجود کارندے مجھے پُرتجسس نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ بات ہر کسی کے کان تک پہنچ چکی تھی کہ اکیلے ایک بندے نے موکھلوں کے چھ سات بندوں کی دوڑ لگوائی ہے۔
بھرا ہوا پستول میری قمیص کے نیچے تھا۔ میں راستوں پر گھوڑی دوڑاتا ہوا بیس پچیس منٹ میں باغ والے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ دو جلے ہوئے کمروں میں سے اٹھنے والا ہلکا ہلکا دھواں دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ میں نے گھوڑی ڈیرے کے اندر داخل کر دی۔ توڑ پھوڑ کے آثار نظر آ رہے تھے۔ ایک دو دیواروں پر گولیاں لگی ہوئی تھیں۔ سامنے ہی قریباً دو کھیتوں کے فاصلے پر موکھلوں کا کھُوہ تھا۔ کھُوہ کو ایک اونچی رہی تھی۔ موکھلوں کے گھوڑے اور ان کے مسلح کارندے پھرتے صاف نظر آ رہے تھے۔
میں نے ہینڈ پمپ چلایا اور ملبے میں سے جہاں جہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا، وہاں چھڑکاؤ کیا۔ میری نظریں اور میرے کان موکھلوں کے کھُوہ کی طرف ہی لگے ہوئے تھے۔ پھر ایک دم میرے سینے میں دھڑکن کا نقارہ گونج اٹھا۔ میں نے موکھلوں کے آٹھ دس گھڑ سوار دیکھے، وہ کھُوہ کی طرف سے تیزی کے ساتھ ڈیرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے

پیچھے دس پندرہ پیدل کارندے بھی تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں چمکارے مار رہی تھیں۔ ان کے پگڑ اور رنگ برنگے لاچے، جیسے جوش سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔
میں نے اپنے عقب میں راجوال کی طرف دیکھا۔ راجوال سے آنے والا راستہ خالی دکھائی دیتا تھا مگر مجھے امید تھی کہ یہ زیادہ دیر خالی نہیں رہے گا۔ مجھے یقین تھا کہ عسکری کی اطلاع کے بعد والی جی نے میرے پیچھے گھڑ سوار روانہ کر دیے ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ ان گھڑ سواروں سے کہا گیا ہو، وہ مجھے ڈیرے سے بہ حفاظت واپس لے آئیں۔
دو تین منٹ میں موکھل میرے سر پر پہنچ گئے۔ مجھے ٹھیک سے پہچاننے کے بعد ان کی آنکھیں قہر برسانے لگیں۔ چھوٹا موکھل سب سے آگے تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ جست لگا کر گھوڑے سے اترا اور پھنکارا۔ ''اچھا ہے تُو خود چل کر آ گیا ہے۔ نہیں تو ہم نے تو تجھے تیری ماں کی بغل میں سے بھی کھینچ کر نکال لینا تھا۔''
ایک دوسرا شخص بولا۔ ''لگتا ہے، جوانی کچھ زیادہ ہی اچھالے مار رہی ہے اس کے اندر۔'' پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''چلو بھئی! نکالو اس کا چار پانچ سیر خون... طبیعت بحال کرو ذرا اس کی۔''
چار پانچ افراد گھوڑوں سے چھلانگیں لگا کر نیچے اتر آئے۔ انہوں نے رائفلیں میری طرف سیدھی نہیں کی تھیں۔ میں نے بھی پستول نہیں نکالا۔ وہ مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ڈر بھی رہے تھے۔ یقیناً ان کی آنکھوں کے سامنے آج صبح والے مناظر گھوم رہے تھے... پھر اچانک ایک شخص کا داؤ چل گیا۔ اس پہلوان نما شخص نے پیچھے سے آ کر وزنی لاٹھی کی بھرپور ضرب میرے سر کے عقبی حصے پر لگائی۔ لاٹھی نے ہوا کو کاٹتے ہوئے جب ''شائیں'' کی آواز پیدا کی تو مجھے خطرے کا احساس ہوا لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچے اور میں گھٹنوں کے بل گر گیا۔ موکھلوں کے بندے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ پہلوان نما شخص نے مجھے پیچھے سے اپنے جن جپھے میں جکڑ لیا اور باقی اندھا دھند مارنے لگے۔ وہ بے دریغ مجھ پر گھونسے، ٹھوکریں برسا رہے تھے۔ اچانک مجھے موقع مل گیا۔ میں نے پہلوان کی ناک پر سر کے پچھلے حصے کی ٹکر رسید کر کے خود کو اس کے جن جپھے سے چھڑا لیا۔ اس کے ساتھ ہی آج سویرے والا منظر پھر دُہرایا جانے لگا۔ میں نے اپنے اردگرد موجود افراد کو کڑے ہاتھوں لیا۔ میری دھواں دھار ٹکروں اور گھونسوں نے ان میں کھلبلی مچا دی۔ بہر حال، وہ تعداد میں زیادہ تھے۔ کسی بھی وقت میں چاروں شانے چت ہو سکتا تھا۔
یہی وقت تھا جب مجھے کمک مل گئی۔ ڈیرے کے عقب سے ہوائی فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں پھر میرے گھڑ سوار ساتھی للکارے مارتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ان میں میرا لنگوٹیا یار تیمور... باگو، ملتانی اور چاچا عسکری سب سے آگے تھے۔
''تگڑا ہو جا خاور ے! ہم آگئے ہیں۔'' تیمور نے نعرۂ مستانہ بلند کیا۔
پلک جھپکتے میں ڈیرے کے اندر اور باہر گھمسان کا رن پڑ گیا۔ دونوں طرف سے زبردست لاٹھیاں چلنے لگیں۔ شروع میں دونوں فریقوں نے گولی چلانے سے گریز کیا۔ لیکن پھر کسی ایک کی طرف سے گولی چلائی گئی اور اس کے ساتھ ہی صورتِ حال سنگین تر ہو گئی۔ تڑاتڑ فائرنگ ہونے لگی۔ میں نے موکھلوں کے ایک بندے کو گولی کھا کر بھینس کی کھُرلی میں گرتے ہوئے دیکھا۔ چاچے عسکری کو گولی لگی اور وہ کراہتا ہوا میرے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ میں بھی اپنا پستول نکال چکا تھا۔ ایک دیوار کی آڑ لے کر میں بھی گولی چلانے لگا۔ لگتا تھا کہ صورتِ حال خراب تر ہو جائے گی اور آٹھ دس لاشیں گر جائیں گی مگر اچانک درختوں کی طرف سے سیٹیوں کی آواز سنائی دی۔ یہ پولیس کے گھڑ سوار تھے جو درختوں سے نکل کر موقعۂ واردات کی طرف بڑھ رہے تھے۔
''نکل جاؤ بھئی!'' میرے کانوں میں چھوٹے موکھل کی آواز پڑی۔
دیکھتے ہی دیکھتے موکھل اور اس کے کارندے اور عزیز اپنے کنوئیں کی طرف واپس بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ سب کماد کی لمبی فصل میں گھس گئے۔ بس گھڑ سواروں کے بالائی دھڑ فصل سے باہر نظر آتے رہے۔
میرے اندازے کے مطابق پولیس والوں نے بھی جان بوجھ کر دیر لگائی تا کہ موکھلوں کو بھاگنے کا موقع مل جائے اور خواہ مخواہ ان کا پولیس سے ٹاکرا نہ ہو۔
موقعے پر تقریباً تین منٹ تک فائرنگ ہوئی تھی۔ تاہم اس فائرنگ میں کوئی شدید جانی نقصان نہیں ہوا۔ دونوں طرف کے دو دو بندے زخمی ہوئے۔ ہاں، لاٹھیوں وغیرہ کے زخم کافی لوگوں کو آئے۔ موکھلوں کا ایک اضافی نقصان بھی ہوا۔ ان کے ایک قیمتی گھوڑے کے سر میں رائفل کی گولی لگی اور وہ مردہ حالت میں ڈیرے کے سامنے ہی پڑا رہ گیا۔

اس لڑائی میں کسی کی ہار جیت تو نہیں ہوئی تھی، تاہم اس سے راجوال والوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ ان کا حوصلہ بلند ہو گیا۔ خاص طور سے حویلی کے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ موکھلوں سے ٹکر لینا ناممکن نہیں ہے۔ ان کی اینٹ کا جواب پتھر سے نہ بھی دیا جا سکے تو کم از کم اینٹ سے ضرور دیا جا سکتا ہے۔

پولیس نے دونوں پارٹیوں کے تین تین بندوں کو حراست میں لیا۔ موکھلوں کی طرف سے جو پرچہ درج کروایا گیا، اس میں میرا نام نمایاں تھا۔ تھانے دار افضال ساہی مجھے گرفتار کرنا چاہتا تھا مگر والی جی نے میری گرفتاری دینے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کا اثر و رسوخ کام آیا اور تھانے دار نے تعداد پوری کرنے کے لیے ایک اور کارندے کی گرفتاری ڈال دی۔

درحقیقت اس لڑائی کے بعد والی جی اور ان کے قریبی ساتھیوں نے خود کو ایک دم ہلکا پھلکا اور خوش باش محسوس کیا۔ موکھلوں کی زیادتی کا جواب نہ دے سکنے کا جو ذہنی احساس ان کے دلوں کو افسردہ کر رہا تھا، وہ اب ختم ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس واقعے کے بعد میرا بھی خاصا چرچا ہوا۔ خاص طور سے یہ بات دیکھتے ہی دیکھتے ہر ایک کی زبان پر آ گئی کہ میں نے پچھتی فارم کی لڑائی میں تن تنہا موکھلوں کے چھ سات بندوں کو بھگایا ہے۔ اپنے ساتھیوں اور گاؤں کے لوگوں کی آنکھوں میں، میں تحسین کے جذبات صاف طور پر محسوس کر رہا تھا۔ رونق علی میری کارکردگی کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا تھا۔ وہ مجھے... اپنی دریافت سمجھتا تھا اور اس وجہ سے میری کسی کامیابی کی خوشی اسے ضرورت سے زیادہ ہوتی تھی۔

چاچے عسکری کی مرہم پٹی پہلے گاؤں میں کی گئی۔ پھر اسے مزید علاج اور ڈاکٹری ملاحظے کے لیے ڈسکے بھیج دیا گیا۔ گولی اس کے ماس کے اندر رہی تھی۔ چاچے عسکری کے ڈسکے جانے سے مجھے ایک بار پھر اس کے کمرے میں سونے اور بیگم بلقیس سے رات کو باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ بیگم بلقیس کا فون رات دس بجے کے لگ بھگ آیا۔ انہوں نے سب سے پہلے میری خیر خیریت پوچھی پھر مسکراتے لہجے میں بولیں۔

"ہر طرف تمہاری ہی باتیں ہو رہی ہیں بھئی۔ سارے تمہاری تعریف کر رہے ہیں۔"

"مجھے ساروں سے کوئی غرض نہیں۔ اگر آپ اور والی جی مجھ سے خوش ہیں تو پھر میرے لیے واقعی خوشی کی بات ہے۔"

"والی جی بھی خوش ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہارے سامنے تمہاری زیادہ تعریف نہیں کر رہے کہ کہیں تم زیادہ ہی نڈر نہ ہو جاؤ لیکن وہ اندر سے بہت خوش ہیں۔ کہہ رہے تھے، اس منڈے میں بات ہے۔"

"اور آپ کیا کہتی ہیں؟"

"ہاں بھئی... منڈے میں بات ہے۔" انہوں نے اور دبی آواز میں ہنسنے لگیں۔ پھر ذرا سنبھل کر بولیں بہت خطرناک ہو۔ تم جان بوجھ کر باغ والے ڈیرے تھے۔ آگ دیکھنے کا تو بس بہانہ ہی تھا۔ تم چاہتے تھے ہونا ہے، آج ہو جائے۔"

میرے جسم پر کئی چھوٹی موٹی چوٹیں تھیں مگر لحاف کی گوار گرمی اور بیگم جی کی باتوں کی مزے دار حرارت ساری تکلیف بھلا دی۔ یخ بستہ، سرسراتی ہوئی رات آغوش میں ہماری باتیں طویل ہوتی چلی گئیں۔ بہت جلد اپنی اصل ڈگر پر آ گئے۔ وہ ڈگر جس پر چلتے ہوئے عجیب سے جوش کا احساس ہوتا تھا۔ سانسیں تیز چلنے لگتی تھیں، دھڑ بڑھ جاتی تھی۔ بدن میں میٹھا میٹھا... لذت دیتا ہوا درد تھا اور کسی کو حقیقت میں چھونے اور محسوس کرنے کی خواہش بہت بڑھ جاتی تھی۔ ہم اب بہت بے باک ہو چکے تھے۔ خاص طور سے میں کچھ زیادہ ہی کھلتا جا رہا تھا۔ میں نے ہونٹوں سے چومنے کی آواز پیدا کی اور کہا۔ "پوچھیں، کہاں پیار کیا؟"

وہ شرم سے بوجھل لہجے میں بولیں۔ "کہاں؟"

"پیشانی پر... اور اب؟" میں نے دوبارہ چومنے کی آواز نکالی۔

"کہاں؟"

"آپ کی پیاری سی ناک پر... اور اب؟" پھر چومنے کی آواز نکالی۔

"کہاں؟"

"آپ کے... ہونٹوں... پر۔"

اور پھر یہ سلسلہ حسب معمول چلتا رہا۔ بمبوکاٹ پر ہماری سرگوشیاں سرسراتی رہیں۔ کچھ دیر بعد بیگم جی نے ایک گہری درد بھری سانس لی اور بولیں۔ "خاور! ڈر لگ رہا ہے۔"

"کس سے؟"

"اس سے آگے جانے سے۔"

"کیا مطلب؟"

"ہم یہاں تک تو آ گئے ہیں۔ اب اس کے بعد جو کچھ ہوگا، وہ بہت خطرناک ہے۔ تم جانتے ہی ہو، یہ مردوں کی دنیا ہے۔ ان کی بڑی بڑی غلطیاں معاف ہوتی ہیں مگر عورت چھوٹی سی غلطی پر قیامت آ جاتی ہے... اور پھر ایسی عورت بیاہی ہوئی بھی ہو۔"

"بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔" میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

وہ بولیں۔ "کبھی تم نے سوچا ہے کہ جو کچھ... ہم کر رہے ہیں اس کا آخر کیا ہوگا۔ وہ کیا کہتے ہیں، انجام!"

"ذہن میں سوچ تو آتی ہے لیکن پھر آپ کی سوچ اتنی تیزی سے آتی ہے کہ باقی ہر سوچ پر حاوی ہو جاتی ہے۔"

"پر میں سوچتی ہوں اور ایک دم کانپ جاتی ہوں۔"

میں خاموش ہو گیا۔ بیگم جی کو اندازہ ہوا کہ گفتگو کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گئی ہے اور میں بھی ایک دم بجھ گیا ہوں۔ انہوں نے میری ٹمٹماتی روشنی کو تیز کرنے کے لیے ایک دم موضوع بدلا اور ہنستے ہوئے بولیں۔ "آج کل گھر میں ہر وقت تمہاری ہی باتیں ہوتی رہتی ہیں... حامد بھی کسی نہ کسی بہانے تمہارا ذکر چھیڑتا رہتا ہے۔ آج ماسٹر چاچا نے مجھے شاباش دی... آج ماسٹر چاچا نے میرے ساتھ گیند بلا کھیلا۔ کل میں اور ماسٹر چاچا مچھلیاں پکڑنے جائیں گے... پرسوں پتا ہے نا، تم سارا دن اندر نہیں آئے تھے۔ پتا ہے والی جی نے کیا کہا؟"

"کیا کہا؟"

"نہیں... رہنے دو۔" وہ ادا سے بولیں۔

"دیکھیں، اب آپ آدھی بات کر رہی ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں۔"

وہ شرمیلے انداز میں ہنس کر کہنے لگیں۔ "شام کے وقت والی جی مجھ سے بولے، صبح سے میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں کہتا تھا کہ ایک دو گولی لے کر کھاؤں گا مگر وہ تمہارا چہیتا ماسٹر صاحب آج آیا ہی نہیں۔ میں ایک دم ٹھٹک گئی۔ میں نے کہا، میرا چہیتا کیوں ہونے لگا؟ چہیتا تو آپ کا ہے۔ ایک دن نظر نہ آئے تو آپ کو اداسی ہونے لگتی ہے۔ مسکرا کر کہنے لگے، چلو میرا ہی سہی لیکن وہ ہے کہاں؟"

بیگم جی کی بات نے مجھے بھی ٹھٹکا دیا۔ پتا نہیں کیوں، کبھی کبھی مجھے بھی احساس ہوتا تھا کہ والی جی اتنے بے خبر نہیں، جتنا ہم انہیں سمجھتے ہیں۔ انہیں کچھ نہ کچھ خبر ہے۔ اگر خبر ہے تو پھر وہ چپ کیوں ہیں؟ کیا جان بوجھ کر ڈھیل دے رہے ہیں؟ کیا وہ پکے ثبوتوں کے ساتھ پکڑنا چاہتے ہیں؟ کیا ان کا خیال ہے کہ ہمارا تعلق صرف ہنسنے بولنے تک محدود رہے گا اور وہ اس حوالے سے تھوڑی سی رعایت دے رہے ہیں؟ کئی سوال ذہن میں ابھرے لیکن حتمی جواب کوئی نہیں تھا۔

ہماری گفتگو نے ایک بار پھر رومانی انداز اختیار کیا اور رات ڈھائی تین بجے کے قریب ختم ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں، میں جب بھی کوئی فقرہ شروع کرنے سے پہلے کہتا... "یقین کریں..." وہ فوراً ذرا شوخی سے میری بات کاٹتیں اور کہتیں... "نہیں کرتی۔" ان کی سوالیہ "بس؟" کی طرح یہ بھی ان کی ایک خوب صورت ادا تھی... انسان کی فطرت ہے کہ وہ ایک جگہ ٹھہرنا نہیں چاہتا۔ دلکش سے دلکش مناظر بھی بہت جلد اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی کشش کھو دیتے ہیں۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ نئے رستے اور نئے منظر دیکھنا چاہتا ہے۔ دیوار کے پار کیا ہے؟ اس پہاڑ کی دوسری طرف کیا ہے... سمندر کا اگلا کنارہ کہاں ہے؟ اس طرح کے سوالوں کے بیج قدرت نے انسان کی فطرت میں بو دیے ہیں۔

چند اور راتیں گزریں اور پھر بمبوکاٹ پر ہونے والی گرما گرم گفتگو بھی مجھے کم دلچسپ محسوس ہونے لگی۔ اس گفتگو کے عموماً تین حصے ہوتے تھے۔ ایک حصے میں بیگم بلقیس اپنی گھریلو باتیں کرتی تھیں، اپنے میکے اور اپنے بھائی بہنوں کی باتیں سناتی تھیں۔ ایک حصے میں میری درخواست پر وہ اپنی آواز کا جادو جگاتی تھیں۔ ہیر پڑھتی تھیں، کوئی لوک گیت گاتی تھیں اور آخر میں ہمیشہ بڑی ادا سے پوچھتی تھیں... بس؟ گفتگو کا تیسرا حصہ خالص رومانی ہوتا تھا۔ ہم تصور میں ایک دوسرے کے بالکل قریب آ جاتے تھے۔ لیکن اب تصور کی دلکشی کم ہوتی جا رہی تھی اور حقیقی لمس کی ضرورت بڑھ رہی تھی۔ کم از کم میرے ساتھ تو ایسا ہی تھا۔

پھر ایک رات ایک عجیب اتفاق ہوا۔ میں اپنے گاؤں مراد پور سے والی جی کے لیے باداموں والی دوا لے کر آیا۔ یہ دوا میری بے بے جی ہم بہن بھائیوں کے لیے بنایا کرتی تھیں اور خاص طور سے میرے لیے کیونکہ میں پڑھائی میں سر کھپایا کرتا تھا۔ اب ذرا یہ بھی سن لیں کہ یہ دوا کیا تھی؟ ایک سیر جھلے اور کوٹے ہوئے باداموں میں ایک سیر چینی اور ایک سیر دیسی گھی! باداموں کو یہاں تک بھونا جاتا تھا کہ وہ نیم سرخ ہو جائیں۔ اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کتنی مزے دار چیز ہوتی ہوگی۔ پھر بے بے جی اس کو دوائی کیوں کہتی تھیں، اس میں بھی ایک رمز تھی۔ یہ مٹھائی (یعنی دوائی) عام طور پر میری دماغی توانائی کے لیے بنا کرتی تھی۔ لیکن چھوٹی بہن عارفہ اور اس کی دو تین سہیلیاں از حد چٹوری تھیں۔ وہ اس کشتے پر بھی ہاتھ صاف کر جاتی تھیں، لہٰذا بے بے جی نے اسے دوائی کا نام دے دیا تھا اور مجھے دو ٹائم کھلاتی تھیں دوائی کے انداز میں تھیں۔ دو پنچ بھر کر منہ میں ڈالتی تھیں اور اوپر سے کاڑھنی کا گرم گرم دودھ پلا دیتی تھیں۔

میں نے بے بے جی سے خاص فرمائش کر کے یہ دوا والی جی کے لیے بنوائی تھی... جب میں راجوال پہنچا تو رات کے نو بج رہے تھے۔ میں نے انٹر کام یعنی بمبوکاٹ کے ذریعے والی

جی کو بتانا چاہا کہ میں دوا لے کر آ گیا ہوں۔ والی جی کے بجائے بیگم بلقیس سے رابطہ ہوا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں دوا لے آیا ہوں۔

وہ بولیں۔ ''وہ شام سے تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ابھی جاگ رہے ہیں، تم لے آؤ۔''

''ٹھیک ہے۔ میں دس پندرہ منٹ میں آ رہا ہوں۔''

راستے میں ایک جگہ گھوڑی پھسل گئی تھی اور میرے کپڑے کیچڑ میں لتھڑ گئے تھے... میں نے ٹرنک میں سے نکال کر نیا لاچہ کرتا پہنا اور منہ ہاتھ دھویا۔ حویلی کے اندر پہنچا تو زنان خانے کے دروازے پر ہی بیگم بلقیس کھڑی تھیں۔ رات کے سناٹے نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ایک دو کمروں میں ہی لالٹینوں کی روشنی تھی۔ میں نے دوا والا وزنی شاپر جو تھیلے میں محفوظ تھا، بیگم بلقیس کو تھما کر واپس جانا چاہا تو وہ بولیں۔ ''انہیں خود دو... اور استعمال کا طریقہ بھی بتاؤ۔''

میں بیگم بلقیس کے پیچھے چلتا اور ان کی کمر کے دلکش بلکوروں کو چور نظروں سے دیکھتا ہوا، والی جی کے کمرے تک پہنچا۔ وہ رنگین پلنگ پر نیم دراز تھے۔ شہنیل کا نہایت خوب صورت لحاف ان کے سینے تک کھچا ہوا تھا اور وہ سو چکے تھے۔

انہیں سوتا دیکھ کر میں اور بیگم بلقیس واپس پلٹ آئے۔ اردگرد کوئی نہیں تھا۔ اندرونی کمروں کے اندر سے گزرتے ہوئے میرا دل یک دم نہایت شدت سے دھڑکنے لگا۔ بیگم بلقیس مجھ سے ایک قدم آگے تھیں۔ میں نے اچانک ان کا بازو تھام کر انہیں روک لیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکیں۔ وحشی ہرنی کی طرح دائیں بائیں دیکھا۔ پھر دیوار کے ساتھ لگ گئیں۔ انہوں نے اپنا رخ اسیار رکھا تھا کہ اگر خدانخواستہ والی جی یا فیروزاں میں سے کوئی جاگتا یا ہماری طرف آتا تو وہ اسے دیکھ سکتی تھیں۔ یقیناً انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ دو پیار کرنے والوں کے درمیان شاید کوئی خفیہ زبان ہوتی ہے جو وہ ایک دوسرے کی خواہشات اور نیتوں کو سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ایک دو سیکنڈ کے لیے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر پھر مجھے آگے بڑھنے کی اجازت دے دی۔ میں نے انہیں بانہوں میں بھر لیا۔ ان کا لمس میرے لیے ناقابلِ فراموش تھا۔ یہ ایک ناقابلِ بیان کیفیت تھی۔ میرے ہونٹ ان کے چہرے سے ہم کلام ہوئے۔ میرے پاؤں جیسے زمین پر نہیں تھے، میں ست رنگی ہواؤں کے دوش پر اڑ رہا تھا۔ انہوں نے بھی عجب دلیری اور الہڑپن سے میرے رخسار کو چوما۔ یہ صرف تیس چالیس سیکنڈ تھے مگر صدیوں جیسی تاثیر رکھتے تھے۔

اچانک بیگم بلقیس نے مجھے جھٹکے سے پیچھے دھکیل دیا۔ کوئی آ رہا تھا۔ وہ مڑیں اور تیزی سے ایک قریبی دروازہ کھول کر اس میں اوجھل ہو گئیں۔ میں بھی خود کو سنبھال کر برآمدے کی طرف مڑ گیا۔ دفعتاً چودھری عزیز کی بھاری بھرکم آواز نے میرے قدم روک لیے۔ ''کون ہے؟'' چودھری نے بلند آہنگ میں پوچھا۔

''میں ہوں جی خاور۔'' میں نے رکتے ہوئے جواب دیا۔

چودھری کے ہاتھ میں حقے کی، لوہے کی پتریوں والی چلم تھی۔ آج شاید وہ پھر رات کے وقت چلم کے لیے گڑ ڈھونڈنے نکلا ہوا تھا۔ ''یہاں کیا کر رہے ہو؟'' چودھری نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''مراد پور سے والی جی کے لیے دوائی لے کر آیا ہوں۔ وہی دینے آیا تھا۔''

''والی جی تو سو رہے ہیں۔ ابھی تمہارے ساتھ کون تھا یہاں؟''

''کوئی بھی نہیں جی۔''

چودھری عزیز نے شک بھری نظروں سے دائیں بائیں دیکھا پھر نہایت خشک لہجے میں بولا۔ ''رات کو اس طرح یہاں نہ آیا کرو۔ کوئی چیز بھیجنی ہو تو منشی منظور یا بابے گلاب کے ہاتھ بھیجا کرو۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' میں نے کہا اور کان لپیٹ کر واپس آ گیا۔

اگلے چوبیس گھنٹوں تک مجھے دھڑکا لگا رہا کہ کہیں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو گئی ہو۔ اس رات بیگم بلقیس سے بمبوکاٹ پر رابطہ بھی نہیں ہو سکا۔ تاہم آثار سے نظر آتا تھا کہ خیریت ہی ہے۔ بیگم بلقیس کے لمس کا تصور ایک تیز نشے کی طرح میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ میں جتنی مرتبہ ان دلکش لمحوں کو یاد کرتا تھا، اتنی مرتبہ ایک سرور انگیز کیفیت سے لبریز ہو جاتا تھا۔ تین چار ماہ پہلے تک میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ بیگم بلقیس جو میرے لیے آسمان پر چمکنے والے ایک دور دراز ستارے کی طرح ہیں، میرے اس قدر قریب ہو جائیں گی... میں نے اپنے بازو پر جلنے کا پرانا نشان دیکھا اور اپنے سابقہ خیالات پر خود ہی مسکرانے لگا۔ میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ اگر زندگی میں کبھی بیگم بلقیس کو چھونے کا موقع آیا بھی تو میں صرف ان کے ہاتھوں کو چھوؤں گا۔ اس سے آگے نہیں... ہرگز نہیں۔ وہ سارے خام خیال، وقت کے دھارے میں تنکوں کی طرح بہہ گئے تھے۔ اب میں آگے کی سوچ رہا تھا... اور آگے کی سوچ رہا تھا۔ بدن میں بار بار بے حد میٹھا درد جاگتا تھا۔ یہ درد کمر کے

زیریں حصے سے شروع ہوتا تھا، پورے بدن میں سرسراتا اور سینے میں پہنچ کر آگ کی طرح دہکنے لگتا تھا۔ میں تصور ہی تصور میں بیگم بلقیس کے قریب ہوتا تھا، قریب تر ہوتا تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ عقل، ہوش اور مصلحت کے ساتھ اس کا تعلق کم کم ہی ہوتا ہے۔

بیگم بلقیس سے رابطہ دوسرے دن بھی نہیں ہوا۔ میں سہ پہر کے وقت حامد کو پڑھانے گیا۔ وہاں بھی عجیب طرح کی سرد مہری محسوس ہوئی۔ بیگم بلقیس سامنے آئیں نہ انہوں نے حسبِ معمول کھانے کی کوئی شے بھیجی۔ تاہم بھی دکھائی نہیں دی۔ رات کو بھی میں منتظر رہا مگر خاموش بمبوکاٹ میں جان نہیں پڑی۔ شاید وہ دور رہ کر میری تڑپ کو بڑھا رہی تھیں یا پھر ہو سکتا ہے، اس میں شرم، جھجک وغیرہ کا عمل دخل ہو۔

تیسری رات گیارہ بجے کے لگ بھگ انٹرکام کی بیل ہوئی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف بیگم بلقیس تھیں۔ وہ بہت مدھم لہجے میں بول رہی تھیں اور ان کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''خاور! کام بہت خراب ہو گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے... والی جی کو... سارا پتا چل گیا ہے۔''

''کک... کیا مطلب؟''

''شاید عزیز بھاجی نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے والی جی کے بہت کان بھرے ہیں۔ اور مجھے لگتا ہے کہ...'' بیگم بلقیس کی آواز بھرا گئی اور وہ بول نہ سکیں۔

''کیا لگتا ہے آپ کو؟''

''مجھے لگتا ہے کہ شاید دو چار دن پہلے والی جی نے بھی کہیں مجھے فون پر باتیں کرتے سن لیا ہے۔ وہ چار پانچ دن سے چپ چپ تھے اور پرسوں والی بات کے بعد تو وہ بالکل ہی چپ ہیں۔ دو دن سے انہوں نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ مجھ سے اور حامد سے بات تک نہیں کرتے۔ اب بھی شام سے کمرے میں بند ہیں۔ اندر سے کنڈی لگائی ہوئی ہے۔ مم... مجھے تو ڈر لگ رہا ہے خاور!'' وہ سسک پڑیں۔

''آپ حوصلہ رکھیں۔ کچھ نہیں ہو گا۔'' میں نے کہا تاہم اپنی آواز کا کھوکھلا پن خود مجھے بھی محسوس ہوا۔

لائن پر کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر بیگم بلقیس کی دھیمی آواز ابھری۔ ''خاور! ہم سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔ پر جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ نہ ہو کوئی بڑی مصیبت پڑ جائے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

''لیکن اگر...''

''نہیں خاور... کچھ مت کہو۔ جو میں نے کہا ہے، وہ کرو۔ اب تم چلے جاؤ یہاں سے... اور ہو سکے تو کچھ دنوں کے لیے شہر کی طرف نکل جاؤ... اور خاور! پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا...'' آخری الفاظ کہتے ہوئے ان کی آواز پھر بھرا گئی۔

''آپ سے دور کیسے رہوں گا؟''

''سمجھو میں مر گئی ہوں تمہارے لیے... اب میں پھر فون نہیں کر سکوں گی... خدا حافظ!'' انہوں نے کہا اور جلدی سے انٹر کام بند کر دیا۔

میں اپنی جگہ سناٹے میں بیٹھا رہ گیا۔ خیالات کے حسین محل ٹوٹ کر بکھر گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ بہرحال، یہ بات تو ظاہر تھی کہ یہاں میرے لیے سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اب مجھے یہاں سے جانا ہو گا۔

اگر مجھے جانا تھا تو پھر میرے لیے بہتر تھا کہ رات کے اندھیرے میں خاموشی سے ہی نکل جاؤں۔ میرا سامان تو تھا لیکن مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ اس سامان میں سے مجھے بس دو چار چیزیں ہی زیادہ عزیز تھیں۔ ان کا تعلق بیگم بلقیس سے تھا۔ ایک بغیر بازو کا سویٹر تھا جو انہوں نے مجھے دیا تھا۔ بعد ازاں انہوں نے رازداری سے بتایا تھا کہ یہ انہوں نے خود بُنا ہے۔ ایک وہ رومال تھا جو بیگم بلقیس نے تحفتاً لکھتے ہوئے استعمال کیا تھا۔ اس سے انہوں نے اپنی سیاہی میں لتھڑی ہوئی انگلیاں پونچھیں تھیں۔ اس طرح کی ایک دو چیزیں اور تھیں۔ یہ چیزیں اور کچھ دیگر سامان میں نے ایک چھوٹے بیگ میں ڈال لیا۔ میں خوف زدہ بالکل نہیں تھا۔ ہاں، یہ خیال ضرور تھا کہ میرے یہاں موجود رہنے سے بیگم بلقیس کی مصیبت میں اضافہ نہ ہو جائے۔

میں نے اصطبل سے اپنی گھوڑی نکالی اور روانہ ہو گیا۔ نصر اللہ اور ایک دوسرے ساتھی نے پوچھا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ میں نے گول مول بات کی اور انہیں بتایا کہ ایک ضروری کام سے گاؤں جانا پڑ گیا ہے۔ یہ چاندنی رات تھی۔ ہوا خاصی بستہ تھی۔ میں عجیب کیفیت میں اس گاؤں کو چھوڑ رہا تھا جہاں پچھلے چند ماہ کے اندر مجھے زندگی کی انوکھی خوشیاں ملی تھیں۔ جہاں میرے اندر جینے اور آگے بڑھنے کی بے مثال ترنگ جاگی تھی۔ ہاں، یہی گاؤں تھا جہاں ایک حویلی تھی، حویلی میں ایک کچا کمرا تھا۔ کمرے میں ایک بمبوکاٹ تھا۔ سرد تاریک راتوں میں اس کمرے کے اندر انگیٹھی کی خوش نما روشنی میں بمبوکاٹ کے اندر زندگی جاگتی تھی اور اس کی آواز میں دنیا جہان کے رنگ سمٹ آتے تھے۔ گھوڑی آگے بڑھ رہی تھی اور سب کچھ پیچھے رہتا جا رہا تھا۔ گھوڑی کے قدم بھی جیسے افسردگی کے عالم میں اٹھ رہے تھے... جیسے وہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ میں ہمیشہ کے لیے یہ گلی کوچے چھوڑ جاؤں۔ میرا

ارادہ تھا کہ گاؤں سے چھ سات میل آگے آنے کے بعد گھوڑی کو چاچے عسکری کے پنڈ میں اس کے گھر چھوڑ دوں گا۔ وہاں سے کوئی اسے خود ہی راجوال پہنچا دے گا۔ یوں تو یہ گھوڑی والی جی نے مجھے دی ہوئی تھی مگر جب میں ان کا ملازم ہی نہیں رہا تھا تو پھر گھوڑی بھی میری نہیں تھی۔

رات کے وقت دیہاتی علاقے کا جو عالم ہوتا ہے، وہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ آج فرق صرف یہ تھا کہ چاندنی رات تھی اور سردی معمول سے زیادہ تھی۔ میں نے اپنا منہ، سر اچھی طرح گرم صافے میں لپیٹ رکھا تھا۔ لوئی کی بکل بھی ماری ہوئی تھی، اس کے باوجود ٹھنڈی ہوا سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ میرے آگے ایک چوراہا سا تھا۔ اچانک میں چونکا۔ کیچڑ میں لتھڑا ہوا ایک ٹریکٹر بڑی تیزی کے ساتھ میرے سامنے سے گزرا۔ ٹریکٹر پر جگہ نہ ہونے کے باوجود سات آٹھ بندے سوار تھے۔ وہ چیونٹیوں کی طرح ٹریکٹر سے چمٹے ہوئے تھے۔ چار پانچ بندے جگہ نہ ملنے کے سبب ٹریکٹر کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ان کے کندھوں پر کدالیں اور کسیاں وغیرہ تھیں۔ میرے چونکنے کی وجہ ٹریکٹر کا رنگ تھا۔ عام طور پر ٹریکٹر سرخ ہوتے ہیں لیکن یہ کالے رنگ کا تھا۔ یہ رنگ غالباً خود ہی کیا گیا تھا۔ یہ کالا ٹریکٹر میں نے جھگڑے کے وقت موکھلوں کے کھوہ پر دیکھا تھا۔

اس افراتفری کے عالم میں... اور اس وقت یہ لوگ کہاں جا رہے تھے؟ میرے ذہن میں شک جاگا۔ میں ٹریکٹر کی آواز پر اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ والی جی کا مچھلی فارم یہاں سے قریب ہی تھا۔ تین چار منٹ میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ میں نے گھوڑی کماد کے ایک کھیت کی آڑ میں روک لی... وہاں کا منظر دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ یہاں اس سنسان رات میں دن کی سی گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ یہاں والی جی کی زمین پر کم از کم پچاس ساٹھ افراد موجود تھے۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی اور دو گاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ چاند کی روشنی میں والی جی کی زمین پر اندھا دھند بنیادوں کی کھدائی ہو رہی تھی۔ ایک طرف کی بنیاد جو قریباً دو سو فٹ لمبی تھی، کھودی جا چکی تھی اور اس کے اندر کوئی ایک درجن معمار تیزی کے ساتھ اینٹوں کی دیوار چنتے جا رہے تھے۔

”شاوا بھئی شاوا... سپیڈ پکڑو۔“ کسی نے پکار کر کہا۔

میں سناٹے میں تھا اور میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ آدھی رات کو یہاں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ وہ زمین جس پر موکھل اپنا حق جتا رہے تھے، سخت خطرے میں تھی۔ اس پر قبضہ جمانے کے لیے شب خون مارا جا رہا تھا۔ میں نے اپنی گھوڑی واپس موڑی اور جتنی رفتار سے ممکن تھا، اسے دوڑاتا ہوا واپس راجوال پہنچ گیا۔ سب سے پہلے میں نے نصر اللہ اور منشی منظور کو یہ خبر پہنچائی، وہ ہکا بکا رہ گئے۔ میں نے نصر اللہ سے کہا۔ ”والی جی تک یہ خبر پہنچانی ہے لیکن ایک دم نہیں۔ وہ نیند سے جاگیں گے۔ انہیں بہت جھٹکا لگے گا۔ وہ پہلے ہی ٹھیک نہیں ہیں۔“

”تو پھر کیا کیا جائے؟“

”تم پہلے بیگم جی تک اطلاع پہنچاؤ اور انہیں بتا دو کہ طریقے سے والی جی کو خبر کر دیں۔“

جب نصر اللہ اطلاع دینے کے لیے حویلی کے اندر گیا، میں نے اپنے ساتھیوں تیمور، باگو اور کرامت وغیرہ کو جگایا اور فوراً گھوڑوں پر کاٹھیاں ڈالنے کی ہدایت کی۔ پانچ دس منٹ کے اندر پچیس افراد کا ایک دستہ تیار ہو گیا۔ ان میں سے چھ سات کے پاس رائفلیں تھیں، باقی کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے مسلح تھے۔ اسی دوران میں والی جی اور چودھری عزیز پریشان چہروں کے ساتھ ہماری طرف آتے دکھائی دیے۔ ان کے پیچھے پیچھے رونق علی اپنی توند ہلاتا اور ڈگمگاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“ والی جی نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

”کچھ نہیں والی جی! ایویں بیس تیس بندے ہیں۔ چوروں کی طرح اندھیرے کا فائدہ اٹھا رہے ہیں اور چور کے کوئی پاؤں نہیں ہوتے۔ ابھی ذرا دیر میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگیں گے۔“ میں نے حوصلے سے کہا۔

”لیکن اگر...“

”کچھ نہیں ہوگا والی جی... میں جا رہا ہوں۔ ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بے شک آرام کریں۔ بس چودھری عزیز صاحب کو باقی بندوں کے ساتھ میرے پیچھے بھیج دیں۔ اللہ نے چاہا تو آج ہم ان خبیثوں کو ان کے گھروں تک چھوڑ کے آئیں گے۔“

چودھری عزیز جو ہر موقعے پر میری بات کاٹتا تھا، اس وقت خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے کے سوا کچھ نہیں کر رہا تھا۔ دو تین منٹ میں سب کچھ طے ہو گیا۔ میں تیار گھڑ سواروں کے ساتھ موقعے کی طرف جا رہا تھا... باقی افراد کو والی جی اور چودھری عزیز کے ساتھ ہمارے پیچھے آنا تھا۔ ہم برق رفتاری سے روانہ ہوئے تو والی جی نے دوبارہ آواز لگائی۔ ”ہماری طرف سے گولی چلنے میں پہل نہ ہو۔“

چند روز پہلے باغ والے ڈیرے پر جو واقعہ ہوا تھا، اس کے بعد ہمارے حوصلے کافی بڑھ چکے تھے۔ والی جی کے عام کارندے جن کے رنگ موکھلوں کا نام سنتے ہی پیلے پڑ جاتے

تھے، اب جوش میں دکھائی دیتے تھے۔

موقعے پر پہنچنے سے ذرا دیر پہلے ہی ہم نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ میرے ہاتھ میں 38 بور کا پستول تھا اور میں سب سے آگے تھا۔ جونہی ہم پھلی فارم کے سامنے پہنچے، موکھلوں اور ان کے کارندوں میں کھلبلی مچ گئی۔ معماروں کے ہاتھ رک گئے۔ رائفلیں کندھوں سے اتر آئیں اور کلہاڑیاں، لاٹھیاں سونت لی گئیں۔ میں عین اس جگہ پہنچا جہاں بنیاد بھری جا رہی تھی۔

میں گھوڑی سے اترا اور ٹھوکر مار کر دو فٹ اونچی دیوار کی چند اینٹیں گرا دیں۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میں گرجا۔

دونوں طرف سے للکارے گونجے اور رائفلیں سیدھی کر لی گئیں۔ ''ٹھہرو ٹھہرو... گولی نہیں چلانا۔'' ایک لمبا تڑنگا شخص دہاڑ کر بولا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا میرے سامنے آ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا۔

''کون ہو تم؟'' اس نے مجھے سرتاپا گھورا۔

''تم ہماری زمین پر کھڑے ہو۔ یہ تم سے میں پوچھتا ہوں کہ کون ہو تم؟'' میں نے کہا۔

''یہ زمین کسی کی ماں بہن کو جہیز میں نہیں ملی ہے، یہ ہماری زمین ہے۔ ہمارے پاس پورے ثبوت ہیں اس کے۔''

''ثبوت ہیں تو عدالتوں میں پیش کرو... اور ایک منٹ کے اندر اندر نکلو یہاں سے، ورنہ چار پائیوں پر جاؤ گے۔'' میں نے بے خوفی سے کہا۔

''اوئے... اوئے چھچے! منہ سنبھال کر بات کر، نہیں تو کھڑے کھڑے زمین میں دھنسا دوں گا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے گالی دی۔

جواباً میں نے بھی اسے اسی ''وزن'' کی گالی سے نوازا۔ اس نے ایک دم بھڑک کر میرے منہ پر زناٹے کا تھپڑ رسید کیا۔ میں نے جواب میں اس سے زیادہ طاقت کا تھپڑ مارا تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں ایسے انداز میں جواب دوں گا۔

اس سے پہلے کہ وہ پستول میری طرف سیدھا کر کے فائر کرتا، میں نے اپنے 38 بور سے اس کے بازو میں گولی ماری۔ وہ ڈکرا کر ایک طرف جھکتا چلا گیا۔ دونوں طرف کے افراد بھڑکیں مارتے ہوئے ایک دوسرے پر پل پڑے۔ میں نے نیچے جھک کر ایک موکھل کی کلہاڑی کا وار بچایا۔ میرے عقب میں موجود باگو نے موکھل کے سینے پر ریوالور سے گولی چلائی... وہ جھٹکے سے ایک کھدی ہوائی بنیاد میں جا گرا۔

دونوں طرف کے افراد نے بھاگ بھاگ کر مختلف چیزوں کے پیچھے پناہ لے لی اور اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔ معمار اور مزدور وغیرہ اپنی اپنی جانیں بچا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں اور تیمور دو دیگر افراد کے ساتھ نئی اینٹوں کے ایک چکے کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ فائرنگ سے بچنے کے لیے اور جوابی فائر کرنے کے لیے یہ بڑی موزوں جگہ تھی۔ چاند رات میں ہر طرف شعلے سے لپک رہے تھے... گولیاں سیٹیاں بجاتی نامعلوم سمتوں میں پرواز کر رہی تھیں۔ اچانک نصر اللہ کے ایک قریبی ساتھی کو گولی لگی اور وہ کراہتا ہوا اپنے پہلو پر گر گیا۔ میں نے اس کی سیون ایم ایم رائفل اٹھا لی اور ایک اگلی پوزیشن پر پہنچ کر فائرنگ کرنے لگا۔

یہی وقت تھا جب ہمارے عقب سے درجنوں گھڑ سواروں کا شور سنائی دیا۔ وہ للکارے مارتے اور ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ یہ ہمارے ساتھی تھے۔ ان کے ساتھ والی جی اور چودھری عزیز وغیرہ بھی تھے۔ جب موکھلوں نے یہ صورتِ حال دیکھی تو ایک دم اپنی پوزیشنیں چھوڑ کر گودام کی طرف پسپا ہونے لگے۔ وہ فائرنگ کرتے ہوئے پیچھے ہٹتے جا رہے تھے۔ کچھ الٹے پاؤں بھاگ رہے تھے اور کچھ پیٹھ پھیر کر!

میں اپنی پوزیشن چھوڑ کر دوڑا اور پیٹھ پھیر کر بھاگتے ہوئے ایک موکھل کو عقب سے دبوچ کر زمین پر گرا لیا۔ پھر میں اسے تھسیٹ کر ایک جیپ کی اوٹ میں ہو گیا... یہ میں نے ایک خطرناک کام کیا تھا۔ کوئی بھی آوارہ گولی میرا مزاج پوچھ سکتی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ یہ کام کرنا ضروری ہے۔

موکھل فائرنگ کرتے ہوئے اپنے گودام کے اندر گھس گئے اور آہنی دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کمک کے آ جانے سے راجوال والوں کے حوصلے ایک دم بڑھ گئے تھے۔ ان میں سے کچھ کا خیال تھا کہ ہمیں پیچھا کرتے ہوئے گودام کے اندر گھس جانا چاہیے۔

لیکن ایسا کرنا خطرناک تھا۔ والی جی نے اپنے بپھرے ہوئے ساتھیوں کو اس ارادے سے باز رکھا۔ جو مسلح افراد آگے چلے گئے تھے، ان کو بھی واپس بلا لیا۔ گودام کے اندر سے ان پر فائرنگ ہو سکتی تھی۔ فضا میں خوفناک سراسیمگی تھی۔ موقعے پر دو لاشیں پڑی تھیں۔ ایک ہماری تھی، ایک موکھلوں کی۔

ہماری طرف سے جان ہارنے والا نصر اللہ کا وہی ساتھی تھا جس کی رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ گولی اس کی گردن چیر کر نکل گئی تھی اور وہ موقعے پر ہی دم توڑ گیا تھا۔ موکھلوں کی طرف سے مرنے والا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ اس کے منہ اور کپڑوں سے دیسی شراب کی بُو آ رہی تھی۔ تھری ناٹ تھری کی

دو گولیاں اس کے پیٹ میں لگی تھیں اور ایک کمر پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ اس کا خون بنیاد کی تازہ اینٹوں پر پھیلا ہوا تھا۔ دیہاتی زبان میں کہا جا سکتا تھا کہ زمین کے اس ٹکڑے نے انسانی خون چکھ لیا ہے، اب یہ زمین آدم خور ہو جائے گی۔

ہمارے چار ساتھی گولیوں اور کلہاڑیوں سے زخمی ہوئے تھے۔ ان میں سے دو کو اسپتال پہنچانا ضروری تھا۔ میں نے والی جی سے کہا۔ ''مجھے اجازت دیں۔ میں ان کو ڈسکہ اسپتال لے جاتا ہوں۔''

''نہیں... تم یہیں رہو۔'' والی جی نے عجیب انداز میں کہا۔ ''میں صوفی اسلم اور نصر اللہ کو اپنی گاڑی پر بھیج دیتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''ان کے تین چار بندے بھی ضرور زخمی ہوئے ہیں۔ وہ بھی زخمیوں کو ڈسکہ کے اسپتال میں ہی لے جائیں گے۔ یہ نہ ہو کہ وہاں پھر ٹکرا ہو جائے۔''

میری بات میں وزن تھا۔ والی جی نے حکم دیا کہ زخمیوں کے ساتھ آٹھ دس مسلح بندے جائیں گے اور بالکل چوکس رہیں گے۔

جس تنومند موکھل کو میں نے بھاگتے ہوئے پکڑا تھا، وہ ادھیڑ عمر تھا۔ وہ ذرہ بھر خوف زدہ نہیں تھا۔ وہ بار بار منہ سے خون تھوک رہا تھا اور ہمیں خوفناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ وہ جب بھی دھمکی دیتا، کوئی نہ کوئی شخص اس کے منہ پر ٹھوکر رسید کر دیتا... لیکن وہ دھمکیاں دینے اور گالیاں بکنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔

والی جی نے کہا۔ ''اس کے ہتھ پیر باندھ دو اور اس کے گندے منہ میں کپڑا ٹھونس دو۔''

اس نے والی جی کی طرف تھوکا اور بولا۔ ''تیرا بڑا بُرا حشر ہونا ہے والڑی۔ اسی زمین پر تیرے خانوادے کی لاشیں نہ گھسیٹیں تو ہم اپنے پیو کے نہیں۔''

چودھری عزیز مجھے ایک طرف لے گیا اور سخت لہجے میں بولا۔ ''اس بندے کو پکڑنے کی کیا لوڑ تھی؟ یہ چھوٹے موکھل کا ماما ہے۔ دل کا مریض بھی ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو اور مشکل پڑ جائے گی۔''

میں نے کہا۔ ''چودھری صاحب! میرے خیال میں آپ ایک بات بھول رہے ہیں۔ یہاں پھلی فارم پر ہمارے کتنے بندے تھے؟''

''دو تھے۔'' چودھری عزیز نے چونک کر کہا۔ ''شیرا اور فتح محمد۔''

''وہ دونوں اب یہاں کہیں نظر نہیں آ رہے۔ یہاں کام شروع کرنے سے پہلے یہ لوگ انہیں پکڑ کر گودام میں لے گئے ہوں گے۔ اب ان دونوں کو چھڑانے کے لیے ہمارے پاس موکھلوں کا کوئی بندہ تو ہے۔''

چودھری عزیز نے پہلی بار ذرا تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

کچھ دیر میں راجوال سے کچھ اور لوگ بھی لاٹھیاں، کلہاڑیاں لے کر پہنچ گئے۔ یہ لوگ ایک ٹریکٹر ٹرالی پر سوار ہو کر آئے تھے۔

ہم صبح تک موقعے پر موجود رہے پھر اطلاع ملی کہ پولیس لاشوں کو قبضے میں لینے کے لیے پہنچ رہی ہے۔ اب فوری لڑائی کا خطرہ ٹل چکا تھا۔ والی جی نے مجھے اور باگو کو موقعے سے ہٹ جانے کی ہدایت کی۔ انہوں نے نصر اللہ کو ہمارے ساتھ کیا۔ اس وقت سورج کی پہلی کرنیں، اوس سے بھیگے ہوئے پودوں اور کھیتوں کو چمکا رہی تھیں جب ہم راجوال پہنچے۔ گاؤں کے زیادہ تر لوگ ابھی گھروں کے اندر تھے۔ شاید بہت سوں کو یہ پتا بھی نہ ہو گا کہ رات کو پھلی فارم پر کتنا سنگین واقعہ ہوا ہے۔ والی جی کی ہدایت کے مطابق نصر اللہ ہمیں حویلی کے پچھواڑے بڑے اصطبل میں لے گیا۔ یہاں گرے ہاؤنڈ کتے راتب کے انتظار میں منہ لٹکائے بیٹھے تھے اور پنجروں میں عقاب، شاہین وغیرہ پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ہمارے گھوڑے ایک چھپر تلے باندھ دیے گئے۔ نصر اللہ ہمیں اصطبل کے ایک نیم تاریک کمرے میں لے گیا۔ یہاں پرالی کے بڑے بڑے گٹھے پڑے تھے۔ دو بندوں نے مل کر گٹھوں کو تیزی سے ہٹانا شروع کیا۔ اور تب مجھے پہلی بار پتا چلا کہ یہاں اصطبل کے اندر نیچے کو جاتی ہوئی سیڑھیاں ہیں اور ایک تہ خانہ ہے۔

تہ خانہ تین کمروں پر مشتمل تھا۔ در و دیوار کچے تھے تاہم ان کی لپائی کی گئی تھی۔ یہاں چار پانچ چارپائیاں، مٹی کے گھڑے، لالٹینیں اور روزمرہ استعمال کے برتن وغیرہ موجود تھے۔ والی جی نے مجھے بتا دیا تھا کہ ہم دونوں کو کچھ دن یہاں روپوش رہنا ہے۔ یاد رہے کہ موکھلوں کا جو بندہ ہلاک ہوا تھا، اسے باگو کے ہاتھ سے ہی گولی لگی تھی۔

ہم اس تہ خانے میں پورے تین دن رہے۔ صرف صبح سویرے کچھ دیر کے لیے ہم باہر نکلتے تھے اور ضروریات سے فارغ ہو کر دوبارہ تہ خانے میں چلے جاتے تھے۔ باہر کے حالات کی ہمیں کچھ زیادہ خبر نہیں تھی۔ ہم زیادہ تر بیٹری والا ریڈیو سنتے رہتے، تاش کھیلتے رہتے یا پھر گپ شپ لگاتے۔ زیادہ وقت لحافوں کے اندر گزارنا پڑتا تھا کیونکہ یہاں حرارت کے لیے انگیٹھی نہیں جلائی جا سکتی تھی۔ دھواں وغیرہ

نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ تین وقت بہترین کھانا ہمیں مل رہا تھا۔ ہماری دیکھ بھال کی ذمے داری اصطبل کے دو ملازموں شیدے اور عبیداللہ کی تھی۔ انہی کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ لڑائی میں زخمی ہونے والے دونوں بندوں کی حالت اب بہتر ہے۔

یہ چوتھے روز دوپہر کی بات ہے، رونق علی خود تہ خانے میں داخل ہوا۔ وہ ہمارے لیے مولی والے پراٹھے پکوا کر لایا تھا۔ ساتھ میں چائی کی نمکین لسی اور گاجر کا حلوہ تھا۔ میرے ذہن میں باہر کی صورت حال کے حوالے سے بے شمار سوال کلبلا رہے تھے۔ سب سے اہم سوال تو یہی تھا کہ جھگڑے کا کیا بنا؟

رونق علی نے کہا۔ ''کافی چنگی چنگی خبریں ہیں۔ نیا ایس ایچ او اور انا شبیر سیانا بندہ ہے۔ والی جی کی عزت بھی کرتا ہے۔ اس نے دونوں پارٹیوں کو اچھے مشورے دیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لمبی چوڑی گرفتاریاں نہیں ہوئیں اور نہ ہی کچھ زیادہ مال پانی خرچ کرنا پڑ رہا ہے۔''

''یہ کیسا پولیس والا ہے رونق بھائی؟ کہیں جعلی تو نہیں ہے؟''

''نہیں یار! اچھے بُرے بندے تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ والی جی اور چھوٹے موکھل سے بات شات کر کے اس نے بڑا مناسب وقوعہ بنایا ہے۔ دونوں طرف کا ایک ایک بندہ مرا ہے۔ اس نے دونوں برابر ایک دوسرے کا قتل ڈال دیا ہے۔ شدید زخمیوں کا بھی کوئی ذکر شکر نہیں کیا گیا۔''

''شیرے اور فتح محمد کا کیا بنا؟''

''ایسے معاملوں میں تمہارا دماغ بڑا کام کرتا ہے۔ تمہارا یہ اندازہ بالکل ٹھیک تھا کہ موکھل ان دونوں کو پکڑ کر گودام میں لے گئے ہیں۔ یہ مسئلہ پولیس کو بتائے بغیر ہی حل کیا گیا ہے۔ ہم نے موکھلوں کے مامے تاج دین کو چھوڑ دیا ہے۔ انہوں نے شیرے اور فتح محمد کو آزاد کر دیا ہے۔''

''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مچھلی فارم کی زمین والا معاملہ اب کچھ ٹھنڈا پڑ جائے گا؟'' میں نے رونق علی سے پوچھا۔

اس نے اپنا بڑا سا چہرہ نفی میں ہلایا اور بولا۔ ''ایسے جھگڑے تسلکھڑے آسانی سے کہاں ختم ہوتے ہیں شہزادے... اور یہ جھگڑا تو اب شروع ہوا ہے۔ آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا؟''

''قبضہ تو جگہ پر ہمارا ہی ہے نا؟''

''قبضہ تو بالکل اپنا ہے، پر ان کا پانی والا پائپ ہماری زمین پر ہی ہے... اور گندا پانی دن رات تالاب میں جمع ہو رہا ہے۔ اب انہوں نے ہماری طرف ایک دروازہ بھی نکال لیا ہے۔ دو چار روز تک بڑا موکھل بھی پنڈ واپس آ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے آنے کے بعد معاملے میں اور گرمی شرمی آ جائے۔''

''بڑا موکھل کہاں ہے؟''

''ان کی کچھ زمینیں رحیم یار خان میں بھی ہیں۔ وہ وہاں گیا ہوا ہے۔''

رونق علی سے اس گفتگو کے دوران میں ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ والی جی کا پیارا کتا ہیرا بالآخر مر گیا ہے۔ والی جی چند دن اس کے لیے بہت پریشان رہے ہیں۔ رونق سے مختلف موضوعات پر بات چیت جاری رہی۔

''ہمیں اور کتنے دن یہاں رہنا پڑے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو والی جی ہی بتا سکتے ہیں۔ ویسے میرے خیال میں اب حالات ٹھیک ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسی ہفتے تمہیں باہر نکال لیں۔ ویسے ایک کام تم سے گڑبڑ والا ہوا ہے۔ تم نے جس بندے کو تھپڑ کے جواب میں تھپڑ مارا تھا، پتا ہے وہ کون ہے؟''

''کون ہے؟''

''بڑی بھیڑی شے ہے۔ بہت بھیڑی شے ہے۔''

''اس بھیڑی شے کا نام بھی تو بتائیں۔'' باگو نے کہا۔

رونق علی مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میں نے تم سے شام پور کی ایک کڑی ثمینہ کا ذکر کیا تھا نا جو غیر برادری کے ایک بندے سے ملتی ہے؟''

''ہاں، بتایا تو تھا آپ نے... والی جی نے ثمینہ اور اس بندے کو ایک کھیت سے موقعے پر پکڑا تھا اور مار پیٹ بھی تھا۔''

رونق علی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہی وہ خانہ خراب ہے۔ اس کو موکھل پاشا کہتے ہیں۔ یہ بڑے موکھل کے دادے... گاؤں کا ہے۔ یہاں زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس کا باپ اپنے پنڈ میں پھیری لگا کر پکوڑے بیچتا تھا، پر یہ یہاں چودھری بن کر پھر رہا ہے۔ بڑی آکڑ شاکڑ ہے اس میں۔''

''کر لیں گے جی ٹھیک اس کی آکڑ۔'' میں نے لسی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

رونق علی نے جہازی سائز کے پراٹھے کے چوتھے حصے کو لقمہ بنا کر منہ میں رکھا اور مجھے موکھل پاشا کے بارے میں مزید باتیں بتانے لگا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ کچھ دن پہلے پیش آنے والے واقعے میں والی جی نے موکھل پاشا کو مارا وغیرہ نہیں تھا۔ انہوں نے بس اسے بالوں سے پکڑا تھا۔ جواب میں اس نے اتنی زور سے والی جی کا ہاتھ جھٹکا کہ ان کی کلائی اتر گئی۔ وہ ابھی تک خلیفے سے کلائی کی مالش کرواتے تھے۔

رونق علی قریباً دو گھنٹے ہمارے ساتھ موجود رہا۔ اس

دوران میں اس نے بیگم بلقیس کے بارے میں کسی حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔ میں اس کے تاثرات سے اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا اور مجھے اندازہ ہوا کہ وہ شاید اس گڑبڑ کے بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں ہے۔

میں پچھلے تین چار دن سے مسلسل اندیشوں میں مبتلا تھا۔ میں چار دن پہلے جن حالات میں راجوال چھوڑ کر جانے لگا تھا، یقیناً وہ اب بھی موجود تھے۔ میرے کانوں میں بار بار وہ گفتگو گونجتی رہتی تھی جو بدھ کی شب بیگم بلقیس نے مجھ سے کی تھی۔ ان کی لرزتی ہوئی آواز، ان کی سسکی، ان کا خوف! جو کچھ بھی تھا، وہ بڑی ہمت والی تھیں۔ اس کے باوجود وہ ڈری ہوئی تھیں۔

کسی وقت خوامخواہ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگتی تھی۔ میں سوچنے لگتا تھا، کہیں ایسا تو نہیں کہ والی جی نے کسی سازش کے تحت مجھے یہاں بھیجا ہو۔ اب اگر اس تہ خانے میں میرے اور باگو کے ساتھ کچھ ہو جاتا تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونا تھی۔ ہمیں مار کر اسی تہ خانے کے کچے فرش میں یوں گاڑا جا سکتا تھا کہ کسی کو ہمارا نام و نشان تک نہ ملتا۔ یا پھر ہمیں قتل کر کے ہماری لاشیں کھیتوں میں پھینکی جا سکتی تھیں اور اس کا الزام بہ آسانی موکھلوں پر دھرا جا سکتا تھا۔

مگر پھر میں والی جی کی صورت ذہن میں لاتا اور ان کے رویے پر غور کرتا۔ میرا دل گواہی دینے لگتا کہ میں غلط سوچ رہا ہوں۔ والی جی ایسا نہیں کریں گے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ چند دن بعد جب حالات ٹھیک ہو جائیں، وہ مجھے اپنی حویلی سے اور نوکری سے نکال دیں اور حکم دیں کہ میں دوبارہ اپنی شکل نہ دکھاؤں لیکن وہ میرے ساتھ اس طرح کی زیادتی نہیں کریں گے۔

میں نے بتایا ہے کہ اس کچے تہ خانے میں ہمیں ہر طرح کی سہولت حاصل تھی... سوائے اس کے کہ اصطبل کی ہلکی سی بو آتی تھی اور وہ بھی اس وقت جب یہاں کا اکلوتا دروازہ کھلتا تھا۔ اس تہ خانے کے تین چار کمرے تھے۔ اندرونی دیواروں میں سلاخ دار کھڑکیاں بھی لگی ہوئی تھیں۔ کمروں کے دروازے علیحدہ علیحدہ تھے۔ یہ ساتویں آٹھویں روز کی بات ہے... میں ریڈیو پر کسان بھائیوں کا پروگرام سنتے سنتے سو گیا۔ مجھے باگو نے جھنجھوڑ کر جگایا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا اور میرا ہاتھ پستول کی طرف گیا۔

''وہ دیکھو... نویں پروہنے آئے ہیں۔'' باگو نے کھڑکی میں سے ایک ساتھ والے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ بیس بائیس سال کی ایک لڑکی چارپائی پر بیٹھی تھی اور چہرہ ہاتھوں میں چھپائے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اس کے جسم پر عام دیہاتی لباس تھا۔ اپنے حلیے سے وہ کسی غریب گھرانے کی لگتی تھی۔

چند لمحے بعد لڑکی روتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی اور کمرے کا بند دروازہ پیٹنے لگی۔ ''مجھے یہاں سے نکالو۔ خدا کے لیے نکالو۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں بے گناہ ہوں۔''

کچھ دیر تک دروازہ پیٹنے اور دہائی دینے کے بعد وہ بے دم سی ہو کر کچے فرش پر ہی بیٹھ گئی۔ اس کی پشت دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ لڑکی قبول صورت تھی۔ پہلی نظر میں مجھے اس کے چہرے پر معصومیت اور سچائی نظر آئی۔

باگو نے کھڑکی اس طرح بند کر رکھی تھی کہ دونوں پٹ کے درمیان دو تین انچ کی درز باقی رہ گئی تھی۔ ہم تو لڑکی کو دیکھ سکتے تھے مگر شاید وہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں لڑکی کا طویل سایہ دیوار پر لرزتا دکھائی دیتا تھا۔

''کون لایا ہے اسے یہاں؟'' میں نے باگو سے پوچھا۔

''چودھری عزیز صاحب اور ان کے دو بندے ابھی چھوڑ کر گئے ہیں۔''

''معاملہ کیا ہے؟''

''کچھ پتا نہیں... یہ اندر نہیں گھس رہی تھی۔ چودھری عزیز صاحب نے اسے دو تین چپیڑیں بھی ماری ہیں۔''

چند منٹ بعد ہماری دیکھ بھال کرنے والا رشید عرف شیدا اندر آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ کڑی کس چکر میں یہاں تاڑی گئی ہے۔ یہ شکل سے تو بڑی معصوم سی لگتی ہے۔''

''شکل پر نہ جاؤ خاور صیب! یہ ایک نمبر کی فٹے منی... چالو کڑی ہے۔'' شیدے نے دبی آواز میں کہا۔

''کوئی چن چڑھایا ہے اس نے؟'' باگو نے پوچھا۔

''کوئی ایک چن؟ چن پر چن چڑھا رہی ہے۔ والی جی تک نے منت ترلا کر کے دیکھا، پر یہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتی۔ غیر برادری کے بندے سے ملتی ہے... بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ دشمن برادری کے بندے سے ملتی ہے۔ سارے پنڈ کی عزت مٹی میں ملا رہی ہے۔''

میں نے چونک کر کہا۔ ''کہیں یہ وہی کڑی ثمینہ تو نہیں جو کچھ دن پہلے کھیتوں میں پکڑی گئی تھی؟''

''آہو جی! وہی ہے۔ یہ موکھلوں کے منڈے سے ملتی ہے۔ سنا ہے کہ وہ کھیتوں میں ہی اس کے ساتھ بڑا بھلا کر کے جاتا ہے۔ اس سورنی کو بھی ذلیل ہونے کا چسکا پڑ گیا ہے۔ لاکھ منع کرنے پر بھی بھاگی جاتی ہے اس بدمعاش کے پاس۔

آج سویرے پھر پکڑی گئی ہے۔ میرا تو دل چاہتا ہے، والی جی اسے چھت سے الٹا لٹکا کر اس کی چمڑی اتروا دیں...''

''پیو بھرا (والد اور بھائی) وغیرہ نہیں ہیں اس کے؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی نہیں ہے جی۔ اسی لیے تو مچھری پھرتی ہے۔ بس ایک ماں ہے، اس کو یہ کچھ سمجھتی نہیں ہے۔ تین بہنیں اس سے بڑی ہیں۔ وہ بھی غیر شادی شدہ ہیں۔ اپنے کرتوتوں سے ان کی بیڑیوں میں بھی وٹے ڈال رہی ہے۔''

''وہ مُنڈا کون ہے؟'' میں نے تصدیق کرنے کے لیے شیدے سے پوچھا۔

''پاشا نام ہے جی اس کا۔ موکھل پاشا بھی کہتے ہیں۔ یہ وہی لمبا چوڑا ہڈوش ہے جی، جس نے آپ کو تھپڑ مارا تھا اور پھر آپ نے بھی اسے تھپڑ مارا تھا۔ ویسے وہ بندہ بہت زیادہ خطرناک ہے۔ آپ کو اس کی طرف سے ہوشیار رہنا پڑے گا۔''

شاید شیدے کے ساتھ ہماری گفتگو کچھ دیر مزید جاری رہتی مگر اسی دوران میں لڑکی ثمینہ نے پھر واویلا شروع کر دیا۔ وہ رونے چلانے لگی اور دروازے پر دوہتڑ مارنے لگی۔ وہ دھمکی دے رہی تھی کہ اپنی جان لے لے گی۔ شیدا باہر والوں کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے لیے واپس چلا گیا۔ لڑکی کچھ دیر تک روپیٹ کر اور تھک ہار کر پھر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ چوڑیاں ٹوٹ جانے سے اس کی کلائیوں سے خون رِس رہا تھا۔

میں اور باگو دھیمی آوازوں کے ساتھ اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے رہے۔ ''یہ کوئی پیار شیار کا معاملہ ہے شاید۔'' باگو نے خیال ظاہر کیا۔

''ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔'' میں نے کہا۔ ''یہ کُڑی عمر میں موکھل پاشا سے کافی چھوٹی نظر آتی ہے۔ ویسے بھی پاشا شکل سے ایک نمبر کا خرانٹ اور ڈھاڈا لگتا ہے۔ یہ بالکل معصوم گھگی (فاختہ) کی طرح ہے۔ اور ہو اس لیے سکتا ہے کہ پیار محبت کرنے والے شکل، عمر، ذات شات کچھ نہیں دیکھتے۔''

لڑکی قریباً پانچ گھنٹے تک اسی تہ خانے میں رہی۔ رو رو کر اس نے بُرا حال کر لیا تھا۔ اس کی حالت پر ترس آنے لگا۔ کبھی وہ اللہ سے مدد مانگنے لگتی اور کبھی ان بندوں سے جنہوں نے اسے یہاں بند کیا تھا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ ہم بھی اس کے آس پاس موجود ہیں۔ وہ ہمیں بھی کئی بار پکار چکی تھی مگر ہم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

قریباً شام کے وقت تہ خانے کا دروازہ کھلا اور میں نے والی جی کو دیکھا۔ چودھری عزیز ان کے ساتھ تھا۔ دو مسلح کارندے بھی تھے۔ جونہی ایک کارندے نے لڑکی کے کمرے والا دروازہ کھولا، وہ تڑپ کر آگے بڑھی اور والی جی کے قدموں میں گر گئی۔ ''مجھے معاف کر دیں والی جی... مجھے معافی دے دیں... میں اب... کہیں نہیں جاؤں گی۔ جیسا کہیں گے ویسا کروں گی۔''

''یہ تو تم پہلے بھی کہتی رہی ہو۔'' والی جی نے بھاری آواز میں کہا۔

''بس مجھ سے غلطی ہو گئی جی۔ اب نہیں ہو گی۔ ہم آپ کے نوکر ہیں جی... ہم نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ آپ کے حکم پر جان بھی دے سکتے ہیں۔''

''جان دے سکتی ہو... پر اس زانی کے ساتھ کھیتوں میں گھسنا بند نہیں کر سکتی ہو۔'' چودھری عزیز نے زہریلے لہجے میں کہا۔ اس نے ایک جھٹکے سے لڑکی کو والی جی کے قدموں سے پیچھے ہٹایا اور پھنکار کر کہا۔ ''اس کی باتوں پر نہ جائیں بھائیا جی! یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نکلنے والا نہیں ہے۔ اس کو بند رہنے دیں یہاں دو چار ہفتے اور اس کے ساتھ دو تین بوہلی کتے بھی باندھ دیں یہاں... یہ کتوں کے ساتھ رہنے کے لائق ہے۔''

لڑکی ثمینہ کا رنگ زرد تر ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر والی جی کے پاؤں سے چمٹ گئی اور منت سماجت کرنے لگی۔ اس کی اوڑھنی اتر گئی تھی اور وہ ننگے سر تھی۔ والی جی نے جھک کر اس کی اوڑھنی اٹھائی اور سر ڈھانپا۔ پھر انہوں نے اسے پیچھے ہٹ کر بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ سہمی ہوئی چڑیا کی طرح ایک کونے میں سمٹ گئی۔ اس کی عمر بیس برس سے زیادہ نظر نہیں آتی تھی۔ مجھے اپنا پہلا اندازہ غلط محسوس ہوا۔

اس کی سیاہ آنکھوں میں خوف و ہراس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ خاص طور سے وہ چودھری عزیز سے خوف زدہ نظر آتی تھی۔ والی جی نے چودھری عزیز کے کان میں ہولے سے کچھ کہا۔ وہ لڑکی کو آتشیں نظروں سے دیکھتا اور بُرا بھلا کہتا ہوا باہر چلا گیا۔ دونوں کارندے بھی باہر نکل گئے۔ بس ایک کارندہ دروازے سے باہر موجود رہا۔ والی جی نے لڑکی کو نسبتاً نرم لہجے میں سمجھایا بجھایا۔ ان کی آواز ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ بس کوئی کوئی لفظ کانوں میں پڑتا تھا۔ ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ لڑکی کو موکھل پاشا سے نہ ملنے کی وارننگ دے رہے ہیں۔ لڑکی بار بار وعدہ کر رہی تھی کہ اب ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔ وہ ان کی ہدایت پر چلے گی اور برادری کی عزت خراب نہیں کرے گی۔

کچھ دیر بعد والی جی نے دروازے سے باہر کھڑے کارندے کو اندر بلایا اور اسے لڑکی کو باہر لے جانے کے لیے کہا۔ یہ لڑکی والا معاملہ ختم ہوا تو والی جی ہماری طرف آ گئے۔

میرے دل کی دھڑکنیں زیروزبر ہو رہی تھیں۔ میں والی جی کے چہرے کے تاثرات سے جاننے کی کوشش کرنے لگا کہ ان کا موڈ کیسا ہے۔ چہرہ سپاٹ تھا۔ کبھی کبھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گہری طبیعت کے مالک ہیں۔

انہوں نے مجھے نارمل لہجے میں مخاطب کیا اور بولے۔ ''مجھ پتا ہے، یہاں تم لوگوں کا دم گھٹ رہا ہو گا مگر مجبوری تھی۔ بہرحال، اب تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ دو چار دن کی بات ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ ہمارے لیے بالکل پریشان نہ ہوں جی۔ آپ جہاں بھی رکھیں گے، ہم وہاں خوش ہوں گے۔''

''بہرحال، اس رات جو کچھ ہوا بہت اچھا ہوا۔ اگر تمہیں پتا نہ چلتا کہ وہاں فارم پر کیا ہو رہا ہے تو ان لوگوں نے حد بندی کر کے وہاں قبضہ کر جانا تھا۔ لیکن مجھے یہ پتا نہیں چلا کہ تم آدھی رات کو وہاں پہنچ کیسے گئے؟''

میں اس جواب کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میں یہ تو نہیں بتا سکتا تھا کہ میں راجوال کو خدا حافظ کہہ کر یہاں سے رخصت ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''پتا نہیں کیوں ایک دم میرا دل کرنے لگا کہ ماں جی کو دیکھوں۔ عجیب سی پریشانی لگ گئی۔ میں نے گھوڑی پکڑی اور چل دیا۔ ارادہ یہ تھا کہ راتوں رات گاؤں سے ہو کر واپس آ جاؤں گا۔ شفیع محمد کے کھوہ پر پہنچا تو مجھے موکھلوں کا کالا ٹریکٹر نظر آیا۔ اس پر سات آٹھ بندے چڑھے ہوئے تھے۔ کچھ بندے ٹریکٹر کے پیچھے پیچھے بھی بھاگے جا رہے تھے۔ مجھے شک پڑا اور میں ان کے پیچھے چل دیا۔''

والی جی نے گہری سانس لی اور ہولے سے بولے۔ ''یہ زمین بھی تو ماں ہی کی طرح ہوتی ہے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ گئے۔ ثمینہ کے حوالے سے انہوں نے کچھ بتایا، نہ ہم نے پوچھا۔

وہ چلے گئے اور میں سوچتا رہا۔ والی جی کا رویہ سمجھ سے باہر تھا۔ یقیناً وہ میرے اور بیگم بلقیس کے بارے میں بہت کچھ جان چکے تھے، اس کے باوجود انہوں نے ابھی تک مجھ پر کچھ ظاہر کیا تھا اور نہ مجھے یہاں سے دفع ہونے کا حکم دیا تھا۔ شاید وہ کوئی درمیانی راستہ اختیار کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ کوئی ایسا طریقہ کہ میں ان کے قریب رہ سکوں۔ موکھلوں کے ساتھ حالات بہت بگڑ گئے تھے اور والی جی کو مضبوط بازوؤں کی ضرورت تھی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ مضبوط بازوؤں کی خاطر اپنی آن بان داؤ پر لگانے کو تیار تھے۔ اگر وہ چاہتے تو اپنے پیسے کے زور پر بڑے سے بڑا پھنے خان اپنے محافظوں میں شامل کر سکتے تھے... اگر وہ میرے بارے میں نرمی سے سوچ رہے تھے تو اس کی وجہ کچھ اور تھی۔ شاید میں ان کے مزاج کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ان کی ضرورت بن گیا تھا۔ وہ مجھ سے ہر موضوع پر کھل کر اور بے تکلفی سے بات کرتے تھے۔

اسی ہفتے ہمیں اس کچے تہ خانے سے نکال لیا گیا۔ میں ایک بار پھر حویلی سے باہر اسی کوارٹر نما کمرے میں پہنچ گیا جہاں اس سے پہلے رہ رہا تھا۔ والی جی کی ہدایت تھی کہ فی الحال میں راجوال سے باہر نہ نکلوں۔ میں اپنی والدہ اور بہن سے ملنے کے لیے بے چین تھا لیکن والی جی کی ہدایت پر عمل کرنا بھی ضروری تھا۔ بہرحال، والی جی نے اپنے طور پر میری والدہ اور بہن کی خیریت دریافت کروائی تھی... اور انہیں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ دونوں چند روز کے لیے اپنے کسی عزیز رشتے دار کے ہاں چلی جائیں۔ وہ دونوں ایک قریبی گاؤں سکھیرا میں چلی گئی تھیں۔ وہاں ہمارے ننھیالی تھے۔

کہنے کو تو میں اپنے ٹھکانے پر واپس آ گیا تھا لیکن باقی کے حالات بدل گئے تھے۔ حامد کے لیے ایک اور ماسٹر کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ حویلی کے اندر میرا آنا جانا بالکل ختم ہو گیا تھا۔ اگر والی جی نے مجھ سے کوئی بات کرنا بھی ہوتی تو خود باہر آ کر کرتے... وہ مجھے مردانے میں بھی نہیں بلاتے تھے۔ عسکری اپنے کندھے کے زخم سے صحت یاب ہو کر واپس آ گیا تھا۔ تاہم ہر تیسرے چوتھے روز اسے مرہم پٹی کے لیے ڈسکہ اسپتال جانا پڑتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کا کمرا میرے استعمال میں آ جایا کرتا تھا مگر اب پہلے جیسا نہیں تھا۔ اب وہاں نصر اللہ سوتا تھا اور وہی بمبوکاٹ پر حویلی سے آنے والے پیغام وغیرہ سنتا تھا۔

والدہ اور عارفہ چند دن نانا کے گھر رہ کر واپس مراد پور آ گئی تھیں اور خیریت سے تھیں۔ میں ایک بار ان سے مل آیا اور تسلی تشفی دے آیا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ بیگم بلقیس سے میرا رابطہ بالکل منقطع تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ حویلی میں موجود ہی نہیں ہیں۔ میں ان کے حوالے سے بہت فکرمند تھا۔ ایک دن خوش قسمتی سے مجھے موقع مل گیا۔

عسکری ڈسکے گیا ہوا تھا۔ والی جی بھی تاریخ پر لاہور گئے ہوئے تھے۔ میں نے نصر اللہ کو بہانے سے ماجھو حلوائی کی طرف گرم جلیبی اور اچھی نسل کی مونگ پھلی لانے کے لیے بھیج دیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے انٹرکام پر حویلی میں رابطہ کیا۔ ڈر یہ تھا کہ چودھری عزیز یا فیروزاں میں سے کوئی انٹرکام نہ اٹھا لے۔ دوسری طرف سے ابھرنے والی آواز بیگم بلقیس کی تھی۔ یہ بچھڑی ہوئی آواز سن کر سینے میں شادیانہ سا بج گیا۔

''کیسی ہیں آپ؟'' میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''بس ٹھیک۔'' انہوں نے بہت مدھم اور ڈری ہوئی سی آواز میں جواب دیا۔

''آپ کے لیے بہت پریشان تھا میں۔''

وہ ذرا توقف سے بولیں۔ ''تم نے تو گاؤں چھوڑ کر چلے جانا تھا۔''

''میں تو جا رہا تھا۔ اس کے بعد آپ کو معلوم ہی ہے جو کچھ ہوا۔ اب جھگڑا چل نکلا ہے، شاید اسی لیے والی جی چاہ رہے ہیں کہ میں فی الحال یہاں رہوں۔''

''ہاں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہیں کھونا نہیں چاہتے۔'' بیگم بلقیس نے بدستور افسردہ آواز میں کہا۔

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔''

بیگم بلقیس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''خاور! جو کچھ ہو گیا، وہ ہو گیا۔ اب ہمیں بالکل سنبھل جانا چاہیے۔'' ان کی آواز میں گمبھیر سنجیدگی تھی۔

''کیا اب میں آپ کی آواز بھی نہیں سن سکوں گا؟''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہم اپنے آپ کو خوامخواہ مصیبت میں ڈال دیں گے۔ ویسے بھی اب میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے والی جی کو کسی طرح کا صدمہ ہو۔ ہمیں اب بہت محتاط رہنا ہوگا۔''

''لیکن... کبھی کبھار...'' میں نے التجا کے لہجے میں کہا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں۔ ''بس یہی ہو سکتا ہے کہ کسی وقت وہ تاریخ پر جائیں۔ چاچا عسکری بھی کمرے میں نہ ہو اور تم اس طرح رابطہ کر لو۔'' وہ بدستور دھیمی آواز میں بول رہی تھیں۔

''میرا خیال ہے کہ وہ چودہ پندرہ تاریخ کو تو ضرور جاتے ہیں۔''

''لیکن ضروری تو نہیں کہ چاچا عسکری بھی ان دنوں گیا ہوا ہو۔''

''اس کا میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔'' میں نے کہا۔

''تم والی جی کو ہر طرح راضی رکھنے کی کوشش کرو۔ انہیں کوئی ایک پریشانی نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ ثمینہ والا معاملہ بھی انہیں بہت پریشان کرتا ہے۔ وہ بھی خبیث ایسی ڈھیٹ ہے کہ لاکھ منع کرنے پر بھی باز نہیں آ رہی۔ وہ پکا بدمعاش ہے جس کے اشاروں پر ناچ رہی ہے۔''

''کیا یہ حویلی کی نوکری بھی کرتی رہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ نہیں، اس کی ماں کرتی تھی اور اس سے پہلے اس کی ماں کرتی تھی۔ سمجھو کہ یہ حویلی کے خاندانی ملازم رہے ہیں۔ پھر کسی بات پر ثمینہ کی ماں دلشاد، والی جی سے ناراض ہو گئی اور حویلی چھوڑ کر شام پور گاؤں چلی گئی۔ اپنی پانچوں بیٹیوں کو بھی ساتھ لے گئی۔''

''میں نے تو سنا تھا کہ یہ چار بہنیں ہیں۔''

''نہیں، پانچ تھیں۔ بڑی کا نام آسیہ تھا۔ وہ کوئی تین سال پہلے بیمار ہو کر مر گئی تھی۔ اب چار ہیں اور چاروں شادی کے لائق ہیں۔ بلکہ بڑی دو کی تو عمریں بھی گزرتی جا رہی ہیں اور شادی کسی کی نہیں ہوئی۔ اب سنا ہے کہ کہیں پر بڑی دو لڑکیوں کی بات چل رہی ہے لیکن جس طرح کے کرتوت یہ چھوٹی کر رہی ہے، ہو سکتا ہے کہ ان کی بات بھی بگڑ جائے۔ یہ خاندانی ملازم رہے ہیں اس لیے والی جی کو ان کے بُرے بھلے کی فکر ہے۔''

''لیکن ان کی ماں دلشاد نے حویلی چھوڑی کیوں تھی؟''

''کچھ بھی نہیں۔ بس ایونیں چھوٹی سی بات تھی۔ کچھ پیسے مانگے تھے اس نے۔ بھائی عزیز (چودھری عزیز) نے ''نہ'' کہہ دی۔ اس بات پر اس نے جھگڑا کیا اور حویلی چھوڑ گئی۔ وہ اچھی تو بڑی نتھی لیکن اس میں آکڑ بھی تھی۔ بس اسی آکڑ نے اسے مجل خراب کیا۔ اب خراب حالت میں ہے۔ ایک دو چھوٹے چھوٹے زمیندار ہیں جن کے گھروں میں پٹیاں کام کرتی ہیں۔''

''خود کیا کرتی ہے؟''

''خود تو سات آٹھ سال سے کچھ نہیں کرتی۔ گوڈوں کا درد ہے۔ یہاں حویلی میں بھی اس کی بڑی بیٹی آسیہ ہی کام کیا کرتی تھی۔ وہ ان سب میں اچھی تھی۔ اس وچاری کی اپنی عمر بھی ستائیس اٹھائیس سال ہو چکی تھی... اس کا نکاح ہوا تھا، پر رخصتی سے پہلے ہی طلاق ہو گئی تھی۔ بندہ شرابی کبابی نکل آیا تھا۔ اب اس نے اپنے ویاہ کا خیال ہی دل سے نکال دیا تھا۔ اس کی ایک ہی تمنا تھی کہ اس کی چھوٹی چاروں بہنوں کی شادیاں جلد سے جلد ہو جائیں۔ حویلی سے جانے کے بعد بھی اس نے اپنی بہنوں کے لیے بڑی محنت مشقت کی۔ مگر پھر بیمار ہو گئی اور ایسی بستر سے لگی کہ اٹھی ہی نہیں۔''

بیگم بلقیس نے ذرا توقف کیا اور بولیں۔ ''میں یہ سب تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ تمہیں ثمینہ کے حالات کا پتا ہو اور والی جی تم سے اس بارے میں کوئی بات کریں تو تم مشورہ دے سکو۔''

یکا یک دوسری طرف سے کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ بیگم بلقیس سرگوشی میں بولیں۔ ''ٹھیک ہے۔ میں بند کرتی ہوں۔ چودہ پندرہ تاریخ کو موقع ملا تو بات کریں گے۔''

بہو کاٹ خاموش ہو گیا۔ بیگم بلقیس کا رازدارانہ انداز مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ جب وہ سرگوشی میں بات کرتی تھیں تو دیر تک میرے لہو میں خوش گوار ہلچل مچی رہتی تھی۔

بیگم بلقیس کو جیسے خود اپنی سمجھ بھی نہیں آ رہی تھی۔ اپنی محبوبہ کے ایک فقرے میں انہوں نے رابطہ بالکل منقطع کرنے کی بات کی تھی۔ لیکن اگلے ہی فقرے میں انہوں نے مجھے امید بھی دلا دی تھی کہ کم از کم گفتگو کی حد تک رابطہ برقرار رہ سکتا ہے۔ یہ میرے لیے خوش آئند تھا۔

☆☆☆

زمین کے ٹکڑے کے لیے زبردست قسم کی مقدمے بازی شروع ہو چکی تھی۔ کارخانے کا پانی بدستور مچھلی فارم کی طرف آتا تھا۔ دروازہ بھی مچھلی فارم کی طرف بدستور کھلا ہوا تھا۔ تاہم موکھلوں نے اس سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے یہ بھی سنا جا رہا تھا کہ وہ اس دروازے سے آمد و رفت شروع کریں گے۔ اب دروازے پر اندر کی طرف تالا پڑا رہتا تھا۔

درحقیقت اب موکھلوں میں پہلے جیسی تیزی اور تن فن باقی نہیں رہی تھی۔ وہ قدم سوچ کر اٹھا رہے تھے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں اچھی طرح آ رہی تھی کہ راجوال والے پوری طرح جاگ رہے ہیں اور اگر وہ اینٹ پھینکیں گے تو دوسری طرف سے بھی اینٹ ہی آئے گی... اور ہو سکتا ہے کہ پتھر بھی آ جائے۔ ڈر تھا کہ بڑے موکھل کے آنے کے بعد کوئی بڑا ہنگامہ ہو گا لیکن ابھی تک خیریت ہی گزر رہی تھی۔ پچھلے جھگڑے میں میری چلائی ہوئی گولی موکھل پاشا کے بازو میں لگی تھی تاہم اسے معمولی زخم آیا تھا۔

ایک دن رونق علی میرے پاس میرے کمرے میں آیا۔ میں تو اب حویلی میں جاتا نہیں تھا۔ یہ رات آٹھ نو بجے کا وقت تھا۔ رونق علی کا پیٹ خوب کسا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ کہیں سے دو چار چرغے اور اسی مناسبت سے روغنی نان وغیرہ پیٹ میں ٹھونس کر آیا ہے۔ ''کہاں سے آ رہے ہو رونق بھائی!'' میں نے پوچھا۔

''ڈسکے گیا ہوا تھا۔ بس تھوڑا سا جشن مشن منایا ہے اس خوشی کے موقع پر۔''

''خوشی کا موقع؟ کس کی خوشی؟''

''تمہاری خوشی بھائی۔''

''پہلی بات ہے رونق بھائی۔ میری خوشی اور جشن آپ خود ہی منا آئے ہیں۔ اور یہ کیسی خوشی ہے کہ مجھے خود بھی پتا نہیں۔''

''تمہارے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں جس طرح کا جشن مناتا ہوں، تمہیں پتا ہی ہے۔ بس ذرا گانا شانا سنتا ہوں۔ تم ان چیزوں سے پرہیز سرپرز کرتے ہو۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ خوشی تمہاری ترقی کی خوشی ہے۔ شاید والی جی نے ابھی تمہیں بتایا نہیں۔ چلو، میں ہی بتا دیتا ہوں... عسکری کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔ لڑائی میں پھٹل ہونے کے بعد بیمار شمار رہتا ہے۔ اس نے خود کہا ہے کہ اب اس سے بھاگ دوڑ نہیں ہوتی۔ عسکری کی خالی جگہ پُر کرنے کے لیے دو نام تھے۔ ایک تمہارا، دوسرا نصر اللہ کا۔ قرعہ تمہارے نام نکلا ہے۔ اب تم جاگیر کے سالار محافظ ہو۔''

یہ سنتے ہی ایک دم مجھے مسرت کا احساس ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی بھاری ذمے داری کا خیال بھی آیا۔ رونق علی نے دراز میں سے لڈوؤں کا ڈبا نکالا اور کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے لڈو کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے ہاتھ پر چمچ مارا۔ ''نہیں... یہ تمہاری طرف سے ہیں۔ پہلے ان کی رقم شکم ادا کرو۔ میری یہی مہربانی ہے کہ میں لیتا آیا ہوں۔''

میں نے اسے دو سو روپے دیے۔ وہ بولا۔ ''میں بس ایک دو ہی کھاؤں گا۔ آج کل بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے۔ اور وہ کیا کہتے ہیں... کولاسٹرول بھی!''

''کولیسٹرول تو بڑھے گا ہی۔ آپ پانی کے علاوہ ہر شے میں مکھن ڈال کر استعمال کرتے ہیں۔''

''اوئے، مکھن سے کچھ نہیں ہوتا شوتا۔ مکھن تو ٹھنڈا ہوتا ہے۔''

''پر کبھی کبھی ٹھنڈا بھی کر دیتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' رونق علی نے پورا لڈو منہ میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

میں نے سنی ان سنی کر دی۔ رونق علی نے دو تین لڈو کھانے کا کہا تھا مگر ہوا اس کے برعکس... بس دو تین لڈو ہی بچے۔ پھر وہ کہنے لگا۔ ''دیکھو... یہ جو دو سو روپیا میں نے تم سے لیا ہے اگر جیب میں رکھوں گا تو یہ بڑی زیادتی ہو گی۔ چلو، اس کی بھی جلیبیاں شلیبیاں منگوا لو۔ لیکن جلیبیاں تو اس وقت ملیں گی نہیں... چلو ریوڑیاں ہی منگوا لو۔ ویسے بھی مجھے لگتا ہے کہ ریوڑیوں سے میرا بلڈ پریشر کافی ٹھیک رہتا ہے۔''

''ہاں، ریوڑیاں بھی بہت ٹھنڈی ہوتی ہیں جی۔ خاص طور سے ان پر جو تل لگے ہوتے ہیں، وہ تو ٹھنڈے ٹھار ہوتے ہیں۔''

''یار! تم تو مذاق کرنے لگتے ہو... چلو، جو جی چاہتا ہے منگوا لو۔ لیکن کچھ منگواؤ ضرور۔ مجھے خوشی اور غم کے موقع پر بھوک بھی کچھ زیادہ لگتی ہے۔''

''سیانے شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ہماری زندگی بس دو ہی حالتوں کا نام ہے... خوشی اور غم!''

''اچھا، یہ پڑھے لکھوں والی چکردار باتیں چھوڑو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ کہیں اس خبیث پاشا سے آمنا سامنا تو نہیں ہوا۔''

''آمنا سامنا کیا ہونا تھا۔ والی جی کے کہنے کے مطابق میں پنڈ کی جُوسے باہر ہی نہیں گیا ہوں۔''

''بس اس کی طرف سے ہوشیار رہنے کی لوڑ ہے۔ وہ تھپڑ والی بات بھولے گا نہیں۔ بدلہ لینے کے لیے موقعے کی تاک شاک میں ہوگا۔''

''جب سامنے آئے گا تو دیکھ لیں گے جی۔ ہماری ہی طرح دو ہاتھوں پاؤں اور ایک سر والا بندہ ہے نا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے، پر اس کی خصلت بڑی بھیڑی ہے۔ وہ پڑی واس (خانہ بدوش) لڑکے والی بات کا پتا ہے تجھے؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ رونق علی بولا۔ ''یہ ڈھائی تین سال پہلے کی بات ہے۔ پڑی واسوں کا ایک مُنڈا موکھلوں کے کھیتوں سے آلو نکالتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ اس حرامی نے اس جرم کی سزا مُنڈے کو یہ دی کہ اسے بھوکے شیر کے آگے ڈال دیا۔''

''شیر کے آگے؟ شیر کہاں سے آ گیا؟''

''اس حرامی نے ایک دھاری دار شیر رکھا ہوا ہے۔ زیادہ بڑا نہیں ہے، پر ہے تو شیر۔ اس کو سنگلیاں ڈال کر دیہات میں گھماتا ہے اور لوگوں پر دہشت ڈالتا ہے۔ سنا ہے، اس نے جانور رکھنے کا لائسنس شائد بھی لیا ہوا ہے۔''

یہ واقعی حیران کن اطلاع تھی۔ میں نے کہا۔ ''آپ لڑکے کی بات بتا رہے تھے۔''

''ہاں... دراصل تھوڑا بہت قصور پڑی واسوں کا بھی تھا۔ وہ رات کے وقت موکھلوں کی پیلیوں (کھیتوں) سے آلو شالو اکھاڑ کر لے جاتے تھے۔ موکھلوں نے انہیں دو چار دفعہ منع شنع بھی کیا۔ پھر ایک رات وہ لڑکا پکڑا گیا۔ موکھل پاشا نے اس روتے کرلاتے مُنڈے کو شیر کے آگے ڈال دیا۔ حویلی کے احاطے میں وہ مُنڈا شیر کے آگے آگے بھاگتا رہا اور دُہائی دیتا رہا۔ شیر نے اسے پکڑا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کو چبا گیا اور اس کی گردن بھی پیچھے سے اُدھیڑ دی۔ ڈر کے مارے مُنڈے کا کوئی وارث اس کے پیچھے نہیں آیا۔ موکھل اپنی حویلی میں ہی ایک دو دن اس کی مرہم پٹی کرتے رہے۔ وہ مُنڈا مر گیا۔''

''پولیس تک بات نہیں گئی؟''

''گئی ہوگی۔ پر وہ کہتے ہیں نا جس کی لاٹھی شاٹھی اسی کی بھینس شینس۔ پاشا نے مشہور کیا کہ مُنڈا چوری کی نیت سے ہتھیار لے کر حویلی کے اندر گھسا تھا اور اسے شیر نے نہیں، رکھوالی کے کتوں نے بھنبھوڑا ہے۔ پڑی واس تو ایسے ڈرے کہ اپنے ڈیرے اٹھا کر کہیں غائب شائب ہو گئے۔ پر بعد میں ساتھ والے پنڈ شریف والا کے ایک ماسٹر اشرف نے مُنڈے کے ماں پیو کو ڈھونڈا اور کہا کہ وہ موکھل پاشا کے خلاف قتل کی رپورٹ شپورٹ درج کرائیں۔ رپورٹ شپورٹ بھی ہوئی، پر تمہیں کہا ہے نا... ہمارے جیسے دور دراڈے علاقوں میں کمزور کا کچھ نہیں بنتا اور نہ اس کی کوئی سنتا ہے۔ الٹا کمزور کی مدد کرنے والا بھی پھنستا ہے۔''

''کیا ماسٹر اشرف بھی پھنس گیا؟''

''بالکل پھنس گیا بھئی۔ اور لوگوں کو پکا یقین ہے کہ ماسٹر اور اس کے گھر والوں کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کے پیچھے پاشا کا ہاتھ ہی تھا۔''

اس کے بعد رونق علی نے مجھے اس موقعے کا سب سے لرزہ خیز حصہ سنایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ ماسٹر اشرف نے مقتول کے وارثوں کو مقدمہ کرنے پر اکسایا تھا اور سینہ تان کر گواہی وغیرہ بھی دی تھی، اس لیے موکھلوں کو رنج تھا۔ بعد میں مقدمہ تو خارج ہو گیا پر موکھلوں کے دل میں رنج رہا... خاص طور سے موکھل پاشا کے دل میں۔ ماسٹر اشرف کی تنخواہ معمولی تھی۔ گزر بسر کے لیے ماسٹر اشرف کا چھوٹا بھائی گھر میں ہی دیسی طرز کی ماچیس بناتا تھا۔ اشرف کی بیوی اور دو بچے بھی اس کام میں شریک ہوتے تھے... کوئی ایک سال پہلے ان کے گھر رکھی ہوئی گندھک پاشاس میں زوردار دھماکا ہوا اور سارا گھر دھڑا دھڑ جلنے لگا۔ ماسٹر اشرف کے گھر میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا۔ ماسٹر اشرف کے علاوہ اس کی بیوی، دو بچے اور چھوٹا بھائی سب جل کر خاکستر ہو گئے۔ بہ ظاہر یہ ایک حادثہ تھا لیکن علاقے کے واقف حال لوگ جانتے تھے کہ یہ حادثہ کیوں ہوا اور کس نے کیا۔ عام لوگوں کو بھی یقین تھا اور ہے کہ اس کے پیچھے موکھل پاشا کا ہاتھ تھا۔

موکھل پاشا کے بارے میں تفصیل جاننے کے بعد میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس سنسنی میں ڈر کی آمیزش نہیں تھی بلکہ ایک طرح کی ترنگ تھی اور اس ترنگ سے یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ میں اس خطرناک بندے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھوں۔ پھر مجھے اس معصوم ثمینہ کا خیال آیا اور مجھے تعجب ہونے لگا کہ اگر پاشا واقعی اتنا خطرناک اور غلط کار ہے تو پھر ثمینہ نے اس سے یارانہ کیوں بنایا ہوا ہے؟ کہیں رونق علی کے قیافے کے مطابق وہ واقعی کسی چکر

میں تو نہیں پھنسی ہوئی؟ اگر ایسا تھا تو پھر اسے مدد کی ضرورت تھی لیکن مدد تو تب ہوتی جب حقیقت کا پتا چلتا۔

☆☆☆

چاچے عسکری کی جگہ لینے کے بعد میری مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔ نصر اللہ میرے معاون کا کردار ادا کر رہا تھا۔ میں نے نصر اللہ کو پوری عزت اور محبت دی تھی۔ اسے مجھ سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ ہم سائیسوں کی مدد سے گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتے۔ اسلحے کو دیکھتے بھالتے، بندوں کو چوکس رکھتے۔ شکاری جانوروں یعنی کتوں اور بازوں وغیرہ کے نگران بھی مجھ سے رابطے میں رہتے اور اپنی رپورٹیں دیتے رہتے۔

ان ساری مصروفیات میں بھی بیگم بلقیس کا خیال چند لمحوں کے لیے بھی ذہن سے نہیں نکلتا تھا۔ اتفاقاً چودہ پندرہ تاریخ کو والی جی راجوال سے باہر نہیں گئے۔ مجھے مزید دو ہفتے انتظار کرنا پڑا۔ اس دوران میں، میں نے ایک بہت اہم کام کیا۔ کچھ لائسنسی بندوقوں کی مرمت کروانے کے لیے میں گوجرانوالہ گیا تو لاہور کا چکر بھی لگا آیا۔ لاہور کی شاہ عالم مارکیٹ سے میں نے 18 واٹ کا ایک اور انٹر کام خریدا اور اس کا تار اور کنیکٹر وغیرہ لیا۔ راجوال واپس پہنچے کے دو دن بعد مجھے ایک سنہری موقع مل گیا۔ میں نے چاچے عسکری کے کمرے میں چھت کے پاس سے انٹر کام کا تار ڈھونڈا اور اس تار کو نئے تار سے منسلک کر دیا۔ نئے تار کو چھت کی سرکیوں کے اندر سے گزار گزار کر میں اپنے کمرے تک لے آیا۔ یہ سارا کام میں نے اس طریقے سے کیا کہ آسانی سے کسی کی نگاہ میں نہ آ سکے۔ سچ کہتے ہیں کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔

اب دوسرا انٹر کام میرے کمرے کے اندر چوبی الماری کی ایک دراز میں مقفل تھا اور میں بے چینی سے کسی اچھے وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ اچھا وقت دو ہفتے بعد آیا۔ والی جی اور چودھری عزیز دونوں کو تاریخ پر جانا پڑا۔ رات کو میں نے بیگم بلقیس سے رابطہ کیا... ہمارے درمیان دیر تک باتیں ہوئیں۔ لیکن اب میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ گفتگو میں کافی محتاط ہیں۔ میں اب انہیں بیگم بلقیس کے بجائے صرف بلقیس کہنے لگا تھا۔

میں نے کہا۔ ''بلقیس! آپ کو کیسا لگتا ہے؟ مجھے تو لگتا ہے کہ شاید ہم آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے دور ہو رہے ہیں۔ کہیں یہ... واپسی کا سفر تو شروع نہیں ہو گیا؟''

وہ پہلی بار ذرا سا ہنسیں اور دل نواز لہجے میں ایک جملہ کہا۔ ''اب واپسی شاید ممکن نہیں ہے خاور!''

میرے دل کے بجھتے ہوئے دیے میں جیسے پھر سے تیل پڑ گیا۔ میں نے جذبات سے بوجھل لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کی آواز کو ترس رہا ہوں۔''

''بول تو رہی ہوں دو گھنٹے سے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر کانوں کو کچھ اور عادت بھی پڑ گئی ہے۔''

وہ پھیکے انداز میں ہنسیں۔ ''نہیں... اب بس۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ کہیں واپسی تو شروع نہیں ہو گئی؟''

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہیں پھر میرے اصرار پر انہوں نے ہیر وارث شاہ کا ایک ایسا بند سنایا جس میں ناقابلِ مزاحمت محبت کے ساتھ ساتھ مجبوریوں اور ناموافق حالات کا تذکرہ بھی تھا۔ اس کے علاوہ اس ناطاقتی، نارسائی اور خوف کا بیان تھا جو ہمیشہ عورت ذات کے ساتھ منسلک رہے ہیں۔ آخر میں پھر امید کی ایک کرن سی تھی۔

سچ بات تو یہ ہے کہ ان کے گانے سے بھی زیادہ مجھے ان کی اس سوالیہ ''بس'' کا مزہ آتا تھا جو وہ گانے کے آخر میں کہتی تھیں۔ اس مرتبہ بھی آخر میں انہوں نے بڑے دل رُبا انداز میں ''بس؟'' کہا اور میں پوری جان سے تڑپ گیا۔

میں نے کہا۔ ''کاش! آپ سامنے ہوتیں تو...''

وہ میری بات سمجھتے ہوئے شرمیلے انداز میں بولیں۔ ''تو... اب کچھ نہیں۔ بس اب سنبھل جانا چاہیے۔''

وہ سنبھلنے کی بات تو کرتی تھیں مگر ایسے میٹھے انداز میں کہ مزید بکھرنے کو دل چاہنے لگتا تھا۔

والی صاحب دو دن مزید نہیں آئے اور ہمارے درمیان باتیں ہوتی رہیں۔ چاچے عسکری والا کمرا اب مستقل طور پر منشی منظور کو دے دیا گیا تھا۔ منشی منظور ہی حویلی سے پیغام رسانی کا ذمے دار ٹھہرا تھا۔ وہ جلدی سو جاتا تھا۔ پھر بھی میں محتاط رہتا تھا کہ کسی وقت وہ اپنی طرف سے ریسیور نہ اٹھا لے۔ یہ عجیب سا بہاؤ تھا جس میں ہم دونوں نے سب کچھ جانتے بوجھتے پھر بہنا شروع کر دیا تھا۔

میرے گھر کی مالی حالت اب کافی بہتر تھی۔ والدہ اور عارفہ مجھ سے خوش تھیں۔ والدہ نے اصرار کر کے مجھ سے نیلی بار کی ایک بھینس منگوالی تھی۔ اس کے سینگ مڑے ہوئے تھے اور پنڈا خوب چمک دار تھا۔ صبح اور شام کا دودھ ملا کر کوئی پندرہ کلو ہو جاتا تھا۔ والدہ یعنی بے بے دودھ کو خدا کا نور کہتی تھیں۔ اس ''نور'' کو سنبھالنے، جمانے، بلونے اور اس میں سے مکھن نکالنے میں انہیں بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ سارا دن بس اسی کام میں لگی رہتی تھیں۔ میں گاؤں جاتا تو وہ جہاں بھی

ہوتیں، میں انہیں پکڑ کر چار پائی پر لٹاتا اور ان کے پاؤں دبانا شروع کر دیتا۔ ان کے پاؤں دبانے میں مجھے جو راحت ملتی تھی اس کا بیان لفظوں میں ممکن نہیں۔ عارفہ ہر وقت میری شادی کی بات کرتی رہتی۔

میں کہتا۔ ”تو بڑی خچری ہے۔ شادی ویاہ کی باتیں اس لیے چھیڑتی ہے کہ پھر تیری شادی کی باتیں بھی ہوں۔“

”نہیں جی! مجھے کوئی شوق نہیں ہے ویاہ کرانے کا۔“

میں کہتا۔ ”شوق تو مجھے بھی نہیں تھا مگر دیکھو، اب پڑ گیا ہے۔ جاگیردار صاحب کی ایک نہیں تین بیٹیاں ہیں اور تینوں ایک سے بڑھ کر ایک سوہنی۔ تینوں میں دوڑ لگی ہوئی ہے کہ کون مجھ پر حاوی ہوتی ہے۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ مجھے ایک نہیں دو... بلکہ شاید تین شادیاں کرنی پڑیں گی۔“

وہ تنک کر کہتی۔ ”کبھی آپ کہتے ہیں کہ میرے ہتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں، کبھی اکٹھی تین وو ہٹیوں کے لاڈلے بنتے ہیں۔“

”بس اسی بات سے ڈر لگتا ہے، بہن میری... اگر لکیریں واقعی سچی ہوتی ہیں تو پھر کوئی بھی گڑبڑ گھوٹالا ہو سکتا ہے۔ کیا پتا، وہ تینوں آپس میں ہی لڑ پڑیں اور کوئی ایک بھی ہتھ نہ آئے۔“

”مجھے تو لگتا ہے کہ آپ بس ناٹک رچاتے ہیں، وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔“

بے بے بڑی سنجیدگی سے کہتیں۔ ”دیکھ پتر خاور! اب اللہ سوہنے نے ہمارا ہتھ سوکھا کر دیا ہے۔ جو تھوڑا بہت قرضہ تھا، وہ بھی اتر گیا ہے۔ اب سب سے پہلے ہم دو کچے پکے کوٹھے بنا لیں... جب تک کوٹھے بنتے ہیں، میں تیرے لیے کوئی چنگی سی کڑی ڈھونڈ لیتی ہوں۔ میں سچ کہتی ہوں خاورے! اب تو تیرے سر پر سہرا دیکھنے کی آس میں جی رہی ہوں۔“ ان کی دن بہ دن بوڑھی ہوتی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی چمک جاتی۔

ہمارے گھر میں بس ایک ہی قابلِ استعمال کمرا تھا۔ ہمیں ایک یا دو کمروں کی شدید ضرورت تھی۔ اب دیہات میں کہیں کہیں پکے کوٹھے بننے شروع ہو گئے تھے۔ میرا دل بھی چاہتا تھا کہ ہمارے پنڈ میں پہلا پکا کوٹھا ہمارا ہو۔ اس کے لیے میں ہر مہینے پیسے جمع کر رہا تھا اور اب بے بے کے جستی ٹرنک میں کوئی آٹھ ہزار روپے اکٹھے ہو چکے تھے۔ ایک روز میں نے بے بے سے وعدہ کیا کہ چھوٹی عید کے فوراً بعد کوٹھے بنوانا شروع کرا دوں گا۔

راجوال میں حالات ٹھیک جا رہے تھے۔ دو نمبر بمبوکاٹ اپنا کام بڑے اچھے طریقے سے کر رہا تھا۔ بیگم بلقیس سے رابطہ جاری تھا۔ اب کبھی کبھی والی جی کی موجودگی میں بھی بیگم بلقیس بات کرنے کا موقع نکال لیتی تھیں۔ جب والی جی سو رہے ہوتے، وہ انٹرکام پر ایک بیل کر کے بند کر دیتیں۔ منشی منظور کو کچھ اندازہ نہ ہوتا کہ بیل کیوں ہوئی ہے۔ وہ اکثر ریسیور ہی نہ اٹھاتا۔ کبھی کبھی ریسیور اٹھا لیتا اور ایک دو دفعہ ہیلو کہہ کر بند کر دیتا۔ میرے والے انٹرکام پر بہت مدھم بیل ہوتی تھی۔ منشی منظور کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں کال کرتا اور بیگم بلقیس کی بے مثال آواز کا رس میرے کانوں میں ٹپکنا شروع ہو جاتا۔ میں جانتا ہوں، یہ سب کچھ غلط تھا مگر اس کے ہونے یا نہ ہونے پر ہمارا بس نہیں تھا۔ خاص طور سے میرا تو بالکل بھی نہیں تھا۔ میں سرتاپا بیگم بلقیس کی محبت میں ڈوب چکا تھا۔ جسم کے ایک ایک روئیں میں ان کی چاہت بس چکی تھی۔ اور میں جانتا تھا کہ وہ ایک بیوی ہیں، ایک جوان ہوتے بچے کی ماں ہیں اور ان کی عزت کے ساتھ والی جی کی اور پوری جاگیر کی عزت وابستہ ہے۔

ایک دن میں نے کہا۔ ”بلقیس! میں آپ کو کچھ دینا چاہتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“

”دیکھیں، آپ ہمیشہ مجھے کچھ نہ کچھ دیتی ہی رہی ہیں۔ آپ کی درجنوں چیزیں میرے پاس جمع ہو چکی ہیں لیکن میں آج تک آپ کو کچھ نہیں دے سکا۔“

”کوئی ضرورت نہیں۔ بس تم نے کہہ دیا، مجھے مل گیا۔“

”نہیں، اس طرح نہیں... میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس عید پر آپ کو کچھ دوں اور دیکھیں، آپ نے انکار نہیں کرنا۔“

”نہیں خاور! یہ ٹھیک نہیں۔“

وہ نہ نہ کرتی رہیں اور میں اپنی بات پر اڑا رہا۔

بیگم بلقیس سے بات ہونے کے بعد میں نے سوچنا شروع کیا کہ انہیں کیا دیا جائے... میں نے بازار میں کبھی خریداری نہیں کی تھی۔ اس کام میں مجھے ذرہ بھر دلچسپی نہیں تھی... کبھی شادی بیاہ کے موقع پر بے بے جی یا عارفہ بہت زور لگاتیں کہ میں خریداری کے لیے ان کے ساتھ ڈسکے تک ہی چلا جاؤں لیکن میں مان کر نہیں دیتا تھا۔ سو بہانے بناتا اور بالآخر جان چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا۔ اب زندگی میں پہلی بار میرا دل بازار جانے کو اور خریداری کرنے کو چاہا... اور اس طرح چاہا کہ میں باقی سب کچھ بھول گیا۔

میں پورے دو دن سوچتا رہا کہ اس کو کیا تحفہ دوں جو میری رگِ جاں سے بھی قریب ہو چکا ہے۔ ہر تحفہ حقیر اور ہر

ارادہ چھوٹا محسوس ہو رہا تھا۔ کوئی ایسی چیز درکار تھی جو مختصر ہو اور قیمتی بھی۔ ظاہر ہے، یہ کوئی طلائی زیور ہی ہو سکتا تھا...

مجھے پتا تھا کہ بیگم بلقیس ایک جاگیردار کی بیوی ہیں اور ان کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک گہنا ہوگا۔ شادی کے موقعے پر میں نے انہیں نہایت قیمتی ہار اور جھمکے پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک جاگیردار اور ایک ملازم پیشہ کا مقابلہ کہاں ہو سکتا تھا؟ لیکن کم از کم اس تحفے کے حوالے سے میں پیچھے رہنا نہیں چاہتا تھا۔

میں ایک دن لاہور پہنچا اور روزے کی حالت میں سارا دن سوہا بازار کے چکر لگاتا رہا۔ سوہا بازار کی دکانیں سونے چاندی کے زیورات سے بھری ہوئی تھیں۔ ان میں کئی بہت بیش قیمت تھے تاہم میری جیب میں صرف وہ آٹھ ہزار روپے تھے جو میں نے کئی ماہ میں جمع کیے تھے تاکہ دو کوٹھے بن سکیں۔ تلاشِ بسیار کے بعد مجھے ایک ہار بیگم بلقیس کے شایانِ شان محسوس ہوا۔ اس میں سچے نگینے بھی لگے ہوئے تھے۔ یہ نہایت خوب صورت چیز تھی۔ صراف نے اس کی قیمت اٹھارہ ہزار بتائی۔ اس دور کے حساب سے یہ کافی قیمت تھی۔

میں دل میں ارادہ کر چکا تھا کہ اب کچھ بھی ہو یہی ہار لینا ہے، لہٰذا میں لاہور سے واپس آ گیا۔ اگلے تین چار روز میں نے پیسوں کے انتظام میں گزار دیے۔ رونق علی سے تین ہزار روپے لیے۔ یاروں دوستوں سے تھوڑا تھوڑا اُدھار لیا۔ اپنی ایک دو ذاتی اشیا بیچیں جن میں ایک ولایتی رائفل اور سونے کے دو تعویز (خالی ڈبیاں) شامل تھے۔ میں دوبارہ لاہور پہنچا اور جب مطلوبہ ہار میرے ہاتھ میں آیا تو یوں لگا کہ زندگی کی ایک بہت بڑی خوشی حاصل ہو گئی ہے۔ محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ یہ بندے سے ایسے ایسے کام کراتی ہے جو وہ عام حالات میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں نے حساب لگایا تو اندازہ ہوا کہ میں نے قریباً پانچ روز اس ہار کے لیے مسلسل بھاگ دوڑ کرتے گزارے ہیں لیکن مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں نے یہ عرصہ زمین پر جُل خراب ہوتے نہیں ہواؤں میں اڑتے ہوئے گزارا ہے۔

میں نے ایک چھوٹا سا عید کارڈ بھی لیا تھا مگر اس پر لکھا کچھ نہیں تھا۔ میں نے یہ چیزیں پیک کر لیں، اب انہیں بیگم بلقیس تک پہنچانے کا مرحلہ تھا۔ میں حویلی کے اندر جاتا نہیں تھا اور وہ باہر آتی نہیں تھیں۔ اب آمنا سامنا ہو تو کیسے؟ میں مختلف طریقے سوچتا رہا۔ اسی دوران میں اتفاقاً میری مشکل آسان ہو گئی۔ شاید اسی کو قسمت کا زور مارنا کہتے ہیں۔ یہ عید سے بس چار پانچ دن پہلے کی بات ہے۔ رات کے نو بجے ہوں گے۔ میں کمرے میں تھا اور نصر اللہ کے ساتھ بیٹھا مونگ پھلی ٹھکور رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں بیل ہوئی، چند سیکنڈ بعد دروازے پر منشی منظور نمودار ہوا اور بولا۔

”خاورے! تجھے والی جی بلا رہے ہیں۔“

”کہاں؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”بمبوکاٹ پر!“

میں جلدی سے دوسرے کمرے میں گیا۔ انٹرکام پر والی جی کراہ رہے تھے۔ ”کیا ہوا جناب؟“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

وہ کراہتے ہوئے بولے۔ ”آج روزہ رکھا تھا۔ افطاری کے بعد سے سینے میں سخت سڑن پڑ رہی ہے۔ الٹی بھی آئی ہے۔ مولوی بشارت نے دو پڑیاں دی تھیں، پر کچھ فرق نہیں پڑا۔ اگر تمہارے پاس کوئی دوا ہے تو...“

”کیوں نہیں جی... ہے دوا۔“

”تو پھر لے آؤ۔“ انہوں نے کراہتے ہوئے کہا۔

اب مسئلہ وہی تھا۔ والی جی انگریزی دوا کھاتے نہیں تھے۔ الٹی کی دوا ”گریوی نیٹ“ تو میں نے پیس کر رکھی ہوئی تھی۔ سینے میں جلن کی معروف دوا جیلوسل ٹکیوں کی شکل میں تھی۔ میں نے نصر اللہ کو باہر بھیج کر جیلوسل کی پانچ چھ ٹکیاں بھی اسٹیل کے گلاس میں پیس کر اخبار کے کاغذ میں پڑیوں کی طرح لپیٹ لیں۔ متلی کی دوا گریوی نیٹ بھی میں نے اسی میں مکس کر لی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے الماری کی مقفل دراز میں سے چھوٹا پیکٹ بھی نکال لیا۔ عید کارڈ اور ہار والا پیکٹ!

کئی ماہ بعد میں حویلی میں داخل ہوا اور والی جی کے کمرے میں پہنچا۔ انہیں تکلیف میں دیکھ کر مجھے حقیقی پریشانی ہوتی تھی۔ بیگم بلقیس والی جی کو پیالی سے پانی پلا رہی تھیں۔ انہوں نے اوڑھنی کو اس طرح سر پر ڈھلکا رکھا تھا کہ چہرے پر چھوٹا سا گھونگھٹ بن گیا تھا۔ میرے آنے کے بعد وہ باہر چلی گئیں۔ تاجو ہمارے آس پاس ہی موجود رہی۔ میں نے والی جی کو دوا کھلائی۔ ان کے پاس بیٹھ کر ان کا حال احوال دریافت کرتا رہا۔ ایک دم میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”والی جی! ایک چھوٹی پڑیا تو رہ ہی گئی ہے، میں ابھی لے کر آیا۔“

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

دراصل مجھے قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوا تھا کہ بیگم بلقیس زنان خانے کے داخلی دروازے کی طرف جا رہی ہیں۔ اب اگر میں بھی داخلی دروازے کی طرف جاتا تو ان سے آمنا سامنا ہو سکتا تھا۔ میں دروازے کی طرف بڑھا اور

بالکل اسی طرح ہوا جس طرح میں نے سوچا تھا۔ بیگم بلقیس داخلی دروازے کی طرف سے ہو کر واپس آ رہی تھیں اور میں جا رہا تھا۔ ہماری ملاقات ایک تنگ راہ داری میں ہوئی۔ وہ اپنی گرم شال میں کچھ سمٹی ہوئی سی تھیں۔ شاید انہیں پہلے سے اندازہ تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ وہ قریب پہنچیں تو میں نے واسکٹ کی اندرونی جیب سے ہار والا پیکٹ نکالا اور ان کی طرف بڑھایا۔

یہ خطرناک لمحے تھے۔ تاجوار دگرد موجود تھی اور حامد بھی جاگ رہا تھا۔ فیروزاں کی آواز کہیں پاس سے آ رہی تھی۔ بیگم بلقیس نے عجیب انداز سے نفی میں سر ہلایا اور بدن چرا کر میرے پاس سے گزرنا چاہا۔ میں نے ایک بار پھر پیکٹ انہیں تھمانے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے ہاتھ شال سے باہر نہیں نکالے اور تیزی کے ساتھ میرے پاس سے گزریں۔

ان ساعتوں میں ایک عجیب سی جھنجھلاہٹ نے مجھے گھیرا۔ میں نے مشینی انداز میں ہاتھ کو حرکت دی اور پیکٹ بیگم بلقیس کے سامنے فرش پر پھینک دیا۔ انہوں نے پیکٹ کو گرتے دیکھا مگر اسے اٹھائے بغیر کمرے میں چلی گئیں۔ میں بھی لمبے ڈگ بھرتا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے ایک لمحے کے لیے مڑ کر دیکھا۔ بیگم بلقیس دوبارہ کمرے سے نمودار ہوئیں۔ انہوں نے پیکٹ اٹھا کر اپنی شال کے نیچے چھپایا اور اندر چلی گئیں۔

میں درد کی دوا بیسکوپین کی ایک پسی ہوئی ٹکیا کی پڑیا لے کر واپس آ گیا... اور والی جی سے کہا کہ وہ درد کے وقت اسے استعمال کر سکتے ہیں۔

حویلی سے اپنے کمرے میں واپس آ کر میں دیر تک آج کے واقعے کے بارے میں سوچتا رہا۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب انٹرکام کی ایک بیل ہوئی۔ منشی منظور آج کل اونچا سنانے والا آلہ استعمال کر رہا تھا پھر بھی وہ ایک مختصر بیل سے جاگنے والا کہاں تھا۔ یہ بیل بیگم بلقیس کی طرف سے اشارہ تھی۔ میں نے انٹرکام پر ان سے رابطہ کیا۔ انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''بہت بُری بات ہے... بہت ہی بُری بات ہے۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''کیا مطلب؟''

''اتنا مہنگا تحفہ... نہیں... میں یہ نہیں لوں گی۔''

''آپ نے لیا ہی کب ہے۔ میں تو پھینک کر آ گیا ہوں۔''

''اور ہاں... یہ کیا حرکت تھی؟ یہ کیوں کیا تم نے... اگر کوئی دیکھ لیتا تو پھر؟''

''پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے۔ بلکہ تب تو میرا دل چاہتا تھا کہ اسے کہیں دور پھینکوں۔ کہیں کوڑے وغیرہ میں۔''

''خاور! یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم؟''

میں نے گہری سانس لی۔ ''بلقیس! کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں آپ کے لیے مستقل خطرہ بنا ہوا ہوں۔ آپ کی زندگی بھی میری وجہ سے مشکل میں ہے۔ اس کے ساتھ یہ احساس بھی ہے کہ والی جی کو دھوکا دے رہا ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ واقعی سب کچھ چھوڑ کر چلا جاؤں۔ بہت دور... جہاں مجھ تک آپ کی کوئی خبر نہ پہنچے اور نہ میری خبر آپ کو ہو... کبھی نہ ہو۔''

''لگتا ہے ناراض ہو گئے ہو؟''

''نہیں بلقیس! یہ ناراضگی اپنے آپ سے ہے۔ آپ... یہ بات بھی بار بار ذہن میں آتی ہے کہ آخر اس سلسلے کا کیا ہو گا۔ اور جس چیز کو کوئی انجام ہی نہ دیا جا سکتا ہو اسے جاری رکھنے سے حاصل؟''

اسی دوران میں والی جی کے مسلسل کھانسنے کی آواز آئی۔ بیگم بلقیس نے کہا۔ ''اچھا، میں انہیں دیکھتی ہوں... بات کریں گے۔''

اس کے ساتھ ہی انٹرکام یعنی بمبوکاٹ بند ہو گیا۔

اگلے روز رات کو نو بجے کے لگ بھگ مجھے والی جی کے بلاوے پر پھر حویلی میں جانا پڑا۔ ان کی طبیعت اب ٹھیک نہیں تھی۔ شام سے پیٹ میں مسلسل درد ہو رہا تھا۔ رنگ زرد دکھائی دے رہا تھا۔ والی جی کو ڈسکہ جانے اور ڈاکٹر کو دکھانے کا مشورہ فضول تھا۔ انہوں نے ماننا ہی نہیں تھا۔ میں نے انہیں پسی بیسکوپین کھلائی اور پسی ہوئی جیلوسل کی ایک پڑیا بھی دی۔

میں ان کے پاس ہی بیٹھا رہا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ چودھری عزیز بیوی بچوں سمیت کسی شادی پر گوجرانوالہ میں تھا۔ درد کش دوا نے جلد ہی اثر کیا اور والی جی کی تکلیف بتدریج کم ہونے لگی۔ وہ بولے۔ ''خاور! یہ تیری دوائیں تو سنیاسی، پر ان میں سے بُو وہی منحوس انگریزی دواؤں کی آتی ہے۔''

''آرام تو دیتی ہیں نا جی۔''

''ہاں۔ یہ بات تو ہے۔ مولوی بشارت کے نسخوں میں جیسے کوئی اثر ہی نہیں رہا۔ لگتا ہے جب سے اس نے دوسرا... کیا ہے اس کے کام میں برکت ختم ہو گئی ہے یا پھر یہ خود... کے نام پر برکت نکال لیتا ہے۔''

ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں چونکہ دوسرے تیسرے روز مچھلی فارم کا چکر لگا آتا تھا، اس لیے والی جی مجھ سے وہاں کی صورتِ حال دریافت کرنے

پھر انہوں نے ایک قریبی زمیندار سے دس نئے گھوڑے خریدنے کی بات چھیڑ دی۔ ان کا خیال تھا کہ سودے سے پہلے میں ایک بار چاچے عسکری کو ساتھ لے جا کر گھوڑوں کو دیکھ آؤں۔ باتیں کرتے کرتے ان کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور وہ سو گئے۔ درد سے نجات کے بعد عموماً مریض کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔

آج تاجو بھی کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ بس کبھی کبھی قریبی کمروں سے قدموں کی مدھم چاپ ابھرتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ بیگم بلقیس ہی تھیں۔ میں اب جانا چاہتا تھا۔ میں کمرے کے دروازے تک پہنچا اور کھنکھار کر گلا صاف کیا تاکہ گھر والوں کو پتا چل جائے کہ میں جا رہا ہوں۔ اس وقت قریبی دروازے پر بیگم بلقیس نمودار ہوئیں۔

''جا رہے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا اور زنان خانے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے کے لیے راہ داری میں داخل ہوا۔ وہ اپنی جگہ کھڑی رہیں اور میری طرف دیکھتی رہیں۔ اچانک میرے رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی۔ دل کی دھڑکنیں پورے جسم میں گونجنے لگیں۔ میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی ناک کا کوکا لشکارے مار رہا تھا۔ ہونٹوں پر ایک دبی سی مسکراہٹ تھی۔ میرے پاؤں جیسے زمین نے جکڑ لیے۔ میں بیگم بلقیس کے مقابل قریباً چار فٹ کی دوری پر کھڑا رہ گیا۔ یہ بڑے معنی خیز لمحے تھے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے شیریں لہجے میں کہا۔

''اب کھڑے کیوں ہو... جاتے کیوں نہیں؟''

میں نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''آپ کہتی ہیں تو چلا جاتا ہوں۔'' میں کہہ تو رہا تھا مگر میرا سراپا گواہی دے رہا تھا کہ میں پتھر کا ہو چکا ہوں۔ اب یہاں سے ہلنا میرے لیے بے حد دشوار کام ہوگا۔ کوکے کے لشکارے کے سوا ہر چیز میری نظر میں دھندلا گئی تھی۔

ان کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں لرزے۔ پھر انہوں نے بڑی ادا سے میری کلائی تھام لی اور الٹے پاؤں چلتے ہوئے مجھے ایک نیم تاریک کمرے میں لے آئیں۔ اس کمرے میں لالٹین وغیرہ نہیں تھی۔ بس قریبی کمرے کے نیم وا دروازے سے مدھم روشنی یہاں پہنچ رہی تھی۔ اس دوسرے کمرے میں حامد شہنیل کے لحاف کے نیچے سو رہا تھا۔ اس کے اردگرد کاپیاں بکھری ہوئی تھیں۔ فیروزاں بھی شاید آس پاس کے کسی کمرے میں سو رہی تھی۔ وہ میری کلائی تھامے، الٹے قدموں پیچھے ہٹتی گئیں اور پھر ایک منقش چوبی الماری سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئیں۔ یہ ایک ایسی دعوت تھی جس سے انکار کرنا یا جس کو قبول کرنے میں تاخیر کرنا میرے لیے ممکن ہی نہیں

میں نے ان کو بانہوں میں لے لیا۔ میر... مہینوں سے ان کے چہرے کو ترس رہے تھے۔ ان کی سرسراہٹ، بدن کی خوشبو، چہرے کا نمک... لشکارا... یہ سب کچھ آپس میں گڈمڈ ہو گیا اور ایک... فزا کیفیت میں ڈھل گیا جس نے مجھے یک لخت ہوش... اڑا دیا۔ میرے ہاتھ گستاخ ہونے لگے۔ میں نے ان... کان میں سرگوشی کی۔ ''کیوں اتنا پیار کرتا ہوں آپ... کیوں کرتا ہوں؟''

اس ہانپی ہوئی سرگوشی کا جواب ہانپی ہوئی سانسوں... سوا اور کچھ نہ تھا۔ احاطے سے پار کوئی گھوڑا اہنہنایا۔ کسی... ہوئے پہرے دار نے دو تین بار کھانسی کی اور ایک بار... گہری خاموشی چھا گئی۔ ''ناراض ہو گئے تھے؟'' بیگم... نے میرے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

''آپ سے کیسے ناراض ہو سکتا ہوں۔'' میں نے کہا... ایک بار پھر ان میں گم ہونے لگا۔ ان کی پشت پر چوبی الماری... ہل رہی تھی اور آہٹ پیدا کر رہی تھی۔ ''اب بس کرو...'' انہوں نے کہا اور ایک ادا سے مجھے پیچھے ہٹا دیا۔

کسی قریبی کمرے سے فیروزاں کی نیند میں ڈوبی... آواز سنائی دی۔ ''نی تاجو... تھوڑا سا پانی پلا دے۔''

بیگم بلقیس نے کہا۔ ''اچھا... اب تم جاؤ۔''

میں واپس مڑا مگر دو قدم چل کر پھر بیگم بلقیس کی طرف... آگیا۔ ایک عجیب سی جذبات انگیز شوخی نے مجھے پھر... چہرے پر جھکا دیا۔ ''اوہو... اب جاؤ بھی۔'' انہوں نے... ہولے سے دھکیلا۔

''بمبوکاٹ پر بات کریں گی؟''

''اچھا بابا کروں گی۔''

''کتنی دیر میں؟''

''ایک گھنٹے تک!''

میں واپس آگیا۔ میرے روئیں روئیں میں خوشی... رہی تھی۔ ایک ایسی مستی تھی جس میں ہر طرح کے اندیشے... خدشات غرق ہو کر رہ گئے تھے۔ مجھے اپنے آپ سے... خوشبو آرہی تھی۔ ان کے دل نواز چہرے کا نمک میرے... ہونٹوں کے رستے میرے پورے جسم میں سرایت کر گیا... میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس دل نشیں ملاقات کے مناظر... میں بسا کر آنکھیں بند کر لوں اور سو جاؤں لیکن ابھی... میں ان کی کال آنا تھی۔

میں انٹرکام کے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ جونہی

...کی طرف سے بیل ہوئی، میں نے فوراً ریسیور اٹھا لیا۔ ''ہیلو!'' بیگم بلقیس کی شیریں آواز کانوں میں گونجی۔

''ہیلو! اب تو آپ کے بغیر تھوڑی دیر گزارنا بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔''

''اور اگر لمبی جدائی پڑ گئی تو...''

''پھر جینا مشکل ہو جائے گا۔'' وہ خاموش رہیں۔ میں نے پوچھا۔ ''فیروزاں کو شک تو نہیں ہوا۔'' انہوں نے نفی میں جواب دیا۔ ''اور تاجو آج کہاں تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ آج ماں سے ملنے گئی ہوئی ہے۔''

''گئی ہوئی ہے یا آپ نے بھیجا ہے؟'' میں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''جو بھی تم سمجھ لو۔'' وہ شرمیلے انداز میں مسکراتے لہجے میں بولیں۔

''والی جی اب ٹھیک ہیں؟''

''ہاں... اور ان کو ٹھیک رکھنا تمہاری ہی ذمے داری ہے۔''

''کیوں نہیں جی۔''

انہوں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''خاور! والی جی کو تمہاری ضرورت ہے۔ وہ ہر معاملے میں تم پر بہت بھروسا کرنے لگے ہیں۔ تمہارے موجود ہونے سے ان کو بہت سہارا ملتا ہے۔ ان سے دور مت ہونا۔ تم... تم ان کی ضرورت بن گئے ہو۔''

''نہیں بلقیس! آپ اس بارے میں بالکل بے فکر رہیں۔''

''کل تمہارے آنے سے انہیں بہت فائدہ ہوا۔ دو دن سے بالکل گم صم تھے لیکن تم سے باتیں کرتے رہے۔ دوائی سے ان کی طبیعت بھی بہتر ہوئی۔''

''آپ کے لیے اور ان کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔'' میں نے کہا اور خلوصِ دل سے کہا۔

''موکھلوں کی طرف سے کوئی نئی شرارت تو نہیں ہوئی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں۔ ابھی تک تو معاملہ کنٹرول ہے۔ بس قانونی کارروائی ہو رہی ہے۔''

''اور وہ ثمینہ والا معاملہ؟ میرا مطلب ہے، اب تو نہیں مل رہی وہ موکھلوں کے بندے سے؟''

''نہیں۔ ابھی تک تو کوئی ایسی اطلاع نہیں ہے جی۔''

''وہ اس بات کا بھی دل پر بڑا اثر لے رہے ہیں۔ کچھ بھی ہے، یہ لوگ حویلی کے پرانے ملازم تھے... بلکہ جدی ملازم کہنا چاہیے۔''

''آپ بالکل بے فکر رہیں جی۔ میں نے اور نصراللہ نے سارے معاملے پر گہری نظر رکھی ہوئی ہے۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

ہم تقریباً ایک گھنٹا باتیں کرتے رہے۔ ایک بار پھر ہار کا تذکرہ بھی ہوا۔ بیگم بلقیس بار بار کہہ رہی تھیں کہ میں نے اتنا مہنگا تحفہ کیوں خریدا؟ والی جی کو بیگم بلقیس کے سارے زیورات کا علم تھا۔ اس لیے بیگم بلقیس نے یہ ہار ایک تکیے میں چھپا کر جستی پیٹی کے سامان میں سب سے نیچے رکھ دیا تھا۔

بات ختم ہونے کے بعد بھی میں دیر تک بیگم بلقیس کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ایک معمّا تھیں... ان کے محسوسات کو سمجھنا میرے لیے ایک نہایت دشوار کام تھا۔ کل میں نے ان سے ناراضی کا اظہار کیا تھا اور افسردہ دلی سے خیال ظاہر کیا تھا کہ شاید میں راجوال چھوڑ جاؤں لیکن آج صورتِ حال بالکل بدلی ہوئی تھی۔ کسی وقت یوں لگتا تھا کہ وہ والی جی کی خاطر مجھ سے محبت کرتی ہیں... یا پھر شاید مجھ سے محبت کرتے رہنے کے لیے انہوں نے ایک جواز ڈھونڈ لیا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کیا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہی ہیں، بے شک غلط ہے لیکن اس میں ان کے محبوب شوہر کی بہتری شامل ہے... ان کو ایک مضبوط سہارا مل رہا ہے۔

ایک بار پھر وہی سوال ذہن میں ابھرتا تھا۔ کیا ایک عورت دو مردوں سے پُرخلوص محبت کر سکتی ہے؟

میں بستر پر نیم دراز ہو کر سوچتا رہا۔ انگیٹھی کی راکھ میں نیم سرخ انگارے چمکتے رہے۔ کبھی کبھی رات کے سناٹے میں حویلی کے پہرے دار کی آواز گونجتی رہی ''جاگتے رہو بھئی۔'' میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں... میں اونگھنے لگا... اس سے پہلے کہ میں سو جاتا، دروازے پر دستک ہوئی۔ سردی میں گرم رضائی سے نکلنا بھی کام رکھتا ہے۔ میں نے وہیں سے پوچھا۔

''کون ہے بھئی؟''

''میں نصراللہ۔'' دبی دبی آواز آئی۔ آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

نصراللہ اندر آگیا۔ اس کا چہرہ متغیر تھا۔ میں نے لالٹین کی روشنی میں اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''خیر تو ہے؟''

''خیر ہے... لیکن گڑبڑ بھی ہے۔'' اس نے اپنے اونی دستانوں والے ہاتھ انگیٹھی کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔ ہفتے اور منگل کی رات نصراللہ تین گھنٹے کا گشت لگاتا تھا۔ آج بھی وہ گشت سے آیا تھا۔

''کیا گڑبڑ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ کڑی ثمینہ باز نہیں آرہی۔ الو کی پٹھی آج پھر پاشے سے ملی ہے۔ میں خود دیکھ کر آرہا ہوں۔''

اطلاع واقعی حیران کن تھی۔ ''کہاں دیکھا ہے تم نے؟'' میں نے پوچھا۔

''شام پور سے باہر۔ نمبردار سعید کھوکھر کے پرانے کھوہ (کنوئیں) پر۔ میرے ساتھ نذیر اور ملتانی بھی گشت پر تھے۔ روہی کے پاس سے وہ دونوں ''رکھ'' کی طرف نکل گئے۔ میں نے شام پور کا چکر کاٹنا تھا۔ ابھی میں سعید کے ڈیرے کے پاس تھا کہ مجھے وہ نظر آگیا...''

''کون... پاشا؟''

نصراللہ نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے بعد اس نے تفصیل بتائی۔ جس جگہ کو سعید کا کھوہ کہا جاتا تھا، وہ بے آباد پڑی تھی۔ کھوہ کسی وجہ سے بند ہوگیا تھا۔ کھوہ کے ساتھ جو دو تین کچے کمرے تھے، وہ بھی ڈھے چکے تھے۔ شاید ایک ٹوٹے پھوٹے کمرے کی چھت سلامت تھی۔ نصراللہ نے پاشا کو انہی کمروں سے نکلتے دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ وہ جست لگا کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ نصراللہ نے خود کو جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے کرلیا۔ وہ اس کے پاس سے ہو کر نکلا۔ نصراللہ وہیں کھڑا رہا۔ دو تین منٹ بعد اس نے ایک اور پرچھانواں دیکھا۔ یہ ثمینہ تھی۔ مدھم چاندنی میں وہ سکڑی سمٹی نکلی اور پھر کماد کے کھیتوں میں گھس کر شام پور کی طرف چلی گئی۔

''تم نے اچھی طرح دیکھا تھا... وہ ثمینہ ہی تھی؟''

''ایک سو ایک فیصد جی۔ اور پاشا بھی مجھ سے بس تین چار گز کے فاصلے سے گزرا ہے۔'' نصراللہ کی آواز میں اب بھی ہلکی سی لرزش موجود تھی۔

''اس کا مطلب ہے کہ یہ کوئی عام چکر نہیں ہے۔ کافی پکا اور گہرا معاملہ لگتا ہے۔''

''پتا نہیں، یہ کڑی کیسے پھنس گئی ہے اس ہدوش کے شکنجے میں۔ اس کی عزت تو مشکل ہی بچی ہوگی۔ مجھے تو ڈر ہے کہ اس کی جان بھی نہ چلی جائے... یہ بہت غلط بندہ ہے۔''

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

صبح سویرے میں اور نصراللہ گھوڑیوں پر سوار شام پور پہنچے۔ ابھی اندھیرا پوری طرح چھٹا نہیں تھا۔ ہر شے اوس میں بھیگی اور ٹھٹھری ہوئی تھی۔ جوہڑوں کے اوپر برف کی پتلی تہ جمی ہوئی تھی۔ تازہ پانی کی کھالوں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھتا تھا۔

سعید کھوکھر کے مسمار شدہ کنوئیں پر ہو کا عالم طاری تھا۔ کنوئیں کے پاس واقع دو کچے ڈھارے گر چکے تھے... تاہم ایک کی چھت جزوی طور پر سلامت تھی۔ یہاں پرالی کے چند گٹھے پڑے تھے اور کچے فرش پر خشک اپلوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے ٹارچ جلا کر دیکھا، پرالی کے درمیان بیٹھنے کے لیے تھوڑی سی جگہ بنائی گئی تھی جیسے کوئی بیٹھا ہو۔ یہاں مجھے بھنے ہوئے مرغ کی کچھ ہڈیاں پڑی نظر آئیں۔ یقیناً یہ مرغ یہاں رات کو ہی کھایا گیا تھا۔ نمک کے کچھ ٹکڑے بھی کچے فرش پر پڑے تھے۔ ہم نے پرالی ادھر اُدھر کیا تو قریباً دو فٹ کی گہرائی سے سگریٹوں کا پیکٹ اور شراب کے دو سیل بند ادھے دستیاب ہوئے۔ ان سارے لوازمات کا تعلق پاشے اور ثمینہ سے ہی تھا۔

''یہ دیکھو جی!'' نصراللہ نے کچے فرش کی طرف اشارہ کیا۔ ذرا دھیان سے دیکھنے پر ایک زنانہ اور ایک مردانہ جوتے کے نشان صاف پہچانے جاتے تھے۔

''اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں پھر یہاں آئیں گے۔ ان کو رنگے ہاتھوں پکڑا جاسکتا ہے۔'' نصراللہ نے کہا۔

میں خاموش رہا۔ میرے کانوں میں بیگم بلقیس کے الفاظ گونج رہے تھے۔ انہوں نے کہا تھا۔ ثمینہ اور اس کی ماں دلشاد حویلی کے جدی ملازموں میں سے ہیں اور ان کے لیے والی جی بہت فکرمند رہتے ہیں۔ اس جوڑے کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کا مطلب تو یہ ہوتا کہ ثمینہ کی بدنامی کے پوسٹر بھی دیواروں پر لگ جاتے۔

مذکورہ جگہ دیکھنے کے بعد ہم واپس آگئے۔ میں اس واقعے کی اطلاع والی جی کو دے کر ان کی پریشانی میں ہرگز اضافہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے نصراللہ کو بھی تاکید کردی کہ وہ فی الحال یہ خبر صرف اور صرف اپنے تک محدود رکھے۔

اگلے روز شام کے فوراً بعد میں حویلی سے نکل کھڑا ہوا۔ میں نے اصطبل سے اپنی گھوڑی نکالی... کارندے اور محافظ وغیرہ اب مجھے ادب سے سلام کرتے تھے اور مجھے دیکھتے ہی میرے لیے راستہ چھوڑتے تھے۔ ظاہر ہے، اب میں سالار جی تھا۔ چاچے عسکری کی طرح مجھے بھی والی جی کی طرف سے ایک سرخ پگڑی دی گئی تھی۔ یہ پگڑی امتیاز و اختیار کا نشان تھی۔ کئی وقتوں سے یہ خاص پگڑی جاگیر کے سالار محافظ کے لیے مخصوص تھی۔

بہرحال، فی الوقت یہ پگڑی میرے سر پر نہیں تھی۔ میں شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے میں نے حسب رواج ایک گرم لوئی میں منہ سر لپیٹ رکھا تھا۔ حویلی سے تھوڑی دور میں نے چودھری عزیز کو دیکھا۔ وہ ایک سجے سجائے تانگے پر حویلی کی طرف آرہا تھا۔ میں نے اسے سلام کیا۔ اس نے حسب عادت رعونت سے جواب دیا۔ اس کی رعونت کو نظرانداز کرتے ہوئے میں شام پور کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ویسے بیگم بلقیس کے حوالے سے چودھری عزیز نے ابھی تک مجھ سے کسی طرح کی کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ اب تک اس نے یہی ظاہر کیا تھا جیسے اسے کچھ معلوم ہی نہیں۔ مگر میں جانتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں خاص طرح کی ناپسندیدگی میرے لیے موجود ہے اور بڑھتی جارہی ہے۔

وسیع و عریض کھیتوں کے درمیان شام پور، نیم روشن گھروں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ تھا۔ اس کے ارد گرد کتے شور مچاتے تھے اور اس کے اندر جانے والے راستے ٹھنڈ میں ٹھٹھرے ہوئے سانپوں کی طرح بے حرکت پڑے تھے۔ گاؤں کے عین وسط میں ہلکی دُھند میں لپٹے ہوئے مسجد کے مینار نظر آتے تھے۔ چارے سے لدے ہوئے ایک سست رو گدھے کے قریب سے گھوڑی دوڑاتا ہوا میں گاؤں میں داخل ہوگیا۔ دلشاد کا گھر ڈھونڈنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ میں ساری معلومات پہلے ہی حاصل کرچکا تھا۔ میں نے لکڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ چند سیکنڈ بعد اندر سے ایک محتاط آواز آئی۔ ''کون ہے؟''

''میں شاہ خاور ہوں۔ والی جی کی طرف سے آیا ہوں۔ ثمینہ کی والدہ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

دروازے کی دوسری طرف چند سیکنڈ کے لیے ایک سہمی ہوئی سی خاموشی رہی۔ پھر وہی آواز دوبارہ ابھری۔ ''کیا کام ہے آپ کو؟''

اس مرتبہ مجھے ذرا عزت سے پکارا گیا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ غائبانہ طور پر مجھے اور میری حیثیت کو جانتے ہیں۔ میں نے کہا۔ ''میں یہاں کھڑے کھڑے کچھ نہیں کہہ سکتا، آپ مجھے تھوڑا سا وقت دیں۔'' پھر میں نے ذرا توقف سے پوچھا۔ ''آپ ثمینہ کی والدہ ہیں؟'' توقع کے مطابق اس سوال کا جواب ''ہاں'' میں ملا۔ میں نے کہا۔ ''اماں جی! پریشان ہونے کی کوئی لوڑ نہیں۔ آپ ماں بجا ہیں اور آپ کی بیٹیاں میری بہنوں کی طرح ہیں۔ آپ دروازہ کھولیں۔ میں بس آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

کچھ دیر تک اندر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ غالباً دروازے کی دُرزوں سے مجھے اچھی طرح دیکھا بھی گیا۔ پھر ایک اُدھیڑ عمر عورت نے دروازہ کھولا۔ وہ پچاس کے قریب دکھائی دیتی تھی۔ لباس اور چہرے سے غربت ٹپکتی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں ایک تمکنت تھی اور ایک طرح کا وقار تھا۔

میں نے سلام کیا۔ عورت مجھے برآمدے سے گزار کر ایک کمرے میں لے گئی۔ یہاں ایک پرانے جستی ٹرنک کے اوپر مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ وہی دیا جس میں روئی کی بتی اور سرسوں کا تیل ہوتا ہے اور جس کی لَو رات کے وقت دیہات کے کچے کمروں کو عجیب سی اسراریت دیتی ہے۔ ایک طرف اوپر تلے تین چار پائیاں رکھی تھیں۔ ان چارپائیوں پر کچھ رنگ برنگے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے مختصر برآمدے میں بھی ایسے چند چمکیلے لباس دیکھے تھے... مجھے بیگم بلقیس کی بات یاد آئی۔ چند روز پہلے بیگم بلقیس نے بتایا تھا کہ دلشاد کی دو بڑی بیٹیوں کے رشتے کی بات کہیں چل رہی ہے۔

دلشاد کی آنکھوں میں ڈرے ہوئے سے سوالات تھے۔ میں نے پہلے اپنی بے تکلف باتوں سے اسے نارمل کرنے کی کوشش کی اور جب وہ قدرے نارمل نظر آنے لگی تو میں اصل موضوع پر آگیا۔ میں نے اس کی سب سے چھوٹی بیٹی ثمینہ کا ذکر چھیڑا اور بتایا کہ والی جی اس کی طرف سے پریشان ہیں۔

دلشاد کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آئے۔ اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''میری بچیوں کے لیے کسی کو پریشان ہونے کی کوئی لوڑ ضرورت نہیں ہے۔''

''لیکن اماں جی! جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے بعد پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔ آپ بھی اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ وہ بندہ نہ صرف غیر برادری کا ہے بلکہ دشمن پارٹی کا ہے۔ اس میں ہم سب کی عزت بے عزتی کا سوال ہے۔''

''عزت بے عزتی کی باتیں میں ارباب (والی جی) سے بہتر سمجھتی ہوں۔'' دلشاد کے لہجے میں زہر پوشیدہ تھا۔ ''اور جہاں تک ثمینہ کی بات کررہے ہو، وہ بات اب پرانی ہوچکی ہے۔ ٹھیک ہے، میری دھی سے ایک غلطی ہوئی ہے لیکن غلطی کس سے نہیں ہوتی؟ کون غلطی نہیں کرتا۔ اس پنڈ میں اور کتنی غلطیاں ہو رہی ہیں۔ ان کی طرف کسی کی نظر کیوں نہیں جاتی؟ اور جہاں تک میری دھی کی بات ہے، اب وہ سنبھل گئی ہے۔ میں نے سنبھال لیا ہے اسے۔ مہربانی کرکے اس کے بارے میں کوئی فکرمند نہ ہو۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ اب ثمینہ کا موکھل پاشا سے کوئی رابطہ نہیں ہے؟''

''نہیں ہے۔'' دلشاد نے غصے اور وثوق سے کہا۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''اماں جی! میں یہاں کوئی تھانے دار بن کر نہیں آیا... حالانکہ میں ایسا کر بھی سکتا ہوں... میں صرف آپ کے ہمدرد کے طور پر یہاں موجود ہوں۔ مجھے کچھ باتوں کا پتا چلا ہے اور میں نے یہ باتیں ابھی تک والی جی کو بھی نہیں بتائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ثمینہ کو یہاں لائیں، میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

میرے لب و لہجے نے اماں دلشاد کو چونکا دیا۔ وہ کچھ دیر تذبذب میں رہی لیکن میرے اصرار پر اسے ثمینہ کو کمرے میں لانا پڑا۔ ثمینہ کو آج میں دوسری مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ پہلی مرتبہ تب دیکھا تھا جب وہ اصطبل کے تہ خانے میں تھی اور باہر نکلنے کے لیے رو پیٹ رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھنے پر اس کے چہرے سے بھی پہلے جو چیز نظر آتی تھی، وہ اس کی معصومیت تھی... اس کی نگاہیں سچی تھیں اور وہ اپنے پاؤں کے ناخن سے کمرے کے کچے فرش کو مسلسل کھرچ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پر تازہ تازہ مہندی لگی تھی۔

میں نے اماں دلشاد سے کہا۔ ''اماں جی! یہ میری چھوٹی بہن کی طرح ہے۔ آپ ذرا باہر چلی جائیں۔ میں اس سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

اماں دلشاد نے باہر جانے سے انکار کیا مگر میں نے نرمی اور حکمت سے اسے قائل کرلیا۔ میں نے ثمینہ کو آڑے ہاتھوں لیا اور اس سے پوچھا کہ وہ صاف صاف بتائے کہ چاہتی کیا ہے؟

اس کے لہجے میں اور جسم میں لرزش نمودار ہوگئی۔ ''میں نے کیا کیا ہے جی؟''

''تم وہ سب کچھ کر رہی ہو جس کو نہ کرنے کا تمہیں بار بار کہا گیا ہے اور جس سے باز آجانے کا تم نے رو رو کر وعدہ بھی کیا تھا۔ تم پھر اس بدمعاش سے مل رہی ہو اور ہم سب کو ذلیل و خوار کرانے پر تلی ہوئی ہو۔'' میں نے دھیمے مگر پھنکارتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں کسی سے نہیں مل رہی۔ میں نے تو باہر قدم بھی نہیں رکھا۔'' وہ ہکلائی۔

''اور کل رات کو تمہاری روح سعید کے کھوہ پر پہنچی ہوئی تھی۔ اور وہاں پرالی کے ڈھیر میں بھی تمہاری روح ہی اس غنڈے کے ساتھ گھس کر بیٹھی ہوئی تھی۔'' میں نے واسکٹ کی جیب سے شراب کا سیل بند اڈا نکالا اور سگریٹوں کا وہ بند پیکٹ بھی جو پرالی میں سے ملا تھا۔ وہ گنگ ہوگئی۔

میں نے کہا۔ ''میرے بندوں نے تم دونوں کو وہاں ڈھارے سے نکلتے دیکھا ہے اور ڈھارے کے اندر تم دونوں کا کھرا اب بھی ویسے کا ویسا پڑا ہے۔ کہتی ہو تو وہاں پہنچ کر دکھا دیتا ہوں۔''

ثمینہ کا رنگ ہلدی ہوگیا۔ اوڑھنی کے اندر اس کے ہاتھ ہولے ہولے کانپتے جا رہے تھے... وہ ایک دم سے رونے لگی۔ اس کے موٹے آنسو بارش کے قطروں کی طرح تواتر سے اس کے مہندی لگے ہاتھوں پر گرتے چلے گئے۔

میں نے اپنے لہجے کو ذرا نرم کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو ثمینہ! جس طرح سے تم چل رہی ہو، تم پر بڑا سخت وقت والا ہے۔ اگر اس وقت سے بچنا چاہتی ہو تو مجھے کھل کر بتاؤ تم چاہتی کیا ہو؟ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو کچھ تم بتاؤ گی اپنے تک رکھوں گا۔ والی جی تک کو بھی نہیں بتاؤں گا۔ طرح ہوسکا، تمہاری مدد بھی کروں گا۔'' وہ خاموش ہوئی جھکا کر سسکیاں بھرتی رہی۔

''میرے ہوتے تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے مزید تسلی دی۔ ''میں اپنی زبان کے پکے کٹ مرنے والا بندہ ہوں...'' کچھ دیر تک اس کے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد میں نے کہا۔ ''کیا وہ تم سے کسی طرح زبردستی کر رہا ہے؟ کسی طرح کا دباؤ ہے تم پر؟''

چند سیکنڈ تک ساکت رہنے کے بعد اس نے اوڑھنی کے نیچے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر کیا ہے... کیا تم اسے پسند کرتی ہو؟'' وہ چپ رہی۔ میں نے دو بار مزید یہی سوال دہرایا۔ آخر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور سسکنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا وہ بھی تمہیں پسند کرتا ہے... شادی کرنا چاہتا ہے تم سے؟'' اس نے روتے روتے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا تم جانتی ہو کہ وہ دشمن پارٹی کا بندہ ہے اور اس کے بارے میں اور بھی بہت کچھ مشہور ہے۔''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''کچھ بھی ہے... میں اسے پسند کرتی ہوں۔ اس کا گھر بسانا چاہتی ہوں۔ لوگوں کا تو کام ہی باتیں کرنا ہے۔ وہ رائی کا پہاڑ بناتے ہیں...''

میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سیدھی سادی لڑکی کس طرح پاشے جیسے شخص کے چکر میں گرفتار ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا، یکا یک کمرے کا دروازہ زور سے کھلا اور اماں دلشاد دندناتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا، اس نے ثمینہ کو بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور اس پر چلاتے ہوئے کئی زوردار دو ہتڑ اس کے سر پر مارے۔ ''حرامزادی، کتی ڈائن... میرے کلیجے کو کچا کھانے والی... تو پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہ گئی۔ تجھے زندہ کیوں نہ دفن کر دیا ہم نے؟'' وہ بولتی چلی گئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کمرے کے دروازے سے لگی کراندر ہونے والی باتیں سنتی رہی ہے۔

میں نے ثمینہ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ اماں دلشاد بے طیش میں تھی۔ وہ ثمینہ کو مارتے ہوئے اس کے اوپر ہی گر پڑی اوپر نیچے رکھی ہوئی تینوں چارپائیاں بھی ڈھے گئیں۔ پڑھتی پر بڑی ترتیب سے رکھی ہوئی چینی کی پیالیاں اور پلیٹیں گر

ٹوٹ گئیں۔ میں نے ڈھال بن کر ثمینہ کو بچایا۔ ایک اور لڑکی کی آواز میں چلاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے اماں دلشاد کو تھام لیا۔ یقیناً یہ اس کی بیٹیوں میں سے ایک تھی۔ اماں دلشاد نے دل دوز آواز میں ثمینہ کو اور دیگر بیٹیوں کو کوسا۔ ''یہ کیوں زندہ ہیں؟ مر جاتیں یہ ساری حرامزادیاں۔ ان کے نصیب پڑے ہوئے تھے تو پھر یہ خود بھی سڑ گئی ہوتیں۔ مرنے والا مر گیا اور مجھے عذابوں میں ڈال گیا۔''

میں نے اماں دلشاد کو بہ مشکل سنبھالا۔ دوسری لڑکی، ثمینہ کو کلاوے میں لے کر باہر چلی گئی۔

اماں دلشاد کچھ دیر تک روتی رہی پھر بولی۔ ''اس مرن جوگی نے قسم کھائی تھی کہ اب اس منڈے سے نہیں ملے گی۔ اگر ملے گی تو میرا مرا ہوا منہ دیکھے گی۔ پر یہ پھر اس کے پاس گئی ہے۔ اس نے ہماری عزت نیلام کرنے پر کمر باندھی ہوئی ہے۔ ایسی اولاد کے تو ٹوٹے کر دینے چاہئیں...''

''جی ہے اماں جی! آپ بریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ آپ بس ذرا اس کی نگرانی سخت کر دیں۔ اسے بتائیں کہ اگر اب والی جی نے اسے پکڑ لیا تو آسانی سے چھوڑیں گے نہیں۔ میں بھی سمجھاتا ہوں اسے۔ اور واقعی یہ کام بہت خطرناک ہے۔''

''پتا نہیں کیا ہو گیا ہے اسے؟ کسی نے تعویذ پلا دیے ہیں؟ یہ میری سب سے چہیتی کڑی تھی، سب سے سمجھ دار۔ بڑی بہنوں کو بھی سمجھاتی تھی۔ سب کی ہمدرد، سب کی غمخوار... پر اب تو اسے اپنے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ ایسی اس کتے کے چکر میں پڑی ہے کہ سب کچھ بھول گئی ہے۔ حرامزادی یہ بھی نہیں دیکھ رہی کہ سو منتوں مرادوں کے بعد بڑی بہنوں کے ہتھ پیلے ہونے لگے ہیں۔ اگر اس کے کرتوتوں سے ان کا کام بگڑ گیا تو کیا ہوگا۔ وہ دونوں وچاریاں اس کی وجہ سے دن رات سہمی ہوئی ہیں...''

میں تقریباً مزید آدھ گھنٹا اماں دلشاد کے گھر رہا۔ میں نے اماں دلشاد کی موجودگی میں ہی ایک بار پھر ثمینہ کو سمجھانے کی کوشش بھی کی۔ اس کے رخساروں پر طمانچوں کے نشان تھے اور ایک باچھ سے تھوڑا تھوڑا خون بھی رس رہا تھا۔ وہ بس اوڑھنی کی اوٹ میں مسلسل روتی ہی رہی۔ دوبارہ آنے کا کہہ کر میں رات آٹھ بجے کے قریب اماں دلشاد کے گھر سے نکلا۔ باہر نکلنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر اپنا منہ سر، گرم چادر اور مفلر میں لپیٹ لیا تھا۔ میں نے اماں کو سمجھا دیا تھا کہ وہ کسی کو میرے بارے میں نہ بتائے۔ یہی کہہ دے کہ کوئی رشتے دار ملنے آیا تھا۔ دروازے سے باہر میری گھوڑی کھڑی تھی۔ میں سوار ہو کر چل دیا۔ گلی خالی تھی۔ ایک دو کتے دیہاتی انداز میں پروٹوکول دینے کے لیے میرے پیچھے پیچھے چل دیے۔ گلی کے موڑ پر چادر میں لپٹی ہوئی ایک لڑکی نما عورت تیزی سے میرے سامنے آئی اور ساتھ ہی ہاتھ کے اشارے سے مجھے رکنے کا کہا۔

میں رک گیا۔ ''میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

میں نے آواز سے پہچان لیا۔ یہ وہی بڑی عمر کی لڑکی تھی جو کچھ دیر پہلے ثمینہ کو اماں دلشاد کی مار سے بچانے کے لیے کمرے میں آئی تھی۔ ''کون ہو تم؟'' میں نے ان جان بن کر پوچھا۔

''میں ثمینہ کی سب سے بڑی بہن شاداں ہوں۔''

''ثمینہ کی سب سے بڑی بہن تو فوت ہو چکی ہے۔''

''ہاں۔ میں اس کے بعد سب سے بڑی ہوں۔ میں آپ کو ایک بہت ضروری بات بتانا چاہتی ہوں۔ کیا آپ کل ڈیگر (عصر) کے بعد میاں جی کے قبرستان میں آسکتے ہیں؟''

''اگر تم کہتی ہو تو پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے الجھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

''تو ٹھیک ہے، کل ڈیگر کے بعد میں وہیں ملوں گی؟'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور تیزی سے گھر کی طرف چلی گئی۔

جس کو وہ میاں جی کا قبرستان کہہ رہی تھی، یہ درختوں سے گھرا ہوا ایک چھوٹا سا قبرستان تھا اور گاؤں سے کوئی دو فرلانگ باہر تھا۔ جاگیر کا بڑا قبرستان ڈیڑھ دو میل آگے تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں راجوال کی طرف روانہ ہوگیا لیکن ذہن اماں دلشاد، ثمینہ اور شاداں وغیرہ میں اٹکا رہا۔ شاداں غالباً میرے نکلنے سے پہلے ہی گھر سے باہر آگئی تھی اور اس نے مجھے راستے میں روک لیا تھا۔ یقیناً وہ کوئی ایسی خاص بات بتانا چاہتی تھی جس کا ذکر وہ ماں اور دوسری بہنوں کے سامنے نہیں کرسکتی تھی۔ میرے اندر تجسس گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

اگلے روز میں مقررہ وقت سے تھوڑی دیر پہلے ہی میاں جی کے قبرستان کے قریب پہنچ گیا۔ میں ایسی جگہ کھڑا ہوگیا جہاں سے قبرستان پر نظر رکھی جا سکے۔ میرا انداز ایسا ہی تھا جیسے یہاں رک کر کسی کا انتظار کر رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ ایک دو راہ گیروں نے مجھے پہچانا بھی ہو مگر کسی نے مجھے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ شام کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے مگر شاداں نامی وہ لڑکی کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ قبرستان میں ایک درمیانی عمر کی عورت کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ کسی تازہ تازہ مرنے والے کی قبر پر فاتحہ خوانی کر رہی تھی۔ چند کوے ایک

جنتر پر ستار ہے تھے۔ جنتر کے نیچے ایک بکری خودرو گھاس پر منہ مار رہی تھی۔ میں یونہی ادھر اُدھر گھومتا رہا جیسے فاتحہ خوانی کے لیے کسی خاص قبر کی تلاش ہو۔ آہستہ آہستہ شام کا اندھیرا قرب و جوار کو ڈھانپنے لگا۔ شاداں نہیں آئی۔ ایک بار دل چاہا کہ آج پھر اماں دلشاد کے گھر کا رخ کروں لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا... اور واپس آ گیا۔ ذہن میں کئی طرح کی اُلجھنیں تھیں۔ کسی وقت لگتا تھا کہ ثمینہ اور پاشا والا معاملہ واقعی عشق اور محبت کا معاملہ ہے۔ کہتے ہیں کہ محبت اندھی ہوتی ہے اور میں خود بھی اسی قول کا شکار تھا، لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ثمینہ کسی مجبوری کے گھیرے میں ہو۔

نصر اللہ کو میں ساری صورتِ حال سے آگاہ کر رہا تھا۔ اگلے روز نصر اللہ نے ایک ایسے بندے کی ڈیوٹی قبرستان پر لگائی جو اماں دلشاد اور اس کی بیٹیوں کو پہچان سکتا تھا۔ غفور نامی اس بندے کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ عصر کے بعد میاں جی کے قبرستان پر نظر رکھے اور دیکھے کہ شاداں وہاں فاتحہ خوانی کے لیے آتی ہے یا نہیں... نصر اللہ ہی کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ اماں دلشاد کی سب سے بڑی بیٹی آسیہ کی قبر اسی قبرستان میں ہے اور عین ممکن تھا کہ اس نے فاتحہ خوانی کے بہانے وہاں آنا ہو۔ غفور دو دن وہاں جاتا رہا مگر میری توقع کے عین مطابق شاداں وہاں نہیں آئی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ خوف زدہ ہو گئی ہے یا کسی وجہ سے اس نے مجھے کچھ بتانے کا ارادہ بدل دیا ہے۔ اسی دوران میں عید کے دن آ گئے اور یہ معاملہ کچھ دنوں کے لیے پس منظر میں چلا گیا۔ بہرحال، اس بات کی مجھے تسلی تھی کہ ثمینہ جلد ہی پاشے سے نہیں ملے گی۔

دیہات میں عید کا اپنا ہی ایک انداز ہوتا ہے۔ گھروں کو لیپا پوتا جاتا ہے۔ دیواروں پر نقش و نگار بنائے جاتے ہیں۔ چوڑیاں اور سرخی پاؤڈر بیچنے والی عورتیں گلیوں کے چکر لگاتی ہیں اور گھروں کے صحنوں میں دھڑا دھڑ سلائی مشینیں چلتی ہیں۔ حویلی کے سامنے ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ یہاں ایک بازار لگ گیا تھا اور عورتیں یہاں عید کی خریداری کرتی تھیں۔

ایک دن میرا یار تیمور میرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ہم بچپن کے لنگوٹیے تھے۔ ایک دوسرے کی کوئی بات ہم سے چھپی نہیں رہتی تھی۔ بیگم بلقیس والی بات بھی نہیں چھپی تھی۔ باتیں کرتے کرتے اچانک تیمور نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ ”لے بھائی خاورے! تیری ہیر آ گئی ہے اپنی سہیلیوں سمیت۔“ میں نے کھڑکی سے جھانکا اور دھڑکنیں زیر و زبر ہو گئیں۔

بیگم بلقیس اپنی بہن فرزانہ اور کچھ دیگر عورتوں کے ساتھ خریداری کے لیے آئی تھیں۔ تاجو اور فیروزاں وغیرہ بھی ہمراہ تھیں۔ میں نے آہ بھری۔ ”ہاں یار! واقعی ایسے آ رہی ہیں جیسے سہیلیوں کے درمیان ہیر... یا پھر تاروں کے درمیان چاند!“

”لیکن یہ چاند یہاں لینے کیا آیا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ یہ تو سستا سا بازار ہے۔“ تیمور نے سرگوشی کی۔

”پر اب ان کے آنے سے تو سستا نہیں رہا۔“

تیمور نے گہری سانس لی۔ ”خاورے! تم تو شاعر ہوتے جا رہے ہو۔ پر سچی بات میں بار بار کہوں گا، مجھے اس سارے معاملے کا انجام کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ چودھری عزیز اور والی جی اندر ہی اندر غصہ جمع کر رہے ہیں۔ کسی دن دھماکا ہو جائے گا۔“

”اب تو جو کچھ بھی ہو۔“ میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی بیگم بلقیس کا فقرہ کانوں میں گونجنے لگا۔ ”اب واپسی ناممکن ہے خاور!“

میں بہ دستور کھڑکی کے راستے عید بازار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آج یہاں خاصا رش تھا۔ عورتیں، بچے، مرد سب موجود تھے۔ قریبی دیہات سے بھی عورتیں، چوڑیاں وغیرہ خریدنے کے لیے یہاں پہنچ جاتی تھیں۔ بیگم بلقیس کی چال ڈھال میں ایک عجیب سی باوقار کشش تھی۔ وہ کمر بالکل سیدھی رکھ کر چلتی تھیں اور اپنے قد سے زیادہ لمبی لگتی تھیں۔ وہ دیگر لڑکیوں کے ساتھ مخالف سمت میں جا رہی تھیں اور ایک لڑکی کی طرح ہی نظر آتی تھیں۔ حالانکہ حامد کی عمر اب لگ بھگ سال سے کم نہیں تھی۔ میں انہیں دیکھتا رہا اور اتنے فاصلے سے بھی ان کی کمر کے لوچ اور قدموں کے آہنگ کو محسوس کرتا رہا۔

”کیا نظروں نظروں میں کھا جانے کا ارادہ ہے؟“ تیمور نے فقرہ کسا۔

”اس دیوانے دل کے ارادے تو مت ہی پوچھ۔ لگتا ہے کہ میں ساری عمر اس چکر سے نکل نہیں سکوں گا۔“

”اور وہ جو تیری بے بے بیٹھی ہوئی ہے مراد پور میں۔ رات دن تیرے سر پر سہرا دیکھنے کے سفنے دیکھ رہی ہے۔“

”اس کا کوئی قصور نہیں... اور نہ قصور میرا ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

بیگم بلقیس دیگر عورتوں کے ہمراہ آگے نکل گئی تھیں۔ اب میں انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ان کا تازہ تازہ تصور آنکھوں میں بسا کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ آج کل پتا نہیں کیا ہوتا جا رہا تھا۔ ہر وقت نیم تاریک کمرے میں آخری ملاقات کے مناظر ذہن میں گھومتے رہتے تھے۔ اپنی گستاخیاں اور بیگم بلقیس کی نیم رضامندیاں ذہن میں آتی تھیں اور لہو میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگتی تھیں۔ دل گواہی دینے لگتا تھا کہ اگلی ملاقات میں ہم مزید آگے بڑھیں گے۔ بیگم بلقیس مجھے مزید قریب آنے کا موقع دیں گی۔ میں اپنی دلی کیفیت چھپا نہیں رہا ہوں۔ میری محبت میں جہاں لطیف ترین احساسات پوری شدت سے موجود تھے، وہاں جسمانی تقاضے بھی پوری طاقت سے پائے جاتے تھے۔

”اوئے! یہ کیا ہوا؟“ تیمور کی آواز نے مجھے چونکایا۔

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ کھڑکی سے باہر عید بازار میں ہلچل نظر آ رہی تھی۔ عورتیں اور بچے ہراساں انداز میں بازار سے باہر نکل رہے تھے۔ پھر میں نے ایک ہانپتے ہوئے شخص کو دیکھا جو تیز تیز بول کر لوگوں کو کچھ بتا رہا تھا۔ ایک دم چلانے کی بہت سی آوازیں ابھریں اور خریدار بھرا مار کر بازار سے باہر بھاگے۔

میں اور تیمور بھی بُری طرح چونکے۔ میں نے تکیے کے نیچے سے پستول نکالا۔ ہم دونوں بھاگتے ہوئے باہر آئے۔ عورتیں، مرد، بچے... گھروں کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔ افراتفری میں ایک جلیبی فروش کی ریڑھی الٹ گئی۔ جلتا ہوا گیس سلنڈر لڑھک کر ایک دکان میں گھس گیا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور آناً فاناً دکان نے آگ پکڑ لی۔

”کیا ہوا؟“ میں نے ایک شخص کو زبردستی روکا اور جھنجھوڑ کر پوچھا۔

اس نے جو جواب دیا، وہ ہرگز میرے گمان میں نہیں تھا۔ وہ دہشت زدہ آواز میں بولا۔ ”شیر آ رہا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی وہ خود کو چھڑا کر دوڑا۔

میں نے اس ٹولی کو دیکھا جس میں بیگم بلقیس بھی موجود تھیں۔ یہ ٹولی بھی گرتی پڑتی گاؤں کی طرف بھاگی آ رہی تھی۔ بیگم بلقیس پیچھے تھیں۔ بھگدڑ میں ایک تین چار سالہ بچہ نیچے گر گیا تھا اور چلا رہا تھا۔ بیگم بلقیس نے رک کر اسے اٹھایا اور وہ بھی بھاگتی ہوئی میری طرف آئیں۔ ان کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ ایک سیکنڈ کے لیے میرے قریب رک کر انہوں نے کہا۔ ”دیکھو خاور... آگے جا کر دیکھو کیا ہو رہا ہے؟“

ہماری گھوڑیاں پاس ہی کھڑی تھیں۔ میں اور تیمور جست لگا کر سوار ہوئے۔ میں نے نصر اللہ سے کہا۔ ”بندے لے کر ہمارے پیچھے آؤ۔“

نصر اللہ اصطبل کی طرف بھاگا اور ہم اس سمت میں دوڑے جدھر سے مرد و زن لپکے چلے آ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو تین عارضی دکانوں نے آگ پکڑ لی تھی۔ ہر طرف بچوں کے کھلونے اور چوڑیاں اور رنگ برنگے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔

قریب ہی موجود تین اور گھڑ سوار محافظ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے اور ہم برق رفتاری سے آگے بڑھے۔ گاؤں سے آگے کھیت تھے۔ کھیتوں میں بھی ہمیں درجنوں افراد نظر آئے جو اپنی کسیاں اور دیگر اوزار اٹھائے گاؤں کی طرف بھاگے آ رہے تھے۔

ہم نے ایک ایسے ہی حواس باختہ کاشت کار کو روک کر پوچھا۔ اس نے چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا۔ ”موکھلوں نے شیر کھلا چھوڑ دیا ہے۔ اس نے دو بندوں کو مار دیا ہے اور اب پنڈ کی طرف آ رہا ہے۔“

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ یہ افریقا کا جنگل نہیں تھا، تحصیل ڈسکہ کا علاقہ تھا۔ یہاں جیتے جاگتے لوگ رہتے تھے اور یہاں بھوکے شیر کو کھلا چھوڑنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ شاید کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔

ہم نے پھر گھوڑیاں دوڑائیں۔ راستے میں فق چہروں والے افراد نے چلا چلا کر ہمیں بتایا کہ آگے شیر ہے... اور لوگوں کو مار رہا ہے۔ شام پور گاؤں سے ذرا پہلے جاگیر کی حد کے پاس ہی ہمیں کھیتوں میں بہت سے افراد ایک جگہ جمع نظر آئے۔ یہ افراد دو ٹولیوں میں تھے اور دونوں ٹولیوں میں کوئی ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ تھا۔ قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ دور والی ٹولی موکھلوں کی ہے اور مکئی کے کھیتوں میں پاس والی ٹولی ہمارے لوگوں کی ہے۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی پر دو زخمیوں کو گاؤں کی طرف بھیجا جا رہا تھا۔ یہ دونوں جاگیر کے کھیت مزدور تھے۔ ان کے کپڑے لہولہان ہو رہے تھے۔ بہرحال، دونوں ہوش میں تھے۔ ایک تیسرے زخمی کی موقعے پر ہی مرہم پٹی کی جا رہی تھی۔ اس کی دھوتی کو لنگوٹ کی طرح باندھ کر اس کی سانولی ٹانگیں ننگی کر دی گئی تھیں۔ مجھے زخمی کی ایک ران کی پچھلی طرف پنجے کا گھاؤ صاف نظر آیا۔

میں نے سب سے پہلے اسی شخص سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے۔ اس نے روتے ہوئے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ یہاں چار پانچ بندے اور تین عورتیں کھیت میں کام کر رہی تھیں۔ اتنے میں اچانک دھاری دار شیر کھیت میں گھس آیا۔ اس نے حملہ کر دیا۔ کھیت مزدور روتے چلاتے بھاگے تو شیر نے ان کا پیچھا کیا۔ ساتھ والی پیلی میں ایک اور بندے کو بھنبھوڑ دیا پھر کماد میں گھس گیا۔ اتنے میں موکھل بھی دو گاڑیوں پر وہاں پہنچ گئے۔ ایک لوڈر پر بڑا سا پنجرہ بھی رکھا

ہوا تھا۔ انہوں نے کھلے شیر کو گھیر گھار کر پھر سے پنجرے میں بند کر دیا... اور گاڑی کو واپس لے گئے۔ اس واقعے میں کل تین بندے زخمی ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کو خشک روہی نالے میں گرنے سے چوٹیں آئی تھیں۔

بہر حال، کچھ بھی تھا، یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ موکھلوں نے منصوبے کے ساتھ جاگیر کے لوگوں میں خوف و ہراس پھیلانے کی کوشش کی تھی اور پوری طرح کامیاب ہوئے تھے۔ یہ بڑی سنگین شرارت تھی۔

میں نے موقعے پر موجود لوگوں سے پوچھا۔ ”موکھل پاشا بھی ساتھ تھا؟“

”بالکل جی!“ ایک ڈرے ہوئے گارڈ نے جواب دیا۔ ”وہ اب بھی یہیں ہے۔ وہ دیکھیں، وہ سامنے ٹریکٹر کے پاس کھڑا ہے... نیلے کرتے والا!“

میں نے بہ غور دیکھا اور میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ شخص دشمن نمبر ایک بنتا جا رہا تھا۔ اسی دوران میں نصر اللہ قریباً تین درجن مسلح گھڑ سواروں کے ساتھ دھول اڑاتا موقعے پر پہنچ گیا۔ موکھلوں کی طرف بھی کافی بندے جمع تھے۔ میں نے تمام اندیشے بالائے طاق رکھتے ہوئے گھوڑی کو موکھلوں کی طرف ایڑ لگا دی۔ مجھے آگے بڑھتے دیکھ کر میرے ساتھی بھی ایک جانباز دستے کی طرح میرے پیچھے آئے۔ پچھلے دو واقعات کی وجہ سے ان کے حوصلے بلند تھے۔ چند ہی سیکنڈ میں موکھل اور ہم آمنے سامنے تھے۔ میں جست لگا کر گھوڑی سے اترا اور بے خوفی سے سیدھا موکھل پاشا کی طرف بڑھا۔ دونوں طرف سے رائفلیں کھٹا کھٹ تیار ہو گئیں۔ میں نے بے دھڑک موکھل پاشا کا گریبان پکڑا اور جھنجھوڑ کر پوچھا۔ ”کیا چاہتا ہے تو... کیا چاہتا ہے؟“ میری للکار دور تک گونجی۔

موکھل پاشا کی گہری بھوری آنکھوں میں چند لمحے کے لیے حیرت نظر آئی پھر اس نے بھی میرا گریبان پکڑ لیا اور دہاڑا۔ ”اپنی اوقات میں رہ اوئے۔ نہیں تو ادھر لاشیں گریں گی۔“

”لاشوں سے کسی اور کو ڈرانا۔ تیرے جیسوں کو اپنے پیشاب میں بہاتا ہوں حرامزادے۔“ میں نے اسے طاقت سے جھنجھوڑا۔

دو اُدھیڑ عمر افراد درمیان میں آئے اور مجھے پاشا سے دور ہٹانے کی کوشش کی۔ اسی دوران میں کوئی آواز ابھری۔ ”پلس آ گئی ہے۔“

ایس ایچ او رانا شبیر اور اس کا دستہ بڑی تیزی سے گھوڑے دوڑاتا ہوا موقعے پر پہنچ گیا۔ بہت سے پولیس والے ہمارے اور موکھلوں کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ رانا شبیر کی دلیری ہی تھی۔ ورنہ فائر کھل جاتا تو سب سے پہلے پولیس والے ہی نشانہ بنتے۔ رانا شبیر نے دونوں طرف ہتھیار نیچے کرنے کا حکم دیا اور دونوں پارٹیوں کو موقعے سے تیس تیس قدم پیچھے ہٹا دیا۔ میں بھی موکھل پاشا کو خونی نظروں سے دیکھتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

اسی دوران میں چودھری عزیز بھی چند سواروں کے ساتھ موقعے پر پہنچ گیا۔ دونوں طرف سے بڑی عمر کے بندے آگے آئے اور زبانی جنگ شروع ہوئی۔ موکھلوں کا ایک شخص ایس ایچ او رانا شبیر سے مخاطب تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”یہ جھوٹ بکتے ہیں۔ یہ زنانے تو کتے کی مار نہیں سہہ سکتے۔ ان پر شیر چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو غلطی سے باہر نکل گیا تھا۔ ہم اس کے پیچھے آئے اور اسے پکڑ کر پنجرے میں بند کر لیا۔“

میں نے پکار کر کہا۔ ”فکر نہ کرو۔ تم سے غلطی ہوئی ہے تو ہمارے نشانے بھی اتنے ٹھیک نہیں۔ ایسی ایسی غلط جگہوں پر گولیاں ماریں گے کہ مرنے کے بعد بھی شرماتے رہو گے۔“

موکھل پاشا نے زہر خند مسکراہٹ کے ساتھ کوئی جوابی فقرہ کہا جو ہمارے کانوں تک نہیں پہنچ سکا۔ تاہم فقرے کی حرارت ہوا میں تیرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

☆☆☆

میں نے عید اپنے گاؤں میں بے بے جی اور عارفہ کے ساتھ منانی تھی۔ مگر جس طرح ہنگامی حالات میں چھٹیاں منسوخ ہو جاتی ہیں، اسی طرح والی جی نے مجھے بھی راجوال میں رہنے کا پابند کر دیا۔ میں عید کے روز بس ایک دو گھنٹے کے لیے بے بے جی اور عارفہ کے پاس رہ کر واپس آ گیا۔ بے بے جی پوچھتی ہی رہ گئیں کہ کوٹھے کب شروع کرنے ہیں۔ میں نے بس گول مول جواب دے دیا۔

عید کے روز ہی میرے واپس آ جانے سے رونق علی بہت خوش تھا۔ اس کی خوشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں باداموں والی دوائی (یعنی مٹھائی) بھی لے کر آیا تھا۔ یہ مٹھائی تازہ تازہ بنی ہوئی زیادہ مزے دار ہوتی ہے۔ میرے بیٹھے بیٹھے وہ قریباً آدھ کلو کھا گیا۔ میں نے کہا۔ ”رونق بھائی! آپ نے کہا تھا کہ آپ خوشی میں زیادہ کھاتے ہیں یا غم میں۔ اب یہ جو آدھ کلو بادام آپ نے فنا کیے ہیں، اس کی وجہ غم ہے یا خوشی؟“

وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”غم!“

”کیا مطلب؟“

اس نے ایک گہری سانس لی اور دیوار سے ٹیک لگا کر کہنے لگا۔ ”یار! مجھے لگتا ہے کہ تمہارے اور چودھری عزیز کے تعلقات کچھ گڑبڑ ہوتے جا رہے ہیں۔“

”اب کیا ہوا ہے؟“

”بس وہی لڑائی والے واقعے کی بات شات کر رہے تھے۔ انہیں اعتراض ہے کہ جب بازار میں بھگدڑ شگدڑ مچی تو وہ موقعے پر ہی موجود تھے لیکن تم نے ان سے مشورہ نہیں کیا اور خود ہی نصر اللہ سے کہہ دیا کہ بندے لے کر میرے پیچھے آ جاؤ۔“

”رونق بھائی! وہ مشورے کا وقت کہاں تھا۔ اس وقت تو لگ رہا تھا کہ پتا نہیں کیا طوفان آ گیا ہے۔ لوگ بہت ڈرے ہوئے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ شیر واقعی راجوال کی طرف آ رہا ہے۔“

”پر وہ کہتے ہیں کہ اگر وہاں کھلم کھلا لڑائی شروع ہو جاتی تو اس کا ذمے دار کون تھا؟“

”اگر مجھے سالار بنایا گیا ہے تو میری بھی کوئی ذمے داری ہے... اور میں آپ کو ایک بات بتاؤں رونق بھائی! چودھری عزیز بس مجھے یہاں سے نکالنے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں ان کو پہلے دن ہی سے اچھا نہیں لگا۔“

چودھری عزیز کا رویہ واقعی خراب ہوتا جا رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ چودھری عزیز کو اس بات کا بھی پتا چل گیا ہے کہ اس کی غیر موجودگی میں، میں حویلی کے اندر آتا جاتا رہا ہوں۔ پھر یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے بھگدڑ کے موقعے پر بیگم بلقیس کو مجھ سے بات کرتے دیکھا ہو۔ اس صورت حال کی وجہ سے وہ اندر ہی اندر زہر گھول رہا تھا۔ بہر حال، جب تک اس کا زہر اس کے اندر تھا، مجھے پروا نہیں تھی۔ اس کے علاوہ یہ بات میں بہ خوبی جان رہا تھا کہ اس حویلی میں چودھری عزیز کے اپنے ڈھکے چھپے مفادات بھی ہیں۔

عید آئی اور گزر گئی مگر... کچھ رونق پھیکی رہی۔ لوگ دہشت اور خوف کے نرغے سے نکل نہیں سکے تھے۔ ایک رات پھر بمبو کاٹ پر بیگم بلقیس سے بات ہوئی۔

انہوں نے کہا۔ ”خاور! یقین نہیں آ رہا کہ موکھل اس دشمنی میں اتنا آگے جا سکتے ہیں۔ ایسی باتیں تو کہانیوں اور فلموں میں ہوتی ہیں۔ انہوں نے ایک بھوکے درندے کو جیتے جاگتے لوگوں کی طرف چھوڑ دیا۔ وہ تو شکر ہے کہ بچ بچا ہو گیا۔ ورنہ کسی کی جان بھی جا سکتی تھی۔ یقین کرو، بچے ابھی تک سہمے ہوئے ہیں۔ حامد گھر سے ہی نہیں نکلتا۔“

”ہاں، سب پر اثر ہے لیکن ایک دو ہفتے میں ٹھیک ہو جائے گا۔ آج کافی بندے کھیتوں پر بھی گئے ہیں۔ ایس ایچ او صاحب بھی بڑا تعاون کر رہے ہیں۔ جن چار پانچ کھیتوں میں واقعہ ہوا ہے، وہاں انہوں نے پولیس کے بندے بھی بٹھائے ہیں۔ ہمارے اپنے بندے بھی وہاں دو دن سے گشت کر رہے ہیں۔“

”جو بندہ زیادہ زخمی ہوا تھا، اس کا کیا بنا؟“

”اب وہ ٹھیک ہے۔ اس کی طرف سے رپورٹ بھی درج کرائی گئی ہے۔ کل شہر سے ڈی ایس پی صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے وڈے موکھل کو بڑی سخت وارننگ دی ہے اور کہا ہے کہ آئندہ ایسا واقعہ ہوا تو جانور کو متعلقہ محکمے کے حوالے کر دیا جائے گا اور ذمے داروں کے خلاف سخت کارروائی ہو گی۔“

”تم نے اپنی آنکھوں سے شیر دیکھا تھا؟“ بیگم بلقیس نے پوچھا۔

”نہیں، تب تک وہ اسے گاڑی میں ڈال کر واپس لے جا چکے تھے... پر ایسا شیر میں نے ڈیرہ غازی خان کے ایک وڈیرے کے پاس دیکھا تھا۔ اس کے پیلے پنڈے پر کالی دھاریاں ہوتی ہیں۔ اسے بنگالی ٹائیگر بھی کہتے ہیں... یہ بغیر دھاریوں والے شیر سے زیادہ پھرتیلا اور خوں خوار ہوتا ہے۔“

”اچھا چھوڑو۔ خوامخواہ ڈرنے ڈرانے والی باتیں ہیں۔ اب کوئی اور بات کرو۔“

”اور بات تو پھر ایک ہی ہو سکتی ہے۔“ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

”وہ کیا؟“

میں کچھ دیر خاموش رہا پھر شوخ ہو کر ہونٹوں سے چومنے کی آواز پیدا کی۔ اب وہ میرے اصرار پر کبھی کبھی میرے ہی انداز میں جواب بھی دیتی تھیں لیکن اس مرتبہ ایسا نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔ ”آپ نے جواب نہیں دیا۔“

”نہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔“

”تو پھر... وہ بتا دیں جو ٹھیک ہے؟“

”کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔“ انہوں نے کہا اور دل نواز انداز میں ہنس دیں۔ ذرا دیر بعد کہنے لگیں۔ ”کبھی کبھی لگتا ہے کہ ہم بالکل نوجوان لڑکے لڑکی کی طرح باتیں کر رہے ہیں۔“

”تو ہم کون سا بوڑھے ہیں۔“

”ایسے نوجوان بھی تو نہیں۔ میری عمر چھتیس سے اوپر ہے...“

”لیکن آپ اپنی عمر سے پانچ چھ سال چھوٹی لگتی ہیں۔“

''والی جی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ تم ہر فن مولا ہو۔ شاعری بھی کر سکتے ہو۔ بندے کو باتوں ہی باتوں میں گھما کر رکھ دیتے ہو۔ حامد اکثر تمہارے سنائے ہوئے لطیفے اور مزاقیہ باتیں مجھے اور والی جی کو سناتا رہتا ہے۔''

''والی جی اب کیسے ہیں؟''

''بس ٹھیک ہیں اور نہیں بھی۔ کسی وقت بہت خوش لگتے ہیں، کسی وقت گم صم ہو جاتے ہیں۔''

''کبھی میرے حوالے سے تو کوئی بات نہیں کہی؟''

بیگم بلقیس نے ذرا توقف کیا اور بولیں۔ ''کھلم کھلا تو نہیں کی، پر اشاروں میں مجھے ایک دو دفعہ اونچ نیچ سمجھائی ہے۔ بتایا ہے کہ غلطی انسان سے ہوتی ہے لیکن غلطی سے سیکھ لینا ہی عقل مندی ہے... اور یہ بھی کہ اس طرح کی باتیں چھپی نہیں رہ سکتیں اور جھوٹ، جھوٹ ہی ہوتا ہے۔''

''والی جی کا رویہ سمجھ سے باہر ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ عام چودھریوں، زمینداروں سے بہت وکھرے ہیں خاور! اور میں سمجھتی ہوں کہ ان کے اندر برداشت اور حوصلہ بھی بہت ہے۔ اور میرے خیال میں اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے جو ان کے رویے کو زیادہ سخت نہیں ہونے دیتی۔ وہ تمہیں پسند کرتے ہیں۔ تمہاری ہمت اور دلیری سے ان کو بھی طاقت ملتی ہے۔''

''بلقیس! کیا وہ آپ سے محبت کرتے ہیں؟''

اس کا جواب بیگم بلقیس نے عجیب دیا۔ کہنے لگیں۔ ''ان کا تو پتا نہیں مگر ان کی محبت میرے روئیں روئیں میں رچی ہوئی ہے۔''

وہ کسی وقت عجیب بات کہہ دیتی تھیں اور ایسی ہی باتیں ان کو میرے لیے معما بناتی تھیں۔ وہ آج کہہ رہی تھیں کہ والی جی کی محبت ان کے روئیں روئیں میں رچی ہوئی ہے اور چند دن پہلے وہ میرے ساتھ حویلی کے نیم تاریک کمرے میں تھیں اور ان کی پشت پر چوبی الماری تھی... جو میرے جذبات کی یورش میں ہولے ہولے ہلتی تھی... اور پھر مجھے وہ بات بھی یاد آئی جو ایک دن بیگم بلقیس نے روانی میں کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا، یہ زمانہ مردوں کی غلطیاں تو معاف کرتا ہے لیکن عورتوں کی نہیں۔ کیا اس بات میں یہ اشارہ تھا کہ والی جی سے بھی کوئی خاص غلطی ہوئی ہے؟

ہر دوسرے یا تیسرے دن بیگم بلقیس کے ساتھ میری نیم شب کی خمار آلود گفتگو ہوتی رہی۔ انٹر کام کا ''ایکس ٹینشن'' میں نے اتنی صفائی سے لگایا تھا کہ کسی کی نظر میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ میرے اور تیمور کے سوا اس کا علم کسی کو نہیں تھا... ثمینہ اور اماں دلشاد والا معاملہ ابھی تک وہیں رکا ہوا تھا۔ ... والے واقعے کے بعد سے اردگرد کے دیہات میں ... موجود تھی۔ یقیناً اس دہشت کا اثر اماں دلشاد ... چاروں بیٹیوں پر بھی تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان ماں بیٹ... کوئی بھی بات اگلوانے کے لیے یہ وقت مناسب نہ... میں چند روز انتظار کرنا چاہتا تھا۔

اور پھر وہ یادگار دن آیا جس میں صبح سے شام تک ... بلقیس کی شیریں آواز مسلسل میرے کانوں میں گونجتی ... مجھے یاد ہے کہ وہ چھوٹی عید سے قریباً تین ہفتے بعد کا ایک ... گوار دن تھا۔ پورا گاؤں سونا سونا نظر آ رہا تھا۔ دراصل ... گاؤں مکھن وال کا سالانہ میلہ تھا۔ وہاں مویشیوں کی ایک ... منڈی بھی لگتی تھی۔ لوگ ذوق شوق سے شریک ہوتے ... آج گاؤں راجوال کی بیشتر آبادی صبح سویرے ہی میلہ د... چلی گئی تھی۔ گھوڑوں پر، بیل گاڑیوں اور تانگوں پر... یہاں تک کہ بائیسکلوں پر بھی لوگ گئے تھے۔ حویلی سے بھی ایک ... بھری ہوئی ٹرالی میلے کے لیے روانہ ہوئی تھی۔ اس پر رنگ برنگ کپڑوں والی عورتیں اور بچے لدے تھے۔ ڈھول ... بیٹھے تھے۔ ٹریکٹر ٹرالی پر زور شور سے پنجابی گانے بجا... جا رہے تھے۔ سن وے بلوری اکھ والیا۔ اساں دل تیر... نال لا لیا... اور پھر... سن ونجلی دی ٹھڑی تان وے... میں تر... ہو ہو گئی قربان وے۔

والی جی کی طرف سے مجھے ہدایت تھی کہ میں گاؤں ... ہی موجود رہوں۔ حویلی کے تیس چالیس گھڑ سواروں ... بھی یہی ہدایت تھی۔ موکھلوں کے ساتھ چپقلش کی وجہ ... ایسی احتیاط ضروری تھی۔ میں نے صبح سات بجے کے قریب ... والی جی کی لینڈ روور کو گاؤں سے نکلتے دیکھا تھا۔ اس میں ... والی جی، چودھری عزیز اور حامد وغیرہ نظر آئے تھے۔ ... یقین تھا کہ بیگم بلقیس بھی ہوں گی مگر جب نو بجے کے قر... انہوں نے بمبوکاٹ پر اپنی موجودگی کا اشارہ دیا تو میں ... رہ گیا۔

میں نے انہیں کال کی۔ ''آپ گئی نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''گئی ہوئی ہوں مگر تمہارے بمبوکاٹ کو اپنے ساتھ ... میلے پر لے گئی ہوں۔'' انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''حیرت ہے، والی جی آپ کو چھوڑ گئے۔''

''دراصل صبح سے سر میں سخت درد تھا۔ تھوڑی ... تمہارے سنیاسی صاحب کی دو پڑیاں ایک ساتھ کھائی ... اب ٹھیک ہوں۔''

''واقعی ٹھیک ہیں یا دوائی لے کر آ جاؤں۔'' میں ... نہیں چھیڑا۔

''نہیں نہیں۔ اب بالکل ٹھیک ہوں چھوٹے سنیاسی جی۔'' ''میری بات سمجھ کر ہنسیں۔

... میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''یقین کریں ... بغیر ...''

''نہیں ... رتی۔'' انہوں نے حسب عادت ادا سے کہا۔

''یقین کریں بلقیس... جو وقت آپ کے بغیر گزرتا ہے، عذاب ہوتا ہے۔ آپ کی آواز کانوں میں نہ پڑے تو کان بہرے ہونے لگتے ہیں... آپ نے کیا کر دیا ہے؟''

''میں نے کچھ نہیں کیا۔ جو کچھ ہوا ہے خود ہی ہوا ہے۔''

''جب آپ سے بات نہیں ہوتی، دل میں بہت سے وسوسے جاگتے ہیں۔ کہیں یہ نہ ہو گیا ہو، کہیں یہ نہ ہو گیا ہو۔''

''ہاں، یہ بات تو ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''ویسے بھی عورت کو تو مرد سے کہیں زیادہ سوچیں ہوتی ہیں اور کہیں زیادہ وسوسے۔''

''کسی وقت ڈر لگتا ہے۔ کہیں آپ سے دور نہ ہو جاؤں... یقین کریں کہ...''

''نہیں کرتی۔'' انہوں نے کہا اور ہم دونوں ہنس دیے۔

وہ بڑی خوب صورتی سے سنجیدہ گفتگو کو ہلکی پھلکی گفتگو کی طرف موڑ دیتی تھیں۔ حویلی کے زنان خانے میں نوکرانیوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس دن ہم نے بڑے سکون سے دل کھول کر گفتگو کی۔ میرے پُرزور اصرار پر، کافی عرصے بعد انہوں نے مجھے ہیر وارث شاہ بھی سنائی۔ ہم نے ہر موضوع پر جی بھر کر باتیں کیں۔ ہنستے بھی رہے۔ کبھی کبھی تھوڑے سنجیدہ بھی ہوتے رہے۔ رمزیہ گفتگو، نرم گرم سرگوشیاں... سب کچھ ہوا۔ انٹر کام پر ہی ہم نے دوپہر کا کھانا بھی کھایا۔ حویلی کے ملازمین اور مہمانوں وغیرہ کے لیے ہر روز دو دیگیں پکتی تھیں۔ آج بریانی پکی ہوئی تھی۔ میں اپنی پلیٹ کمرے میں اٹھا لایا۔ بیگم بلقیس کے پاس آلو انڈے کا سالن اور تندوری روٹی تھی۔ ساتھ میں مکئی کی میٹھی روٹی تھی جو ملائی میں پکاتے ہیں۔

''میرے ہاتھ سے لقمہ لیں گی؟'' میں نے بمبوکاٹ پر پوچھا۔

''دے دو۔''

''منہ کھولیں۔''

''لو، کھول دیا۔''

''یہ لیں۔'' میں نے خیالی لقمہ ان کے منہ میں رکھا اور پوچھا۔ ''سوادی ہے؟''

''تمہارے ہاتھ کا ہوگا تو سوادی کیوں نہ ہوگا۔''

''لیں، اب مجھے کھلائیں۔'' میں نے کہا۔

وہ بھی موڈ میں تھیں۔ انہوں نے میرے والا عمل دُہرایا۔ میں نے کہا۔ ''آپ کو درد نہیں ہوا؟''

''کیوں؟''

''بھئی! میں نے آپ کی انگلیوں پر کاٹا ہے۔''

''کچھ درد اتنے مزے دار ہوتے ہیں کہ... درد ہوتا ہی نہیں۔'' وہ ہنسیں۔ انداز میں خوب صورت سادگی تھی۔

میں نے کہا۔ ''مرچیں کچھ زیادہ تھیں۔ منہ جل گیا ہے۔ کوئی میٹھی چیز ہے آپ کے پاس؟''

''مکئی کی روٹی ہے۔''

''چھوڑیں جی۔ مکئی کی روٹی بھی کوئی منہ میٹھا کرنے والی چیز ہے۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا... اور ہونٹ ماؤتھ پیس کے ساتھ لگا کر آواز پیدا کی۔ وہ ذرا شرمیلے انداز میں ہنسنے لگیں...

''کیا بات ہے، آپ بس ہنس دیتی ہیں... پیار کا جواب پیار سے نہیں دیتیں؟ چلیں، جواب دیں۔'' وہ کچھ دیر ''نہ نہ'' کرتی رہیں۔ لیکن آخر انہوں نے بھی ماؤتھ پیس سے ہونٹ لگا کر چومنے کی آواز پیدا کی... اور اپنی جانی پہچانی ادا کے ساتھ کہا۔ ''بس؟''

میں نہیں جانتا تھا کہ طویل جدائی سے پہلے یہ ایک طرح سے ان کا الوداعی بوسہ ہے۔ شام تک ہم ہنستے کھیلتے رہے۔ پھر تین دن بعد بات کرنے کا کہہ کر ہم نے بمبوکاٹ بند کر دیا۔

تین دن گزر گئے... پانچ چھ دن بھی گزر گئے مگر بیگم بلقیس کی طرف سے رابطہ نہیں ہوا۔ حامد یا تاجو وغیرہ کی شکل بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ فضا میں گھٹن سی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ اکتوبر کی چوبیس تاریخ تھی... والد کی وفات کی وجہ سے یہ تاریخ مجھے یاد رہتی تھی۔ اکتوبر کے آخری دنوں میں دیہاتی علاقے پوری طرح سردی کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ درختوں سے زرد پتے گرتے تھے اور گہرے نیلے آسمان کے نیچے کھیتوں اور پگڈنڈیوں پر اداسی گشت کرتی تھی۔ رات کے وقت میں اور والی جی جیپ پر سوار ہو کر مچھلی فارم کا چکر لگا کر آئے۔ راستے میں وہ مجھے مقدمے کی صورت حال سے آگاہ کرتے رہے۔ وہ بعض اوقات مجھ سے ایسی باتیں بھی کر جاتے تھے جو شاید چودھری عزیز سے بھی نہ کرتے ہوں۔ میں بھی حسب حال ان کو اپنی رائے دیتا تھا۔

رات گیارہ بجے کے لگ بھگ بیگم بلقیس کی کال آئی تو

میں کھل اٹھا۔ ہمارے درمیان چند رسمی باتیں ہوئیں۔ ان باتوں کے دوران میں ہی میں نے محسوس کرلیا کہ بیگم بلقیس کی ''ٹون'' کچھ بدلی ہوئی ہے۔ کوئی بہت گمبھیر بات کہنے سے پہلے، بندے کے لہجے میں جو بوجھل پن آجاتا ہے، وہ بیگم بلقیس کے لہجے میں بھی تھا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اصل موضوع پر آگئیں...

''خاور! آج تم سے ایک وعدہ لینا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کروگے۔''

میرے سینے میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''خاور! آگے چل کر حالات جو بھی ہوں مگر تم والی جی کو تنہا نہیں چھوڑو گے۔ ان کے ساتھ تمہارا تعلق اسی طرح قائم رہے گا۔''

''آپ کہیں جارہی ہیں؟'' میں نے نہایت دل گرفتہ لہجے میں پوچھا۔

''جاتو نہیں رہی... لیکن خاور! جیسے پہلے بھی ہمارے درمیان کئی دفعہ بات ہوئی ہے... ہمیں اب سنبھلنا پڑے گا... اگر نہیں سنبھلیں گے تو بہت کچھ برباد ہوجائے گا۔ اور اب مجھ میں اور دکھ سہنے کی ہمت نہیں۔''

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ بات میری سمجھ میں آرہی تھی۔ بیگم بلقیس کی گفتگو میں پچھلے کئی دنوں سے موجودہ صورتِ حال کا تھوڑا تھوڑا رنگ موجود تھا۔ وہ جیسے مجھے اس صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر تیار کررہی تھیں اور اب سب کچھ کھل کر سامنے آگیا تھا۔ اگلے آدھ پون گھنٹے میں ہمارے درمیان جو بات چیت ہوئی، وہ بڑی دکھ آمیز اور بوجھل تھی۔ بیگم بلقیس کا لہجہ بار بار بھیگ رہا تھا۔ میری آواز بھی بار بار بھرا جاتی تھی۔ وہ مجھ سے قربانی مانگ رہی تھیں اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا رہی تھیں کہ میں والی جی سے اپنے تعلقات پوری طرح بحال رکھوں گا۔ ان کے ساتھ اپنی محبت میں کسی طرح کی کمی نہیں آنے دوں گا... وہ محسوس کررہی تھیں کہ والی جی سازشوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ چودھری عزیز کا نام لیے بغیر انہوں نے اس کی طرف سے بھی اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا۔

میں نے کہا۔ ''میری طاقت تو آپ ہیں بلقیس! آپ کے بغیر میں کچھ نہیں ہوں۔''

''یہ طاقت اب بھی تمہارے ساتھ ہے خاور! ہم ایک دوسرے کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے اور... یہ ضروری تو نہیں ہوتا کہ محبت میں سب کچھ حاصل ہی کرلیا جائے۔ ایک دوسرے سے دور رہ کر بھی تو... محبت... ہوسکتی ہے۔''

مجھے کئی دنوں سے احساس ہورہا تھا کہ حویلی میں کچھ ہورہا ہے۔ آج وہ احساس درست ثابت ہوا تھا۔ میں نے محسوس کرلیا تھا کہ وہ فیصلہ کرچکی ہیں۔ ان کو قائل کرنے کی کوشش میں ناکامی اور مایوسی کے سوا اور کچھ حاصل نہ تھا۔ اس موقع پر باوقار خاموشی زیادہ مناسب تھی۔ گفتگو بوجھل انداز میں شروع ہوئی تھی اور بوجھل ماحول میں ختم ہوئی۔ انہوں نے کہا تھا کہ شاید وہ ایک بار... کریں گی لیکن انہوں نے نہیں کیا... جسم اور روح کو چھلنی کرنے والا اور برداشت کو ریزہ ریزہ کردینے والا ہجر کا موسم شروع ہوچکا تھا۔ اس کی طوالت کا مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا اور نہ اس کی شدت کا...!

☆☆☆

نئی نئی جدائی تھی، کچھ زیادہ محسوس نہیں ہورہی تھی اور دل کے کسی گوشے میں یہ روشن امید بھی موجود تھی کہ بیگم بلقیس سخت دل نہیں ہوسکتیں۔ وہ جلد ہی اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کریں گی اور ٹھہری ہوئی راتوں میں، آج کل خاموش رہنے والا بمبوکاٹ پھر سے جاگ جائے گا۔ میرے کان رات کو کوٹھڑی کی اس اکلوتی بیل پر لگے رہتے جو بیگم بلقیس کی طرف سے رابطہ کرنے کا اشارہ ہوتی تھی۔

ایک ایسی ہی اداس شام کا ذکر ہے۔ سورج ڈوبتے ہی ہلکی دھند پھیلنا شروع ہوگئی تھی۔ رونق علی سے گپ شپ کرنے اور بیمار منشی منظور کی بوڑھی ٹانگیں دبانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آیا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''سالار جی! ایک عورت ملنے آئی ہے جی آپ سے۔'' گلاب دین کے بیٹے گلزار نے مؤدب لہجے میں کہا۔

''کون ہے؟ چلو لے آؤ۔'' میں نے کہا۔

چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور ایک عورت نما لڑکی اندر آگئی۔ اس نے اپنا منہ سر اچھی طرح چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ تھوڑی سی کوشش سے میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ اماں دلشاد کی بڑی بیٹی شاداں تھی۔ اس کا سارا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے موڑھا دیا۔ وہ بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی پھر دل دوز آواز میں بولی۔

''خاور صاحب! ثمینہ کی مدد کریں جی۔ وہ بڑی مشکل میں ہے۔ اس مرن جوگے پاشے نے اسے بری طرح پھنسایا ہے۔ اس نے میری بہن کو کہیں کا نہیں چھوڑنا...'' پھر ایک دم اس نے رونا شروع کردیا۔

یہ دلچسپ اور یادگار داستان ابھی جاری ہے
بقیہ واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے

جرات مند

مریم کے خان

ایک چور کی ''پیشہ ورانہ مہارت'' کا احوال - وہ اتنی صفائی سے کام کرتا تھا کہ کوئی سراغ نہ ملتا - بالآخر اکاّ دکاّ سراغ ملے... لیکن جو کچھ سامنے آیا، حیران کن تھا!

بین فیلڈ جیسے چھوٹے سے قصبے میں چند راتوں میں چوری کی وارداتیں کسی بھونچال سے کم نہیں تھیں۔ آج کل گفتگو کا موضوع یہی وارداتیں تھیں، اس لیے ڈنر کے بعد گفتگو کا موضوع ان کی طرف مڑ گیا۔ ان وارداتوں میں سب سے تشویش ناک بات یہ تھی کہ کسی ایک واردات میں بھی چور یا چوروں نے اپنا نشان تک نہیں چھوڑا تھا اور جس گھر میں بھی چوری ہوئی، وہاں سے ہر قیمتی شے چرالی گئی تھی۔ پولیس سرتوڑ کوششوں کے باوجود ذرا سا سراغ لگانے میں ناکام رہی تھی۔ سب کو اپنی فکر پڑ گئی تھی۔ بین فیلڈ کے بیشتر مکین دولت مند تھے اور ان کے گھروں میں رقم اور سونے جواہرات کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ چور ہمیشہ کسی کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوئے اور بے حد خاموشی اور صفائی سے اپنا کام کرکے نکل گئے۔ نہ کسی نے ان کو آتے دیکھا اور نہ ہی جاتے ہوئے۔

مس پینسی جو ہماری مالک مکان تھی، کھانے کی میز پر ہمیشہ سربراہ والی جگہ بیٹھتی تھی اور یہ اس کا حق بھی تھا۔ اس نے بنا ہچکچاہٹ تسلیم کرلیا کہ اگر کبھی نصف رات کو اس کی آنکھ کھلے اور وہ اپنے کمرے میں کسی چور کو پائے تو وہ چیخنا شروع کردے گی اور اس وقت تک چیختی رہے گی جب تک سارا قصبہ جمع نہیں ہوجاتا اور چور پکڑا نہیں جاتا... یا کم از کم فرار نہیں ہوجاتا۔ اگر اس کے پاس پستول ہوا تو وہ اس سے چور کو قتل کرنے کی کوشش کرے گی مگر اس کا اصل کام چیخنا ہی ہوگا۔

مس لیزا کا خیال ذرا مختلف تھا۔ اگر اسے چور دکھائی دیتا تو وہ چادر کو سر تک اوڑھ لیتی اور خاموشی سے دم سادھ کر چور کو اجازت دیتی کہ اس نے جو لینا ہے لے اور یہاں سے

چلا جائے۔

''یہ خاصی احمقانہ بات ہوگی۔'' یہ خیال میرے اس لاج کے ساتھی مسٹر بنل کا تھا۔ وہ بے حد چالاک مگر شریف نظر آنے والا مرد تھا۔ یعنی اس کی چالاکی مکاری کی حد میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ اس نے لاج کے ڈرائنگ روم پر قبضہ کر رکھا تھا اور میز پر میرے عین سامنے بیٹھا تھا۔

''تمہارا کیا ردعمل ہوتا مسٹر بنل؟''

''میں چور سے لڑ جاتا۔ اسے قابو کرنے یا قتل کرنے کی پوری کوشش کرتا۔'' مسٹر بنل نے جوش سے کہا۔ ''اگر وہ مجھ سے مضبوط ہوتا تو میں اسے مارنے کے بجائے اس وقت تک روکنے کی کوشش کرتا جب تک کہ مدد نہیں آجاتی۔ مگر تم جانتے ہو... میں لڑنے کا ماہر ہوں۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی چور مجھ سے مقابلے کی ہمت کرے گا۔ میں اسے زیر کرنے کے لیے سب کر گزروں گا۔''

مس پینسی نے مسٹر بنل کے جوش سے متاثر ہو کر کہا۔ ''ویسے بھی چور کے پاؤں مضبوط نہیں ہوتے۔''

اس کے برعکس مس لیزا نے کہا۔ ''ممکن ہے جب سچ مچ کے چور سے سامنا ہو تو تمہارا خیال بدل جائے مسٹر بنل!''

''میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔'' مسٹر بنل نے گونجتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے گپ مارنے کی عادت نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک چور سے میرا سابقہ پڑ چکا ہے۔''

''سچ۔'' مس لیزا چلائی۔ ''مگر تم نے کبھی بتایا نہیں۔''

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں صرف انیس برس کا تھا۔'' مسٹر بنل نے ماضی میں جھانکا۔ ''ایک چور میرے باپ کے گھر میں گھسا۔ میں نے اسے نصف رات کے قریب اپنے کمرے میں پایا۔ وہ دوسرے کمروں کا معائنہ پہلے ہی کر چکا تھا۔''

''میرے خدا!'' مس لیزا نے لرز کر کہا۔ ''پھر تم نے کیا کیا؟''

''تم نے یقیناً اس پر حملہ کر دیا ہوگا؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''بالکل... میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ خبردار ہوتا، میں نے جھپٹ کر اسے اس کے کوٹ کے کالر سے پکڑ لیا۔ اس نے آزاد ہونے کی کوشش کی مگر جوانی کا دور تھا، میں تو اسے موت کی طرح چمٹ گیا۔ بدقسمتی سے اس کے منحنی سے جسم پر خاصا بڑا کوٹ تھا۔ وہ اچانک ہی پھسل کر کوٹ سے نکل گیا اور اس سے پہلے کہ میں اسے پکڑتا، وہ کھڑکی سے کود کر فرار ہو گیا۔''

''وہ تمہیں دھوکا دے گیا۔'' مس پینسی ہنسی۔

''ہاں، یہ تو ہے اور اس کے صرف تین منٹ بعد پولیس آ گئی تھی۔ اگرچہ خاصی تاخیر سے آئی تھی... بہرحال، اگر ایسا کوئی صورتِ حال ہو تو تم کیا کرو گے؟'' مسٹر بنل نے میری طرف مڑ کر کہا۔

''میں... میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' میں نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ اس پر وہ مسکرایا اور خاموشی سے کھانے میں مشغول ہو گیا۔ وہ کسی قدر تاخیر سے آیا تھا اور اس کا ڈنر ابھی تک جاری تھا۔ میرا جواب درست نہیں تھا۔ درحقیقت اگر میں کسی چور کو آدھی رات کے سناٹے میں اپنے کمرے میں پاتا تو میں ڈھیر ہو جاتا۔ میں اسے سب کچھ کرنے کی آزادی دے دیتا اور معمولی سی مزاحمت بھی نہیں کرتا۔ بے شک وہ میرے ساتھ بھی کچھ کر گزرتا تب بھی مجھ میں اسے روکنے کی ہمت نہ ہوتی۔ میں یہ بات کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا اور کہنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ آخر لوگ لالچی، گھٹیا اور اندر سے سفلے ہوتے ہیں مگر وہ یہ بات کسی کو بتاتے نہیں ہیں۔ ہاں، یہ ہے کہ لوگ جلد دوسروں کے بارے میں ایسی باتیں جان جاتے ہیں۔

چوری کا یہ موضوع ڈنر کے باضابطہ خاتمے کے بعد بھی جاری رہا تھا۔ مجھے ایسے موضوعات سے الجھن ہوتی ہے جن کا مرکزی خیال خوف ہو۔ چوروں اور بھوتوں کا موضوع مجھے ایک جیسی اعصابی کشیدگی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ آج بھی ایسا لگ رہا تھا کہ مارے خوف کے مجھے نیند نہیں آئے گی اور میں رات بھر جاگ کر چور کا انتظار کرتا رہوں گا۔ ہلکی سی آواز بھی آئے گی... جو بے شک کسی چوہے نے نکالی ہو تو میں اسے چور کی آواز سمجھوں گا۔ کھانے کے کمرے سے نکل کر میں اسٹڈی روم میں آیا اور ایک سگریٹ سلگا کر اپنے اعصاب کو پُرسکون کرنے لگا... میں نے سوچا کہ اپنے کمرے میں جا کر سب سے پہلے دیکھوں گا کہ میری کھڑکی درست طریقے سے بند ہے یا نہیں۔ اسی دوران میں نے مسٹر بنل کے سست قدموں کی آواز سنی۔ وہ ہال سے گزر کر سیڑھیوں کے ذریعے اوپر اپنے کمرے میں جا رہا تھا اور چند منٹ بعد میں نے اس کی گھبرائی ہوئی آواز سنی۔

''مس پینسی... مس پینسی!''

''کیا ہوا؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔ وہ ہال میں بھاگی چلی آئی تھی۔ ''کیوں چلا رہے ہو؟''

''خدا کے لیے جلدی سے ادھر آؤ۔'' اس نے ویسی ہی گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اور کوریٹ کو بھی آنے کے لیے کہہ دو۔''

جب وہ مجھے کوریٹ کہتا تھا تو یہ لفظ مجھے نہایت بُرا لگتا

تھا۔ وہ اسے اس طرح ادا کرتا تھا کہ یہ ایک اور لفظ کیورٹ جیسا ہو جاتا تھا جس کے معنی تھے... انسان سے کمتر کوئی شے! ٹھیک ہے کہ میں اتنا طاقتور نہیں تھا اور معمولی سی صورتِ حال میں میرے اعصاب کشیدہ ہو جاتے تھے مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ مجھے انسان سے کمتر کوئی مخلوق سمجھا جائے۔ بہرحال، اس وقت اس کی آواز میں ایسی بات تھی کہ میں اپنی چند دیدی بھلانے پر مجبور ہو گیا۔ میں بھی باہر کی طرف لپکا۔ البتہ کسی خوف کے زیر اثر مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ شاید کوئی خلافِ معمول بات ہوئی تھی۔ میں مس پینسی کے پیچھے لپکا۔ وہ مسٹر بنل کے پیچھے جاتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی۔ ''آخر ہوا کیا ہے مسٹر بنل؟''

''چوری!'' اس نے کہا۔ ''کسی نے میرے کمرے میں گھس کر ہر وہ شے چرا لی ہے جس کی ذرا سی بھی مالیت تھی۔''

اس انکشاف نے مس پینسی کو دہلا دیا۔ وہ ایک جھٹکے سے زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کا جسم لرز رہا تھا۔ اس خبر نے میرے اعصاب پر بھی بُرا اثر ڈالا تھا مگر میں نے خود کو قابو میں رکھا اور مسٹر بنل کے عقب میں اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ پورا کمرا تہ و بالا تھا۔ الماری کے پٹ کھلے ہوئے تھے اور میز کی ساری درازیں اور ان کا سامان فرش پر پڑا تھا۔ گدا الٹ گیا تھا اور کارپٹ کی ساری چیزیں بھی بے ترتیب تھیں۔ اس کی ساری قیمتی اشیا غائب تھیں۔ میں یہ سارا منظر دیکھ کر ٹھہر گیا۔

''خدا کرے کہ میری چیزیں محفوظ ہوں۔'' میں نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف لپکا۔ مگر اندر داخل ہوتے ہی میری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ میرا کمرا بھی مسٹر بنل کے کمرے کا نقشِ ثانی بنا ہوا تھا۔ میری بھی تمام قیمتی چیزیں غائب تھیں۔ ابھی دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ مس لیزا کے رونے چلانے کی آواز آئی۔ صاف ظاہر تھا کہ چور نے اس کے کمرے کی صفائی بھی کر ڈالی تھی۔ گویا سب ہی اپنی قیمتی اشیا سے محروم ہو گئے تھے... سوائے مس پینسی کے!

صورتِ حال ایسی تھی کہ کسی کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ نہ تو کسی نے چور کو آتے جاتے دیکھا تھا اور نہ ہی یہ پتا تھا کہ وہ آیا کہاں سے تھا؟ باقی سب بوکھلائے ہوئے تھے اور میرا حال سب سے زیادہ خراب تھا۔ میرے اعصاب مضمحل تھے اور میرے پیروں نے میرا بوجھ برداشت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اگرچہ میری چوری ہونے والی چیزوں کی مالیت زیادہ نہیں تھی۔ اس کی وجہ بڑی سادہ تھی۔ میرے پاس کوئی قیمتی شے نہیں تھی اس لیے چور بھی معمولی قیمت کی اشیا لے جا سکا تھا مگر اس صدمے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میری ساری جسمانی توانائی زائل ہو کر رہ گئی تھی اور میں بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔

مسٹر بنل کا نقصان شدید تھا مگر وہی سب سے زیادہ ہوش میں تھا۔ اس نے کہا۔ ''ہمیں فوری طور پر کسی کو پولیس کو بلانے کے لیے بھیجنا چاہیے۔''

نگاہِ انتخاب گھر کی ملازمہ میری پر پڑی۔ اسے روانہ کیا گیا اور نصف گھنٹے بعد وہ پولیس کے ہمراہ آ گئی۔ پولیس نے آتے ہی سب سے پہلے دروازوں اور کھڑکیوں کا معائنہ کیا۔ باغ میں قدموں کے نشان تلاش کیے گئے۔ انہوں نے عمارت کی چھت اور بیرونی حصہ دیکھا۔ پھر انہوں نے مجھ سے اور مسٹر بنل سے اس وقت تک سوالات کیے جب تک ہم جوابات دے دے کر اُکتا نہیں گئے۔ آخر میں انہوں نے کمروں کے اسکیچز بنائے جہاں چور نے کام دکھایا تھا اور رخصت ہو گئے۔ واحد دریافت یہ تھی کہ ڈرائنگ روم کی کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔ میری نے اعتراف کیا کہ یہ اس کی غلطی تھی۔ اس نے شام کے وقت اسے بند نہیں کیا تھا۔ چور اسی راستے سے اندر آئے یا آیا۔ اس وقت ہم ڈنر میں مصروف تھے جب اس نے سکون سے ہماری اشیا چرائیں اور رخصت ہو گیا۔ دوسرے گھروں میں ہونے والی چوریوں کی طرح یہاں بھی چور نے کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔

اسی روز شام کو میں اور مسٹر بنل قصبے میں اپنے ایک مشترکہ دوست مسٹر وائی کار کے گھر گئے تو اس نے ہمیں اگلے روز اپنے عالی شان گھر میں ڈنر کی دعوت دی۔ مسٹر بنل کو بین فیلڈ آئے ہوئے صرف دو مہینے گزرے تھے تاہم وہ تمام واقف کاروں سے ملاقات کر کے قصے کی زندگی سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کر رہا تھا — مسٹر بنل کی گفتگو پُرکشش اور اس کے پاس بہترین جنرل نالج تھی جس سے ایک عام آدمی کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے بین فیلڈ میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ اسے تمام مذاہب اور فلسفیانہ مکاتبِ فکر کے بارے میں معلومات تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ کس انسان سے کس طرح بات کرنی ہے۔ اسے دوسروں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کا فن آتا تھا۔ اس کی شخصیت اور کردار میں تمام عمومی خوبیاں تھیں اور وہ ان سے دوسروں کو متاثر کرتا تھا۔

مگر جب ہم وائی کار کے گھر کی طرف جا رہے تھے تو وہ سُست اور خاموش تھا۔ اس کی فطری شوخی اور بات کرنے کی عادت دبی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ بھی تھی۔ گزشتہ رات ہی وہ چوروں کے ہاتھوں اپنی تمام ہی قیمتی اشیا سے ہاتھ دھو چکا تھا۔ اس نے خاصی دیر بعد کہا۔ ''میری خواہش ہے کہ ایک بار وہ

چور میرے ہاتھ آجائے۔ میں اسے مزہ چکھا دوں۔ وہ عام چوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذلیل اور گھٹیا ہے جو کسی شخص کو اس کی تمام جمع پونجی سے محروم کر دیتا ہے۔"

اس نے درست کہا تھا۔ یہ چور کچھ زیادہ ہی شیطان فطرت تھا۔ اول تو وہ اتنی تیزی سے یکے بعد دیگرے وارداتیں کر رہا تھا۔ حالانکہ عام چور ایسا نہیں کرتے۔ جب تک ایک چوری کا سامان ٹھکانے نہ لگ جائے، وہ دوسری چوری کا نہیں سوچتے۔ وائی کار کے گھر میں ڈنر کے دوران مسٹر بیل کا موڈ کسی قدر بحال ہو گیا تھا اور میں نے اس بات پر سب سے زیادہ سکون محسوس کیا کہ اس نے گزشتہ رات کی چوری کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کے بجائے وہ وائی کار کے چاندی اور شیشے کے برتنوں اور دوسرے سامان کی تعریف کر رہا تھا۔ وہ ان سے متاثر دکھائی دے رہا تھا۔ پھر اس نے بے حد قیمتی نوادرات... کپوں کی تعریف شروع کر دی جو کھانے کی میز کے وسط میں سجے تھے۔ یہ استعمال کے لیے نہیں تھے، صرف شوپیس تھے۔

اس دعوت کی میزبان مسز وائی کار نے بے حد قیمتی زیورات پہن رکھے تھے۔ ڈنر کے دوران مسٹر بیل نے مسز وائی کار کے زیورات اور قیمتی ملبوس کی تعریف کی تو وہ کھل اٹھی۔ ڈنر کے بعد اس نے وائی کار سے ان تصویروں پر تبادلہ خیال کیا جو کھانے کے کمرے کی دیواروں پر آویزاں تھیں۔ یہ سب قیمتی تصاویر تھیں۔ آتش دان پر چین سے تعلق رکھنے والے چند نوادرات رکھے تھے۔ صرف اس کمرے کے آرائشی اشیا سے ہی وائی کار کی دولت مندی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

میں حیران تھا کہ یہ وہی مسٹر بیل ہے جو یہاں آتے ہوئے مردہ اور مایوس لگ رہا تھا۔ اب اس کے الفاظ اور لہجے میں کتنی زندگی تھی۔ وہ ہر چیز کے بارے میں کتنی روانی سے بات کر رہا تھا۔ اس کی باتوں میں کتنی چاشنی تھی۔ اس کے انداز میں اعتماد اور وقار تھا۔ اس نے اس رات جیسی باتیں کیں، ایسی باتیں میں نے پھر نہیں سنیں۔ وہ باقاعدہ چمک رہا تھا۔ اس کے سامنے وائی کار پُراعتماد تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بیل کی لفاظی اور تعریفوں سے اتنا متاثر نہیں تھا جتنا کہ میں تھا۔ اس نے معمول کے سے انداز میں ہمیں اپنا گھر اور نوادرات کا خزانہ دکھایا۔

اس موقعے پر مسٹر بیل نے اچانک ہی تجویز پیش کی۔ "بین فیلڈ... میں جو ہو رہا ہے، اس کے پیشِ نظر تمہیں اپنی قیمتی اشیا کی حفاظت کے لیے سخت انتظامات کرنے چاہئیں۔"

اس کے بعد گفتگو کا رخ یکایک ہی اس موضوع کی طرف مڑ گیا جس سے مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی تھی اور میرا [illegible] پُرلطف ڈنر کا سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔ بہرحال، اچھی بات [illegible] ہوئی کہ ہم اس کے بعد زیادہ دیر نہیں رکے کیونکہ مسٹر [illegible] اگلی صبح جلدی لندن جانے کے لیے ٹرین پکڑنا تھی۔ اس [illegible] ہم وائی کار کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہو گئے۔

"بدقسمتی سے مسٹر وائی کار... ہم تاجر لوگ ہیں او[illegible] سے ہم آئے ہیں، ان چند مہینوں میں ہمیں آرام سے [illegible] موقع کم ملا ہے۔" مسٹر بیل نے جانے سے پہلے وائی کار سے کہا۔ "گزشتہ رات میں اپنی ساری دولت سے جو یہاں میرے پاس تھی، محروم ہو چکا ہوں... مگر پھر بھی یہاں گزارے پُرلطف وقت کو میں کبھی بھول نہیں سکوں گا۔"

"مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی ہے۔ بین فیلڈ ایک خوب صورت اور زندگی سے بھرپور قصبہ ہے۔ بے شک! [illegible] عرصے سے ہونے والی چوریوں کی وجہ سے یہاں کا ماحول خراب ہوا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ یہ خرابی زیادہ عرصے جاری نہیں رہے گی۔ چور پکڑا جائے گا۔"

"شاید ایسا ہی ہو... مگر مجھے امید نہیں ہے کہ چور پکڑا جائے گا۔ اس نے تمام چوریاں مہارت سے کی ہیں اور اپنے پیچھے کوئی نشان نہیں چھوڑا ہے۔ مجھے تو امید نہیں ہے کہ میری کوئی بھی چیز مجھے واپس مل سکے گی۔"

"میں تمہاری بات سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں۔" وائی کار نے سر ہلایا۔ وہ ہمیں باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔

"بین فیلڈ میں چور نے پانچ گھروں کا صفایا کر دیا اور ایک جگہ بھی کوئی نشان نہیں چھوڑا۔ ممکن ہے یہ کوئی بھوت ہو۔ وہ جس خاموشی سے کام کرتا ہے اس سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔" مسٹر بیل نے مزاحیہ انداز میں کہا تو سب مسکرانے لگے۔

"ممکن ہے جب تم واپس آؤ تو صورتِ حال بدل چکی ہو۔" وائی کار نے کہا اور ہم اس سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔ گلیوں میں مدھم روشنیاں تھیں اور میں سوچ رہا تھا، ممکن ہے چور کسی اور گھر کو تاڑ رہا ہو یا اپنا کام کر کے جا چکا ہو۔ ہاں میں اپنے کمروں میں جانے سے پہلے مسٹر بیل نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"تم مجھے کم سے کم تین دن بعد دیکھ سکو گے۔ اگر سب ٹھیک رہا تو میں ہفتے کی صبح لوٹ آؤں گا۔"

مجھے مسٹر بیل کی واپسی کی کوئی خاص بے تابی نہیں تھی۔ تاجر ہونے کی وجہ سے وہ میرا حریف تھا اور ہمارے درمیان یہ دوڑ رہتی تھی کہ کون زیادہ چالاک اور کامیاب ہے۔ [illegible] روز جب مسٹر بیل جا چکا تو میں نے خبر سنی کہ رات رمزے وائی کار کے گھر چور نے دھاوا بولا اور اس کی بے شمار قیمتی چیزیں لے اڑا۔ میں اس شام کو اس کے گھر افسوس کے لیے گیا تو وہ پولیس کی کارکردگی پر سخت مشتعل تھا۔ درحقیقت اس معاملے میں پولیس کچھ نہیں کر سکی تھی۔ یہ چھٹی واردات تھی اور اس میں سب سے زیادہ نقصان ہوا تھا۔ وائی کار کے مطابق چور جو لے گیا تھا، اس کی مالیت بیس ہزار پاؤنڈز سے زیادہ تھی۔

"ان میں کئی ایسے نوادرات ہیں جو اَن مول ہیں۔ ان کا دنیا میں کوئی متبادل نہیں ہے اور وہ اب مجھے نہیں مل سکتے۔"

"چور پکڑے جانے کی صورت میں ان کی نشان دہی ہو سکتی ہے۔"

"مجھے تو مسٹر بیل کی بات درست لگ رہی ہے۔ یہ چور کوئی بھوت ہے جو کسی کی نظروں میں آئے بغیر کام کر جاتا ہے۔" رمزے وائی کار نے سرد آہ بھری۔

مسٹر بیل حسبِ وعدہ ہفتے کی صبح لوٹ آیا تھا اور جب میں نے اسے وائی کار کے گھر میں ہونے والی چوری کے بارے میں بتایا تو وہ ششدر رہ گیا۔ اس نے کرسی پر گر کر اپنا سر تھام لیا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ میں نے اس کے گھر میں جو شان دار نوادرات دیکھے تھے، وہ اب نہیں رہے؟"

"بیشتر نہیں رہے۔"

"اور احمق پولیس والے اب تک کچھ نہیں کر سکے؟"

"نہیں... ان کی تفتیش کے تمام گھوڑے اس رخ پر دوڑ رہے ہیں کہ چور قصبے کے باہر سے آتے ہیں۔"

"یہ شروع سے غلط رخ پر تفتیش کر رہے ہیں۔" مسٹر بیل نے غصے سے کہا۔ "بھلا باہر سے آنے والے کو کیا پتا کہ کس گھر میں قیمتی اشیا ہیں... اور کہاں کہاں ہیں؟"

میں نے اس کی تائید کی۔ "چوریوں کا انداز بتا رہا ہے کہ چور تمام مکانات کی اندرونی ساخت سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے بلکہ اسے یہ بھی پتا ہوتا ہے کہ قیمتی اشیا کہاں رکھی ہیں۔ اسے گھر والوں کے معمولات کا بھی علم ہوتا ہے۔"

"اسی وجہ سے وہ کامیاب ہے۔" مسٹر بیل نے کرسی سے اٹھ کر بے تابی سے ٹہلتے ہوئے کہا۔ "ان پولیس والوں کی عقل میں یہ بات کیوں نہیں آ رہی ہے؟"

"وائی کار کو صدمہ ہوا ہے۔"

"اسے ہونا بھی چاہیے۔ اس کے پاس بعض بہت خوب صورت چیزیں تھیں۔ مجھے جب ان چیزوں کے چوری ہونے کا اتنا صدمہ ہے تو اسے تو زیادہ ہوگا۔ میں آج ہی اس کے پاس افسوس کے لیے جاؤں گا۔"

"مسٹر بیل! میرا خیال ہے کہ تمہیں اس سے زیادہ کرنا

ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے

1 جاسوسی ڈائجسٹ
2 سسپنس ڈائجسٹ
3 ماہنامہ پاکیزہ
4 ماہنامہ سرگزشت

صرف 500 روپے
ادا کریں اور ہمارا کوئی ایک ماہنامہ 12 ماہ تک، رجسٹرڈ ڈاک سے اپنے گھر پر وصول کریں۔

2000 روپے
میں آپ کو ایک سال تک ہمارے چاروں ماہنامے باقاعدگی سے ملتے رہیں گے۔ رقم ڈرافٹ یا منی آرڈر کے ذریعے جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے نام مندرجہ ذیل پتے پر ارسال کریں۔

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون 5895313 فیکس 5802551
E-mail:jdpgroup@hotmail.com

اگر آپ کو پرچوں کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے تو مندرجہ ذیل فون نمبر پر رابطہ کرسکتے ہیں
ثمر عباس 0301-2454188

چاہیے۔ تم لندن جیسے شہر کے رہنے والے شخص ہو۔ تمہارے پاس عقل، سمجھ بوجھ اور ذرائع ہیں۔ اگر تم ان چوریوں کا کھوج لگانے کی کوشش کرو تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ممکن ہے، ہم چور کو پکڑ لیں یا نہ پکڑ سکے تو بھی ہم مزید چوریوں کو روک سکیں گے۔''

''خیال تو بُرا نہیں ہے۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں کسی بھی قیمت پر اس چور تک پہنچنا چاہتا ہوں... مگر میرا خیال ہے کہ تم اس کام کے لیے زیادہ موزوں نہیں ہو۔ تم بہت جلد نروس ہو جاتے ہو۔ تم نے میری بات کا بُرا تو نہیں مانا؟''

''نہیں، میں نے بُرا نہیں مانا۔'' میں نے ملامت سے کہا۔ ''یہ حقیقت ہے کہ میں جلدی گھبرا جاتا ہوں مگر اس معاملے میں کچھ نہ کچھ کرنا ہے اور بہت جلد کرنا ہے۔''

''تم درست کہہ رہے ہو۔ میں ذرا سستا لوں پھر ہم وائی کار کے گھر جائیں گے اور دیکھیں گے۔ ممکن ہے، وہاں چور نے کوئی نشان چھوڑا ہو۔''

وائی کار نے مسرت سے ہمارا استقبال کیا اور جب ہم نے اسے اپنا ارادہ بتایا تو وہ فوراً ہمارے ساتھ ہو گیا۔ ''مگر چور بے حد چالاک ہے۔''

''چور کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو... نشان ضرور چھوڑتا ہے۔'' مسٹر بیل نے کہا۔

جب ہم نے کسی نشان کی تلاش شروع کی تو مسٹر بیل کو اس کھڑکی کے نیچے ایک جوتے کا نشان ملا جس سے چور اندر گھسا تھا۔ میں نے باغ میں ایک چھپر تلے رکھا جوتوں کا جوڑا دریافت کیا اور جب ہم نے اسے کھڑکی کے نیچے والے نشان سے میچ کیا تو وہ اس سے مل گیا۔ مگر سب سے اہم نشان وائی کار کے باغ کے گرد خاردار تار سے الجھی ایک جیکٹ کی دھجی تھی۔ چور جب جا رہا تھا تو یہ یقیناً اس کے لباس سے الگ ہوئی تھی۔

''اگر ہم نے وہ جیکٹ تلاش کر لی جس کی یہ دھجی ہے تو ہم چور تک پہنچ جائیں گے۔'' مسٹر بیل نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔ ''مسٹر رمزے وائی کار... بالآخر ہم نے ایک نشان تلاش کر لیا ہے۔''

''مجھے بھی امید ہے۔'' وائی کار بھی پُرجوش تھا۔ ''اگر بعد میں کوئی سراغ ملا تو میں تمہیں ضرور آگاہ کروں گا۔''

مگر آنے والے ایک مہینے تک میں اور مسٹر بیل جان توڑ کوشش کے باوجود اس مرحلے سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ ہماری ساری توانائیاں خرچ ہو چکی تھیں اور ہمیں ذرا بھی کامیابی نہیں ملی تھی۔ مسٹر بیل صرف اپنے ماہانہ دورے پر لندن گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا سارا ہی وقت چور کی تلاش میں گزرا تھا۔ شروع میں ہمیں لگا تھا جیسے ہم نے چور کو کھوج لیا ہے مگر جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے رہے، ہماری امیدیں خاک میں ملتی رہیں اور آخر میں آکر پتا چلا کہ ہم اپنا وقت اور توانائیاں ضائع کر رہے ہیں۔

''میرا خیال ہے کہ ہم نے ضرورت سے زیادہ توقعات لگا لی تھیں۔'' ایک مہینے بعد مسٹر بیل نے ٹوٹے دل کے ساتھ کہا۔ ''ہم نے ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ لی مگر ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ نہ تو ہم جوتے کے مالک کو تلاش کر سکے اور نہ ہی اس دھجی والی جیکٹ کو۔ ہم صرف وقت ضائع کرتے رہے ہیں۔ چور اب بھی آزاد اور بے خوف گھوم رہا ہے۔''

''تم نے درست کہا ہے دوست!'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''ہم بے شک چور کو نہیں پکڑ سکے اور نہ ہی ہم نے ملنے والے نشانات سے فائدہ اٹھایا... مگر مسٹر بیل! تم نے ایک بات محسوس کی کہ ہم نے چور کو مزید کسی تازہ واردات سے روک دیا ہے۔''

''گزشتہ ایک مہینے سے ہم جیسے میدانِ جنگ میں تھے۔'' مسٹر بیل نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ہم خود بھی پریشان رہے اور اپنے پڑوسیوں کو بھی پریشان رکھا۔ مگر یہ میری سب سے بڑی خواہش ہے... اس سے پہلے کہ میں بین فیلڈ سے رخصت ہوں، اس چور کو گرفتار کروا دوں۔''

''ہم نے کچھ اچھا کیا' اس کے باوجود میں مایوس ہوں۔'' میں نے تسلیم کیا۔

مسٹر بیل کو قصبے میں آئے تین مہینے ہونے کو آئے تھے۔ گزشتہ ایک مہینے میں اس نے سوائے لندن جانے کے سارا وقت مجھے دیا تھا اور اپنے کاروبار پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اب وقت آگیا تھا کہ وہ اپنے کام پر توجہ دے۔ ویسے بھی میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ شاید واپس لندن جانے والا ہے۔ آخر وہ دن آگیا جب اس کے بھاری بھرکم سامان سے بھرے بیگز ایک دن پہلے اسٹیشن روانہ کر دیے گئے۔ اگلے روز اسے صبح کی ٹرین سے ہمیشہ کے لیے لندن چلے جانا تھا۔

بین فیلڈ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور اس میں گھروں کی تعداد دو سو سے زیادہ نہیں ہے۔ آبادی بہ مشکل بارہ سو ہے۔ اس آبادی میں زیادہ تر سادہ اور ایسے امرا ہیں جن کو دنیا کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔ ایسے میں مسٹر بیل جو لندن جیسے شہر کا پروردہ تھا، اس قصبے میں آیا۔ اس کی باتوں کے انداز، اس کی چمکتی دمکتی علمیت اور اس کی مسحور کن شخصیت نے

سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اب وہ واپس جا رہا تھا تو ہم سب ہی افسردہ تھے۔ خاص طور سے لاج کی مالک مس پینسی اور مس لیزا بار بار آنکھوں میں بھر آنے والے آنسو صاف کر رہی تھیں۔ رات کا ڈنر جو مسٹر بیل کے لیے الوداعی ڈنر بھی تھا، افسردہ ماحول میں کیا گیا۔

اگلی صبح مسٹر بیل کو رخصت کرنے کے لیے سب نے جلدی اٹھنا تھا، اسی لیے سب ہی ڈنر کے فوری بعد سونے کے لیے اٹھ گئے۔ مجھے تو مسٹر بیل کے ساتھ ریلوے اسٹیشن تک جانا تھا۔ میں کمرے میں آیا تو مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے میں روشنی کر کے ایک کتاب دیکھنے لگا۔ خزاں کا آغاز تھا اور رات کو خاصی سردی ہو جاتی تھی، اس لیے میں سرِشام کھڑکی بند کر دیا کرتا تھا۔ نصف رات کے قریب اچانک میری کھڑکی کے شیشے پر دستک ہوئی۔ میں ایک لمحے کو گھبرا گیا۔ باہر اندھیرا تھا اور بالکل بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ذرا سا شیشہ اوپر کیا۔ ''کون ہے؟''

''یہ تم ہو مسٹر کوریٹ!'' باہر سے ایک نامانوس نسوانی آواز آئی۔ ''میں مسز سینڈی کی ملازمہ ہوں۔ انہوں نے آپ کو بلایا ہے کہ ان کی بچی کو بپتسمہ دیں... انہیں ڈر ہے کہ بچی مرنے والی ہے۔''

میں بتانا بھول گیا تھا کہ میں نے پادری کا کورس بھی کر رکھا تھا اور جز وقتی طور پر پادری کا کام بھی کرتا تھا۔ میں نے جلدی سے جواب دیا۔ ''تم واپس جاؤ اور مسز سینڈی سے کہو کہ میں جلد از جلد وہاں پہنچتا ہوں۔''

ملازمہ چلی گئی۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور جلدی سے لباس اور جوتے پہنے۔ اپنا چوغہ لیا۔ مجھے خوشی تھی کہ مسز سینڈی کی ملازمہ کی آمد سے کوئی اور ڈسٹرب نہیں ہوا تھا۔ جب میں مسٹر بیل کے کمرے کے پاس سے گزرا تو مجھے اندر روشنی دیکھ کر حیرت ہوئی۔ کیا وہ جاگ رہا تھا؟ میں ایک لمحے کے لیے کھڑا ہوا اور اندر کان لگائے مگر کوئی آواز نہیں آئی۔ پھر میں نے دستک دی۔ آہستگی سے بولا۔

''مسٹر بیل! مجھے امید ہے کہ میں نے تمہیں پریشان نہیں کیا ہوگا؟''

میں جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ مسٹر بیل کچی نیند سونے والا تھا اور ذرا سی آہٹ پر بے دار ہو جاتا تھا مگر اس بار اس کی جانب سے کوئی جواب نہیں آیا۔ حالانکہ اندر لائٹ بھی جل رہی تھی۔ میں نے دوبارہ دستک دی اور اسے پکارا۔ جواب حسبِ سابق تھا۔ میں نے ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھولا۔ اگرچہ مسز سینڈی بے تابی سے میرا انتظار کر رہی تھی اور اس کا بچہ موت کی دہلیز پر تھا مگر یہاں کچھ تھا جو مجھے روک رہا تھا۔ اچانک ہی میرے اندر ایک شک نے سر اٹھایا۔ میں نے اندر جھانکا۔ کمرا خالی تھا اور بستر اس طرح صاف ستھرا تھا جیسے اس پر کوئی دراز ہی نہ ہوا ہو۔ ہزاروں شکوک کے زہریلے سنپولیے اچانک ناگ بن کر پھنکارنے لگے۔ مسٹر بیل نصف رات کے وقت کہاں گیا تھا اور کیوں گیا تھا؟ جبکہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ سونے ہی گیا تھا۔

میرے پاس وقت نہیں تھا اس لیے میں اس پر مزید تحقیق کرنے کے بجائے کہ مسٹر بیل کہاں اور کیوں گیا تھا... خاموشی سے اس کے کمرے کا دروازہ بند کر کے نیچے ہال میں آیا۔ اپنی ٹوپی لی اور جب باہر کا دروازہ کھولنا چاہا تو وہ بھی کھلا ملا۔ یہ ناممکن تھا کہ مس پینسی رات کو دروازہ کھلا چھوڑ کر سو جائے۔ یعنی مسٹر بیل خاموشی سے گھر سے باہر گیا تھا... مگر کیوں اور کہاں؟ یہ سوال پھر شدت سے میرے ذہن میں ابھرا۔ میں جلدی سے باہر آیا اور مسز سینڈی کے گھر کی طرف دیکھا جو گلی کے بالکل سرے پر تھا اور دوسرے گھروں سے الگ تھلگ تھا۔ اچانک میں چونک کر رک گیا اور نزدیکی باڑھ میں سرک گیا۔ اس کے سائے میں کوئی مجھے بالکل قریب آئے بغیر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں نے اس مکان کو اندر سے اچھی طرح دیکھا ہوا تھا۔ اس میں کئی افراد رہتے تھے اور یہ سب اچھے لوگ تھے۔ میری نظر مکان پر مرکوز تھی۔ اچانک سناٹے میں ایک کھڑکی چیخی۔ میں نے اسے آہستہ سے کھلتے اور اس سے ایک مرد کا سایہ نمودار ہوتے دیکھا۔ 'ایک اور چوری!' میں نے سوچا۔ 'کتنی عجیب بات ہے' اس وقت ایک پولیس والا بھی اس جگہ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔'

مجھے نہیں معلوم کہ میں نے اس وقت چیخ کیوں نہیں ماری مگر اس وقت میں خاموش رہا تھا۔ میں ایک مکان کے چھجے تلے چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ چور کسی سائے تلے یہاں سے نکلے گا۔ وہ روشنی میں آنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے خود کو بلی کی طرح گول مول کر کے ایک ستون کے عقب میں چھپا لیا تھا۔ اچانک میری نگاہ سینڈی کے مکان کی دیوار پر ابھرے نقوش پر گئی۔ یہ ستون سے ستون تک بنے تھے اور چور لازمی ان پر قدم رکھ کر زمین تک آتا۔ یہ خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا تھا اور عجیب بات تھی کہ اس وقت نہ تو مجھے اختلاج کا دورہ پڑا تھا اور نہ ہی میں گھبرایا تھا۔ میں برآمدوں کی آڑ لیتا سینڈی کے مکان کے ستونوں تک چلا آیا اور تاریکی میں لیٹ گیا۔

میری توقع کے عین مطابق چور کے پاؤں میرے چہرے کے بالکل سامنے نمودار ہوئے۔ جیسے ہی اس کے ہاتھوں نے ستون کو چھوڑا، میں نے اس کے پاؤں پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا اور وہ منہ کے بل پھولوں کے ایک تختے پر گرا۔ میں نے پھرتی سے اس کے دونوں پاؤں ستونوں کے دائیں بائیں سے گزار کر جکڑ لیے۔ اس لیے اس کے اٹھنے اور آزاد ہونے کی کوشش ناکام رہی۔ وہ پہلے کراہا پھر اس نے غرّا کر سرگوشی کی۔

''مجھے جانے دو احمق... یا میں تمہارا بھیجا اڑا دوں؟''

اس وقت میرا خوف مجھ پر حملہ کر چکا تھا اور وہ خاموشی سے کچھ دیر جدوجہد کرتا تو میں اسے جانے دیتا۔ مگر اس نے بول کر میرا خوف ختم کر دیا تھا۔ یہ آواز مسٹر بیل کی تھی... میرے پُرکشش اور قابلِ احترام دوست کی تھی۔ وہ ایک گھر سے چوروں کی طرح نکلا تھا۔

''مسٹر بیل!'' میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''یہ کس طرح ممکن ہے؟''

''کیا؟'' اس نے جدوجہد کرتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے جانے دو... میں تمہیں زخمی نہیں کرنا چاہتا۔''

''کبھی نہیں۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا اور گلا پھاڑ کر مدد کے لیے چلّایا۔ میں نے اپنی آواز آخری حد تک نکالی تھی۔

''احمق!'' وہ چلّایا۔ ''اب تم نے آواز نکالی تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔''

''تمہارا خیال تھا کہ میں بزدل ہوں۔'' میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''مگر تم دیکھ رہے ہو کہ ایسا نہیں ہے۔'' میں نے ایک آواز سنی اور چلّانا جاری رکھا مگر اس آواز نے مجھے ایک بار پھر خوف زدہ کر دیا تھا۔ یہ ریوالور کا گھوڑا چڑھانے کی آواز تھی۔ اس دوران میں، میں مسٹر بیل کا پاؤں قابو میں رکھنے اور وہ اسے آزاد کرانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ میں اس سے موت کی طرح چمٹ گیا تھا۔ جیسے جیسے وہ کوشش کر رہا تھا، میری گرفت بھی سخت ہوتی جا رہی تھی۔ جب میں نے ریوالور کا گھوڑا چڑھنے کی آواز سنی تو اس نے جدوجہد ترک کر دی تھی۔ اس نے کچھ اور ہی فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ خود نہیں اٹھ سکتا تھا مگر ہاتھ اوپر کر کے مجھ پر گولی چلا سکتا تھا۔ میں نے اپنا سر نو انچ قطر کے ستون میں چھپانے کی کوشش کی۔ یہ کوشش جزوقتی کامیاب رہی کیونکہ گولی چلنے کے دھماکے کے بعد مجھے اپنے سر کے ایک طرف سنسنی کا احساس ہوا تھا اور میری آنکھیں ریوالور سے نکلنے والے شعلے سے خیرہ ہو گئی تھیں۔

''تم مجھے نہیں مار سکے۔'' میں چلّایا۔ ''تم ناکام رہے مسٹر بیل!''

میں بچ جانے پر خوش تھا... پر گولی نے نقصان کیا تھا۔ گرم خون بہہ کر میرے رخسار تک آ رہا تھا۔

''مردود!'' وہ غرایا اور دوسرا فائر کیا۔ اس بار میرے بائیں بازو میں جیسے گرم سلاخ اتر گئی۔ اس بار میں اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے ملے جلے انسانی شور اور دوڑنے کی آوازیں سنیں اور اس کے بعد سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک اجنبی کمرے میں بستر پر دراز تھا۔ میرے ایک جانب ڈاکٹر اور دوسری طرف نرس کھڑی تھی۔ میرے دونوں زخموں کی مرہم پٹی کی جا چکی تھی اور میں سکون محسوس کر رہا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ مسٹر بیل موقع پر پکڑا گیا تھا اور اس کے پاس سے وہ تمام چیزیں برآمد ہو گئی تھیں جو اس نے مسز سینڈی کے گھر سے چرائی تھیں۔ میں اسی کے گھر میں لیٹا تھا۔ اگلی صبح میبل فورڈ مجھ سے ملنے آئی۔ اس کے بارے میں قصبے والوں کی متفقہ رائے تھی کہ وہ اس قصبے کی حسین ترین لڑکی ہے۔ وہ میرے برابر میں بیٹھی اور اس نے مجھ سے کہا کہ میں ایک بہادر آدمی ہوں اور میرے زخم معمولی سے ہیں۔ اس لیے اسے امید ہے کہ میں مروں گا نہیں۔ اس کے آخری الفاظ میرے لیے باعثِ تکلیف تھے۔ اگرچہ میں بزدل تھا مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں بازو پر گولی کھانے سے مر سکتا ہوں۔ اس وقت میں اتنا کمزور ہو رہا تھا کہ میں احتجاج بھی نہ کر سکا۔ بہرحال، میبل کے الفاظ میرے لیے تسکین کا باعث بھی تھے اور میں اپنی کمزوری میں کمی محسوس کرنے لگا تھا۔

میں پورے ایک ہفتے تک بستر پر دراز رہا۔ ان دنوں میں میں نے بہت کچھ جانا تھا۔ اس میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ انسان کی ظاہری خصوصیات اتنی اہم نہیں ہوتیں، اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ آدمی خدا کے راستے پر چل رہا ہے یا شیطان کے راستے پر۔ مسٹر بیل دلکش اور کامیاب شخصیت کا مالک تھا۔ وہ دوسروں کو مسحور کر لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ زندگی کے کسی بھی مثبت شعبے میں کامیابی حاصل کر سکتا تھا مگر اس نے شیطان کا راستہ اختیار کیا۔ اس نے خود جنت چھوڑ کر جہنم کا انتخاب کیا۔ خدا بے شک رحم کرنے والا ہے۔ وہ اپنے بندوں کی غلطیاں معاف کر دیتا ہے لیکن آدمی خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ دوسروں کو تکلیف دیتا ہے اور پھر خود اپنی لگائی آگ میں جل جاتا ہے۔

جس روز ڈکیتی کی واردات ہوئی اور بیل پکڑا گیا تھا، اس سے اگلے روز اسے صبح مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کے جرم میں تو کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ سو فیصد رنگے ہاتھوں اور مسروقہ مال کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔ اس نے مجھ پر قتل کے ارادے سے گولی چلائی تھی اور اس کے پاس انکار کرنے کی ذرا بھی گنجائش نہیں تھی مگر پیشی کے دوران ایک مسئلہ سامنے آیا۔ اس کے بارے میں بین فیلڈ کے پولیس چیف کا خیال تھا کہ یہاں ہونے والی باقی چوریاں بھی اسی نے کی ہیں اور اسے مہلت دی گئی ہے کہ وہ ان کے بارے میں ایک ہفتے کے اندر اعتراف کر کے باقی سامان کے بارے میں بتا دے۔ اسے ایک ہفتے کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ اس پیشی کے دوران اس نے ایک بار بھی سر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے رہا بھی کیا تھا۔

میری معلومات کے مطابق بین فیلڈ کی عدالت میں اس سے پہلے کبھی اتنا ہجوم دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ چاروں طرف سے لوگ اُمنڈ آئے تھے اور عدالت کے احاطے تک میں لوگ جمع تھے۔ وہ ایک نظر اس شخص کو دیکھنا چاہتے تھے جو بیک وقت ایک شریف انسان اور ایک چالاک ترین چور کا کردار کامیابی سے ادا کر رہا تھا۔ اس نے اس پُرسکون اور پُرامن قصبے میں جہاں برسوں سے کوئی بڑا جرم نہیں ہوا تھا، خوف و ہراس پھیلا دیا تھا۔ ہر شخص اسے اس کے جرائم کی سزا پاتے دیکھنا چاہتا تھا۔ پولیس سرگرمی سے اس سے تمام جرائم قبول کروانے اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں جاننے کے لیے کوشاں تھی۔

بین فیلڈ کا میئر جو ایک دولت مند شخص تھا، وہ خود اس کیس کی نگرانی کر رہا تھا۔ ایک رات جب وہ سونے کے لیے بستر پر جانے والا تھا تو اس کے گھر کی کال بیل بجی۔ ملازمین پہلے سونے کے لیے جا چکے تھے، اس لیے میئر خود دروازے پر گیا اور وہاں اپنے ایک ماتحت پولیس مین کو پا کر حیران ہوا۔

''ویل مسٹر کانسٹیبل... کیا مسئلہ ہے؟''

''سر! میں اس وقت زحمت دینے پر معذرت خواہ ہوں۔'' اس نے ادب سے کہا۔ ''میں یہ اطلاع دینے آیا ہوں کہ مسٹر بیل نے اپنے تمام جرائم کا اعتراف کر لیا ہے اور اب ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ اس کے سارے گروہ کو گرفتار کر سکیں۔''

''یہ تو اچھی خبر ہے۔'' میئر نے پُرجوش لہجے میں کہا اور کانسٹیبل کو دعوت دی۔ ''برائے کرم اندر آؤ اور مجھے تفصیلات سے آگاہ کرو۔'' میئر نے راستہ دیا تو کانسٹیبل اندر آ گیا۔

''مہربانی کر کے خواتین اور دوسرے افراد کو جگانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' پولیس کانسٹیبل نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''آپ کے لیے ایک چونکا دینے والی خبر ہے۔ آج آپ کے گھر چوری کا منصوبہ ہے۔ چور یہاں گھس کر کام کرنا چاہتے تھے مگر ہم پہلے ہی ان کے لیے تیار ہیں۔ پولیس کے جوان چاروں طرف پھیلے ہیں اور چھپے ہوئے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ تمام روشنیاں بجھا دیں... جیسے ہی سارے افراد سونے کے لیے جا چکے ہیں۔ اس کے بعد ہم یہاں انتظار کریں گے۔''

''چوروں کا؟'' میئر چونکا۔

''نہیں، ان کے پکڑے جانے کا۔ وہ اندر نہیں آ سکتے۔ جو ہونا ہے باہر ہی ہوگا۔''

اس خبر نے میئر کو متوحش کر دیا تھا اور اس پر ہلکی سی کپکپی طاری ہو گئی تھی۔ ''کیا تم لوگوں نے چوروں کو روکنے کے کافی انتظامات کر لیے ہیں؟''

میئر کی حالت پر پولیس کانسٹیبل مسکرایا مگر پھر اس کے مرتبے کا خیال کر کے فوراً سنجیدہ ہو گیا۔ ''سر! ان چوروں نے آپ کے مکان کے عقبی حصے میں ایک دروازہ تلاش کر لیا ہے۔ وہ جیسے ہی اس کے ذریعے اندر آئیں گے، ان کو گرفتار کر لیا جائے گا۔''

اس تسلی کے باوجود میئر کی گھبراہٹ کم نہیں ہوئی تھی۔ ''مجھے امید ہے کہ تمہارے آدمی ان کو اندر آنے سے پہلے گرفتار کر لیں گے۔''

''سر! اس صورت میں ہم ان پر زیادہ سے زیادہ غیر قانونی طور پر گھر میں گھسنے کا الزام لگا سکتے ہیں... اور آپ جانتے ہیں، اس جرم کی کتنی معمولی سی سزا ہوتی ہے۔ نہیں سر! ہم انہیں تمام ثبوتوں اور مکمل الزام کے تحت گرفتار کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کو لمبی مدت کے لیے جیل بھیجا جا سکے۔''

''درست ہے... بالکل ٹھیک!'' میئر نے اس بار حوصلے سے کہا۔ ''میں تم سے متفق ہوں اور اس سارے معاملے کو تمہارے ہاتھ میں دیتا ہوں۔''

''سر! کیا آپ کے گھر والے نشست گاہ میں ہیں؟''

''ہاں... ہم بس سونے ہی جا رہے تھے۔''

''خوب... سر! ان سے کہیں کہ اسی جگہ رہیں اور کوئی آواز نہ کریں۔ اگر ان کو کمروں سے کوئی آواز سنائی دے تب بھی ردعمل ظاہر نہ کریں۔ میں خود یہاں سیڑھیوں کے پاس رہوں گا اور جیسے ہی وہ اندر آئیں گے، اپنے آدمیوں کو اشارہ دوں گا اور ان کی راہنمائی کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ ایک بجے

سے پہلے ہم اس پورے گینگ کو گرفتار کر چکے ہوں گے۔''

''مجھے بھی یہی امید ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں کرسی لا دیتا ہوں۔ اتنی دیر تک کھڑے رہنا مناسب نہیں ہوگا۔ تم تھک جاؤ گے۔''

''مگر آپ لا سکیں تو میں بے حد شکر گزار ہوں گا۔''

میئر نے کانسٹیبل کو کرسی لا دی اور پانچ منٹ میں گھر کی ساری روشنیاں گل کی جا چکی تھیں۔ میئر اپنے خاندان کے ہمراہ نشست گاہ میں چلا گیا تھا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور باہر کانسٹیبل کرسی پر بیٹھا نگرانی کرنے لگا۔ یہ جگہ کھڑکی کے پاس تھی۔ اس کے پاس مدھم روشنی والی لالٹین اور ہاتھ میں پستول تھا۔ وقت اذیت ناک حد تک سستی سے گزر رہا تھا۔ خدا خدا کر کے بارہ بجے اور اب گھڑی ایک بجے کی طرف سفر کر رہی تھی۔ سب خاموش اور تناؤ میں تھے۔ وہ کسی آواز کے منتظر تھے جو اس سناٹے کو توڑ سکے۔ اس کے بعد ساڑھے بارہ بجے کا گھنٹا بجا، اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ ابھی تک کسی طرف سے کوئی تحریک محسوس نہیں ہوئی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ وہ کسی وقت بھی آ سکتے ہیں۔'' میئر نے سرگوشی میں کہا۔ اس کے دانت بج رہے تھے۔ کسی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

میئر کے خاندان کے سب ہی افراد بے حد ڈرے ہوئے تھے۔ اس کی بیوی نے آہستہ سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ پولیس والے ہمارا اور گھر کا تحفظ کر لیں گے؟''

''پولیس کانسٹیبل نے مجھے یقین دلایا ہے۔'' میئر بولا۔

''اب تو ایک بجنے والا ہے۔''

''ممکن ہے، چوروں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہو۔'' میئر نے بیوی سے زیادہ خود کو تسلی دی۔

ایک کے بعد ڈیڑھ بجا اور پھر دو کا وقت بھی گزر گیا۔ مکان میں مکمل خاموشی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہر شے نیند میں ہے۔ رفتہ رفتہ معاملہ میئر کی برداشت سے باہر ہو گیا اور اس نے اٹھ کر چابی کے سوراخ سے باہر دیکھا پھر اس نے دروازہ کھولا اور باہر جھانکا۔ ہال تاریک تھا۔ کہیں کوئی حرکت یا آواز نہیں تھی۔ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اس نے سر سے دیکھا۔ کرسی کھڑکی کے عین نیچے رکھی تھی مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ آخر کانسٹیبل کہاں گیا تھا؟ پانچ منٹ میں میئر نے مکان کی تمام روشنیاں جلا دیں اور اس کے بعد سچ کی تلاش شروع ہوئی جسے سامنے آنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ تمام خواب گاہیں بُری طرح بکھری ہوئی تھیں اور ان میں موجود ہر قیمتی شے غائب ہو چکی تھی۔

''میرے خدا!'' میئر چلّا اٹھا۔ ''یہ سب کیا ہے؟''

پھر ایک شبہ اس کے ذہن میں جاگا۔ میئر نے جلدی سے جوتے پہنے اور بین فیلڈ کے پولیس اسٹیشن کی طرف بھاگا۔ جب وہ پولیس اسٹیشن میں داخل ہوا تو وہاں سکوت طاری تھا اور یہ سکوت کچھ زیادہ ہی تھا۔ عام طور سے پولیس اسٹیشن میں رات کے وقت بھی کچھ نہ کچھ سرگرمی ہوتی ہے لیکن یہاں پر مکمل سناٹا تھا۔ جس کوٹھری میں مسٹر بیل کو بند کیا گیا تھا، اس میں اب صرف ایک کانسٹیبل بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور اس کا کوٹ اور ہیلمٹ غائب تھا۔ کانسٹیبل کی حالت بتاتی تھی کہ اسے بے ہوش ہوئے خاصی دیر ہو چکی ہے اور اس کے ہوش میں آنے میں بھی خاصی دیر تھی۔ اس کے بعد ہی پتا چلتا کہ اس پر کیا گزری اور اصل میں ہوا کیا تھا۔

اگلے روز جب کانسٹیبل پوری طرح ہوش میں آیا تو اس نے انوکھی کہانی سنائی۔ اس نے بتایا کہ رات کے شروع میں جب پولیس اسٹیشن میں سوائے اس کے اور کوئی نہیں رہا تھا، قیدی بیل نے اچانک اس سے شکایت کی کہ اس کی آنکھ میں کوئی شے پڑ گئی ہے جس سے اسے بے حد تکلیف ہو رہی ہے۔ اس لیے وہ دروازے کے اوپری سوراخ سے لالٹین کی روشنی میں اس کی آنکھ دیکھ لے۔ کانسٹیبل نے ایسا ہی کیا اور جیسے ہی اس نے بیل کی آنکھوں میں دیکھا، اسے یوں لگا جیسے اسے مسمرائز یا ہپناٹائز کیا جا رہا ہے۔ اس کا اپنے ذہن پر اختیار ختم ہو گیا اور اس کے بعد وہ وہی کرتا رہا جو بیل نے اس سے کہا۔

یہ بات واضح تھی کہ اس کے بعد بیل نے کانسٹیبل کا کوٹ اور ہیلمٹ پہنا اور لالٹین اور پستول بھی ہتھیا لیا۔ پولیس اسٹیشن سے نکل کر وہ سیدھا میئر کے گھر پہنچا۔ اسے اپنے پولیس مین ہونے کا یقین دلا کر اور ایک کہانی سنا کر خاندان سمیت اسے ڈرائنگ روم تک محدود کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اطمینان سے میئر کے گھر کی صفائی کی اور فرار ہو گیا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ کانسٹیبل نے خود کو الزام سے بچانے کے لیے مسمرائز یا ہپناٹائز ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ درحقیقت بیل نے اسے جسمانی طور پر قابو کر لیا تھا۔

جب میں نے بیل کے فرار کی خبر سنی تو سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ ہم سب سے زیادہ چالاک تھا یا پھر ہم اس سے زیادہ بے وقوف تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ کبھی نظر نہیں آئے گا۔

شناخت

راؤ رشید خاں

اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں ، ایک بے شناخت کا احوالِ ثبات ۔ اس کی تعمیر میں مضمر ، خرابی کی ایک صورت اسے یہاں وہاں لیے پھر رہی تھی ۔کبھی اس ڈگر ،کبھی اس ڈگر ...بادلوں سا اڑتا ، ہوائوں سے لڑتا وہ اپنی اصل کو کھوجتا پھر رہا تھا ۔دنیا کی بھیڑ میں اسے اپنے بھی ملے اور بیگانے بھی ،دوست بھی اور دشمن بھی ...حتیٰ کہ اپنا عکس بھی ! بس وہی مل کے نہیں دے رہا تھا جس کی اسے تلاش تھی ۔ اپنے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان معلق اپنے وجود میں بے وجودی کا شکار تھا اور آباد ہو کر بھی برباد !

آئینہ خانۂ دہر میں چہرہ چہرہ خود کو کھوجتے ، ایک بے شناخت کی روداد

میں اب تک بہن کے رشتے سے تو کیا بہن کے تصور سے بھی محروم تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ پاپا نے میری ماما کے علاوہ رخشی کی بہن سے بھی شادی کی تھی۔ میرے ذہن میں یہی بات تھی کہ پاپا کی ایک ہی شریکِ حیات ہے۔ ہم دو بھائی پیدا ہوئے ہیں۔ اس کے بعد حالات نے ہمیں ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھیر دیا ہے۔

اس روز اچانک ہی یمنم کے متعلق انکشاف ہوا۔ میں نے رخشی اور گے گورڈن کو قابو کرنے کے بعد واش روم میں آکر ان سے چھپ کر فون کے ذریعے پہلی بار بہن کی دل میں اتر جانے والی آواز سنی۔

پہلے تو اس معصوم کو یقین نہیں آیا کہ میں اس کا بھائی اس سے بول رہا ہوں۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ وہ کبھی اپنے بھائیوں میں سے کسی کی آواز سن سکے گی۔ شاید رخشی اور گے گورڈن ہمارے جیتے جی اس کے آگے ہمیں مُردہ کہہ چکے تھے اور شاید اس کے اندر کہیں یہ یقین چھپا ہوا تھا کہ اس سے جھوٹ بولا جا رہا ہے۔ ہوسکتا ہے' اس کے بھائی زندہ ہوں۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ میں نے ایک ذرا یقین دلایا تو اس نے مان لیا کہ میں ایک بھائی ہوں اور پہلی بار اس سے بول رہا ہوں۔ تب وہ جذبات کے ریلے میں بہہ گئی۔ سسکنے لگی۔ رونے لگی۔ ان لمحات میں میرا دل کٹ رہا تھا۔ میں اس کے آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اس کی سسکیوں میں بھیگ رہا تھا۔

تھوڑی دیر پہلے میں نے اس سے کہا تھا کہ میں تمہارا بھائی وجاہت علی ہوں۔ مجھے وجی کہتے ہیں۔ تمہارا ایک اور بھائی وکی تھا۔

پھر میں نے اس سے پوچھا تھا۔ ''تم نے ہمارے نام سنیں ہوں گے؟ آنٹی رخشی نے کیا ہوگا؟''

اس وقت یمنم چپ رہی تھی۔ اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ یقیناً وہ میرے متعلق کشمکش میں مبتلا ہوگی۔ خدا کا شکر ہے' وہ بے یقینی اور کشمکش سے نکل آئی تھی۔ اس کے آنسو کہہ رہے تھے کہ وہ فون پر بولنے والے کو اپنا بھائی تسلیم کر رہی ہے۔

میں نے کہا۔ ''تمہارے آنسو مجھے رُلا رہے ہیں۔ میرا دل رو رہا ہے۔ مگر یہ اطمینان اور یقین ہے کہ آج کے بعد میری بہن کبھی نہیں روئے گی۔ اس کے دشمن روتے روتے مریں گے۔''

وہ قدرے سہمی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''آپ آنٹی کے فون سے بول رہے ہیں۔ یہ بات وہ جانتی ہوں گی پھر جان جائیں گی۔''

''تم فکر نہ کرو۔ کسی سے نہ ڈرو۔ مجھے بتاؤ' ابھی کس ملک کے کس شہر میں اور کس مکان میں ہو؟ میں جلد سے جلد تمہارے پاس پہنچنے کی کوشش کروں گا۔''

اس نے کہا۔ ''آنٹی لندن میں ہیں۔ یقیناً آپ بھی اسی شہر سے بول رہے ہیں۔ میں آپ سے ہزاروں میل پاکستان کے شہر اسلام آباد میں ہوں۔ جب تک آپ یہاں آئیں گے' تب تک انکل گے گورڈن کے آدمی مجھے کسی دوسری جگہ پہنچا دیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''فکر نہ کرو۔ وہ دونوں میرے قابو میں ہیں۔ ابھی میں نہیں جانتا' یہاں حالات کب تک میرے موافق رہیں گے؟ ویسے حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اس لیے میں دوسری چال چلوں گا۔ یہ ظاہر کروں گا کہ تمہارا فون کسی وجہ سے بند پڑا ہے۔ رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔''

وہ بولی۔ ''ہاں۔ اس طرح وہ ذرا مطمئن ہو جائیں گے کہ نہ آپ سے میری بات ہوئی ہے اور نہ آپ میرا اتا ٹھکانا جانتے ہیں۔''

یمنم نے اپنی رہائش گاہ کا مکمل پتا بتایا۔ میں نے اسے ذہن نشین کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم زیادہ باتیں نہیں کریں گے۔ مجھے یہ ظاہر کرنا ہے کہ تمہارا فون بند پڑا ہے۔ جب کبھی تم سے پوچھا جائے تو کہہ دینا' فون میں خرابی پیدا ہوگئی تھی۔''

''میں اب تک اپنے لہو کے رشتوں سے دور مایوسیوں کے گرداب میں ڈوبتی آرہی ہوں۔ ابھی اس فون کو پانی میں ڈبو دوں گی۔ آپ اپنا نمبر بتائیں... دوسرا فون لینے کے بعد آپ سے باتیں کروں گی۔''

میں نے اسے اپنا نمبر بتا کر کہا۔ ''میری بہن! میری جان! فی الحال خدا حافظ... موجودہ حالات سے نمٹنے کے بعد تم سے باتیں ہوں گی۔ اپنا فون اسی لمحے بند کر دو۔ میں رخشی کے پاس جا رہا ہوں۔''

دوسرے ہی لمحے رابطہ ختم ہوگیا۔ اس نے اس فون کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا تھا۔ میں نے امیر حمزہ کے نمبر پنچ کیے۔ پھر رابطے کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ ساحل پر پہنچے اور رخشی کے وہاں سے روانہ ہونے کا انتظار کرے۔ مجھے رخشی کا موبائل فون چاہیے تھا۔ مگر اب اس کے لیے امیر حمزہ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ میرے ہاتھوں تک پہنچ چکا تھا اور میں اس کے ذریعے اپنی بہن سے باتیں بھی کر

چکا تھا۔

رابطہ ہونے پر میں نے امیر حمزہ سے کہا۔ ''تم کہاں ہو؟''

وہ بولا۔ ''میں آپ کے حکم کے مطابق یہاں ساحل پر پہنچا ہوا ہوں۔ رخشی کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''اب اس کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ تم واپس چلے جاؤ۔ یہاں حالات یکسر بدل گئے ہیں۔ فی الحال تفصیل سے نہیں کر سکتا۔ خدا حافظ...''

میں نے رابطہ ختم کر دیا۔ پھر رخشی کے فون پر دکھاوے کے لیے یمنم سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہوا واش روم سے باہر آگیا۔ جھنجلاتے ہوئے رخشی سے بولا۔ ''اس میں یمنم کا نمبر ہے مگر اس سے رابطہ کیوں نہیں ہو رہا ہے؟''

اس نے میرے ایک ہاتھ میں پستول کو دیکھا۔ وہ بُری طرح سہمی ہوئی تھی۔ ان لمحات میں گے گورڈن کو مجبور اور بے دست و پا دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ شاید اس کمرے سے زندہ نہیں جا سکے گی۔ اس نے کہا۔ ''میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ یمنم نے فون بند رکھا ہوگا۔''

میں نے اسے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم نے حکم دیا ہوگا کہ تمہاری غیر موجودگی میں وہ اپنا فون بند رکھا کرے۔''

''میں نے اسے ایسا کوئی حکم نہیں دیا ہے۔ فون بند ہونے کی کوئی وجہ ہوگی۔''

میں نے اسے فون دیتے ہوئے کہا۔ ''اس سے کسی بھی طرح رابطہ کرو۔ نمبر بند ہے تو اس کے آس پاس رہنے والے اپنے رشتے داروں یا کارندوں سے معلوم کرو۔ ان کے فون پر اس سے بات کرواور مجھ سے بات کراؤ۔''

بگ باس نے کہا۔ ''رخشی! قسمت ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ تم کسی سے رابطہ نہ کرو۔ پہلے ہم اپنی زندگی کی ضمانت چاہیں گے۔ پھر بات آگے بڑھے گی۔''

پاپا نے کہا۔ ''ہمیں معلوم ہے' تم کیا چاہو گے۔ کسی بھی طرح ہماری گرفت سے نکل کر یہاں سے جانے کی کوشش کرو گے۔''

وہ بولا۔ ''یہی بات ہے۔ جب تک ہماری سانسیں چلتی رہیں گی' تب تک تمہاری بیٹی بھی کہیں سانسیں لیتی رہے گی۔ ہم سے جھوٹا کیے بغیر تم باپ بیٹے اس کی صورت بھی نہیں دیکھ سکو گے۔''

رخشی نے کہا۔ ''تم درست کہہ رہے ہو، گے گورڈن! قسمت ہم پر مہربان ہے۔ اس لیے یمنم کا فون ناکارہ ہوگیا۔ یہ باپ بیٹے نہ اس سے بات کر سکیں گے' نہ ہماری مرضی کے بغیر اس کے سائے تک پہنچ سکیں گے۔''

پاپا نے پریشان ہو کر مجھے دیکھا۔ بیٹی تک پہنچنے میں رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں۔ حالات دشمنوں کے لیے سازگار ہو رہے تھے۔

بگ باس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''موجودہ صورتِ حال کو سمجھو۔ ہمیں مارو گے تو کبھی یمنم تک پہنچ نہیں پاؤ گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں' مجھے اور رخشی کو نقصان نہیں پہنچاؤ گے تو کم از کم فون کے ذریعے تمہیں یمنم کی آواز ضرور سناؤں گا۔ تم اس سے باتیں بھی کر سکو گے۔''

پاپا نے کہا۔ ''تم سال میں ایک آدھ بار مجھے اس کی آواز سناتے ہو۔ اب اسے ہمارے روبرو لاؤ گے تو زندہ رہ سکو گے۔''

''تم نے بیٹی سے فون پر باتیں کی ہیں مگر اس بھائی نے اپنی بہن کی آواز بھی نہیں سنی ہے۔ اپنے بیٹے سے پوچھو' کیا یہ بہن سے باتیں کرنا اور اس سے ملنا نہیں چاہے گا؟''

میں مجبور نہیں تھا۔ مجھے یمنم کا پتا معلوم ہو چکا تھا مگر ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ اسے حاصل کیے بغیر دشمنوں کو خوش فہمی میں مبتلا رکھنا ضروری تھا۔

میں نے کہا۔ ''پاپا! یہ خبیث ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں اپنی بہن کے لیے تڑپ رہا ہوں۔ ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ہم ان دونوں کو جانی نقصان پہنچائیں گے تو کبھی اس کا پتا ٹھکانا معلوم نہیں کر سکیں گے۔''

وہ پریشان ہو کر سوچ رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ یمنم کو کہیں دیکھ کر اسے صورت شکل سے پہچان سکیں گے؟''

انہوں نے انکار میں سر ہلایا پھر کہا۔ ''اس مرد ُود نے جب وہ پانچ برس کی تھی' تب اس کی ویڈیو فلم دکھائی تھی۔ اس کے بعد میں نہیں جانتا' اس کی صورت شکل کیسی ہوگی؟ اب وہ جوان ہو چکی ہے۔ پتا نہیں کتنی بدل گئی ہوگی؟''

گے گورڈن نے اپنا فون اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے حکم کے مطابق میں نے اپنے دستِ راست سے کہا تھا کہ لانچ کو واپس ساحل کی طرف لے جائے لیکن اب میرا پلڑا بھاری ہے۔ میرے حکم سے یہ پھر گہرے پانیوں میں جائے گی۔''

وہ اپنے دستِ راست کو حکم دینے کے لیے فون کو آن کر کے نمبر پنچ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک لات ماری تو فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فضا میں اڑتا ہوا دور کمرے کے ایک گوشے میں چلا گیا۔

میں نے کہا۔ ''بہت خوش فہمی ہے کہ تمہارا پلڑا بھاری

ہوگیا ہے۔ ایک گولی چلے گی تو پہلے اپنی بوڑھی محبوبہ کو تڑپ تڑپ کر مرتا دیکھو گے۔ اس کے بعد میں تمہیں گن پوائنٹ پر یہاں سے لے جاؤں گا۔ کسی ایسی جگہ لے جا کر سمجھوتا کروں گا اور اپنی بہن کو حاصل کروں گا جہاں تمہاری طاقت اور وسیع ذرائع کسی کام نہیں آئیں گے۔''

رخشی نے رونے کے انداز میں کہا۔ ''گے! میں مرجاؤں گی۔ یہ دونوں تمہیں یہاں سے لے جائیں گے۔ تم کچھ نہیں کر پاؤ گے۔ میں بھی جان سے جاؤں گی۔ پلیز! پہلے میری فکر کرو۔''

بگ باس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر زوردار قہقہہ لگایا۔ ہم اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ قہقہہ لگا کر پیٹ پکڑ کر کبھی گھٹنوں کی طرف جھک رہا تھا، کبھی سیدھا ہو کر بیٹھ رہا تھا۔ اس کے ہنسنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

رخشی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''کیا پاگل ہوگئے ہو؟ کیوں ہنس رہے ہو؟ فار گاڈ سیک... میری فکر کرو۔''

وہ بیڈ کے سرے پر بیٹھا اسی طرح قہقہے لگا رہا تھا۔ کبھی جھک رہا تھا، کبھی اٹھ رہا تھا۔ ایسے ہی وقت اچانک اس کے پیروں کے پاس فرش میں خلا پیدا ہوا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سر کے بل جھکتا ہوا اس خلا سے گزرتا ہوا نیچے چلا گیا۔

ایسا چند ساعتوں میں ہوا تھا۔ میں آگے بڑھ کر اسے نیچے جانے سے نہ روک سکا۔ وہ عرشے کے نچلے حصے میں ایک بڑی سی میز پر جا کر گرا تھا۔ میز کے اطراف مسلح افراد کھانے میں مصروف تھے۔ اپنے بگ باس کو اس حالت میں اوپر سے گرتے دیکھا تو سب ہی اچھل کر کھڑے ہوگئے۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ میں نے فوراً ہی آگے بڑھ کر نیچے کی طرف کھلنے والے پٹ کو اٹھا کر کمرے کے فرش سے برابر کر دیا۔ وہ فرش کے برابر رہنے والا پٹ ایسی ہی ایمرجنسی کے لیے بنایا گیا تھا تاکہ ناگہانی مصیبت کے وقت اوپر سے نیچے پہنچا جا سکے۔

وہ پٹ دو چٹخنیوں کے ذریعے برابر رہتا تھا۔ گے گورڈن بڑی دیر سے آہستہ آہستہ ان دو چٹخنیوں کو کھولتا رہا تھا۔ اس نے بڑی چالبازی دکھائی تھی۔ ہماری گرفت سے نکل کر اپنے مسلح باڈی گارڈز کے درمیان پہنچ گیا تھا۔

پاپا نے پریشان ہو کر کہا۔ ''بیٹے! یہ کیا ہوگیا؟''

میں نے کہا۔ ''ہم دھوکا کھا گئے ہیں۔ شیطان اپنی خالہ کو یہاں چھوڑ گیا ہے۔ اب اس کمرے کو مسلح گارڈز چاروں طرف سے گھیر لیں گے۔''

پاپا نے رخشی کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم تو مریں گے مگر اسے بھی لے مریں گے۔''

میں نے کہا۔ ''بڑا جانباز عاشق ہے۔ محبوبہ کو نیچے پھینک کر چلا گیا ہے۔ اس نے اپنی جان بچالی ہے۔''

میں نے اپنے فون پر اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ایک اعلیٰ افسر کے نمبر ڈائل کیے۔ میری ایک کال پر پولیس فورس وہاں پہنچ سکتی تھی۔ مگر فون پر آواز سنائی دی کہ فی الحال مطلوبہ نمبر سے رابطہ نہیں ہو سکے گا۔

میں نے کن انکھیوں سے رخشی کو دیکھا۔ اسے خوف زدہ کرنا ضروری تھا۔ میں نے خاموش ہو جانے والے فون پر کہا۔ ''ہیلو... میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کا جونیئر آفیسر وجاہت علی بول رہا ہوں۔''

یہ سنتے ہی پاپا ایک دم سے چونک گئے۔ وہ اب تک مجھے وکی سمجھ رہے تھے۔ رخشی بھی چونک کر بے یقینی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں فون کو کان سے لگائے کہہ رہا تھا۔ ''ہیلو... اس وقت وہ میڈم روزی میری گرفت میں ہے جس نے برطانوی پارلیمنٹ کے دفتر سے بہت ہی اہم فائل چرائی تھی۔''

رخشی ایک دم سے اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے ہاتھ ہلا کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر فون پر کہا۔ ''اس کا اصل نام رخشی ہے۔ ہم اپنے طریقہ کار سے ثابت کر دیں گے کہ یہ وہی میڈم روزی ہے۔ اس وقت میں خطرات میں گھرا ہوا ہوں۔ جس جگہ کی نشان دہی کر رہا ہوں، ادھر فوراً ہیلی کاپٹر کے ذریعے مدد پہنچائی جائے...''

میری بات ادھوری رہ گئی۔ باہر سے دروازہ پیٹنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سیکیورٹی افسر نے کہا۔ ''وکی! دروازہ کھولو۔ میڈم کو ذرا سا بھی نقصان پہنچے گا تو تم اپنے باپ کے ساتھ مارے جاؤ گے۔''

بگ باس کی آواز سنائی دی۔ ''وکی! سیکیورٹی افسر کی بات مان لو۔ باپ بیٹے ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں، رخشی سلامت رہے گی تو ہم آرام سے کہیں پیٹو بینم کے سلسلے میں سمجھوتا کریں گے۔''

میں نے رخشی سے کہا۔ ''اس کم بخت کو بتاؤ کہ میں کون ہوں۔ ابھی میں نے اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں کو اس لانچ کا پتا نہیں بتایا ہے۔''

رخشی نے چیخ کر کہا۔ ''گے! ہم اب تک دھوکا کھا رہے ہیں۔ یہ وکی نہیں ہے۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کا جونیئر افسر وجاہت علی یعنی کہ وجی ہے۔''

بگ باس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟

''سچ کہہ رہی ہوں۔ اس نے مجھے میڈم روزی کے طور پر پہچان لیا ہے۔ اس کی ایک کال پر پولیس ہیلی کاپٹر کے ذریعے یہاں پہنچ سکتی ہے۔ مگر اس نے پولیس فورس کو ابھی کچھ کا نہیں بتایا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں صرف اپنی بہن بینم کی خاطر مہلت دے رہا ہوں۔ سمجھوتا کرو گے تو تمہاری رخشی کو میڈم روزی سے گرفتار نہیں کراؤں گا۔ اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے والا معاملہ ہوگا۔ بینم کو میرے حوالے کرو اور رخشی کو لے جاؤ۔''

اب بگ باس کے پاس سوچنے اور پریشان ہونے کے لیے بہت کچھ تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ جب تک ہم اس کیبن سے باہر نہ نکلتے، تب تک ان کی فائرنگ کی زد میں نہ آتے۔ پھر وہ رخشی کو بھی زندہ سلامت حاصل کرنا چاہتا تھا۔

دوسری بات یہ تھی کہ میری ایک کال پر پولیس فورس وہاں پہنچ سکتی تھی۔ فی الحال اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ محبوبہ کو مرنے کے لیے چھوڑ دے اور اپنی جان بچا کر وہاں سے نکل جائے۔

مگر وہ اس مرحلے پر مجبور تھا۔ اس لیے نہیں کہ اس بوڑھی محبوبہ کا عاشق صادق تھا۔ اس سے بے وفائی نہ کرنے کی وجہ کچھ اور تھی۔ اس کا اور رخشی کا بیٹا سلطان ظفر اپنی ماں سے زیادہ متاثر تھا۔ اُس باپ سے برائے نام تعلق رکھتا تھا جس کا نام ولدیت کے خانے میں لکھا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ بیٹا ایک معلم اور ایک مجاہد کے روپ میں بڑی طاقت حاصل کر رہا تھا۔ اگر اس لانچ میں اس کی ماں جان سے جاتی تو وہ اپنے ناجائز باپ کو پچھاڑ کر رکھ دیتا۔

میں نے کہا۔ ''گورڈن! سوچنے سمجھنے کے لیے جتنا وقت چاہتے ہو اس سے زیادہ وقت لے لو۔ میں بھی تھوڑی دیر خاموش رہنا چاہتا ہوں۔ اب آدھے گھنٹے کے بعد بولوں گا۔''

گے گورڈن کو بہت کچھ سوچنا تھا۔ تمام حالات پر غور کرتے ہوئے یہی بات سمجھ میں آرہی تھی کہ وہ رخشی کو گلے سے لگا کر سلطان ظفر کی بڑھتی ہوئی قوت سے محفوظ بھی رہ سکتا ہے اور اس سے فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے۔

☆☆☆

فطرت انسان کو ایک بار مارتی ہے لیکن بُرے حالات کی اور بدقسمتی کی مار بار بار پڑتی رہے تو انسان مر مر کر جیتا رہتا ہے۔ شہناز کو اس کے حالات نے ایسا پٹخا تھا کہ وہ بُری طرح چکرا کر رہ گئی تھی۔ پہلے وکی نے اور پھر اس نرس نے اس کے کانوں میں جو صور پھونکا تھا، اس کے بعد تو جیسے اس

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
سائل نہیں ملتے
ماہنامہ پاکیزہ
ماہنامہ سرگزشت
اندرونِ ملک چھوٹے شہروں اور قصبوں کے معزز قارئین کی یہ شکایت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔
ہاکرز اور بک اسٹال والے صرف اتنی کاپیاں خریدتے ہیں جن کے بک جانے کا انہیں سو فیصد یقین ہو کیونکہ بچ رہنے والی ان کی کئی کاپیوں کا نفع کھا جاتی ہے۔ کوئی بھی خسارے کا ایسا سودا پسند نہیں کرتا
رسائل کے یقینی حصول کے دو طریقے ہیں
○ اپنے ہاکر یا بک اسٹال والے کو تاکید کر دیں کہ وہ ہر مہینے باقاعدگی سے آپ کو رسالہ فراہم کرے، وہ اپنی تعداد بڑھالے گا۔
یا
○ آپ ادارے کو صرف 500 روپے (ڈاک خرچ اس میں شامل ہے) بھیج کر ہمارے کسی بھی پرچے کے سالانہ خریدار بن جائیں اور مزید کسی خرچ یا بھاگ دوڑ کے بغیر 12 شمارے رجسٹرڈ ڈاک سے بذریعہ اپنی دہلیز پر حاصل کرتے رہیں۔
OO
اس شرح سے آپ زائد سالوں اور چاروں پرچوں کے لیے بہ یک وقت زرِ سالانہ ارسال کر کے بے فکر ہو سکتے ہیں
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی میں کورنگی روڈ، کراچی
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
ثمر عباس 0301-2454188
بدرالدین سرکولیشن مینیجر 5802552-5386783-5804200
فیکس نمبر 5802551

کے ہوش ہی اڑ گئے تھے۔ حالانکہ وکی نے جھوٹ بولا تھا کہ اس کا ایک آلۂ کار پولیس کے شکنجے میں آچکا ہے۔ وہ اس کے جھوٹ کو سچ سمجھ رہی تھی۔

دوسری طرف نرس نے یہ دھماکا خیز خبر سنائی تھی کہ اس کا پاؤں بھاری ہوگیا ہے۔ وہ امید سے تھی جبکہ اس کے چاروں طرف ناامیدی سی چھا گئی تھی۔ وہ کیسے خان علی کو زخمی ایشلے کے پاس چھوڑ کر اسپتال سے نکلی اور کیسے اپنے ہوٹل تک پہنچی؟ اسے کچھ خبر نہ ہوئی۔ وہ وکی کو پچھاڑنے گئی تھی مگر خود چاروں شانے چت ہوکر لوٹی تھی۔

سوئیٹ میں زرینہ بانو اور شاہنواز اس کے منتظر تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس نے وکی کے خلاف کیسی سازش کی تھی اور کس طرح چار کرائے کے قاتل خرید کر اس کی موت کا سامان کیا تھا؟

وہ جب سے آئی تھی' تب سے خاموش تھی۔ ماں اور بھائی کے کسی سوال کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ سر تھامے گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے اندر جیسے بھونچال سا آیا ہوا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہوگیا ہے اور آئندہ کیا کرنا ہے؟

بگڑتے ہوئے حالات کو سُدھارنے کے جتن کر کرکے وہ جیسے ہلکان ہوگئی تھی۔ زرینہ بانو نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بات ہے شہناز! ایسے کیوں گونگی بہری بن کر بیٹھی ہوئی ہو؟ نہ جاتے ہوئے بتایا کہ کہاں جارہی ہو اور نہ اب آکر کچھ بتارہی ہو۔ آخر بات کیا ہے؟ تم کہاں گئی تھیں اور یہ چہرہ کیوں ماتمی سا بنایا ہوا ہے؟''

اس نے ماں کو دیکھا' بھائی کو دیکھا پھر ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''بار بار بدقسمتی کے طمانچے پڑتے رہیں تو چہرہ اسی طرح ماتمی سا ہوکر رہ جاتا ہے۔''

ماں نے جلدی سے کہا۔ ''بدقسمت ہوں ہمارے دشمن... آخر تم کس بات کا ماتم کررہی ہو؟ کچھ تو بتاؤ... کیا ہوا ہے؟ تم کہاں سے آرہی ہو؟''

شاہنواز اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا خان علی سے ملنے گئی تھیں؟''

زرینہ بانو نے کہا۔ ''نہیں۔ یہ خان علی کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا۔ شہناز نے اسے ٹالنے کے لیے کہا تھا کہ یہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جارہی ہے۔ مگر اس کے بعد یہ کہاں گئی اور اب کہاں سے آرہی ہے، مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔''

شاہنواز نے شہناز کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیوں ہمیں الجھارہی ہو؟ کچھ تو بولو؟''

وہ جیسے جھنجلا سی گئی۔ الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''کیا بولوں؟ آپ لوگوں نے تو مجھے کچھ بھی بولنے کے قابل نہیں چھوڑا ہے۔ کتنی خوش تھی میں اپنی زندگی سے... لیکن آپ نے وجی کی تلوار میرے سر پر لٹکا کر میری ساری خوشیاں، آرام اور سکون غارت کردیا ہے۔''

''کیا اس نے پھر تمہیں ڈسٹرب کیا ہے؟''

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے بولی۔ ''کچھ سمجھ میں نہیں آتا' کیا کروں؟ کیسے اس سے پیچھا چھڑاؤں؟''

شاہنواز نے کہا۔ ''پیچھا تو اس کی موت کے بعد ہی چھوٹے گا۔''

ماں نے پوچھا۔ ''کیا اس کا فون آیا تھا؟''

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ ''تو پھر کیا بات ہے؟ اس کا ذکر کررہی ہو، کیا اس کے پاس گئی تھیں؟''

وہ بولی۔ ''ہاں۔ اس سے پیچھا چھڑانے گئی تھی مگر ہمیشہ کی طرح بدقسمتی نے میرے چھکے چھڑا دیے۔''

انہوں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ماں نے پوچھا۔ ''کیا مطلب...؟ ہم کچھ سمجھے نہیں، کھل کر بات کرو۔''

اس نے ماں اور بھائی کو دیکھا پھر کہا۔ ''دراصل میں شانی کی طرف سے مایوس ہوگئی تھی۔ یہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ یہ کبھی وجی کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہوسکے گا۔ اس لیے... میں نے خود اس دشمن سے نمٹنے کا فیصلہ کیا اور آپ کو بتائے بغیر اس کے خلاف جان لیوا سازش کی۔''

ماں بیٹے نے ایک دم سے چونک کر اسے دیکھا۔ زیرِلب کہا۔ ''جان لیوا سازش....؟''

وہ تمام باتیں انہیں تفصیل سے بتاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن انجام کار وہی ہوا، میری سازش میرے ہی گلے پڑ گئی۔''

شاہنواز نے کہا۔ ''پتا نہیں وہ کیسی قسمت لے کر پیدا ہوا ہے؟ تم مجھے الزام دیتی تھیں' اب خود آزما کر دیکھ لیا۔ اسے تو جیسے کوئی غیبی امداد پہنچتی رہتی ہے۔ ہمیشہ ہماری گرفت میں آتے آتے نکل جاتا ہے۔''

شہناز نے کہا۔ ''وہ تو نکل گیا لیکن میرا خریدا ہوا ایک آلۂ کار قانون کی گرفت میں آچکا ہے۔ وہ یہاں کا پتا ٹھکانا نہیں جانتا مگر مجھے شکل صورت سے پہچانتا ہے۔''

ماں نے کہا۔ ''یہ تو واقعی تشویشناک بات ہے۔ وجی ویسے ہی ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا ہے اور اب تمہاری سازش کو بھانپ گیا ہے تو یقیناً ہمیں قانون کے شکنجے میں لینا چاہے گا۔''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''اس طرح تو اسے ہمارے خلاف مزید چالیں چلنے کا موقع مل گیا ہے۔''

پھر اس نے بہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جب تم اتنا بڑا قدم اٹھارہی تھیں تو تمہیں کم از کم ہم سے مشورہ تو کرنا چاہیے تھا۔''

وہ بولی... ''اب تک اس کے خلاف جو بھی قدم اٹھایا ہم سب کے باہمی مشوروں کے مطابق اٹھایا گیا مگر نتیجہ کیا نکلا ہے؟''

وہ ایک ہاتھ سے اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ''وجی میرے لیے ایک ایسی دلدل بن گیا ہے جس سے باہر نکلنے کے لیے میں جتنی کوششیں کررہی ہوں' اُتنی ہی دھنستی چلی جارہی ہوں۔''

زرینہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اس نے بیٹی سے کہا۔ ''حالات جیسے بھی تھے، تمہیں خان علی کے ساتھ رہنا چاہیے تھا۔ اسے اسپتال میں ایشلے کے پاس تنہا چھوڑ کر تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ وہ زخمی لڑکی خوب ہمدردیاں سمیٹ رہی ہوگی۔''

اس نے ماں کو دیکھا، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ ایسے ہی وقت شاہنواز نے کہا۔ ''بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ تم وجی سے ملنے گئیں مگر خان علی سے سامنا ہوگیا۔ پھر جب فائرنگ ہوئی تو اچانک ہی ایشلے کہیں سے چلی آئی۔ تم بتارہی ہو کہ وجی بھی وہیں کہیں تھا اور یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا...''

وہ بولتے بولتے ذرا چپ ہوا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''تمام حالات پر غور کرنے کے بعد یہی بات سمجھ میں آرہی ہے کہ اِدھر تم نے اسے ہلاک کرنے کی سازش کی ہوئی تھی اور اُدھر وہ بھی نادان نہیں تھا۔ تمہیں بُری طرح الجھانے کے لیے اس نے بھی بھرپور تیاری کی ہوئی تھی۔''

شہناز نے پوچھا۔ ''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اسی نے پہلے خان علی کو پھر ایشلے کو میرے پاس بھیجا تھا؟''

''سارے حالات تمہارے سامنے ہیں۔''

زرینہ بانو نے کہا۔ ''مجھے تو خان علی کی فکر کھائے جارہی ہے۔ وہ لڑکی نہ جانے کیسے کیسے جادو چلارہی ہوگی؟''

شہناز نے کہا۔ ''فکر نہ کریں' وہ آئی سی یو میں ہے۔ کچھ کہنے سننے کے قابل نہیں ہے۔''

وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ ''سوکن چاہے مٹی کی ہو، سوکن ہی ہوتی ہے۔ بے شک! وہ نہیں بولے گی لیکن خان علی وہاں تنہا اسے دیکھتا رہے گا اور اسی کے بارے میں سوچتا رہے گا۔ تم اس کے پاس ہوتیں تو اس کا دھیان بانٹتی رہتیں۔ تمہیں تو وہاں سے ہلنا بھی نہیں چاہیے تھا۔''

وہ بولی۔ ''اس آلۂ کار کی گرفتاری کی خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا، اسی لیے وہاں رک نہ سکی۔''

شاہنواز نے کہا۔ ''تم صرف ایک کال کرکے اپنے حالات مجھے بتادیتیں پھر پولیس اسٹیشن کے معاملات سے میں خود نمٹ لیتا۔''

وہ ماں اور بھائی کو دیکھتے ہوئے ایک ذرا ہچکچا کر بولی۔ ''دراصل... میں اسپتال میں چکرا کر گر پڑی تھی۔ تب ایک ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا تو پتا چلا...''

وہ بولتے بولتے چپ ہوگئی۔ ماں نے پوچھا۔ ''کیا پتا چلا...؟''

اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرنے لگے۔ اس نے بڑی حقارت سے کہا۔ ''میں ماں بننے والی ہوں۔''

وہ دونوں جیسے اچھل پڑے۔ بڑی حیرانی اور بے یقینی سے بولے۔ ''کیا...؟''

ماں نے سوچتی ہوئی نظروں سے بیٹے کو دیکھا پھر پہلو بدل کر بیٹی سے پوچھا۔ ''کیا واقعی یہ سچی خبر ہے؟''

وہ بولی۔ ''جب میں ہوش میں آئی تو نرس نے مجھے یہی بتایا تھا۔''

ماں نے پریشان ہوکر پوچھا۔ ''وہاں خان علی بھی تمہارے ساتھ تھا؟ کیا اسے...''

شہناز نے کہا۔ ''اس کا سارا دھیان ایشلے کی طرف تھا۔ میں نے اس نرس کو اچھی خاصی رقم دے کر خاموش کرادیا ہے۔ اس بات کی بھنک بھی خان علی کے کانوں تک نہیں پہنچی ہے۔''

ماں نے اطمینان کی ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ اس کی ساری توجہ ایشلے کی طرف تھی۔ اگر اسے تمہاری کنڈیشن کا پتا چل جاتا تو وہ وہیں تمہارے ٹکڑے کردیتا۔''

شہناز نے جھرجھری سی لیتے ہوئے کہا۔ ''بال بال بچی ہوں۔ پتا نہیں کون سی نیکی آڑے آگئی؟''

شاہنواز بڑی دیر سے خاموش تھا۔ بہن کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا تھا۔ شہناز نے ماں سے کہا۔ ''پلیز! فوراً کسی ایسی لیڈی ڈاکٹر سے کنسلٹ کریں جو ہمارے راز کو راز رکھتے ہوئے اس نئے پنپنے والے عذاب سے میری جان چھڑا دے۔ ہم اسے منہ مانگی رقم دیں گے۔''

ماں بیٹے نے چونک کر اسے دیکھا۔ زرینہ بانو کچھ کہنا چاہتی تھی، اس سے پہلے شاہنواز نے کہا۔ ''کیا پاگل ہوگئی ہو؟ یہ عذاب نہیں ہے۔ ہماری اب تک کی محنت اور بھاگ دوڑ کا پھل ہے۔ ہم اسے یونہی ضائع ہونے نہیں دیں گے۔''

اس نے سوالیہ نظروں سے بھائی کو دیکھا۔ ماں نے کہا۔ ''ہم تو اس پھل کو خوب پکا کر، میٹھا کر کے کھائیں گے۔''

وہ انہیں کچھ سمجھنے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ دونوں کرنا کیا چاہتے ہیں؟''

ماں نے کہا۔ ''جیسے تمہیں تو معلوم نہیں ہے؟ کیا بھول گئی ہو؟ ہم نے یہی تو پلاننگ کی تھی کہ علیم شیرازی کو اسی کے وارث کے ذریعے بلیک میل کیا جائے اور اسی مقصد کے لیے ہم نے تمہیں وجی کے قریب پہنچایا تھا۔''

وہ بولی۔ ''مجھے یاد ہے مگر اس وقت حالات کچھ اور تھے۔''

ماں نے بیٹی کے گھٹنے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''حالات تو اب بدلیں گے اور بہت تیزی سے بدلیں گے۔ بڑی تگ و دو کے بعد بازی ہمارے ہاتھوں میں آرہی ہے۔ کیوں شاہنواز...!''

وہ بولا۔ ''بالکل... اب ہم اس اونٹ کو پہاڑ کے نیچے لائیں گے۔''

شہناز نے کہا۔ ''کیا ہو گیا ہے آپ دونوں کو...؟ وجی سے بار بار شکست کھانے کے باوجود کیا یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ وہ ہمارے قابو میں آنے والا شخص نہیں ہے۔ میں کسی بھی قیمت پر اس سے جان چھڑانے کی فکر میں ہوں اور آپ دونوں...''

شاہنواز نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''ہم بھی اس سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں مگر فی الحال حالات نے اچانک ہی زبردست کروٹ لی ہے۔''

وہ بولی۔ ''تم کیا سمجھ رہے ہو، وجی جیسے چالباز شخص کو ایک ناجائز بچے کے ذریعے بلیک میل کرسکو گے؟''

ماں نے کہا۔ ''اسے ناجائز نہ کہو۔ یہی تو علیم شیرازی کا جائز وارث ہو گا اور ہم ثابت بھی کریں گے۔''

شہناز نے معافی مانگنے کے انداز میں دونوں ہاتھ کہنیوں تک جوڑتے ہوئے کہا۔ ''فار گاڈ سیک...! مجھے تو معاف رکھیں۔ اب میں آپ کی کسی پلاننگ کا حصہ نہیں بنوں گی۔ علیم شیرازی سے انتقام لینے کے لیے اپنا شانہ استعمال نہیں کرنے دوں گی۔''

''یہ تم کیسی باتیں کررہی ہو؟ اب جبکہ گیند ہمارے کورٹ میں آئی ہے تو تم میدان چھوڑ کر جانے کی بات کررہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''جب یہ سمجھ میں آجائے کہ دشمن ناقابلِ شکست ہے تو میدان چھوڑ دینا ہی عقل مندی کہلاتی ہے... اور آپ یہ کس گیند کی بات کررہی ہیں؟ اس سارے معاملے میں شروع سے لے کر اب تک میں خود ہی فٹ بال بنی ہوں۔ کبھی خان علی کی طرف اور کبھی وجی کی طرف اچھالی جاتی ہوں۔ لیکن اب مجھ سے یہ کھیل نہیں کھیلا جائے گا۔ آپ دونوں بھی وجی کا بھوت اپنے سر سے اتار دیں۔''

ماں نے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی کچھ بولو... اسے کچھ تو سمجھاؤ...''

وہ بولا۔ ''سمجھانا کیا ہے؟ یہ بات تو پہلے ...''

شہناز نے جھنجلا کر کہا۔ ''خدا کے لیے بس کریں۔ وجی کو ٹریپ کرنے کے لیے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کریں لیکن مجھے اس معاملے سے دور رکھیں کیونکہ اب میں آپ کی کسی بھی چال کے لیے مہرہ نہیں بنوں گی۔''

ماں نے کہا۔ ''تم خوامخواہ گھبرا رہی ہو۔ اس بار تو وجی کو نہیں، اس کے نانا کو ٹریپ کرنا ہے؟''

وہ بولی۔ ''آپ جو چاہے کریں لیکن یہ بات اچھی طرح سن لیں، میں آپ کے ساتھ نہیں ہوں۔''

شاہنواز نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ''ساتھ تو تم واقعی نہیں ہو۔ اگر ہوتیں تو وجی کے خلاف کوئی بھی سازش کرنے سے پہلے ہم سے مشورہ ضرور کرتیں۔''

''یہ نہ سوچو کہ میں نے تم سے کوئی مشورہ نہیں کیا۔ یہ سوچو کہ مجھے اس جھمیلے سے نجات دلانے کے لیے تم نے اب تک کیا کیا؟ وجی سے قائم ہونے والے تعلقات میرے گلے کی ہڈی بن گئے ہیں اور میں اس ہڈی کو کسی صورت نہیں نگلوں گی۔ اسے اگلنے اور تھوکنے کے لیے کسی لیڈی ڈاکٹر سے رابطہ کروں گی۔''

وہ اٹھ کر جانے لگی۔ ماں نے فوراً ہی اسے بازو سے تھام کر روکتے ہوئے پوچھا۔ ''کہاں جارہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''جب اپنے مسائل خود ہی حل کرنے ہیں تو دیر کیوں کروں؟''

وہ اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولی۔ ''اپنوں سے اتنی جلدی بدگمان نہیں ہوا کرتے۔ ادھر بیٹھو اور میری سنو...!''

وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''ہزار باتیں کریں لیکن ہو گا وہی جو میں کہہ چکی ہوں۔''

زرینہ بانو نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھ گئی، تم ماں نہیں بننا چاہتیں۔ ٹھیک ہے، اس معاملے کو یہیں ختم کیا جائے گا۔ میں خود تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر چلوں گی۔ میری فرینڈ یہاں ایک پرائیویٹ اسپتال میں جاب کرتی ہے۔ وہ چٹکیوں میں ہمارا کام کردے گی۔''

شاہنواز نے کہا۔ ''لیکن ممی...!''

وہ ایک ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ''تم چپ رہو۔ میں اس معاملے کو ختم کررہی ہوں اور تمہارا یہ کام ہے کہ تم جلد از جلد وجی کا خاتمہ کردو۔ شہناز درست کہہ رہی ہے۔ علیم شیرازی کو اس کی بلندی سے پستی کی طرف پھینکنے کے لیے ہمیں کوئی اور طریقہ کار سوچنا چاہیے۔ فی الحال یہ سوچو کہ اس کرائے کے قاتل کا کیا کیا جائے جو قانون کی گرفت میں آچکا ہے؟''

اس نے بولتے بولتے بیٹی کی طرف دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر کہا۔ ''تم نے ابھی بتایا ہے کہ وہ ہمارا ایڈریس نہیں جانتا مگر تمہیں شکل وصورت سے پہچانتا ہے؟''

وہ بولی۔ ''وہ چاروں مجھے جانتے ہیں۔''

''بے شک! جانتے ہیں مگر پتا ٹھکانا تو نہیں جانتے۔ یہی تمہارے لیے غنیمت ہے۔ اگر تم اس سوئیٹ تک محدود رہو گی، باہر نہیں نکلو گی تو کوئی خطرے والی بات نہیں ہو گی۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ کیا میں قیدی بن کر یہاں پڑی رہوں گی؟ مجھے خان علی سے ملنا ہو گا۔ اپنے علاج کے لیے اسپتال جانا ہو گا تو...؟''

''علاج کی پروا نہ کرو۔ میں اپنی فرینڈ کو یہاں سوئیٹ میں بلا لوں گی اور جہاں تک خان علی کی بات ہے تو اس سے کہہ دینا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے آرام کررہی ہو۔''

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''لیکن یہ بہانہ کب تک چلے گا؟''

''تم مجھے ان مجرموں کے نمبر دو۔ میں اور شاہنواز اپنے طور پر رابطہ کرکے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے کہ ان کا جو ساتھی پکڑا گیا ہے، وہ کب حوالات سے باہر آنے والا ہے؟ دوسری طرف اس علاقے کے پولیس اسٹیشن سے بھی معلومات حاصل کی جائیں گی۔''

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھا۔ وہ بولی۔ ''اس معاملے کو ہینڈل کرنے کی یہی صورت ہے کہ تم اس سوئیٹ سے باہر نہ نکلو۔''

وہ ذرا دیر چپ رہی۔ سوچتی رہی پھر بولی۔ ''اور وہ وجی... وہ مجھے نکلنے پر مجبور کردے گا۔ چین سے رہنے نہیں دے گا۔''

ماں نے کہا۔ ''تم ہمیں ان مجرموں کا نمبر تو دو۔''

اس نے نمبر نوٹ کرائے۔ زرینہ بانو نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بیٹے سے کہا۔ ''چلو شانی! ہم ابھی جا کر پی سی او کے ذریعے ان سے رابطہ کریں گے۔ پھر میں اپنی ڈاکٹر دوست سے ملاقات کروں گی۔ اسے یہاں شہناز کے پاس لے کر آؤں گی۔''

ماں بیٹا وہاں سے چلے گئے۔ شہناز نے ان کے جانے کے بعد خان علی کے نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ ''مجھے یہاں آئے ایک گھنٹا گزر چکا ہے مگر تم نے ایک کال کرکے میری خیریت نہیں پوچھی۔''

وہ بولا۔ ''شکایت نہ کرو۔ میری مصروفیت کو سمجھو۔ ایشلے آئی سی یو میں ہے۔ میں ایک بیمار کی تیمارداری کررہا ہوں۔ ایک ایسی لڑکی کی جسے میری وجہ سے تکلیف پہنچی ہے۔''

''تم اپنے اوپر الزام کیوں لے رہے ہو؟ وہ نامعلوم افراد کی فائرنگ کی زد میں آئی ہے۔ تمہاری وجہ سے اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچی ہے۔''

وہ بولا۔ ''کیسی باتیں کررہی ہو؟ تم نے خود بھی دیکھا تھا۔ وہ میری جان بچانے کے لیے ڈھال بن گئی تھی۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ اس کی جان بچ گئی، ورنہ میں...''

وہ جل بھن کر بولی۔ ''ورنہ تم ساری عمر اس کی موت کا سوگ مناتے رہتے۔ ہے نا......؟''

وہ ذرا دیر چپ رہا پھر بولا۔ ''میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ لگتا ہے تمہاری طبیعت ابھی سنبھلی نہیں ہے۔ تمہیں آرام کرنا چاہیے۔''

وہ بولی۔ ''تم اس کی تیمارداری کے چکر میں مجھے نظر انداز کررہے ہو...''

اس نے ذرا چونک کر اپنے فون کو دیکھا۔ پھر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ''ہیلو... ہیلو...!''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا تھا۔ اس نے جھنجلا کر اپنے فون کو دیکھا پھر اسے ایک طرف پٹخ دیا۔ یہ سوچ کر غصہ آرہا تھا کہ خان علی ایشلے کی وجہ سے اسے نظر انداز کررہا ہے۔ اس کا رویہ اور لب ولہجہ سمجھا رہا تھا کہ سوکن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ان لمحات میں ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے اس نے وہ کرائے کے قاتل وکی کو ہلاک کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنی محبت کا گلا کاٹنے کے لیے خریدے تھے۔

وکی کے نام کی گولی نے بڑی قیامت ڈھائی تھی۔ وہ خان علی کو لگتی اور وہ جان سے جاتا، تب بھی شہناز کا نقصان تھا۔ اب جبکہ اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوا تھا تو ایشلے کے لیے اس کی محبت اور ہمدردی اسے شہناز سے چھین رہی تھی۔

وہ رہ رہ کر وکی کو کوس رہی تھی۔ اپنی عقل کا ماتم کررہی تھی کہ اسے وکی کے جھمیلے میں الجھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ جو حتمی

فیصلہ آج کیا کہ آئندہ ماں اور بھائی کا ساتھ نہیں دے گی، وہ فیصلہ اسے پہلے ہی روز کر لینا چاہیے تھا۔

ایسا ہوتا ہے۔ پہلے اتنی دور تک سوچنے کا موقع نہیں ملتا اور جب موقع ملتا ہے تو پتا چلتا ہے' پانی سر سے گزر چکا ہے۔ شہناز کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ خان علی تقریباً اس کے سحر سے نکل چکا تھا۔ کسی بھی روز اس کی شامت بننے والا تھا اور یہی بات شہناز کے دل و دماغ میں وسوسے کرنے لگی تھی۔

اُدھر شاہنواز نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے ماں سے کہا۔ ''شہناز نے بہت بڑی خبر سنائی لیکن آپ نے اس کا فیصلہ مانتے ہوئے سارا معاملہ ہی چوپٹ کر دیا۔ میں جعلی نکاح نامہ تیار کروا چکا ہوں۔ آئندہ وجی کو راستے سے ہٹاتے ہی ہم علیم شیرازی کو بھرپور طریقے سے بلیک میل کر سکتے تھے۔ مگر...''

زرینہ نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے کہا۔ ''علیم شیرازی کی دولت اور جائیداد حاصل کرنے کا خواب میرا برسوں پرانا ہے۔''

وہ سر جھٹک کر بولا۔ ''اور اب جبکہ یہ خواب حقیقت بننے والا تھا تو آپ نے ہتھیار ڈال دیے۔''

''حقیقت بننے والا تھا نہیں... ہے۔''

اس نے سر گھما کر ماں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں نے ہتھیار نہیں ڈالے ہیں۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں؟ آپ شہناز کی بات مانتے ہوئے اس معاملے کے مضبوط پہلو سے ہاتھ دھونا چاہتی ہیں۔ پھر یہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ ہتھیار نہیں ڈالے ہیں؟''

وہ بولی۔ ''جس طرح تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں، اسی طرح ایک بات کے دو مطلب ہوا کرتے ہیں۔''

اس نے ماں کو دیکھا۔ پھر گیئر بدلتے ہوئے کہا۔ ''پلیز! اُلجھانے والی باتیں نہ کریں۔ کھل کر کہیں' کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

وہ بولی۔ ''تھوڑی دیر پہلے تمہیں ایسا لگا جیسے میں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں جبکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہونا وہی ہے جس کی ہم نے پلاننگ کی ہوئی ہے۔ لیکن ابھی ہم شہناز سے زور زبردستی کرتے تو بات ہرگز نہ بنتی اور بات بنانے کے لیے ہی میں نے اس کی طرف داری کی تھی۔''

''اور وہ لیڈی ڈاکٹر...؟''

''وہ آئے گی۔ شہناز کو ٹریٹمنٹ بھی دیتی رہے گی لیکن کرے گی وہی جو میں اسے کہوں گی۔''

اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''یعنی....؟''

''یعنی شہناز یہی سمجھتی رہے گی کہ میں اس کی مرضی کے مطابق حمل ضائع کرا رہی ہوں جبکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوگا۔ مجھے ہر حال میں علیم شیرازی کا وارث چاہیے اس کے لیے میں اپنی بیٹی کو دھوکا دوں گی۔ دینا ہی پڑے گا کیا کروں؟ مجبوری ہے۔ وہ نادان ہے' سمجھانے سے میں سمجھے گی۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''یو آر گریٹ ممی! کیا تدبیر سوچی ہے۔ واہ...''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''یہ بھی غنیمت ہی ہے کہ وہ ان مجرموں کی وجہ سے چند روز کے لیے ہی سہی سوئیٹ کی چار دیواری میں محدود ہوگئی ہے۔ ورنہ اپنے طور پر کسی بھی لیڈی ڈاکٹر سے کنسلٹ کر سکتی تھی۔''

اس نے سوچنے کے انداز میں سر ہلایا پھر پوچھا۔ ''آپ نے تو دل خوش کر دیا۔ اب بتائیں' سب سے پہلے کہاں جانا ہے؟''

''پہلے تو اس ریسٹورنٹ کی طرف چلو جہاں شہناز نے ان کرائے کے قاتلوں کو پہنچایا تھا اور پولیس نے وہاں سے کسی ایک کو گرفتار کیا تھا۔''

وہ ماں کی ہدایت کے مطابق مطلوبہ ریسٹورنٹ کے سامنے پہنچ گیا۔ وہاں آس پاس کے دکان داروں سے اور دیگر افراد سے باتوں ہی باتوں میں معلوم کیا گیا تو پتا چلا' فائرنگ کرنے والے نامعلوم افراد میں سے کوئی ایک بھی گرفتار نہیں ہوا ہے۔ پولیس خالی ہاتھ وہاں سے واپس گئی تھی اور یہ بات ان کے لیے حوصلہ افزا تھی۔

شاہنواز نے مطمئن ہو کر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''شہناز کو فون پر بتا دیں۔ وہ خوامخواہ ہلکان ہو رہی تھی۔''

زرینہ نے کہا۔ ''ایسی بے وقوفی ہرگز نہ کرنا۔ فی الحال اسے یہی بتانا ہے کہ ایک مجرم پکڑا گیا ہے۔ قانون کی گرفت میں ہے۔ اس طرح وہ ہمارے قابو میں رہے گی۔''

پھر وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اب اسپتال کی طرف چلو۔ میں جلد از جلد اپنی دوست سے تمام معاملات طے کر کے اسے شہناز سے ملوانا چاہتی ہوں تاکہ وہ اس بات سے مطمئن ہو جائے کہ اس کا علاج شروع ہو گیا ہے۔''

وہ بولا۔ ''ایک مصیبت تو یہ ہے کہ خان علی یہاں سے جانے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ شہناز کا معاملہ آگے بڑھے گا تو یہ بات خان علی سے کیسے چھپائی جائے گی؟ وہ تو یہاں آ کر

جیسے ہمارے سروں پر مسلط ہو گیا ہے۔ ذرا یہ بھی سوچیں کہ اسے کیسے ٹالا جا سکتا ہے؟''

''کیا بھول گئے ہو؟ اس سے یہ بات ہو چکی ہے کہ جب ہم تینوں یہاں سے فرینکفرٹ کی طرف جائیں گے تو وہ پاکستان واپس چلا جائے گا۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''ارے ہاں۔ یہ بات میرے دماغ سے نکل گئی تھی۔ ہمیں فرینکفرٹ جانے کا ڈراما پلے کرنا ہے۔''

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ ''تم نے کنٹری سائیڈ میں جو کاٹیج لیا تھا' اب وہ ہمارے کام آئے گا۔''

شاہنواز نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ ''یہ شہناز بعد میں تو کوئی پرابلم نہیں کرے گی؟ کیونکہ وہ بچہ نہیں چاہتی۔ جب اسے معلوم ہوگا کہ علاج کے باوجود وہ بہ دستور حاملہ ہے تو...''

اس نے بات کاٹ کر کہا۔ ''وہ آخر کو میری بیٹی ہے۔ میں رفتہ رفتہ اسے ذہنی طور پر تیار کرتی رہوں گی۔ وہ لیڈی ڈاکٹر بھی اسے سمجھائے گی کہ بعض اوقات علاج کے باوجود ہونی ہو کر رہتی ہے۔ کبھی کبھی قدرتی معاملات سمجھ میں نہیں آتے۔ یوں نہ چاہتے ہوئے بھی سیکڑوں بچے اس دنیا میں جنم لیتے رہتے ہیں۔''

اس نے ذرا توقف سے کہا۔ ''تم اس کی طرف سے بے فکر رہو۔ اس معاملے کو میں سنبھال لوں گی۔ تم صرف وجی پر دھیان دو۔ اب اسے راستے سے ہٹانا بہت ضروری ہو گیا ہے کیونکہ وہ زندہ رہے گا تو علیم شیرازی کو جعلی نکاح نامے کے ذریعے بلیک میل نہیں کیا جا سکے گا۔''

زرینہ بانو اگرچہ نانا جان کی سگی بہن تھی مگر ان کی بدترین دشمن تھی۔ انہیں اپنے سامنے جھکانے کے لیے اس نے بہت سے حربے استعمال کیے تھے۔ اس کا بس ایک ہی خواب تھا کہ کسی بھی طرح نانا جان کو کنگال بنا کر ان کی تمام دولت اور جائیداد پر قبضہ جما لے اور اب وہ اس خواب کی تعبیر کے لیے بیٹی کو استعمال کر رہی تھی۔ اسے ناجائز بچے کی ماں بنانے والی تھی۔

دوسری طرف شہناز اپنوں پر بھروسا کر رہی تھی۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک پیدا کرنے والی ماں اسے کیسے دھوکا دینے والی ہے؟

☆☆☆

میں نے آدھے گھنٹے کے لیے خاموشی اختیار کی تھی۔ گے گورڈن کو سوچنے' سمجھنے اور حالات پر غور کرنے کی مہلت دی تھی۔ اُدھر وہ سوچ سمجھ رہا تھا۔ اِدھر مجھے اس آدھے گھنٹے میں بہت کچھ کرنا تھا۔

پاپا یہ سن کر شدید حیرانی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ میں وکی نہیں' وجی ہوں۔ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کے قریب آ کر کہا۔ ''پاپا! یقین کر لیں' میں واقعی آپ کا وجی ہوں۔''

انہوں نے تڑپ کر مجھے بازوؤں میں بھر لیا۔ چوم کر گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''بیٹے! میں بیان نہیں کر سکتا' ان لمحات میں مجھے کتنی بڑی دولت مل رہی ہے؟ دولت بھی اور طاقت بھی... دشمنوں نے مجھے اُس مقام پر پہنچا دیا تھا جہاں میں اپنی شریکِ حیات اور اپنے ہی بیٹوں کا دشمن دکھائی دیتا تھا۔ سوچتا تھا کہ کیسے اپنی صفائی پیش کروں گا؟ کیسے اپنی بیوی اور بچوں کی نظروں میں محترم ہو سکوں گا؟ خدا کا شکر ہے۔ ہمارا معبود بڑا کارساز ہے۔ اس نے تمہارے دل سے کدورت مٹائی ہے تو جلد ہی تمہاری ماما اور وکی بھی مجھے اپنے دلوں میں جگہ دیں گے۔''

میں نے ایک ذرا صدمے سے انہیں دیکھا پھر کہا۔ ''بے شک! آپ ہمارے پاپا ہیں۔ ہمارے لیے سب سے محترم ہیں۔ میں جانتا ہوں' آپ نے ہماری خاطر بڑی صعوبتیں اٹھائی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ماما بھی آپ سے بدظن نہیں رہیں گی۔ میں ان کی غلط فہمیاں دور کروں گا۔ مگر وکی...''

میں بولتے بولتے ہچکچانے لگا۔ وہ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے ذرا ٹھہر کر کہا۔ ''دراصل پاپا! وکی... اب ہمارے درمیان نہیں رہا ہے۔ وہ اُس حادثے میں اپنی جان گنوا بیٹھا ہے۔''

وہ میری بات سن کر صدمے سے ٹوٹ کر رہ گئے۔ ''او میرے خدا... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ وکی مر چکا ہے؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو...''

ان کی آواز بھیگنے لگی۔ میں نے ان کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ''ایسا ہو چکا ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو اس وقت میرے بجائے وہی آپ کے پاس ہوتا۔''

ہم سچے جذبوں میں ڈوب کر ایک دوسرے کے غم کو بانٹ رہے تھے۔ رخشی ایک طرف بیٹھی ہماری باتیں سن رہی تھی۔ اسے بھی یہ سن کر شدید حیرت ہو رہی تھی کہ وکی مر چکا ہے۔

وہ عورت اب تک اپنے یار کے تعاون سے ہمارے درمیان پہاڑ جیسی رکاوٹیں پیدا کرتی رہی تھی۔ اب دیکھ رہی تھی کہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گئے تھے اور لہو کے رشتے گلے مل رہے تھے۔

میں پاپا کے سینے سے لگا ہوا تھا۔ ان کے کان میں بہت ہی دھیمی سی سرگوشی میں بولا۔ ''ویسے پاپا! ایک گڈ نیوز سنا رہا ہوں۔ مگر آپ ذرا سی بھی خوشی ظاہر نہ کریں۔ میں نہیں چاہتا کہ رخشی کو ذرا سا بھی شبہ ہو۔''

انہوں نے پوچھا۔ ''بات کیا ہے بیٹے!''

میں نے پھر دھیمی سرگوشی میں کہا۔ ''یینم سے میری بات ہو چکی ہے۔ دیکھیں، پلیز! آپ یہ سن کر بالکل خوشی کا اظہار نہ کریں۔ بہت بڑی خوش خبری یہ ہے کہ یینم کا پتا ٹھکانا بھی معلوم ہو گیا ہے۔''

انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ رخشی پر کڑی نظر رکھیں۔ میں واش روم میں جا رہا ہوں۔ ہمیں جلد سے جلد یینم تک پہنچنا ہے۔ یہاں سے نکلنے کے بعد میں آپ کو پوری وضاحت سے بتا سکوں گا۔''

میں ان سے الگ ہو کر وہاں سے چلتا ہوا واش روم میں آ گیا۔ پھر دروازے کو اندر سے بند کر کے فون کے ذریعے اپنے نانا جان سے رابطہ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ان کی آواز سنائی دی۔ میں نے انہیں سلام کرنے کے بعد کہا۔ ''میں وجی بول رہا ہوں۔''

''وجی! نانا کی جان! تم کیسے ہو؟ بڑے دنوں بعد تمہاری آواز سن رہا ہوں۔ تمہاری طرف سے بہت فکر مند رہتا ہوں۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ کی دعائیں میرے ساتھ رہتی ہیں۔ اسی لیے دشمنوں کے درمیان رہنے کے باوجود خیریت سے ہوں۔ جس سلسلے میں یہاں پہنچا ہوا ہوں' اس میں قدرے کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ انشاء اللہ آج رات تک ماما کے پاس پہنچ جاؤں گا۔''

''یہ تم نے مطمئن کرنے والی بات کی ہے۔ میں چاہتا ہوں' اب اپنی ماما سے دور نہ رہو۔''

''آپ رات کو فون کریں۔ ماما آپ کو یقین دلائیں گی کہ میں ان کی آغوش میں پہنچ گیا ہوں۔ فی الحال آپ سے ایک بہت ضروری کام ہے۔''

''کام ہے تو دیر کیوں کر رہے ہو؟ فوراً بولو۔''

''پہلے یہ بتائیں' آپ پاکستان میں ہیں نا؟''

''نہیں بیٹے! میں اچانک ہی ایک ضروری کام سے موریشس آ گیا ہوں۔''

میں نے ذرا مایوس ہو کر کہا۔ ''یا خدا! پھر تو بڑی مشکلات پیش آئیں گی۔''

''کیسی مشکلات.... کھل کر بولو کیا بات ہے؟''

''اسلام آباد میں میری ایک بہن ہے۔ اس [illegible] فراہم کرنا چاہتا ہوں۔''

انہوں نے چونک کر پوچھا۔ ''بہن...؟ تم [illegible] بہن اسلام آباد میں کہاں سے پیدا ہو گئی؟ کیا تم کسی [illegible] بن گئے ہو؟''

''آپ پہلے میری بات سنیں۔ میری بہن کا نا[illegible] ہے۔ وہ خطرات میں گھری ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں' آپ [illegible] آدمی اسے وہاں سے نکال کر کسی محفوظ پناہ گاہ میں پہنچا دیں۔''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اسے کسی پناہ گاہ میں [illegible] دیا جائے گا۔''

''پہنچا دیا جائے گا نہیں... آپ ابھی فون بند کر [illegible] پہلے یینم کو محفوظ جگہ پر پہنچائیں۔ پھر مجھ سے بات کریں۔ [illegible] بے چینی سے آپ کی کال کا انتظار کرتا رہوں گا۔ کاغذ [illegible] اٹھائیں۔ میں یینم کا پتا بتا رہا ہوں۔''

انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میرا بیٹا ایک بہن کے لیے پاگل ہو رہا ہے جبکہ میں بہو لانے کے متعلق سوچ [illegible] ہوں۔ ہاں۔ تو کیا ہے اس کا پتا؟ لکھواؤ...''

میں نے پتا لکھوا کر پوچھا۔ ''آپ کتنی دیر میں [illegible] کرائیں گے؟ میرا مطلب ہے' کتنی جلدی یینم کسی محفوظ پناہ گاہ میں پہنچ جائے گی؟''

''تم تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو۔ میں دس یا [illegible] منٹ بعد وہاں کی صورتِ حال بتاؤں گا۔ ذرا صبر کرو۔ کا[illegible] جائے گا۔''

انہوں نے فون بند کر دیا۔ میں نے واش روم سے نکل کر کمرے میں آ کر دیکھا۔ رخشی پاپا کے نشانے پر بیٹھی [illegible] تھی۔ اس نے کہا۔ ''وجی! اپنے پاپا سے کہو' یہ ریوالور میرے سامنے سے ہٹا لیں۔ میں یہاں سے بھاگ کر کہیں جا [illegible] سکتی۔ اتنی بے بس ہوں کہ تم لوگوں کی مرضی کے [illegible] دروازے تک بھی نہیں پہنچ سکتی۔ مجھے ڈر ہے' دھوکے سے گو[illegible] چل جائے گی۔ خدا کے لیے اسے ہٹا لو۔''

میں نے کہا۔ ''بقول تمہارے... تمہارا بیٹا مجاہد بن کر اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہے۔ بڑے بڑے اور خطرناک دشمنوں کو للکارتا رہتا ہے۔ تم اس مجاہد کی ماں ہو۔ ہتھیاروں [illegible] رخ اپنی طرف دیکھ کر تمہیں ڈرنا نہیں چاہیے۔''

وہ چپ چاپ مجھے گھورنے لگی۔ گے گورڈن اپنی [illegible] بچانے کے لیے اس کی سلامتی کے لیے مسلح گارڈز کے ساتھ باہر کھڑا ہوا تھا۔ وہ کسی حد تک مطمئن تھی کہ ہمارے ہاتھوں نہیں مرے گی۔ وہاں سے صحیح سلامت نکل جائے گی۔

باہر بگ باس کی آواز سنائی دی۔ ''وجی! میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ ہمارے درمیان دوستانہ سمجھوتا ہو گا۔ میں تمہیں یینم کا پتا بتاؤں گا۔ تم ہر طرح سے یہ اطمینان کر سکو گے کہ وہ تمہاری [illegible] ہے۔ پھر تم اسے کسی بھی محفوظ پناہ گاہ میں [illegible] رخشی کو میرے حوالے کر کے یہاں سے جا سکو گے۔''

پاپا نے مجھے دیکھا۔ ہم ایک دوسرے سے بہت کچھ کہہ دینا چاہتے تھے۔

انہوں نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ''گورڈن! میرے بیٹے نے کہا ہے' آدھے گھنٹے تک خاموش رہے گی۔ لہٰذا خاموش رہو۔ ابھی ہم آپس میں مشورہ کر رہے ہیں۔''

بگ باس فکر مند ہو کر بند دروازے کو دیکھنے لگا۔ فکر یہ تھی کہ رخشی اس سے لانچ میں ملنے آئی تھی۔ یہ بات سلطان ظفر جانتا تھا۔ اب اس کی ماں صحیح سلامت واپس نہیں جائے گی تو یقیناً وہ اپنے ناجائز باپ سے بدظن ہو جائے گا۔ بیٹا ہونے کے باوجود دشمن بن جائے گا۔

اس نے فون کے ذریعے سلطان ظفر کو مخاطب کیا۔ اس نے پوچھا۔ ''ہیلو ڈیڈ! کیسے ہیں؟ مام کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا تھا' آج لانچ میں قربان واسطی سے ملاقات ہونے والی ہے؟''

''ہاں بیٹے! واسطی یہاں آیا ہے مگر یہ ملاقات مہنگی پڑ رہی ہے۔''

''مہنگی کیوں پڑ رہی ہے... خیریت تو ہے؟''

''بات یہ ہے کہ اب تک ہم وکی کے سلسلے میں دھوکا کھاتے رہے ہیں۔ یہ سمجھ نہیں پائے کہ وجی اپنے بھائی کے بھیس میں ہمارے درمیان پہنچا ہوا ہے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ اگر وہ وجی ہے تو آپ اسے پہچان کیوں نہیں پائے؟''

''اس نے بڑی چالاکی دکھائی ہے۔ ایک ذرا شبہ بھی نہیں ہونے دیا۔ وکی کی جگہ لے کر میرا اعتماد حاصل کرتا رہا۔ ابھی یہ بھید کھلا ہے۔ وہ مجھے اور تمہاری مام کو گن پوائنٹ پر رکھ کر یینم تک پہنچنا چاہتا ہے۔''

اس نے حیرانی و پریشانی سے پوچھا۔ ''کیا آپ دونوں گن پوائنٹ پر ہیں؟''

''نہیں۔ میں چور راستے سے نکل آیا ہوں۔ تمہاری مام ایک کیبن میں اس کے نشانے پر ہے۔''

اس نے غصے سے کہا۔ ''یہ کیا خود غرضی ہے؟ آپ میری مام کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ آئے ہیں۔ قربان واسطی کہاں ہے؟''

''وہ دونوں باپ بیٹا ہم پر حاوی ہونا چاہتے ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں تمہاری ماں کو ان کے نرغے سے نکالنے کے لیے ہی وہاں سے نکلا ہوں۔ میری کوئی تدبیر کام نہیں آئے گی تو یینم کو ان کے حوالے کر کے اپنا کام نکالوں گا۔''

''ابھی سچویشن کیا ہے؟''

''وہ باپ بیٹا تمہاری ماں کے ساتھ کیبن میں ہیں۔ دروازہ اندر سے بند ہے۔ ہم فائر کریں گے' دروازہ توڑ کر اندر جانا چاہیں گے تو وہ تمہاری مام کو نقصان پہنچائیں گے۔ آخری حربہ یہی ہو گا کہ ان سے سمجھوتا کیا جائے۔''

''کچھ بھی کریں' میری مام کو جلد از جلد وہاں سے نکالیں۔''

''تم تو جانتے ہو' وجی کا تعلق اسکاٹ لینڈ یارڈ سے ہے۔ اس نے رخشی کو میڈم روزی کی حیثیت سے پہچان لیا ہے۔ اس کی ایک کال پر پولیس فورس ہماری لانچ کو گھیرے میں لے سکتی ہے۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سراغ رساں اقبالِ جرم کرانا خوب جانتے ہیں۔ تمہاری مام کو ان کی حراست میں نہیں جانا چاہیے۔''

''اگرچہ یہ معاملہ بہت ہی تشویش ناک ہے مگر کسی کی مجال نہیں ہے کہ کوئی میری مام کو حراست میں لے۔ میری بھی ایک فون کال پر اسکاٹ لینڈ یارڈ میں زلزلہ آ سکتا ہے۔''

وہ ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے بول رہا تھا اور کیبن کے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''اگر ایسا ہے تو فوراً کچھ کرو۔ ابھی ہماری لانچ سمندر میں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اسکاٹ لینڈ یارڈ کی پولیس یا سراغ رساں ہیلی کاپٹر ہمیں سمندر میں گھیر لیں۔''

''ایسا نہیں ہو گا۔ میں تھوڑی دیر بعد فون کروں گا۔''

سلطان ظفر رابطہ ختم کر کے سوچنے لگا۔ ان لمحات میں شراب سے بھری ہوئی شیشے کی صراحی اور کانچ کا نازک سا جام سرہانے کی میز پر رکھا ہوا تھا اور اس کانچ سے بھی زیادہ نازک ایک حسینہ اس کی گود میں تھی۔ اس نے فون ظفر کے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھا۔ پھر وہاں سے بھرا ہوا جام اٹھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا کر عبرانی زبان میں کہا۔ ''عیش و عشرت کے لمحات میں نو ٹینشن... اور ہمارے درمیان نو تھرڈ پرسن۔''

سلطان ظفر کو عبرانی زبان سکھانے کے لیے ایک یہودی حسینہ کی خدمات پیش کی گئی تھیں۔ اس عیش کدے کے باہر رنگ محل کے دوسرے حصوں میں اس کے اور کئی خدمت گار موجود رہتے تھے۔ ان میں ایسے پلان میکر اور فوج کے تجربہ کار ریٹائرڈ افسران تھے جو اسے عسکری تربیت دیتے

تھے۔ اسلامی ممالک میں دہشت گردی کا سلسلہ جاری رکھنے کے منصوبے پیش کرتے رہتے تھے۔

اسے طریقہ کار بتاتے تھے کہ وہ کس طرح ایسے دو غلے مجاہدین کی تعداد بڑھا سکتا ہے جو انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی شر پسندی اور تخریب کاری کو جہاد کا نام دیتے رہیں۔ اپنے ہی ممالک میں اپنے ہی مسلم بھائیوں کو خاک و خون میں ملاتے رہیں۔

وہ بہت کچھ سیکھ رہا تھا۔ ناخواندہ اور کُند ذہن لوگوں کو غلط مقاصد کے لیے جہاد کا درس دیتا رہتا تھا اور ان کے گلے میں جنت کی پرچی پہنا کر انہیں خودکش حملوں کے لیے تیار کرتا رہتا تھا۔

دنیا کی سب سے خطرناک تنظیم بلڈر برج نے اسے اپنا اہم اور کلیدی رُکن بنا لیا تھا۔ اس کے لیے خزانے کا منہ کھول دیا تھا۔ وہ کسی بھی مطلوبہ ملک میں پہنچ کر خودکشی پر مائل ہونے والوں اور حرام موت مرنے والوں کو منہ مانگی قیمت پر خرید لیتا تھا۔

وہ ایسا کامیاب مہرہ تھا کہ بلڈر برج کے اعلیٰ عہدے دار اسے سر آنکھوں پر بٹھائے رکھتے تھے۔ اس کی ایک فرمائش پر ورلڈ بینک کاؤنٹر سے نوٹوں کی گڈیاں نکل آتی تھیں۔ اسلحہ مافیا تنظیمیں اس کے آگے جدید ہتھیاروں کا انبار لگا دیتی تھیں۔ وہ جب بھی کہیں دہشت گردی یا تخریب کاری کا مرتکب ہوتا' معروف اور اہم ہستیوں کو قتل کراتا تو عالمی عدالتیں اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتی تھیں۔

بے شک! اس نے بڑی قوتیں' بڑے اختیارات اور وسیع ذرائع حاصل کیے تھے۔ وہ اپنی مرضی سے جو چاہتا تھا' وہ کرتا تھا۔ کوئی اسے روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ کسی بھی ادارے' تنظیم یا حکومت سے جو کہتا تھا' وہ ہو جایا کرتا تھا۔

اس نے ہونٹوں تک آنے والے اس شراب کے جام کو ہٹاتے ہوئے حسینہ سے کہا۔ ''باہر جاؤ...''

وہ حیرانی سے بولی۔ ''کیا واقعی...؟ میں باہر جاؤں؟ ابھی تو تم میری قربت سے دیوانے ہو رہے تھے۔ اب اچانک دور جانے کو کہہ رہے ہو؟''

وہ بڑی بے حسی سے بولا۔ ''نو آرگومنٹس... جاؤ یہاں سے...''

اس کی بے حسی نے سمجھا دیا کہ اس کا جادو سر چڑھ کر نہیں بولے گا۔ وہ چپ چاپ اتر کر چلی گئی۔ اس نے میز پر سے فون اٹھا کر نمبر پنچ کیے۔ وہ شیطان صفت تھا۔ شیطانی تنظیم کے لیے کام کرتا تھا۔ اس کے باوجود اس وقت شراب اور شباب کو چھوڑ کر ماں کے لیے پریشان ہو گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ شیطانوں کا کوئی باپ نہیں ہوتا... ایک پیدا کرنے والی ماں ہوتی ہے۔ وہ ماں کو ہی پوجتے... اور کہتے ہیں کہ یہ نہ ہوتی تو ہم نہ ہوتے اور ہم نہ ہوتے... بڑی دنیا میں صرف دینِ ایمان ہی ہوتا۔ سارا عالم... بے کیف ہوتا۔ یہ مستیاں اور یہ دما دم شیطانیاں... ماؤں کے دم سے ہی جاری رہتی ہیں۔

وہ اپنی ماں کی سلامتی کے لیے فون کر رہا تھا۔ رابطہ ہوتے ہی بلڈر برج کے ایک اعلیٰ عہدے دار کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو ظفر! بولو کیا بات ہے؟''

اس نے کہا۔ ''میری ماں مصیبت میں ہے۔ اس کے سر پر موت منڈلا رہی ہے۔ میں فوراً اس کی سلامتی چاہتا ہوں۔''

اس نے رخشی کے حالات بتائے۔ اعلیٰ عہدے دار نے تمام روداد سننے کے بعد کہا۔ ''یہ کوئی پرابلم نہیں ہے۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کی پولیس فورس وہاں جائے گی۔ رخشی اور گے گورڈن کو گرفتار کرے گی۔ جونیئر آفیسر وجاہت علی کو مطمئن کرنے کے بعد انہیں رہا کر دیا جائے گا۔''

''میں چاہتا ہوں' میری مدر کو میڈم روزی نہ سمجھا جائے۔ اسے کوئی پولیس والا ہاتھ نہ لگائے۔''

''وہ تمہاری ماں کے ساتھ عزت سے پیش آئیں گے اور بولو...؟''

''وجاہت علی نے میری ماں کو گن پوائنٹ پر رکھا ہے۔ اس کی توہین کی ہے۔ وہ آئندہ بھی دشمنی سے باز نہیں آئے گا۔ میں اس کی موت چاہتا ہوں۔''

''تم تو خود ہی موت کے ہرکارے ہو۔ جسے چاہتے ہو فنا کر دیتے ہو۔ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ جو چاہتے ہو کر گزرو۔ کوئی تمہیں روکنے والا نہیں ہے۔ ہم ابھی تمہاری ماں کو وہاں سے نکال لائیں گے۔''

ابھی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ رخشی کو فوراً ہی ہماری گرفت سے نکال لیا جاتا۔ میں اور پاپا بھی وہاں سے بہ خیریت نکلنا چاہتے تھے۔ پہلے یہ طے ہونا تھا کہ لانچ میں ہمارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔ ہمیں وہاں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ تب ہی ہم رخشی کو گے گورڈن کے حوالے کر سکتے تھے۔

سلطان ظفر نے گورڈن سے رابطہ کر کے کہا۔ ''ڈیڈ! مام کو ابھی رہائی مل جائے گی۔ مگر ان باپ بیٹے کو وہاں سے زندہ سلامت نہیں جانا چاہیے۔''

''یہ بتاؤ' رخشی ان کے شکنجے سے کیسے نکلے گی؟ اس سچویشن سمجھ کر ہی ان دونوں کو جہنم میں پہنچایا جائے گا۔''

اس نے کہا۔ ''ابھی اسکاٹ لینڈ یارڈ کی پولیس وہاں آئے گی۔ دکھاوے کی کارروائی کے لیے مام کو وجی کی گرفت سے نکال کر لے جائے گی۔ بعد میں انہیں رہا کر دیا جائے گا۔''

''پھر تو میں پولیس کی موجودگی میں ان باپ بیٹے کے خلاف انتقامی کارروائی نہیں کر سکوں گا۔ وجی ان کا افسر ہے۔ وہ بڑی آسانی سے باپ کے ساتھ چلا جائے گا۔''

''مام سے میری بات کرائیں۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا جا رہا ہے؟''

''کیا رخشی کے فون سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے؟''

''نہیں۔ وجی نے فون کو آف کر دیا ہوگا۔''

بگ باس نے کیبن کے دروازے کے پاس آ کر کہا۔ ''وجی! سلطان ظفر اپنی ماں سے بات کرنا چاہتا ہے۔ بیٹے کو ماں سے باتیں کرنے دو۔''

میں نے بند رہنے والے فون کو آن کر کے اسے رخشی کے حوالے کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ''سلطان سے کہو' وہ ماں کے فون پر رابطہ کر سکتا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد ہی کالنگ ٹون سنائی دی۔ رخشی نے بڑی بے تابی سے بٹن دبا کر اسے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو میرے بیٹے! میری جان! تمہیں معلوم ہو چکا ہوگا کہ میں کس حال میں ہوں؟''

وہ بولا۔ ''مجھے معلوم ہے۔ پریشان نہ ہوں۔ میں سارے انتظامات کر چکا ہوں۔ آپ کو ابھی رہائی مل جائے گی۔ یہ بتائیں' ان باپ بیٹے نے آپ کے ساتھ بدتمیزی تو نہیں کی ہے؟''

''نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔''

''مام! تم ان کی قید میں ہو۔ کھل کر بولنا نہیں چاہتیں۔ وہ دشمن ہیں' انہوں نے ضرور سخت باتیں کی ہوں گی؟ تمہیں طعنے دیے ہوں گے؟ ہاں یا نہ میں جواب دو۔''

رخشی نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھا پھر کہا۔ ''ہاں...''

وہ غصے سے بولا۔ ''میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ان کی موت کو دوسروں کے لیے عبرت ناک بنا دوں گا۔''

''بیٹے! میں بہت پریشان ہوں۔ فی الحال ان سے کسی طرح بھی سمجھوتا کرو۔ جتنی جلدی ہو سکے' مجھے یہاں سے نکالو۔''

''ابھی اسکاٹ لینڈ یارڈ کی پولیس وہاں آئے گی اور آپ کو ان سے نجات دلائے گی۔''

''تم جانتے ہو' وجی اس ادارے کا ایک افسر ہے۔ میرے خلاف قانونی کارروائی کرے گا تو...''

وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''اس کا باپ بھی آپ کے خلاف کچھ نہیں کر سکے گا۔ میں تمام معاملات طے کر چکا ہوں۔ آپ پر میڈم روزی ہونے کا الزام نہیں لگایا جائے گا۔ ذرا انتظار کریں۔ دیکھیں تو سہی' آپ کا بیٹا کس طرح ان دشمنوں سے آپ کو بچا رہا ہے اور انہیں منہ کے بل گرا رہا ہے؟''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''مجھے تم پر فخر ہے۔ تم پہاڑ جیسے دشمنوں سے ٹکرانے کی طاقت رکھتے ہو۔''

پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''دشمن منہ کی کھائیں گے۔ میں اپنے بیٹے کو گلے لگانے ضرور یہاں سے نکلوں گی۔''

''ذرا وجی سے میری بات کرائیں۔''

رخشی نے فون میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میرے بیٹے سے بات کرو۔''

میں نے اسے لے کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں... بولو؟''

وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا تھا۔ اس نے فوراً ہی اپنا مزاج اور رویہ بدلتے ہوئے بڑے ہی میٹھے انداز میں اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھی۔ پھر کلام پاک کی ایک مختصر سی آیت سنانے کے بعد کہا۔ ''اللہ ہم سب کو سیدھی راہوں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ مومن وہ ہے جس کے ہاتھوں سے کسی مسلمان کو تکلیف نہیں پہنچتی۔ وہ امن و امان اور سلامتی کی راہوں پر چلتا ہے اور دوسروں کو بھی چلاتا ہے۔ کیا تم میری ایمان افروز باتیں سن رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''فون بولنے اور سننے کے لیے ہوتا ہے۔ تم بول رہے ہو، میں سن رہا ہوں۔ انتظار کر رہا ہوں کہ اصل بات کیا کہنے والے ہو۔''

''یہی کہ مومن بنو۔ میری ماں کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔''

''اے میرے پیارے مومن! اپنی نصیحت پر پہلے خود عمل کرو۔ میری بہن کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔ ایک بیٹی کو بچپن سے جدا کر دیا ہے۔ کبھی اسے باپ سے ملنے نہیں دیا۔ اپنی ماں کی تکلیف کو سمجھنے والے! ایک باپ اور بیٹی کی طویل جدائی کے صدمات کا حساب کرو اور اس بیٹی کو فوراً یہاں پہنچا دو۔''

''بینم کو حالات نے باپ سے جدا کیا ہے۔ ہم نے کوئی ظلم نہیں کیا۔ اس کی ماں مر چکی تھی۔ اس کا باپ یعنی تمہارا بھی باپ در بدر بھٹک رہا تھا۔ بیٹی کی پرورش باپ نہیں کرتا، ماں کرتی ہے۔ ماں نہیں تھی' اس لیے میری ماں اس کی پرورش کر رہی ہے۔''

''میرے پاپا کے پاس دولت' جائیداد اور محفوظ رہائش گاہیں ہیں۔ آج کے بعد ہم ایک ہی چھت کے نیچے رہیں گے۔ یہ نیم میری ماما کی سرپرستی میں رہا کرے گی۔''

''ہم یہ نیم کو سوتیلی ماں کے سائے میں نہیں رہنے دیں گے۔ پھر یہ کہ وہ میری منگیتر ہے۔ اس کے مستقبل کا فیصلہ میں کر چکا ہوں۔''

''میری بہن کے مستقبل کا فیصلہ صرف پاپا کریں گے۔ تم ہماری مرضی کے بغیر اسے اپنی منگیتر بناؤ گے تو یہ سراسر شر پسندی ہوگی۔ معلم بن کر نصیحت کرنے والے! اپنی شر پسندی اور خود غرضی کو بھی سمجھو۔''

''ہم تم سے زیادہ سمجھ رہے ہیں۔ یہ نیم بچپن سے ہمارے پاس رہی ہے۔ ساری عمر ہمارے پاس رہے گی۔ وہ شادی کے بعد تم سب سے مل سکے گی۔''

''تو پھر جاؤ، شادی کرو۔ اس کے بعد ہی تمہاری ماں تمہیں مل سکے گی۔''

اس کا مزاج اور رویہ اچانک ہی بدل گیا۔ وہ بڑی حقارت سے بولا۔ ''تم میرے سامنے مٹی کے کیڑے ہو۔ میں تمہیں اپنے جوتوں تلے مسلتا ہوا اپنی مام کو وہاں سے لے آؤں گا۔''

''تو پھر آؤ... میں انتظار کر رہا ہوں۔''

''میں اتنے وسیع ذرائع اور اختیارات رکھتا ہوں کہ وہاں نہیں آؤں گا اور مام میرے پاس پہنچ جائیں گی۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے' میں ابھی کیا کر رہا ہوں؟''

''اچھی بات ہے۔ میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ تم کیا کر رہے ہو؟ ایک عقل کی بات سمجھاتا ہوں' میرے متعلق بھی سوچو کہ میں کیا کر سکتا ہوں؟''

میں نے فون بند کر کے اسے آف کر دیا۔ یہ سوچنے لگا کہ وہ رخشی کو وہاں سے لے جانے کے لیے کیا کر سکتا ہے اور ابھی کیا کر رہا ہوگا؟ یہ بات سمجھنے کی تھی کہ وہ میرے نانا علیم شیرازی سے سخت نفرت کرتا ہوگا کیونکہ انہوں نے اسے جائز بیٹا تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس کی ماں کو بدکار کہہ کر طلاق دی تھی۔

عقل سمجھا رہی تھی کہ میں نے اس کی ماں کو رہا نہ کیا تو یقیناً وہ میرے نانا پر کوئی مصیبت لے آئے گا۔ ہمارے لیے کوئی نیا تکلیف دہ مسئلہ پیدا کر دے گا۔ میں ابھی نانا جان کو اس کی طرف سے محتاط رہنے کی ہدایت کر سکتا تھا۔

میں نے رخشی کو دیکھا۔ پھر وہاں سے واش روم میں آ کر نانا جان سے رابطہ کیا۔ انہوں نے کہا۔ ''ہاں بیٹے! ابھی میں تم سے رابطہ کرنے والا تھا۔ میں جس کام سے موریشس آیا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ اب واپس پاکستان جا رہا ہوں۔ دو بعد میری فلائٹ ہے۔ میں وہاں پہنچتے ہی تمہاری موجودہ رہائش گاہ سے نکال کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

''آپ وہاں دس بارہ گھنٹوں سے پہلے نہیں پہنچ گے اور میں دشمنوں سے یہ بازی ابھی جیتنا چاہتا ہوں۔ ابھی ان کی لاعلمی میں وہاں سے رہائی دلانا چاہتا ہوں۔''

''اچھا... تو اس کا نام یہ نیم ہے؟ آخر وہ کون ہے؟ معاملہ کیا ہے؟''

''وہ لہو کے رشتے سے میری بہن ہے۔ آپ نہیں جانتے' میرے پاپا نے ایک اور شادی کی تھی۔ میری اس نے یہ نیم کو جنم دیا تھا۔''

انہوں نے ناگواری سے پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ اس کا مطلب ہے' میرے داماد نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میری بیٹی دماغی مریضہ بن گئی اور وہ دوسری شادی کر کے عیش و عشرت میں زندگی گزارتا رہا؟''

''ایسی بات نہیں ہے نانا جان! پاپا نے بڑی مجبوری کی حالت میں وہ شادی کی تھی۔''

''تعجب ہے جو باپ آج تک تم سے دور رہا اور تمہارا دشمن بنا ہوا ہے، تم اس کی حمایت میں بول رہے ہو؟''

''ہم پاپا کو اب تک غلط سمجھ رہے تھے۔ وہ ہماری خاطر پچھلے بیس برسوں سے دشمنوں کے مظالم سہتے رہے اور ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ اللہ نے چاہا تو آج کے بعد پاپا ان کے مقابلے میں تنہا نہیں رہیں گے۔ ہم سب ان کا ساتھ دیں گے۔''

انہوں نے پوچھا۔ ''یہ نیم کا کیا مسئلہ ہے؟''

''رخشی اور اس کے عاشق بگ باس نے یہ نیم کو پاپا سے چھین لیا ہے۔ وہ بیٹی کی خاطر کمزور بن کر ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہتے آئے ہیں۔ آپ جلد سے جلد یہ نیم کو وہاں سے نکالیں گے تو پاپا کی کمزوری دشمنوں کے ہاتھوں سے نکل جائے گی۔''

''ہوں... تو یہ معاملات ہیں۔ وہ لڑکی رخشی اور بگ باس کی قید میں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''اور رخشی اس وقت میری قید میں ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے ہاتھوں سے نکل جائے، آپ یہ نیم کو وہاں سے نکال لیں۔''

''تم رخشی کو کہاں سے پکڑ لائے ہو؟ اسے کہاں قیدی بنا کر رکھا ہے؟ مجھے فوراً بتاؤ۔ ورنہ بگ باس اور اس کے حواری تمہارے لیے عذاب بن جائیں گے۔''

''آپ میری نہیں، بینم کی فکر کریں۔ میں ابھی کن حالات سے گزر رہا ہوں، یہ آپ کو بعد میں بتا سکتا ہوں۔ خدا کے لیے میری بہن کے معاملے میں ایک ذرا سی دیر نہ کریں۔''

''اچھا۔ فون بند کرو۔ میں اسے وہاں سے نکالنے کے لیے کچھ کرتا ہوں۔''

میں نے فون بند کر دیا۔ اگرچہ سلطان ظفر جرائم کی دنیا میں سمندر پار دور تک پاؤں پھیلا رہا تھا تاہم میرے نانا بھی انڈر ورلڈ والوں سے گہرے تعلقات رکھتے تھے۔ پاکستانی سیاست میں بھی بڑی دور تک ان کا عمل دخل تھا۔ وہ کم از کم پاکستان کی حدود میں اچھے خاصے اختیارات اور ذرائع کے مالک تھے۔ مجھے امید تھی کہ وہ ایک آدھ گھنٹے میں بینم کو کسی محفوظ پناہ گاہ تک پہنچا دیں گے۔

اِدھر میں اور پاپا... اُدھر رخشی اور گے گورڈن بڑی بے تابی سے منتظر تھے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے؟ ایسے ہی وقت حالات نے ایک نئی کروٹ بدلی۔ گے گورڈن جو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا، وہ اس کے آگے آ رہا تھا۔ کبھی کبھی بدترین حالات کے جوتے ایسے پڑتے ہیں کہ کھوپڑی گھوم کر رہ جاتی ہے۔

ہم جس کیبن میں تھے، وہ اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ فون کی کالنگ ٹون نے اسے متوجہ کیا۔ اس نے نمبر پڑھے۔ اس کے خفیہ اڈے اور رہائش گاہ کا سیکیورٹی افسر کال کر رہا تھا۔

اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ ''ہیلو! کیا بات ہے؟''

سیکیورٹی افسر نے کہا۔ ''سر! بہت بُری خبر سنا رہا ہوں۔ آپ کی رہائش گاہ میں ڈکیتی ہوئی ہے۔ بنگلے کا منتظم اعلیٰ جان ریڈی بُری طرح زخمی ہوا ہے۔ اس کے بچنے کی امید نہیں ہے۔ ہم اسے ہوش میں لانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ آپ کا آئرن سیف کھلا ہوا ہے اور بالکل خالی پڑا ہے۔''

بگ باس اچھل کر کھڑا ہو گیا اور تقریباً چیخ کر بولا۔ ''یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟ کیا تم اپنے گارڈز کے ساتھ وہاں ڈیوٹی پر نہیں تھے؟''

''آپ جانتے ہیں، ہم ڈیوٹی بدل بدل کر دن رات یہاں موجود رہتے ہیں۔''

''پھر تمہاری موجودگی میں وہاں کون آیا تھا؟''

''وکی آیا تھا۔''

بگ باس نے چونک کر کیبن کی طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر پہلے تک میں ہی اس کے لیے وکی تھا۔ پھر میں نے خود کو وجی کی حیثیت سے ظاہر کیا تھا۔ تب سے وہ سمجھ رہا تھا کہ وکی واقعی مر چکا ہے۔ مگر اب پھر اس کی زندگی کے آ... تھے۔ سیکیورٹی افسر اور دوسرے تمام گارڈز گواہ تھے کہ ایک مُردہ زندہ ہو کر بہت لمبا ہاتھ مارنے اور بگ باس کے پیروں تلے سے زمین سرکانے...

اس نے سیکیورٹی افسر سے پوچھا۔ ''... پورے ہوش و حواس میں رہ کر وکی کو اپنی آنکھوں سے...''

''سر! ہم پورے ہوش و حواس میں تھے... تھے۔ وکی یہاں آتا جاتا رہتا ہے۔ ہم اسے کبھی نہیں... البتہ آپ کا یہ منتظم اعلیٰ جان ریڈی اسے رہائش گاہ ... آنے سے روکتا ہے۔ آج اس نے بھی نہیں روکا تو ہم سمجھا، آپ نے فون کے ذریعے اسے حکم دیا ہے۔ ... وکی کو اندر جانے کی اجازت دی گئی ہے۔''

بگ باس کا سر چکرانے لگا۔ اس آئرن سیف... کے ایسے اہم راز تھے جن کے طشت ازبام ہوتے ہی ... تباہ ہو جاتا۔ انڈر ورلڈ والے اس کے خون کے پیاسے ہو جاتے اور کتنے ہی ملکوں کے انٹیلی جنس والے اسے ... ہی گولی مار دیتے۔

فون پر اتنا کچھ سننے کے بعد یقین نہیں آ رہا تھا کہ ... مُردہ زندہ ہو گیا ہے اور زندہ ہو کر اس کی موت کا سامان ... ہے۔ وہ سوچ رہا تھا اور اس کی آدھی جان نکلی جا رہی ... وہاں سے فوراً ہی اپنی رہائش گاہ میں جا کر اپنی آنکھوں سے ... نہیں سکتا تھا کہ واقعی ایسی جان لیوا واردات ہو چکی ہے ... لانچ میں اس کی بوڑھی محبوبہ قیدی بنی ... اسے بے یار و مددگار چھوڑ کر... جاتا تو سلطان ظفر ... بدظن ہو جاتا۔ یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ اچانک ہی کمزور ... کھوکھلا ہو گیا تھا۔ سلطان ظفر کی ناراضی اور عداوت لینے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔

فون پر سیکیورٹی افسر کی آواز سنائی دی۔ ''سر ... ریڈی کو ہوش آ گیا ہے۔ بہت کمزور ہے۔ پھر بھی آپ ... کچھ بول سکتا ہے۔ میں فون اس کے کان سے لگا رہا ہوں...''

پھر سیکیورٹی افسر نے فون کو اس کے کان سے ... کہا۔ ''بگ باس تمہاری آواز سن رہے ہیں۔ بولو... یہ کون آیا تھا؟''

جان ریڈی کی کمزور اور لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''اسکاٹ لینڈ یارڈ کا ایک افسر وجاہت علی آیا تھا۔''

وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا اور ٹھہر ٹھہر کر ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''میں اسے وکی سمجھتا رہا ... جاتے وقت اپنا نام بتایا تھا کہ وہ وکی نہیں، وجاہت علی عرف وجی ہے۔''

بگ باس اس کی باتیں سن رہا تھا اور کیبن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سمجھنا چاہتا تھا کہ وہاں واردات کرنے وجی گیا تھا تو یہاں کیبن میں وکی ہے یا وجی ہی ہے؟

وہ ناگواری سے اور غصے سے سوچنے لگا۔ یقیناً مکار وجی نے وکی کے نام سے مجھے لوٹ لیا ہے۔ بالکل ہی بے دست و پا کر دیا ہے۔ وہ شیطان مرا نہیں زندہ ہے۔

پھر اس نے جان ریڈی سے پوچھا۔ ''تم نے میری اجازت کے بغیر وکی یا وجی کو اندر کیوں آنے دیا؟''

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آپ کا حکم ہے کہ جب آپ لانچ میں مصروف ہوں تو فون کے ذریعے بھی آپ کو ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ وکی نے یہاں آ کر کہا تھا کہ آپ ایک فائل سیف میں بھول گئے ہیں اور اسے وہ فائل لانے کے لیے بھیجا ہے۔ پھر تو مجھے یقین کرنا ہی پڑا۔''

جان ریڈی بولتے بولتے نڈھال سا ہو گیا تھا۔ اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ سیکیورٹی افسر نے کہا۔ ''سر! اس کی حالت پھر خراب ہو رہی ہے۔ یہ ابھی بول نہیں پائے گا۔''

باس نے پوچھا۔ ''کیا واقعی میرا سیف بالکل خالی ہو گیا ہے؟ کوئی ایک آدھ فائل وہاں نظر آ رہی ہے؟''

''نو سر! جسے ہم وکی کہہ رہے تھے، وہ واپسی میں ایک بھرا ہوا بیگ لے گیا تھا۔ ہم تو یہی سمجھتے رہے کہ وہ حکم کا بندہ ہے۔ آپ کی اجازت سے وہ بیگ لے جا رہا ہے۔''

اتنے سوالات اور جوابات کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ وہ بُری طرح لٹ چکا ہے۔ اب اسے جلد از جلد اس لانچ سے نکل کر کہیں روپوش رہنا ہوگا۔ یہ سوچنا ہوگا کہ اس کی کمزوریاں اور اس کے اہم راز چرانے کے بعد وکی یا وجی اس کے خلاف کیا کرنے والا ہے؟

وہ پاؤں پٹختا ہوا ادھر سے اُدھر جانے لگا۔ لانچ چھوڑ کر بھاگنا لازمی ہو گیا تھا مگر رخشی کو چھوڑ کر کہیں جا کر چھپ جاتا تو اس کا اپنا ہی بیٹا سلطان ظفر زمین کھود کر اسے باہر نکال لاتا۔

اس نے فون پر بیٹے کو مخاطب کیا۔ وہ بولا۔ ''یس ڈیڈ! مام بخیریت ہیں۔ یہاں اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں سے معاملات طے ہو رہے ہیں۔ جلد ہی ان باپ بیٹے سے نجات مل جائے گی۔''

اس نے کہا۔ ''بیٹے! میں ایک نئی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ وکی مرا نہیں زندہ ہے۔''

''اسے جہنم میں جانے دیں۔ اگر وہ زندہ ہے تو آپ کیوں مصیبت میں پھنسیں گے؟''

''بیٹے! اس نے مجھے لوٹ لیا ہے۔ میرے بنگلے میں پہنچ کر تمام گارڈز کو بے وقوف بنا کر میرا سیف خالی کر چکا ہے۔ وہاں سے ایسے اہم راز چرا کر لے گیا ہے جن کے ذریعے وہ مجھے ساری زندگی بلیک میل کرتا رہے گا... یا پھر مجھے ختم کر دینے کے لیے وہ تمام راز میرے دشمنوں تک یا قانون کے محافظوں تک پہنچا دے گا۔''

وہ بے زار ہو کر بولا۔ ''ابھی ایک مسئلہ حل نہیں ہوا تھا کہ یہ دوسرا پہاڑ کھڑا ہو گیا۔ قربان واسطی اور اس کے دونوں بیٹے ایک دوسرے سے الگ الگ تھے۔ کبھی انہیں آپس میں ملتے نہیں دیکھا۔ تعجب ہے، اچانک متحد کیسے ہو گئے؟''

''یہی بات میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے، تینوں نے پہلے سے پلاننگ کی تھی کہ وجی اور قربان واسطی یہاں لانچ میں مجھے اُلجھا کر رکھیں گے۔ ادھر وکی میرے تمام اہم راز چرا کر لے جائے گا۔''

سلطان ظفر نے کہا۔ ''اور ادھر میری مام کو قیدی بنا کر پریشان کیا جائے گا۔ واقعی سوچا جائے تو یہ تینوں باپ بیٹوں کی زبردست منصوبہ بندی لگتی ہے۔''

باس نے کہا۔ ''وکی کے خلاف کچھ کرو۔ اسے کہیں سے ڈھونڈ کر مار ڈالو۔ مگر اسے مار ڈالنے سے بات نہیں بنے گی۔ اس کے بعد پتا نہیں میری کمزوریاں کن ہاتھوں میں پہنچ جائیں گی؟''

''وہ کم بخت ہاتھ آئے گا تو تمام راز اس سے چھینے جا سکیں گے۔ فی الحال میں اپنے ذرائع سے اسے تلاش کروں گا۔''

''جب تک وہ پکڑا نہیں جائے گا، میری جان سولی پر لٹکی رہے گی۔ وکی کسی وقت بھی دشمنوں کو اور قانون کے محافظوں کو میرے پیچھے لگا سکتا ہے۔''

''ہم ایسے کمزور نہیں ہیں کہ پیچھے لگنے والوں سے نمٹ نہ سکیں۔ فکر نہ کریں۔ ابھی کسی طرح مام کے ساتھ یہاں سے نکلیں۔ پھر وکی سے نمٹنے کی تدبیر کی جائے گی۔''

میں صبح بگ باس کے ساتھ لانچ میں آیا تھا۔ اب سہ پہر کے تین بج رہے تھے۔ اتنا وقت گزرنے کے بعد بھی ہم اپنی مرضی سے واپس نہیں جا سکتے تھے۔ میں اور پاپا مجبور تھے۔ بگ باس کو گن پوائنٹ پر رکھے بغیر وہاں سے نکل نہیں سکتے تھے اور وہ بھی مجبور تھا۔ رخشی کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ میں دشمنوں کو کمزور نہیں سمجھتا، اس لیے کہتا ہوں کہ وہ ہمارے مقابلے میں تگڑے تھے۔ انہیں سلطان ظفر کا تعاون حاصل ہو رہا تھا۔

اور ہم بھی وہاں مات کھانے کے لیے نہیں بیٹھے تھے۔ انتظار کررہے تھے جیسے ہی بینم ہماری تحویل میں آتی، ہم ان کے مقابلے میں زبردست ہوجاتے۔ فی الحال کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا ہے؟

☆☆☆

میری جینا، وکی کے پاس تھی۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ میرے پاس ہے۔ میں اس کا محبوب تھا۔ ہم نے ایک ساتھ اچھا خاصا وقت گزارا تھا۔ وہ مجھے اور میرے مزاج کو بڑی حد تک سمجھتی تھی۔ اب قسمت اسے میرے بھائی کے پاس لے آئی تھی۔ وہ وکی کے قریب رہتے ہوئے اس کے مزاج کو سمجھ رہی تھی اور الجھ رہی تھی۔

ہم بھائیوں کی فطرت میں زمین آسمان کا فرق تھا اور یہی فرق جینا کو الجھا رہا تھا۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ وہ مجھ سے نہیں، کسی اجنبی سے مل رہی ہے اور یہی احساسات اس کے اندر بے چینی پیدا کردیتے تھے۔

وہ جھرجھری لے کر سوچتی تھی۔ 'مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ میرا وجی بدل گیا ہے؟ کچھ تو ہے... کہیں تو کوئی گڑبڑ ہے جو میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔'

اُدھر وکی نے بہت بڑی واردات کی تھی۔ بگ باس کے پرسنل سیف سے بہت اہم راز چرائے تھے۔ ایسی واردات کے بعد وہ لندن میں رہ کر باس کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ لہٰذا وہاں سے واپس پیرس آگیا۔

جینا نے پوچھا۔ "یہ تم اچانک ہی بغیر بتائے کہاں چلے گئے تھے؟"

وہ ذرا بے پروائی سے بولا۔ "اپنے ایک کام سے گیا تھا۔"

وہ اس کا لہجہ سن کر ٹھٹک گئی۔ پیچھے ہٹتے ہوئے تعجب سے بولی۔ "تم نے شراب پی ہے؟"

اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی تھی۔ وہ اپنی جن کمزوریوں کے ذریعے باس کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بنا رہتا تھا، ان کمزوریوں کو بھی بڑی چالبازی سے اڑا کر لے آیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے نئی طاقت اور توانائی مل رہی ہے۔ وہ بہت خوش تھا۔ اپنی کامیابی کا جشن منا کر لوٹا تھا اور ایسے وقت یہ خیال نہیں رہا تھا کہ میں شراب نہیں پیتا۔ لہٰذا اسے اس حالت میں جینا کے پاس نہیں آنا چاہیے تھا۔

کسی بھی غلطی کو بات بنا کر ٹالا جاتا ہے۔ اس سے بھی غلطی ہوئی تھی۔ وہ بات بناتے ہوئے بولا۔ "کبھی کبھی دوسروں کا ساتھ دینے کے لیے تھوڑی بہت پینی پڑ جاتی ہے۔ تم پریشان نہ ہو۔"

وہ بولی۔ "بات تو پریشانی کی ہے۔ تم جس [illegible] ہاتھ بھی نہیں لگاتے، آج اسے منہ لگا کر آئے ہو۔"

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "پلیز! اس [illegible] سی بات کو مسئلہ نہ بناؤ۔"

"صرف یہ ایک بات نہیں ہے۔ ایسی بہت [illegible] چھوٹی باتیں مجھے پریشان کرنے لگی ہیں۔"

اس نے سر اٹھا کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ [illegible] کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "تم [illegible] گئے ہو۔ میلسن کے اور تمہارے ساتھ جو حادثہ پیش آیا، اس [illegible] بعد تو ایسا لگتا ہے جیسے میں وجی سے ملی ہی نہیں ہوں۔"

اس نے ایک دم سے چونک کر اسے دیکھا۔ "[illegible] مطلب؟ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"اگر تم میرے وجی ہو تو تمہارا رویہ اتنا بدلا [illegible] کیوں ہے؟ تم ہمیشہ میرا خیال رکھتے تھے۔ مجھے کسی مر[illegible] تنہا نہیں چھوڑتے تھے۔ اب جبکہ میں بالکل ہی تنہا اور [illegible] یار و مددگار ہوگئی ہوں، صرف تمہارے آسرے پر ہوں [illegible] محسوس کررہی ہوں جیسے تمہارے دل میں میرے لیے [illegible] اپنائیت نہیں رہی ہے۔"

"اپنائیت نہ ہوتی تو تم اس وقت میرے ساتھ [illegible] ہوتیں۔"

"ہم ساتھ کہاں ہیں؟ ایک چھت کے نیچے ایک [illegible] چار دیواری میں رہنے کے باوجود ایسا لگتا ہے، ہم ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔"

وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ [illegible] دوری، یہ فاصلے اور یہ حد بندی تمہاری پیدا کردہ ہے۔ [illegible] تمہارے موڈ اور مزاج کے مطابق رہتا ہوں۔"

"میں قربت کی نہیں، محبت کی بات کررہی [illegible] تمہاری باتوں سے وہ پہلے جیسی اپنائیت کی خوشبو نہیں آتی۔"

وہ ایک ذرا بے زار ہوکر گہری سانس لیتے ہو[ئے] بولا۔ "پتا نہیں تم مجھ سے کیسی محبت کروانا چاہتی ہو؟ [illegible] تمہاری منطق میری سمجھ میں نہیں آتی۔ قریب آنا چاہتا [illegible] دور بھاگتی ہو اور دور جاتا ہوں تو شکایت کرنے لگتی ہو۔"

"شکایت تو یہ بھی ہے کہ تم مجھ سے نکاح کیوں نہیں کرتے؟ ایک ہونے کے لیے جائز راستہ اختیار کرنے [سے] کیوں کتراتے ہو؟"

"تمہیں کیا معلوم میں کیسے کیسے جھمیلوں میں الجھا [ہوا] ہوں؟ کیسے اہم معاملات نمٹاتا پھر رہا ہوں؟"

"کیا میرا معاملہ اہم نہیں ہے؟"

وہ بولا۔ "اگر تم یہ چاہتی ہو کہ میں سامنے بیٹھ کر تمہارے قصیدے پڑھتا رہوں، محبت کا دم بھرتا رہوں تو یہ بات ذہن میں بٹھالو... اب حالات پہلے جیسے نہیں رہے ہیں۔"

وہ ایک ذرا صدمے سے بولی۔ "میرے لیے تو تم بھی پہلے جیسے نہیں رہے۔"

وہ کامیابی کے نشے میں چُور واپس آیا تھا۔ اس نے بگ باس کے سیف سے صرف اپنی کمزوریاں ہی نہیں، اس کے بھی کئی اہم راز چرائے تھے۔ آئندہ وہ ان کے ذریعے بہت کچھ کرنے والا تھا۔ ان اہم رازوں کی صورت میں بگ باس کی کئی دُکھتی رگیں اس کی مٹھی میں آگئی تھیں۔

ایسے وقت وہ خود کو بہت ہی پُرسکون اور آزاد محسوس کررہا تھا۔ آزادی کے ان لمحات کو خوب انجوائے کرنا چاہتا تھا لیکن جینا کی باتیں اور اس کے شکوک وشبہات اس کے دماغ کو بوجھل کررہے تھے۔

وہ اس سے کترانے کے انداز میں بولا۔ "اس مسئلے پر پھر کسی وقت بات ہوگی۔ ابھی میں ذرا سونے جارہا ہوں۔"

وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ جینا نے اسے نہیں روکا۔ بڑی خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر سوچ میں پڑ گئی۔ اس کی ایسی بے پروائی اور بے نیازی مزید الجھا رہی تھی۔ اس نے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔ "کیا یہ وجی ہے؟ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے، میں اس کے کسی ہم شکل سے باتیں کررہی ہوں۔ اس کی صورت شکل وہی ہے مگر دل بدل گیا ہے..."

وہ سوچتے سوچتے ذرا چونک گئی۔ پہلو بدل کر اس کے کمرے کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے لندن کی ایک مارکیٹ میں مجھے دیکھا تھا۔ تب وکی نے وجی بن کر رہنے کے لیے اس سے جھوٹ بولا تھا اور مجھے مجرمانہ زندگی گزارنے والا وکی ظاہر کیا تھا۔ اس وقت وہ میرے حلیے کو دیکھ رہی تھی۔ میں سر سے پاؤں تک اس کا وجی دکھائی دے رہا تھا۔

وکی نے اس سے کہا تھا کہ میں دوسروں کو دھوکا دینے کے لیے اس کا یعنی وجاہت علی کا حلیہ اپنائے رہتا ہوں۔ میں اس مارکیٹ میں ماسٹر فو کے ساتھ تھا۔ وہ اسے نہیں جانتی تھی۔ اگر امیر حمزہ کے ساتھ ہوتا تو یقیناً وہ وکی کی باتوں میں نہ آتی۔

جھوٹ آخر جھوٹ ہوتا ہے۔ ایک دن پکڑا ہی جاتا ہے۔ وہ جیسے اس کے جھوٹ کو پکڑ رہی تھی۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے ایک ایک لمحے کو یاد کرتے ہوئے بڑی دور تک سوچ رہی تھی لیکن پھر بھائی کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بارے میں سوچ کر الجھ گئی۔

وہ میں ہی تھا، جو میلسن کو رہا کروا کے اس کے پاس پہنچانے والا تھا اور میں نے اس روز فون پر اس سے باتیں بھی کی تھیں۔

وہ ایک ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے سوچنے لگی۔ 'جب وجی نے اسے رہائی دلوائی، وہی اس کے ساتھ حادثے سے دوچار ہوا اور وہی مجھے جائے حادثہ پر ملا تو پھر یہ کوئی اور کیسے ہوسکتا ہے؟'

اس نے سر گھما کر وکی کے کمرے کی طرف دیکھا۔ 'اگر یہ وجی ہی ہے تو پھر میرا دل اسے قبول کیوں نہیں کررہا ہے؟ کیوں ایسا لگتا ہے جیسے میں کسی اجنبی کے ساتھ رہتی ہوں؟ یا اللہ! تو حقیقت جاننے والا ہے۔ تو ہی میری الجھنوں کو دور کرسکتا ہے۔ مجھ پر رحم فرما...'

ایسے ہی وقت موبائل فون کی کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ وکی اپنا فون صوفے پر بھول گیا تھا۔ اس نے قریب آکر اسے اٹھایا۔

اُدھر وکی بھی اپنے فون کی آواز سن کر کمرے سے باہر آگیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کال ریسیو کرتی، اس نے فوراً ہی آکر فون اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔ ننھی سی اسکرین پر بٹر فلائی کے ایک خاص ماتحت کے نمبر دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے ایک بٹن دبا کر فون کو کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو...!"

دوسری طرف سے اس ماتحت نے پوچھا۔ "تم اس وقت کہاں ہو؟"

وہ بولا۔ "اسی دنیا میں کہیں ہوں مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میں جانتا ہوں، تم دوستوں اور دشمنوں کے لیے پراسرار بن کر رہتے ہو۔ اپنا پتا ٹھکانا کسی کو نہیں بتاتے۔ بے شک! مجھے بھی نہ بتاؤ۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم بھی پیرس میں ہو۔ ابھی جہاں بلا رہا ہوں، فوراً وہاں چلے آؤ۔"

اس نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "میں کسی کے حکم کا غلام نہیں ہوں۔"

وہ بولا۔ "میں حکم نہیں دے رہا ہوں۔ میڈم کا پیغام تم تک پہنچا رہا ہوں۔ دراصل... وہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں زخمی ہوکر اسپتال پہنچی ہوئی ہیں۔ انہیں خون چڑھایا جارہا ہے۔ کیا تم بھی بی نیگیٹیو ہو؟ اگر تمہارا بلڈ گروپ بی نیگیٹیو ہے تو تم بھی اسپتال آجاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ بلڈ گروپ کے نایاب ہونے کی وجہ سے اگر کوئی مشکل درپیش ہوئی تو تم بھی خون دے دینا۔"

وہ اس کے حادثے کا سن کر پریشان ہوگیا۔ فوراً ہی اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں۔ میرا بلڈ گروپ بی نیگیٹو ہے اور اس کا بھی یہی ہے۔''

اس کی بات سنتے ہی جینا کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ''بی نیگیٹو...؟''

وہ فون پر مصروف تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر اسے سر سے پاؤں تک دیکھنے لگی۔ دل و دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ اسے یاد آرہا تھا کہ جب وہ گولی کھا کر اسپتال پہنچی تھی تو میں نے اپنا خون دے کر اس کی جان بچائی تھی۔ ہم دونوں او نیگیٹو تھے جبکہ وہ فون پر اپنا بلڈ گروپ بی نیگیٹو بتا رہا تھا۔ اب تو شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ ان لمحات میں اس کے سامنے میں نہیں ہوں... بلکہ میرا ہم شکل بھائی وکی کھڑا ہوا ہے۔

ایسے وقت اس کے دماغ میں اسی کی باتیں گونج رہی تھیں کہ وکی ایک مجرمانہ زندگی گزارنے والا نوجوان ہے۔ انڈر ورلڈ مافیا سے تعلق رکھتا ہے۔ بڑی حد تک خطرناک بھی ہے۔ وکی نے خاص طور پر جینا کو تاکید کی تھی کہ جب بھی سامنا ہو تو وہ اس سے کترا کر گزر جائے۔

وہ کترا کر کیا گزرتی؟ جس سے دور رہنا تھا' اسی کے ساتھ دن رات گزار رہی تھی۔ حقیقت واضح ہوتے ہی اس کے دماغ نے پوچھا۔ ''یہ یہاں ہے تو وجی کہاں ہے؟ یقیناً وہ مجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہوگا۔''

فون پر رابطہ ختم ہوگیا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''ایک ایمرجنسی آن پڑی ہے۔ مجھے ابھی جانا ہوگا۔''

وہ بولتا ہوا اندر گیا تھا۔ چند لمحوں بعد باہر آیا تو جینا جوں کی توں اپنی جگہ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کے سامنے چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔ ''تم کیوں اسٹیچو بنی کھڑی ہو؟''

اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''سوری... ناراض نہ ہونا۔ جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔''

پھر وہ اس کا جواب سنے بغیر دروازہ کھولتا ہوا باہر چلا گیا اور نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ ادھر جینا کا دماغ تیزی سے سوچنے لگا۔ اب وہ اس چھت کے نیچے وکی کے ساتھ ایک لمحہ بھی گزارنا نہیں چاہتی تھی۔

اس نے سوچا۔ 'یہ اچھا موقع ہے۔ وکی یہاں نہیں ہے۔ مجھے اس کی واپسی سے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔'

وہ تیزی سے پلٹ کر اپنے کمرے میں آئی پھر ایک بیگ میں اپنا ضروری سامان بھرنے لگی۔ اس نے بڑی پھرتی دکھائی تھی۔ چند لمحوں بعد ہی وہ نقاب پہن کر اس خفیہ پناہ گاہ سے نکل آئی۔ وہ پیرس میں رہ کر وکی کی نظروں میں نہیں آنا چاہتی تھی۔ اس نے سوچا تھا' کسی بھی پہلی فلائٹ کے ذریعے اپنی ملازمہ لوری کے پاس لندن چلی جائے گی۔ مگر جب ٹریول ایجنسی سے بات ہوئی تو معلوم ہوا' دوسری صبح سے پہلے کسی بھی فلائٹ میں جگہ نہیں ہے۔ لہٰذا اسے وہ ایک دن اور ایک رات وہیں پیرس میں گزارنی تھی۔

وہ زندگی میں پہلی بار تنہا ایسے حالات کا مقابلہ کر رہی تھی۔ بری طرح سہمی ہوئی تھی۔ اس نے ہوٹل میں ایک کمرا کرائے پر حاصل کیا۔ اس بند کمرے میں رہ کر بھی یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں وکی اس کی بُو سونگھتا ہوا وہاں تک نہ پہنچ جائے۔

دراصل وہ اس حادثے کے بعد اپنے دوستوں اور دشمنوں سے چھپ کر زندگی گزار رہا تھا اور وہ اس کی رازدار تھی۔ یہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ وکی اسے اتنی آسانی سے فرار نہیں ہونے دے گا۔ اپنے راز کو راز رکھنے کے لیے اسے پاتال سے بھی نکال لانے کی کوشش کرے گا۔

وہ ہوٹل کے اس بند کمرے میں بیڈ پر ایک طرف سکڑی سمٹی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کچھ سوچ کر ریسیور اٹھایا۔ پھر نمبر پنچ کر کے رابطے کا انتظار کرنے لگی۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ چند لمحوں بعد کال ریسیو کی گئی تو جینا نے تڑپ کر کہا۔ ''ہیلو وجی...!''

''وجی نہیں' امیر حمزہ بول رہا ہوں۔ آپ کون ہیں؟''

وہ امیر حمزہ کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اس نے فوراً ہی کہا۔ ''میں... میں جینا بول رہی ہوں۔''

ادھر وہ ایک دم سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ماسٹر فو کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''او، جینا...! یعنی رابعہ...؟ تم کہاں ہو؟ کس حال میں ہو؟ ہم سب تمہارے لیے پریشان ہیں۔ نہ جانے تمہیں کہاں کہاں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں؟''

اس نے امیر حمزہ کے سوالوں کے جوابات دینے کے بجائے پوچھا۔ ''یہ وجی کا موبائل فون تمہارے پاس کیوں ہے؟ وہ خود کہاں ہے؟''

''وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں کہیں گئے ہوئے ہیں۔ تم ہمیں بتاؤ' اس وقت کہاں ہو؟ ہم تمہیں لینے آئیں گے۔''

وہ بولی۔ ''میں پیرس میں ہوں۔ صبح لندن پہنچوں گی۔''

اس نے ذرا تعجب سے کہا۔ ''پیرس میں ہو؟ آخر تمہارے ساتھ ہوا کیا تھا؟ تم اس روز جائے حادثہ سے

اچانک ہی کہاں غائب ہوگئی تھیں؟''

''میں نے بہت زبردست دھوکا کھایا ہے۔ مجھے تو یہی معلوم تھا کہ وجی میلسن کے ساتھ حادثے سے دوچار ہوا ہے اور اپنی جان گنوا بیٹھا ہے لیکن جب میں نے اسے وہاں زندہ سلامت دیکھا تو اس کے ساتھ چلی گئی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ وجی کے دھوکے میں اس کے ہم شکل بھائی وکی کے ساتھ جا رہی ہوں۔''

امیر حمزہ کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے بات ہی ایسی کی تھی۔ دراصل اس وقت تک ہم سب یہی سمجھ رہے تھے کہ وکی مر چکا ہے۔ اس نے جو واردات کی تھی' اس کا علم صرف بگ باس کو اور سلطان ظفر کو ہوا تھا۔ ہم باپ بیٹے کیبن میں اس بات سے بے خبر تھے۔

امیر حمزہ نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ وکی زندہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''میں اب تک اسی کے ساتھ تھی۔ وہ بھیس بدل کر سب سے چھپ کر یہاں پیرس پہنچا ہوا ہے۔ ایک خفیہ پناہ گاہ میں رہتا ہے۔ آج جب مجھے اس کی اصلیت معلوم ہوئی تو میں اس خفیہ پناہ گاہ سے نکل آئی۔''

''پھر تو وہ تمہارا پیچھا کر رہا ہوگا؟''

''یقیناً کرے گا مگر فی الحال وہ اپنے کسی معاملے میں الجھا ہوا ہے۔ تم مجھے وجی کے بارے میں بتاؤ' وہ کہاں ہے؟ اس سے کیسے بات ہو سکتی ہے؟''

''تم نے بہت ہی تشویشناک خبر سنائی ہے۔ وکی کے زندہ سلامت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وجی بابا شدید خطرے میں ہیں۔''

اس نے ماسٹر فو کی طرف دیکھتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔ ادھر سے جینا نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''وجی خطرے میں کیوں ہے؟ پلیز! مجھے بتاؤ' وہ کہاں ہے؟''

وہ بولا۔ ''دراصل وجی بابا وکی بن کر دشمنوں کے درمیان پہنچے ہوئے ہیں۔ ہم سب یہی سمجھ رہے تھے کہ وکی مر چکا ہے۔ اس لیے مطمئن تھے مگر اب...''

اس نے ذرا توقف سے کہا۔ ''میں ابھی فون بند کر رہا ہوں۔ لندن پہنچنے تک ہم سے رابطہ رکھنا۔ وکی کی طرف سے ایک ذرا بھی خطرہ محسوس ہو تو فوراً ہمیں اطلاع دینا۔''

ان کے درمیان رابطہ ختم ہوگیا۔ امیر حمزہ نے فون کو ایک طرف رکھتے ہوئے ماسٹر فو کو دیکھا۔ وہ اس کی باتیں سنتا رہا تھا۔ تمام حالات کو بھانپ گیا تھا۔ ایک ذرا حیرانی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ ''کمال ہے... وکی زندہ ہے اور ہم سب اسے مُردہ سمجھ رہے تھے؟''

امیر حمزہ نے کہا۔ ''اس بات سے اس کی شاطر دماغی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس نے صرف ہمیں نہیں اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں کو اور حتیٰ کہ اپنے باس کو بھی بڑی کامیابی سے دھوکا دیا ہے۔ اگر باس کو اس کے زندہ ہونے کا علم ہوتا تو وہ کبھی وجی سے فریب نہ کھاتا۔ وہ لاعلم ہے اسی لیے وجی بابا وہاں خیر و عافیت سے ہیں۔''

''یقیناً یہی بات ہے۔ اس نے اپنے باس کو بھی حقیقت سے آگاہ نہیں کیا ہے۔''

امیر حمزہ نے فون اٹھا کر نمبر پنچ کرتے ہوئے کہا۔ ''وجی بابا کو اس بات کا علم ہونا چاہیے۔ پتا نہیں' وہ اس لانچ میں کیسے حالات سے گزر رہے ہیں؟''

میرا موبائل فون آف تھا، لہٰذا رابطہ نہ ہو سکا۔ اس نے مایوس ہو کر کہا۔ ''ان کا فون تو آف جا رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد کوشش کروں گا۔''

وہ دونوں وکی کے بارے میں سوچ رہے تھے اور کچھ نہ کچھ بول رہے تھے۔ امیر حمزہ نے کہا۔ ''یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ وہ ہم سے اور اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں سے چھپتا پھر رہا ہے لیکن یہ معاملہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس نے بگ باس کو اپنا رازدار کیوں نہیں بنایا؟''

''صرف یہی نہیں' یہ بات بھی الجھا رہی ہے کہ اگر وکی چھپ کر اپنے تمام دوستوں اور دشمنوں پر نظر رکھ رہا ہے تو یقیناً یہ بھی جانتا ہوگا کہ وجی بابا وکی بن کر بگ باس کے پاس پہنچے ہوئے ہیں۔ پھر اس نے اب تک ان کے خلاف کوئی قدم کیوں نہیں اٹھایا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں۔ یہ سوچنے والی بات ہے۔ وہ بگ باس کو ایک فون کال بھی کر دیتا تو وجی بابا بری طرح پھنس کر رہ جاتے۔''

''اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وکی یہاں کے معاملات سے بے خبر ہے۔ وجی بابا کو کمزور بنانے کے لیے اس نے جینا کو ٹریپ کیا ہوا تھا مگر اب وہ کمزوری بھی اس کے ہاتھوں سے نکل گئی ہے۔''

وہ دونوں اپنے اپنے طور پر سوچ رہے تھے اور اس دوران مجھ سے رابطہ کرنے کی بھی کوششیں کر رہے تھے۔

اُدھر جینا ہوٹل کے کمرے میں چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ 'دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔ وکی واپس آگیا ہوگا اور مجھے وہاں نہ پا کر جھنجھلا رہا ہوگا۔'

وہ ایک گہری سانس لے کر زیرلب بولی۔ ''میں خدا کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ میں تو اسے وجی ہی سمجھ رہی تھی اور بضد تھی کہ وہ مجھ سے نکاح کرلے۔ اگر وہ میری ضد مان لیتا تو...''

اس نے جھرجھری سی لی۔ پھر ایک ذرا سنجیدگی سے وکی کے بارے میں سوچنے لگی۔ بے شک! اس نے جینا سے جھوٹ بولا تھا، اسے دھوکا دیا تھا مگر یہ ماننے والی بات تھی کہ اس نے جینا کی غلط فہمی کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ کوئی ایسی نازیبا حرکت نہیں کی تھی' جس کی وجہ سے وہ مجھ سے نظریں نہ ملا پاتی۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو وکی نے میری امانت میں کوئی خیانت نہیں کی تھی۔

دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے ایک دم سے چونک کر ادھر دیکھا۔ پل بھر کو ایسا لگا جیسے وکی اس کے سر پر پہنچ گیا ہے۔ اس نے بیڈ سے اترتے ہوئے پوچھا۔ ''کون ہے...؟''

باہر سے نسوانی آواز سنائی دی۔ ''روم سروس میڈم...!''

جینا نے دروازے کے قریب آکر ڈور آئی سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ باہر ایک ویٹرس کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے مطمئن ہوکر دروازہ کھول دیا مگر دوسرے ہی لمحے میں چونک گئی۔ کھلے ہوئے دروازے پر وکی دکھائی دے رہا تھا۔ ویٹرس ایک طرف ہٹ گئی تھی۔

جینا نے ایک دم سے گھبرا کر دروازہ بند کرنا چاہا مگر وکی نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اپنا ایک پاؤں دروازے اور چوکھٹ کے درمیان پھنسا دیا۔ پھر جیب سے کچھ رقم نکال کر ویٹرس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تھینک یو...''

وہ رقم لے کر مسکراتی ہوئی وہاں سے پلٹ کر چلی گئی۔ ادھر جینا دروازے کو بند کرنے کی کوششیں کررہی تھی۔ وکی نے ایک زور کا دھکا دیا۔ دروازہ پوری طرح کھلتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی جینا بھی پیچھے کی طرف چلی گئی۔ وکی نے اندر آکر دروازے کو بند کردیا۔

وہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ اس سے خوف زدہ بھی تھی۔ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تم... تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یہ سوال تو مجھے پوچھنا چاہیے کہ تم یہاں کیا کررہی ہو؟''

جینا کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے کیا کرے؟ وکی نے ذرا توقف سے پوچھا۔ ''جب میرا ساتھ نہیں دینا تھا تو اتنی دور تک کیوں آئیں اور اب مجھے دھوکا دے کر کہاں جارہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''دھوکا میں نہیں... تم مجھے دیتے آرہے ہو۔ مگر اب تمہارا فریب کھل چکا ہے۔ تم میرے وجی نہیں ہو مسٹر وکی...!''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کمال ہے... ایک ذرا سی شراب کیا پی لی' تم مجھے وکی سمجھنے لگیں؟''

وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''تم وکی ہی ہو۔''

وہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا پھر بولا۔ ''میں وکی ہوں یا وجی... فی الحال تمہیں لینے آیا ہوں۔ اپنا سامان سمیٹو اور میرے ساتھ چلو۔''

وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''ہرگز نہیں۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔''

''اور میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔''

''تم مجھے میری مرضی کے خلاف نہیں لے جاسکتے۔''

اس نے اپنے لباس سے ریوالور نکال کر اسے نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے آگے کسی کی مرضی نہیں چلتی۔ سامان اٹھاؤ اور میرے ساتھ چلو۔''

اس نے ریوالور کو دیکھا پھر وکی کو دیکھا۔ وہ کسی بھی صورت اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی۔ یہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ جائے گی تو پھر کبھی پلٹ کر میری طرف نہیں آسکے گی۔

وہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر آگے بڑھ کر اس کے ریوالور والے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر ریوالور کی نال کو اپنی پیشانی سے لگاتے ہوئے بولی۔ ''مر جاؤں گی... یہیں ختم ہوجاؤں گی مگر تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔''

وہ تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا اپنے وجی کی سلامتی کے لیے بھی نہیں چلوگی؟''

اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ ''اگر میں وجی بن کر یہاں تمہیں دھوکا دے رہا ہوں تو وہ وہاں وکی بن کر میرے بگ باس کو دھوکا دے رہا ہے اور وہ باس میرا خیر خواہ ہے لیکن وجی کا جانی دشمن ہے۔ اگر میں ایک فون کال کرکے اسے ساری حقیقت بتاؤں گا تو سوچ لو... وہاں تمہارے وجی کے ساتھ کیا ہوسکتا ہے؟''

جینا نے شدید پریشانی سے اسے دیکھا۔ اس نے ٹیلی فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی وجی کے ماتحت کو کال کرو۔ اس سے صرف اتنا پوچھ لو کہ وجی میرا بھیس بدل

کر بگ باس کے پاس پہنچا ہوا ہے یا نہیں؟''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ فون کے پاس آکر ریسیور اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ لو... بات کرو۔''

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے فون کو دیکھا۔ اس کے دماغ میں امیر حمزہ کی باتیں گونج رہی تھیں۔ وکی سچ بول رہا تھا۔ امیر حمزہ نے بھی یہی بتایا تھا کہ میں وکی بن کر دشمنوں کے درمیان پہنچا ہوا ہوں۔ جینا نے پریشان ہوکر اسے دیکھا پھر پوچھا۔ ''کیا تم اپنے بھائی سے دشمنی کروگے؟''

''تم ہمارے معاملات کو نہیں سمجھ سکتیں۔ ہم بھائی بعد میں ہیں، دشمن پہلے ہیں۔ تم نمبر ملا کر بات کرو۔''

اس نے وکی کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کریڈل پر رکھ دیا۔ پھر جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی مگر تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔ اگر تم وجی کے دشمن ہو تو تم نے اب تک اپنے باس کو انفارم کیوں نہیں کیا کہ وہ وکی بن کر وہاں پہنچا ہوا ہے؟ ضرور اس کے پیچھے بھی تمہاری کوئی سازش چھپی ہوگی؟''

''تم ان معاملات میں نہ الجھو۔ جتنا کہہ رہا ہوں، اُتنا کرو۔''

''میں نہیں الجھوں گی۔ تم سے کچھ نہیں پوچھوں گی۔ بس مجھے اس بات کی ضمانت دے دو کہ وہاں وجی کو کچھ نہیں ہوگا۔ تم اس کے خلاف کچھ نہیں کروگے۔''

''اب اس کی سلامتی تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ تم ادھر مجھے دھوکا دینا چاہوگی، اُدھر وہ پھنسے گا۔ یعنی تم کروگی اور وہ بھرے گا۔''

''نہیں۔ میں کوئی دھوکا نہیں دوں گی۔ اس کی سلامتی کی خاطر تمہاری قیدی بن کر رہوں گی۔''

وکی نے جھوٹ سچ بول کر آخر کار اسے ٹریپ کر ہی لیا۔ وہ بگ باس سے دور رہ کر اس کی مصروفیات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ایسی صورت میں اس پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے یعنی وجی سے دھوکا کھا رہا ہے۔ اس طرح چھپ کر رہنے سے اسے ایک بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ وہ اس کے سیف سے اپنی بہت سی کمزوریاں اور اس کے کئی اہم راز چرا کر گویا مکمل طور پر اس کے شکنجے سے نکل آیا تھا اور ایسے وقت اس نے یہی ظاہر کیا تھا کہ میں نے یعنی وجی نے وہ واردات کی ہے۔

پتا نہیں' وہ آئندہ بگ باس کے خلاف کیا کچھ کرنے والا تھا؟ فی الحال تو یہ سمجھنا تھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ جینا کو اپنے قبضے میں رکھ کر' اسے میری کمزوری بنا کر میرے خلاف کیا کرنے والا ہے؟

☆☆☆

جیسا کہ میں بیان کرچکا ہوں' مجھے اور پاپا کو یہ نئی بات معلوم نہیں ہوئی تھی کہ وکی نے باس کے بنگلے میں ڈکیتی کی ہے اور اس کے بارہ بجا دیے ہیں۔ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ زندہ ہے۔ اسے مُردہ سمجھ کر ہی میں اب تک وکی کا رول ادا کرتا آرہا تھا۔

اب ہم سب کی حالت ایسی تھی کہ باہر بیٹھا ہوا بگ باس ہم سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ فوراً سمجھوتا کرو اور رخشی کو میرے حوالے کرکے یہاں سے جاؤ۔

ایسا کہنے سے پہلے گے گورڈن اور سلطان ظفر اپنی طاقت، وسیع ذرائع اور اختیارات سے کام نکالنے کی کوششوں میں مصروف تھے، اسی لیے لانچ میں وقت ضائع کررہے تھے۔ میں اور پاپا بھی وہاں سے نکلنے کی جلدی نہیں کررہے تھے۔ ہمیں انتظار تھا کہ پہلے بینم ہماری کسی پناہ گاہ میں خیریت سے پہنچ جائے۔ اس کے بعد ہم وہاں سے جانے کے لیے رخشی اور گے گورڈن کو گن پوائنٹ پر رکھنے والے تھے۔

گے گورڈن نے کیبن کے بند دروازے کے پاس آکر کہا۔ ''تم تینوں بہت چالباز ہو۔ اب تک مجھے دھوکا دیتے آرہے تھے۔''

رخشی نے حیرانی سے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر غصے سے چیخ کر کہا۔ ''گے! تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ ان دشمنوں کے ساتھ مجھے بھی چالباز اور دھوکے باز کہہ رہے ہو؟''

وہ جلدی سے بولا۔ ''اونو رخشی! میں تمہیں نہیں کہہ رہا ہوں۔ تینوں کا مطلب ہے' قربان واسطی اور اس کے دونوں بیٹے مکار ہیں۔''

وہ بولی۔ ''یہ دوسرا بیٹا کہاں سے آگیا؟ وہ تو مر چکا ہے؟''

''یہی تو ان کی مکاری ہے۔ وہ مرا نہیں ہے' زندہ ہے۔ اس نے میرے گھر میں ڈاکا ڈالا ہے۔ میری بہت سی اہم فائلیں اور بہت سے اہم راز چرا کر لے گیا ہے۔''

یہ بات سن کر میں اور پاپا ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ دونوں کی نظروں میں ایک ہی سوال تھا۔ ''وکی زندہ ہے؟ یہ گے گورڈن کیا کہہ رہا ہے؟''

رخشی ہم باپ بیٹے کو دیکھ رہی تھی اور گے گورڈن سے کہہ رہی تھی۔ ''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وکی نے تمہارے سیف سے اہم راز چرائے ہیں؟ تم تو یہاں ہو۔ تم نے وکی کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے؟''

''میرے تمام سیکیورٹی گارڈز اور تمام ملازم اسے پہچانتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ وکی تھا یا وجی؟ اور جو تمہارے سامنے ہے وہ وجی ہے یا وکی؟ مگر اس نے وہاں سے جاتے جاتے یہ کہا ہے کہ وہ اسکاٹ لینڈ یارڈ کا جونیئر افسر وجاہت علی ہے۔ بہرحال، یہاں وہاں ایک ہی شکل صورت والے دیکھے گئے ہیں۔ یہ یقین ہوگیا ہے کہ وکی زندہ ہے۔''

ہم یہ باتیں سن رہے تھے اور دل ہی دل میں خوش ہوکر خدا کا شکر ادا کررہے تھے۔ میرا بھائی زندہ تھا۔ پاپا کا دوسرا بازو صحیح سلامت تھا۔ ان کے چہرے پر رونق آگئی تھی۔ وہ مسکرا رہے تھے۔

رخشی نے مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''سچ بتاؤ، تم وجی ہو یا وکی؟''

میں نے کہا۔ ''ایک ہی لہو کے دو نام ہیں۔ تم کسی بھی نام سے پکار سکتی ہو۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا تم مجھے میڈم روزی کی حیثیت سے گرفتار کرا سکتے ہو؟''

میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ وکی نے بگ باس کے بنگلے میں واردات کرکے وہاں اپنا نام نہیں 'میرا نام بتایا ہے۔ یقیناً اس نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی ایسا کیا ہوگا۔

رخشی نے پوچھا۔ ''چپ کیوں ہو؟ جواب دو۔ اگر تم وجاہت علی ہو، اسکاٹ لینڈ سے تمہارا تعلق ہے تو کیا مجھے گرفتار کرا سکتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''اگر میں ایسا کرسکتا تو اب تک وہاں کی پولیس یہاں آکر تمہیں ہتھکڑی پہنا کر لے جاتی۔''

''یعنی تم وجی نہیں وکی ہو؟''

''فی الحال خود کو بھول رہا ہوں۔ تم پہچان سکو تو مجھے بتا دو کہ میں کون ہوں؟''

''تم وکی ہو... پکے بہروپیے ہو۔''

پاپا نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ یہ وکی ہے، وجی نہیں ہے۔ اس سے کیا فرق پڑے گا؟ کیا تمہارا قبلہ درست ہوجائے گا؟ تم نماز پڑھنا شروع کردو گی؟''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''پاپا! یہ ہم سے یونہی بول رہی ہے۔ یہاں سے رہائی پانے کے انتظار میں یونہی وقت گزار رہی ہے۔''

وہ دروازے کی طرف منہ کرکے اونچی آواز میں بولی۔ ''گے! یہاں جو میرے سامنے ہے، وہ وجی نہیں وکی ہے۔''

پاپا نے طنزیہ انداز میں قہقہہ لگایا۔ وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ ''تمہارے یوں قہقہہ لگانے سے حقیقت نہیں بدلے گی۔ یہ وکی ہے۔''

اس بار میں نے قہقہہ لگایا۔ وہ ذرا بجھ سی گئی۔ دونوں کو باری باری دیکھنے لگی۔ گورڈن نے باہر سے کہا۔ ''تم خوامخواہ نہ اُلجھو۔ صرف وکی ہی جانتا تھا کہ میں نے اہم راز اور اہم فائلیں کہاں چھپا کر رکھتا ہوں؟ وہ میرا سیف سے میری جان نکال کر لے گیا ہے۔ وکی یہ نہیں ہے..... وہ ہے۔''

ہم باپ بیٹے نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا پھر ہنسنے لگے۔ ہمارے قہقہے گونجتے ہوئے باہر تک جارہے تھے۔ گورڈن نے پوچھا۔ ''یہ دونوں بار بار کیوں ہنس رہے ہیں؟''

وہ جل کر بولی۔ ''ہمیں الو بنا کر خوش ہورہے ہیں۔''

گے گورڈن کچھ کہنا چاہتا تھا پھر کالنگ ٹون سن کر اپنے فون کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ننھی سی اسکرین پر کسی اجنبی کا نمبر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ ''ہیلو کون...؟''

اسے جواباً فون پر بھی قہقہہ سنائی دیا۔ وہ ایک دم سے تڑپ کر بولا۔ ''وکی...! یہ تم ہو۔ میں تمہارے ہنسنے بولنے کے انداز کو خوب سمجھتا ہوں۔''

وہ بولا۔ ''یہ تمہاری خوش فہمی تھی کہ مجھے مُردہ سمجھ رہے ہو۔ کیا اب بھی تمہارا یہی خیال ہے؟''

وہ شکست خوردہ ہوکر بولا۔ ''نہیں۔ میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی تھی۔''

''بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جو سیدھی قبر میں پہنچا دیتی ہیں۔''

''نہیں وکی! تم ایسی کوئی غلطی نہیں کرو گے۔ ہمارے درمیان سمجھوتا ہوسکتا ہے۔ آئندہ میری ذات سے تمہیں بہت فائدہ پہنچے گا۔''

''میرے فائدے کی بات نہ کرو۔ یہ حساب کرو کہ مجھ سے سمجھوتا نہ ہوا تو نقصان اٹھانے کی آخری حد کیا ہوگی؟''

''میں ڈوب جاؤں گا۔ ختم ہوجاؤں گا۔ ایسے وقت میرے احسانات کو مت بھولو۔ میں نے بچپن سے تمہاری پرورش کی ہے۔ چاندی کی پلیٹ میں سونے کے نوالے کھلاتا رہا ہوں۔''

اس نے ناگواری سے کہا۔ ''احسان نہ جتاؤ۔ تمہارے جیسا کمینہ تو کوئی نہ ہوگا۔ تم مجھے چاندی کی زنجیریں پہنا کر لہو کے رشتوں سے کاٹتے رہے۔ یہ سمجھاتے رہے کہ اپنی شناخت اور ولدیت کے لیے باپ کا نام ضروری نہیں ہوتا۔

میں ساری عمر ڈنمارک' ناروے اور جرمنی میں رہوں گا تو کوئی باپ کا نام نہیں پوچھے گا۔"

وہ بولا۔ "اور یہ غلط نہیں ہے۔ تم جانتے ہو۔"

"یہ بھی جانتا ہوں اور دیکھتا آرہا ہوں کہ تم رخشی کے ناجائز بیٹے کو میرے نانا کا نام' ولدیت اور وراثت کے حقوق دلانے کے لیے برسوں سے دشمنی کرتے چلے آرہے ہو۔"

پھر وہ حقارت سے بولا۔ "تم کتنے احمق ہو۔ مجھے احمق سمجھتے رہے۔ میں اپنے والدین کی جائز اولاد ہوں اور مجھے ناجائز بن کر رہنے کا سبق پڑھاتے رہے اور رخشی کے ناجائز بیٹے کو جائز ثابت کرنے کے لیے اب تک ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہو۔ اب کیا خیال ہے؟ کیا اسے جائز اور ہمیں ناجائز ثابت کرسکو گے؟"

وہ اچھی طرح مات کھا چکا تھا۔ اس نے ہمارے خلاف برسوں سے جو کھیل جاری رکھا تھا' وہ اب ختم ہونے والا تھا۔ اسے وکی کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اس وقت میرے سامنے ایک میز پر شراب کی بوتل اور شیشے کا جام ہے۔ میں نے پہلا جام تمہارے نام سے پیا ہے کیونکہ اس وقت تمہاری ذلالت' کمینگی اور مجرمانہ وارداتوں کے تمام ثبوت میرے سامنے میز پر بکھرے پڑے ہیں۔"

بگ باس نے ایک گہری سانس یوں کھینچی جیسے اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی ہو۔ پھر بڑی عاجزی سے کہا۔ "وکی! فار گاڈ سیک... مجھ سے ایسی شرائط منوالو جو قابلِ قبول ہوں۔ میں اپنی تمام دولت تمہارے بینک اکاؤنٹ میں منتقل کرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔"

وہ بولا۔ "یہاں کچھ ایسی چیزیں ہیں جنہیں ضائع نہیں کیا جاسکتا۔ میں ایک ویڈیو کیسٹ آن کررہا ہوں۔ تم اس کے ذریعے میرے پاپا قربان علی واسطی کی کچھ اہم باتیں ابھی فون پر سن سکو گے۔"

اس نے کہا۔ "پلیز وکی! وقت ضائع نہ کرو۔ پہلے سمجھوتا کرو۔"

اس کی آواز سنائی نہیں دی۔ اس وقت وہ بٹر فلائی کی رہائش گاہ میں تھا۔ ایک ویڈیو کیسٹ کو وی سی آر سے لگانے کے بعد ٹی وی آن کر کے فون پر کہہ رہا تھا۔ "گورڈن! بیس برس پہلے میری ماما پر طویل سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ وہ بولنے' سننے اور سمجھنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ ایسے وقت تم نے اور رخشی نے میرے پاپا سے کیا کہا تھا؟ بولو کیا کہا تھا...؟"

وہ بولا۔ "ہم نے قربان واسطی سے کہا تھا کہ تمہاری ماں کے پاک دامن پر گناہوں کے دھبے لگائے جائیں گے۔ جب تک اس کے پاؤں بھاری نہیں ہوں گے' تب تک اس کے ساتھ گناہوں کا کھیل جاری رکھا جائے گا۔"

وکی نے پوچھا۔ "ایسے وقت رخشی نے کیا کہا تھا؟"

"رخشی نے تمہارے پاپا سے کہا تھا کہ اگر وہ اس کی بہن ساحرہ سے شادی کرے گا تو تمہاری ماما کو اس کی بے خبری میں گناہ گار نہیں بنایا جائے گا۔ بعد میں سعدیہ نعیم اگر قربان واسطی کی ہی اولاد کو جنم دے گی لیکن ہم اس سے ہونے والی اولاد کو ناجائز ثابت کریں گے۔"

وکی نے پوچھا۔ "ہوں... اور پاپا نے کیا کہا تھا؟"

"قربان واسطی ایک ہی بات کہتا تھا کہ اپنی شریکِ حیات سعدیہ پر غیروں کا سایہ پڑنے نہیں دے گا۔ اس کے دامن کو داغ دار نہیں ہونے دے گا۔ اس نے رخشی کی بات مان لی تھی۔ اس کی بہن سے شادی کرلی تھی۔"

وکی نے کہا۔ "اب خاموش رہو اور سنو...! میرے سامنے ٹی وی اسکرین پر ایک اسپتال کا منظر ہے۔ ایک کمرے کے بیڈ پر میری ماما بے حس و حرکت پڑی ہوئی ہیں۔ میرے پاپا چوروں کی طرح کمرے میں آکر ان کے پاس بیٹھ گئے ہیں۔"

گے گورڈن لانچ کے عرشے پر تھا۔ ایک کرسی پر بیٹھا خلا میں تک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اسپتال کا وہی منظر گھوم رہا تھا۔ ٹی وی سے ابھرنے والی پاپا کی آواز فون پر سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "سعدیہ! تم کتنی مجبور ہو' یہ بھی نہیں جانتیں کہ کیسے بدترین حالات سے گزر رہی ہو؟"

وکی نے والیوم بڑھا دیا تھا۔ گورڈن واضح طور پر سن رہا تھا۔ پاپا کہہ رہے تھے۔ "میں بڑے ارمانوں سے تمہیں دلہن بنا کر پھولوں کی سیج پر لانا چاہتا تھا مگر تم کانٹوں کے بستر پر ہو۔ میں یہ تمام کانٹے چننے آیا ہوں۔ میں نے ایک درمیانہ راستہ اختیار کیا ہے۔ دشمن چاہتے ہیں' تم سے جو اولاد ہو' وہ ناجائز کہلائے۔ رخشی اپنے بیٹے سلطان ظفر کے سلسلے میں انتقام لے رہی ہے۔"

پاپا نے ماما کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم میری منکوحہ ہو۔ ہماری اولاد ناجائز نہیں ہوگی۔ اگرچہ تمہیں بدکار کہا جائے گا مگر خدا دیکھ رہا ہے۔ وہ بڑی قدرت والا ہے۔ بڑا کارساز ہے۔ وہ چاہے گا تو تمہارے دامن پر بدنامی کا دھبا نہیں لگے گا۔"

اچانک خاموشی چھا گئی۔ پاپا کی آواز فون پر سنائی نہیں دی۔ چند لمحوں بعد وکی نے کہا۔ "اب دیکھ رہے ہو گے گورڈن! خدا پر میرے پاپا کا اعتماد کس قدر مضبوط اور مستحکم تھا اور اب میرے ہاتھوں میں ایسے ثبوت آئے ہیں جن کے آگے پوری دنیا میری ماں کو پاک دامن کہے گی اور ہم جائز اولاد کہلائیں گے۔"

اس نے ذرا ٹھہر کر کہا۔ "اس ویڈیو فلم کے علاوہ ایسی تصویریں بھی ہیں جن سے یہ ثابت ہورہا ہے کہ میری ماما اور پاپا اسپتال میں ملتے رہے ہیں۔ ایسی آڈیو کیسٹیں بھی ہیں جن میں پاپا کی' رخشی کی اور تمہاری بڑی اہم باتیں ریکارڈ کی گئی ہیں۔ انہیں سن کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے پاپا کو کس طرح قیدی بنا کر رکھا تھا اور کس طرح انہیں مجبور اور بے بس بنا کر اپنے ناجائز احکامات کی تعمیل کراتے رہے ہو۔"

گورڈن نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ "بے شک! تم نے اپنے ماں باپ کے حق میں بہت بڑی بازی جیتی ہے۔ میں حیران ہوں' جب سے تم نے ہوش سنبھالا' تب سے اپنے ماں باپ سے نفرت اور بے زاری ظاہر کرتے رہے۔ اب اچانک ہی ایسی کیا محبت امڈ کر آئی ہے... یا تم شروع سے مجھے دھوکا دے رہے تھے؟"

اس نے کہا۔ "نہیں۔ جب میں نے نافرمانی کی اور تم نے مجھے سخت سزائیں دیں... اس قدر مجبور کردیا کہ میں اپنے بینک اکاؤنٹ سے رقم بھی نہیں نکال سکتا تھا، ایک وقت کی روٹی کا محتاج ہوگیا تھا... ایسے وقت میں نے روزی روٹی کے لیے ایک جگہ واردات کی تو تم نے مجھے گرفتار کرادیا۔ یہ ثابت کردیا کہ تمہاری غلامی نہیں کروں گا تو فٹ پاتھ کا بھکاری بن کر رہ جاؤں گا۔"

گورڈن فون کو کان سے لگائے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وکی کہہ رہا تھا۔ "تب میں نے بہ ظاہر تمہارے آگے گھٹنے ٹیک دیے مگر یہ قسم کھالی کہ جس طرح میری کمزوریاں تمہارے ہاتھوں میں ہیں' اسی طرح ایک دن میں تمہاری کمزوریوں تک پہنچوں گا اور تمہیں اپنے قدموں میں گراؤں گا۔"

گورڈن نے کہا۔ "تمہاری قسم پوری ہوگئی ہے۔ میں تمہارے قدموں میں گرنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے کام کی باتیں کرو۔"

"یہ کام کی باتیں ہیں کہ میں تم سے بدظن ہونے کے بعد اپنے والدین کے بارے میں اور اپنی جائز شناخت کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے سمجھنے لگا۔ سمجھ داری کی بات یہ تھی کہ ماں باپ کو عزت دے کر ہی میں عزت اور جائز شناخت حاصل کرسکتا تھا۔"

گے گورڈن نے فون کو کان سے ہٹا کر وقت دیکھا۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ اچھا خاصا وقت گزر چکا تھا اور اب تک سلطان ظفر کی طرف سے کوئی مدد نہیں پہنچی تھی۔

اس نے فون کو پھر کان سے لگا کر کہا۔ "وکی پلیز! مجھ سے سمجھوتا کرو۔ پہلے تم میرے تابع دار تھے۔ اب میں تمہارا تابع دار بن کر تمہارے رحم و کرم پر رہنا چاہتا ہوں۔ بس ایک ہی التجا ہے کہ انٹیلی جنس والوں اور انڈر ورلڈ والوں تک میری کمزوریاں نہ پہنچاؤ۔ میرے خلاف جو بارود تمہارے پاس رکھا ہوا ہے، اسے چھپا کر رکھو۔ کسی پر ظاہر نہ کرو۔"

وکی نے کہا۔ "ابھی ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تم میرے والدین کو اور ہم دونوں بھائیوں کو بیس برسوں سے سزائیں دیتے آرہے ہو۔ میں نے طے کیا ہے تمہیں جان سے نہیں ماروں گا، نہ ہی انٹیلی جنس والوں اور انڈر ورلڈ والوں کے حوالے کروں گا۔ تم سمجھوتا کرنا چاہتے ہو نا...؟"

اس نے جلدی سے کہا۔ "ہاں۔ تمہاری یہ باتیں مجھے حوصلہ دے رہی ہیں۔"

"تم مجھے غلام بنا کر رکھتے تھے۔ مجرمانہ زندگی گزارنے کا حوصلہ دیتے تھے۔ آج سے تم میرے غلام ہو۔ میرے تمام احکامات کی تعمیل کرتے رہو گے۔ تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ تم نے اپنے سیف میں وہ تصویریں اور ویڈیو فلمیں بھی رکھی ہوئی تھیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمہارے اور رخشی کے درمیان ناجائز تعلقات رہے ہیں۔ تم نے اعتراف کیا ہے کہ سلطان ظفر تمہارے لہو کی پیداوار ہے۔"

وہ بڑے ہی شکست خوردہ انداز میں بولا۔ "میں مانتا ہوں' میری بہت ساری کمزوریاں تمہارے ہاتھوں میں رہیں گی اور میں تمہارا تابع دار بن کر رہوں گا۔"

"اب میں اپنے تابع دار سے کہہ رہا ہوں کہ ہماری دنیا میں پاکیزگی کو قائم رکھو... رکھو گے نا؟"

"ہاں۔ ضرور رکھوں گا۔"

"غلاظت کو مٹا ڈالو... مٹا ڈالو گے نا؟"

"ہاں ہاں... تم جو کہو گے' وہ کروں گا۔"

"تو پھر سلطان ظفر کا وجود غلیظ ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہو' اُسے مٹا ڈالو۔"

وہ ایک دم سے بوکھلا گیا۔ "یہ... یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"وہی جو تم سن رہے ہو۔"

"نہیں وکی! یہ ممکن نہیں ہے۔"

"کیا اس لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ تمہارا بیٹا ہے؟ اسے ختم کردینے کے خیال سے ہی تم بدحواس ہورہے ہو؟"

"بے شک! وہ میرا بیٹا ہے۔ ویسے سنگین حالات کے کسی موڑ پر بیٹا اپنے باپ کو اور باپ اپنے بیٹے کو بھی ہلاک

کر دیتا ہے۔"

"پھر ایسا کیوں کہہ رہے ہو کہ یہ ممکن نہیں ہے؟"

"تم نہیں جانتے' سلطان ظفر کیا سے کیا ہو گیا ہے؟ وہ ساری دنیا میں ایک معلم اور مجاہد کی حیثیت سے شہرت حاصل کر رہا ہے۔ اس کے آگے پیچھے ہزاروں مسلح جاں نثار ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔ اس کی اجازت کے بغیر ایک پرندہ بھی اڑتا ہوا اس کے قریب سے نہیں گزر سکتا۔"

وکی نے حیرانی سے پوچھا۔ "وہی معلم اور مجاہد سلطان ظفر جس کی تصویریں اور خبریں ٹی وی چینلز اور اخباروں میں آتی رہتی ہیں... تم اسے اپنا بیٹا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں۔ وہی میرا بیٹا ہے۔ ایک سچا مسلمان ہے۔ دینِ ایمان کی راہ میں جہاد کر رہا ہے۔ ایک دن شہادت کا درجہ حاصل کرے گا اور تم ایسے مومن کو مار ڈالنے کی بات کر رہے ہو؟"

وکی ذرا دیر چپ رہا پھر بولا۔ "یا خدا! مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ سچ بتاؤ' یہ کس قسم کا ناٹک کھیلا جا رہا ہے؟"

"یہ کوئی ناٹک نہیں ہے۔ سلطان کی حقیقت ساری دنیا کے سامنے ہے۔ سب ہی اسے معلم اور مجاہد تسلیم کر رہے ہیں۔"

"لیکن میں اتنی آسانی سے تسلیم نہیں کروں گا۔ اگر وہ فراڈ ثابت ہو گا تو تمہاری شامت آ جائے گی۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "کیا مصیبت ہے؟ ابھی وجی اور تمہارے پاپا کے رویے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی ثبوت کے بغیر اسے بہرِ پیا معلم اور مجاہد سمجھ رہے ہیں۔ اب تم بھی یہی کہو گے تو میں سچ کو سچ ثابت نہیں کر سکوں گا۔ میری شامت آ جائے گی۔ لہٰذا میں ابھی سے کہتا ہوں' سلطان ظفر مومن ہے یا شیطان... یہ وہی جانتا ہے۔ مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔"

"یعنی تم ایک باپ ہو کر بیٹے کے بارے میں یہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ مجاہد ہے یا بہروپیا؟ دنیا والے اس کے بہروپ سے دھوکا کھا سکتے ہیں۔ تمہیں تو اس کی اصلیت معلوم ہونی چاہیے؟"

وہ مجبور ہو کر بولا۔ "میں بیٹے کی حمایت میں بول کر پھنسنا نہیں چاہتا۔ بعد میں تم میری جان کو آ جاؤ گے۔ میں اچھی طرح تو نہیں جانتا مگر... اتنا اندازہ ہے کہ وہ خطرناک تنظیموں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ آگے نہ میں جانتا ہوں' نہ اس کے متعلق کوئی بات یقین سے کہہ سکتا ہوں۔"

وکی نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "میں نے سمجھوتا کرنے پر راضی ہوتے ہی تمہیں حکم دیا کہ ناجائز بیٹے کی گند صاف کرو اور تم اتنی دیر سے باتیں بنا رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "میں اپنی سلامتی کے لیے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہوں لیکن اس کے مسلح جانباز مجھے زندہ واپس نہیں آنے دیں گے۔"

"ہوں۔ میں مانتا ہوں' تم اسے ہلاک کرو گے تو خود کسی کے ہاتھوں مارے جاؤ گے۔ چلو، بیٹے کو جانے دو۔ میں آسان ٹارگٹ دیتا ہوں۔ ابھی اسی وقت رخشی کو اڑا دو۔"

"کیا...؟"

وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ شدید پریشانی سے بولا۔ "یہ... یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تم مجھے حکم نہیں دے رہے ہو' سزا دے رہے ہو۔ تمہارے لیے یہ آسان ہو گا لیکن میرے لیے یہ سب سے مشکل ٹارگٹ ہے۔"

"کوئی مشکل نہیں ہے۔ وہ ابھی تمہارے ساتھ لانچ میں ہے۔ اسے سمندر میں دھکا دے سکتے ہو یا پھر کیبن میں دبوچ کر اس کا کام تمام کر سکتے ہو۔"

"تم نہیں جانتے' سلطان ظفر اپنی ماں سے کتنی محبت کرتا ہے؟ یہ سمجھ لو کہ اس کی پرستش کرتا ہے۔ اس پر ایک ذرا سی بھی آنچ آئے گی تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"تو پھر اس پر ظاہر نہ ہونے دو کہ وہ تمہارے ہاتھوں ماری گئی ہے۔"

"وکی! تم یہ بھی نہیں جانتے کہ یہاں لانچ میں ہم کس مصیبت سے دوچار ہو رہے ہیں؟ وجی اور قربان واسطی نے رخشی کو گن پوائنٹ پر رکھا ہوا ہے۔ وہ مجھے مجبور کر رہے ہیں، اپنے مطالبات منوا رہے ہیں۔"

وکی نے خوش ہو کر کہا۔ "اوہو... یہ تو کمال ہو گیا۔ ان باپ بیٹے نے تمہاری لانچ میں آ کر تمہیں مجبور کر رکھا ہے۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ وہاں تم تینوں کی ملاقات ہونے والی تھی مگر اب یہ سن کر حیرت ہو رہی ہے۔ مجھے بھی سناؤ' یہ قصہ کیا ہے؟ میں تمام حالات سے باخبر رہنا چاہتا ہوں۔"

اس نے مختصر سے حالات بتائے کہ صبح سے لانچ میں کیا ہو رہا ہے؟ اصل جھگڑا ینیم کے لیے تھا۔ ہم باپ بیٹے مطالبہ کر رہے تھے کہ ینیم کو ہمارے حوالے کیا جائے گا تو ہم رخشی کو رہا کریں گے۔ اسے اور گورڈن کو گن پوائنٹ پر رکھ کر لانچ سے اتر کر ان کے مسلح گارڈز سے دور چلے جائیں گے۔

وکی پہلے سے اپنی بہن کے متعلق بہت کچھ جانتا تھا۔ جیسا کہ ابتدا میں وہ ہم سے بدظن تھا' اسی طرح اس نے بہن سے بھی گہری وابستگی نہیں رکھی تھی۔ گے گورڈن کی طرف ٹھوکریں ملنے کے بعد اس کی سوچ اور اس کا مزاج بدل

تھا۔ اب اسی بہن کے متعلق معلوم ہو رہا تھا کہ لانچ میں جھگڑا طول پکڑ رہا ہے۔ بات یہاں آ کر اٹکی ہوئی ہے کہ گے گورڈن ینیم کو ان کے حوالے کرے اور رخشی کو لے جائے۔

وکی نے کہا۔ "وجی اور پاپا کا مطالبہ جائز ہے۔ تم ابھی ان کی بات مان سکتے ہو۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ تم ان کا مطالبہ مان کر ہی رخشی کو حاصل کر سکو گے۔ مگر جانے میں جان بوجھ کر دیر کر رہے ہو۔ میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ تم یقیناً دوسرے ذرائع سے وجی اور پاپا پر دباؤ ڈالنے کی کوششیں کر رہے ہو۔"

"پلیز! مجھے غلط نہ سمجھو۔ اب میں تمہارے باپ اور بھائی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

"پہنچانے والے تھے مگر اب تمہاری دُکھتی رگیں میری ایک جھلک میں ہیں۔ ہمارے خلاف ایک ذرا سی غلطی کرو گے تو سیدھے جہنم میں جاؤ گے۔"

"میں کیسے یقین دلاؤں کہ وجی اور قربان واسطی کے خلاف کوئی سازش نہیں کر رہا ہوں؟"

"اس طرح یقین دلاؤ کہ ینیم کو فوراً ان کے حوالے کر دو۔"

"میں یہی کرنے والا ہوں مگر ایسا فوراً نہیں ہو سکے گا۔ ہمارے بھی کچھ راز ہیں۔ کچھ اہم معاملات ہیں۔ وہ جس خفیہ اڈے میں تھی، اسے وہاں سے نکال کر دوسری جگہ پہنچایا جا رہا ہے۔ شاید ایک آدھ گھنٹے میں وہ وہاں پہنچ جائے گی۔ پھر میں تم باپ بیٹوں کو وہاں کا پتا بتاؤں گا۔"

"وہ کس ملک میں ہے؟"

"پاکستان میں ہے۔ اسے ایک علاقے سے نکال کر لاہور پہنچایا جا رہا ہے۔"

وہ سراسر جھوٹ بول رہا تھا۔ وکی اس کا ڈسا ہوا تھا۔ اس پر بھروسا کرنے والا نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ "میرے پاپا اور وجی کے فون نمبر بتاؤ۔ میں ان سے بات کروں گا۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "ان سے کیا بات کرو گے؟ کیا مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟"

"کیا تم اپنے کسی دشمن پر بھروسا کرتے ہو؟ کیا مجھے تم پر بھروسا کرنا چاہیے؟"

وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ "وہ... دراصل بات یہ ہے کہ میں نے تمہارے باپ اور بھائی کو ینیم کے متعلق یہ نہیں بتایا کہ اسے لاہور منتقل کیا جا رہا ہے۔"

"زیادہ باتیں نہ کرو۔ ان کے نمبر بتاؤ؟"

اس نے نمبر بتائے۔ تھوڑی دیر بعد ہی پاپا کے فون سے کالنگ ٹون سنائی دی۔ انہوں نے نمبر پڑھ کر مجھ سے کہا۔ "نیا نمبر ہے۔ کوئی اجنبی کال کر رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہمارے دشمن فون بدل کر یا سم بدل کر باتیں کرتے ہیں۔ آپ اٹینڈ کریں۔"

انہوں نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ پھر پوچھا۔ "ہیلو! کون ہو تم...؟"

وکی فطرتاً بہت ہی ڈھیٹ تھا۔ انتہائی تکالیف سے گزرنے کے باوجود اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں آتے تھے۔ اسے پہلے کبھی کسی رشتے سے لگاؤ نہیں رہا تھا۔ اس لیے وہ کسی سے کوئی تعلق قائم کر کے جذباتی نہیں ہوتا تھا لیکن ان لمحات میں وہ فون پر اٹک گیا تھا۔ کچھ بولنے سے پہلے ہچکچا رہا تھا۔

پاپا نے پوچھا۔ "کون ہو بھائی...! خاموش کیوں ہو؟"

جواباً ایک گہری سانس سنائی دی۔ سانسوں کے درمیان اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ "پاپا!"

پاپا ایک دم سے لرز گئے۔ چیختے ہوئے بولے۔ "وکی! میرے بیٹے! یہ تم ہی ہو نا؟"

میں اور رخشی انہیں بڑی توجہ سے دیکھنے لگے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "ہاں۔ تم ہی ہو۔ میں تمہاری آواز لاکھوں میں پہچان سکتا ہوں۔ تم جب بھی مجھے مخاطب کرتے تھے تو جیسے پتھر مارتے تھے۔ اب بھی تم نے ایک ہی بار پاپا کہا ہے۔ مگر مجھے... مجھے پتھر نہیں لگا۔ کیا ہوا بیٹے...! کیا بیمار ہو؟ پتھر اٹھانے کے قابل نہیں ہو؟ چلو کنکر ہی مارو مگر کچھ تو بولو۔"

وہ تھوڑی دیر تک چپ رہا پھر بولا۔ "جب سے پیدا ہوا تب سے بیمار رہا۔ اب کچھ عرصے سے صحت یاب ہوتا آ رہا ہوں۔ لہو کے گہرے رشتوں کو پہچان رہا ہوں۔ میں اپنی پچھلی غلطیوں پر نہ شرمندگی ظاہر کروں گا اور نہ سوری کہوں گا۔"

"تمہارا یہ انداز ہی تمہارے اندر چھپی ہوئی شرمندگی کو ظاہر کر رہا ہے۔ یہ تمہارا مزاج ہے' سوری نہیں کہو گے۔ مگر تمہارے ضمیر نے چپکے سے سوری کہہ دیا ہے میری جان...!"

وہ مسکرا کر بولا۔ "آئی لو یو پاپا...!"

پاپا نے کہا۔ "آئی لو یو ٹو میرے بچے...!"

اس نے پوچھا۔ "کیا وجی مجھ سے بات کرنا چاہے گا؟"

انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے فون پر کہا۔ "بھائی بھائی سے بات نہیں کرے گا تو کیا دشمنوں سے کرے گا؟ یہ لو، بات کرو۔"

انہوں نے فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اسے لے کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ساری دنیا شیطان سے پناہ مانگتی ہے، اس سے دور بھاگتی ہے مگر وہ کسی نہ کسی بہانے

قریب آہی جاتا ہے اور تم آہی گئے... کچھ بولو' آواز تو سناؤ۔ معلوم تو ہو' شیطان بول رہا ہے یا بھائی...؟''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''زیادہ طعنے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں چکنا گھڑا ہوں۔ ساری باتیں پھسل جاتی ہیں۔''

میں ہنسنے لگا۔ اس نے کہا۔ ''میں عادت سے مجبور ہوں۔ جسے چاہتا ہوں، دماغی جھٹکے پہنچاتا ہوں۔ اس کیبن سے باہر گے گورڈن کو جھٹکے پہنچ رہے ہیں اور اب یہاں تمہیں جھٹکا پہنچے گا۔''

میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''مجھے کسی کی کمزوریوں سے کھیلنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہاری ایک کمزوری میرے ہاتھوں میں ہے۔''

''ذرا اپنی بکواس کی وضاحت کرو گے؟''

پاپا نے ایک ذرا چونک کر مجھے دیکھا۔ دوسری طرف سے وکی نے پوچھا۔ ''تمہاری جان سے پیاری محبوبہ اچانک گم ہوگئی تھی نا؟''

ایک دم سے جینا کا سراپا میری نگاہوں کے سامنے آگیا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''ہاں۔ جینا لاپتا ہے۔ میں اس کے لیے پریشان ہوں۔''

''تمہارے ماتحت جاسوس اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ مگر وہ بے چارے برقعے میں رہنے والی کسی مسلمان لڑکی کا نقاب الٹ کر دیکھ نہیں سکتے۔ اگر دیکھ لیتے تو تمہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ مجھے وجی سمجھ کر دھوکا کھا رہی ہے اور میرے ساتھ دن رات گزار رہی ہے۔''

میں ایک دم سے تن گیا۔ دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر فوراً بولو... تم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟''

''میں نے وہی سلوک کیا ہے جو ایک بھائی کو بھائی کی امانت کے ساتھ کرنا چاہیے۔ وجی! وہ ہمارے خاندان کی عزت بننے والی ہے اور سب سے پہلے میں نے اسے عزت دی ہے۔''

میں جیسے مسرتوں سے پھٹ پڑا۔ ہنستے ہوئے بولا۔ ''میں بیان نہیں کرسکتا' تم میری نظروں میں کتنے بلند ہو گئے ہو۔ ابھی سامنے ہوتے تو گلے لگا کر خوب پیار بھی کرتا اور پٹائی بھی کرتا۔''

وہ حیرانی سے بولا۔ ''پٹائی کیوں کرتے؟''

''پتا نہیں کیوں؟ ہم نے بچپن میں مار پیٹ نہیں کی۔ شاید تم سے مل کر دل چاہے گا کہ بچپن کی یہ کمی پوری کی جائے۔ بائی دا وے... جینا کہاں ہے؟''

وہ بتانے لگا کہ جینا اس سے بدظن ہوگئی تھی۔ یہ سمجھ گئی تھی کہ میرے دھوکے میں اسے وجی سمجھ رہی ہے۔ اسی لیے اس سے پیچھا چھڑا کر بھاگ گئی۔

وکی نے کہا۔ ''میں نے بھی اسے بھاگنے دیا۔ مگر چپ چاپ اس کا پیچھا کرتا رہا اور ایسے ہی وقت میں نے مشتبہ افراد کو اس کے تعاقب میں دیکھا۔''

میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''وہ کون لوگ تھے؟''

''یہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ پتا نہیں' وہ کون تھے اور جینا سے کیا چاہتے تھے؟ وہ مجھ سے چھپ کر لندن جانا چاہتی تھی۔ میں بھی اسے چھوٹ دے رہا تھا لیکن جب ان مشتبہ افراد کو اس کے تعاقب میں دیکھا تو میں نے اسے اپنی پناہ میں لے آنا مناسب سمجھا۔''

وہ مشتبہ افراد کون تھے؟ کیوں جینا کا تعاقب کر رہے تھے؟ اس کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔ فی الحال میں ان دشمنوں کو نہیں جانتا تھا۔ نہ ہی وکی کو ان کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکا تھا لیکن آگے چل کر بہت کچھ معلوم ہونے والا تھا۔

میں چپ چاپ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ ذرا ٹھہر کر بولا۔ ''اس وقت وہ مجھے اپنا دشمن سمجھ رہی تھی۔ میرے ساتھ آنا نہیں چاہتی تھی۔ تب میں نے اس سے جھوٹ بولا کہ وجی میرا بھیس بدل کر دشمنوں کے درمیان پہنچا ہوا ہے۔ اگر وہ میری قیدی بن کر نہیں رہے گی تو میں وجی کا بھید کھول دوں گا۔ تب اس نے تمہاری سلامتی کی خاطر میرے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ورنہ وہ تو مجھ سے اس قدر بدظن تھی کہ میرے ساتھ جانے کے بجائے موت کو گلے لگانا چاہتی تھی۔''

میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ''اب وہ کہاں ہے؟''

''میرے پاس خیریت سے ہے۔ اس کا فون نمبر نوٹ کرو اور اس سے باتیں کر کے اپنی تسلی کرلو۔''

ہم صبح سے سنگین حالات سے دوچار ہوتے آرہے تھے۔ جینا کا معاملہ سنگین نہیں رہا تھا۔ اب اسے رنگین کہا جاسکتا تھا۔ میں ابھی اس سے باتیں کر کے یہ تسلی دے سکتا تھا کہ وہ بے یار و مددگار نہیں رہی ہے۔

میں نے وہ فون پاپا کی طرف بڑھا دیا۔ پھر اپنے فون سے وکی کے بتائے ہوئے نمبر پر رابطہ کرنے لگا۔ اس سے باتیں کیے جیسے صدیاں بیت گئی تھیں۔ پھر میں نے صدیوں بعد اس کی رس بھری آواز سنی۔ ''ہیلو! تم کون ہو؟''

میں واش روم میں آگیا تھا کیونکہ کمرے میں پاپا اور

وکی فون پر بول رہے تھے۔ میں نے بڑی محبت سے کہا۔ ''جینا! میری جان! مجھے آواز سے پہچانو۔ بولو میں کون ہوں...؟''

وہ ذرا چپ رہی۔ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر ایک دم سے بھڑک کر بولی۔ ''یہ کیا ڈراما ہے؟ وجی کی آواز بنا کر کیوں بول رہے ہو؟ میں کوئی دھوکا نہیں کھاؤں گی۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں وکی نہیں ہوں۔ پلیز! اب دھوکا نہ کھاؤ۔ مجھے پہچان لو۔''

''پہچاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے وجی کی سلامتی کے لیے مجھے قیدی بنا کر رکھا ہے۔ پھر یہ کیا ناٹک کر رہے ہو؟''

''ایک بات کا جواب دو' اگر میں وکی ہوں تو بتاؤ' میں نے کبھی تمہیں میلی نظروں سے دیکھا ہے؟''

وہ ایک جھٹکے سے بولی۔ ''نہیں...''

''کیا تمہیں کبھی ہاتھ لگایا ہے؟''

اس نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''نہیں لگایا... مگر یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

اس کا غصہ اور اس کی نفرت بتا رہی تھی کہ وہ دل کی گہرائیوں سے مجھے چاہتی ہے۔ میری جگہ کبھی کسی اور کو دینا نہیں چاہے گی۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم مجھے وجی تسلیم نہ کرو لیکن جب سامنے آؤں گا تو کیسے پہچانو گی؟ ہم دونوں بھائی صورت' شکل اور قد و قامت سے بالکل ایک جیسے ہیں۔''

''وجی کو دیکھ کر میرا دل گواہی دے گا کہ میں اپنے چاہنے والے کی پناہ میں آگئی ہوں۔ اب تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔''

''تو پھر پہلے تمہارے دل نے یہ گواہی کیوں نہیں دی کہ تم اس کے پاس پہنچ کر دھوکا کھا رہی ہو؟ آئندہ میرے سامنے آکر مجھے وجی کی حیثیت سے کیسے پہچانو گی؟''

وہ الجھ کر بولی۔ ''کسی بھی طرح پہچان لوں گی۔ پلیز! تم وجی بن کر نہ بولو۔''

''میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟ آج کسی وقت تم سے ملنے آؤں گا تو سارا معاملہ صاف ہو جائے گا۔''

''تم مجھے یہاں لاک کر کے خود پتا نہیں کہاں غائب ہوگئے ہو؟ اب فون پر یہ تماشا کر رہے ہو۔ کیا اب کوئی نیا گیم کھیلنا چاہتے ہو؟ پلیز وکی! مجھ پر رحم کرو۔ میں اپنے وجی کی سلامتی کے لیے وعدہ کر چکی ہوں' کبھی تمہیں دھوکا دے کر فرار ہونے کی کوشش نہیں کروں گی۔ پھر میرے ساتھ یہ مذاق کیوں کر رہے ہو؟''

مجھے اس کی حالت پر پیار آرہا تھا۔ میں نے بڑی محبت سے کہا۔ ''میری جان! میں تمہارا وجی ہی بول رہا ہوں۔ تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟ کیا مجھے سامنے دیکھ کر پہچان پاؤ گی؟''

وہ ذرا دیر چپ رہی۔ جیسے کسی الجھن کا شکار ہو پھر پریشان ہو کر بولی۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا' کیا کروں؟ یہ سوال مجھے پریشان کر رہا ہے۔ میں اپنے وجی کو پہچان بھی پاؤں گی یا پھر دھوکا کھا جاؤں گی؟ تم...''

وہ بولتے بولتے چپ ہوگئی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

فون پر مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کسی دروازے کو کھول کر بند کیا گیا ہے۔ پھر مردانہ آواز سنائی دی۔ ایسا لگ رہا تھا' کوئی جینا سے ذرا دور کسی سے باتیں کر رہا ہے۔ وہ چپ تھی۔ کچھ بول نہیں رہی تھی۔ میں نے پھر پوچھا۔ ''جینا...! تم چپ کیوں ہو؟ وہاں کون آیا ہے؟''

دوسری طرف جینا حیران پریشان دیدے پھیلائے دروازہ کھول کر آنے والے وکی کو دیکھ رہی تھی اور ادھر فون کے ذریعے میری آواز سن رہی تھی۔ وکی اپنے فون پر پاپا سے باتیں کر رہا تھا۔ مسکراتا ہوا وہاں آکر ایک صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

اب مجھے اس کی آواز اور لب و لہجہ واضح طور پر سنائی دے رہا تھا۔ میں نے جینا سے پوچھا۔ ''کیا وکی وہاں آیا ہے؟''

وہ جیسے چونک کر بولی۔ ''آں۔ ہاں... یہ وکی ہے۔''

''اگر وہ وکی ہے تو پھر بولو... میں کون ہوں؟''

وہ تھوڑی دیر تک چپ رہی۔ اس نے لفظوں سے کچھ نہیں کہا۔ آنسوؤں کی زبان سے بولنے لگی۔ شدتِ جذبات سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے تڑپ کر کہا۔ ''پلیز جینا! چپ ہو جاؤ۔ تمہارے آنسو میرے دل پر گر رہے ہیں۔''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''آنکھوں سے دیکھ کر اور کانوں سے سن کر بھی یقین نہیں آرہا ہے کہ...''

پھر وہ جیسے چونک کر بولی۔ ''مگر وکی نے تو بتایا تھا' تم دشمنوں کے درمیان پہنچے ہوئے ہو۔ اگر میں یہاں اس کی قیدی بن کر نہ رہی تو ادھر تمہاری سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی؟''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''خدا کا شکر ہے' تمام حالات میرے موافق ہیں۔ بے شک! اس نے درست کہا ہے' میں دشمنوں کے درمیان پہنچا ہوا ہوں۔ لیکن میری سلامتی کو کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ یہاں تو لہو کے بچھڑے ہوئے رشتے ایک

ہورہے ہیں۔"

اس نے کن انکھیوں سے وکی کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ "تو کیا یہ دشمنی سے باز آگیا ہے؟"

"دراصل وہ میرا دشمن تھا ہی نہیں۔ اگر ہوتا تو کیا تم ایک دشمن کی پناہ میں عزت آبرو سے رہتیں؟ ابھی تم نے خود ہی اس کی شرافت کا اعتراف کیا ہے۔"

اس نے قائل ہوکر کہا۔ "ہاں... یہ تو ہے۔"

"اب اس سے خوف زدہ رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمہیں بہ خیریت میرے پاس پہنچادے گا۔ ہم جلد ہی ایک دوسرے سے مل سکیں گے۔ ابھی فون بند کررہا ہوں۔ یہاں ضروری معاملات نمٹانے ہیں۔"

ہمارا رابطہ ختم ہوگیا۔ گمشدہ محبوبہ کو پاکر میرے اندر یہ بے چینی پیدا ہوئی کہ اب جلد از جلد اس لانچ سے نکلا جائے اور اپنی جینا تک پہنچا جائے۔ نانا جان نے کہا تھا کہ ایک آدھ گھنٹے میں کام ہوجائے گا۔ ان کے آدمی ینم کو کسی محفوظ پناہ گاہ میں پہنچادیں گے۔ مگر دو گھنٹے گزر چکے تھے اور وہ ینم کے سلسلے میں کوئی خوش خبری نہیں سنا رہے تھے۔

میں نے ان کے نمبر پنچ کیے۔ فون کو کان سے لگایا تو یہ ریکارڈنگ سنائی دی کہ مطلوبہ نمبر سے فی الحال رابطہ ممکن نہیں ہے۔

میں واش روم سے نکل کر کمرے میں آگیا۔ وہاں پاپا فون پر وکی سے باتیں کررہے تھے۔ پھر وہ مجھے رخشی کے پاس چھوڑ کر واش روم میں آگئے۔ وہاں انہوں نے وکی سے کہا۔ "گے گورڈن تم سے جھوٹ بول رہا ہے۔ ینم کو لاہور نہیں پہنچایا جائے گا۔ وہ اسلام آباد میں ہے۔ ہمیں اس کا پتا معلوم ہے۔ تمہارے نانا اسے وہاں سے کسی محفوظ مقام پر پہنچادیں گے۔"

وکی نے کہا۔ "پھر تو آپ دونوں کو یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔ میں ابھی گے گورڈن کی گردن دبوچتا ہوں۔ وہ آپ کو اور وجی کو روکنے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

کیبن کے باہر گے گورڈن اپنے بیٹے سلطان ظفر سے فون پر باتیں کررہا تھا۔ سلطان باپ کو تسلیاں دے رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ "اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں سے معاملات طے ہوگئے ہیں۔ وہ حتمی فیصلہ کرنے کے بعد وجی کو حکم دیں گے کہ وہ میری مام کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ انہیں لانچ میں تمہارے پاس چھوڑ کر چلا جائے۔ ایسے وقت تم بھی وجی اور قربان واسطی کو جانے سے نہیں روکو گے۔"

اس نے ایک کان کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "میں کان پکڑتا ہوں۔ انہیں نہیں روکوں گا۔ میں تو دعائیں مانگ رہا ہوں کہ وہ ابھی یہاں سے چلے جائیں۔ وکی میرے لیے نہ ختم ہونے والا عذاب بن گیا ہے۔"

وہ اسے وکی سے ہونے والی باتیں تفصیل سے بتانے لگا۔ سلطان ظفر نے کہا۔ "ڈیڈ! اس میں شبہ نہیں کہ وکی نے آپ کو الٹا دیا ہے۔ آئندہ آپ اس کے خلاف کچھ نہیں کرسکیں گے۔"

وہ بولا۔ "میں کبھی اس کے خلاف کیا کرسکوں گا' یہ بعد کی بات ہے۔ ابھی تو میری جان کے لالے پڑے ہیں۔ مجھے انڈر ورلڈ والوں سے اور انٹیلی جنس والوں سے چھپ کر رہنا ہوگا۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا کہ کب تک روپوش رہ کر زندگی گزارتا رہوں گا؟"

وہ باپ بیٹے فون پر مصروف تھے۔ ایسے وقت وکی بار بار گے گورڈن سے رابطہ کرنے کی کوششیں کررہا تھا مگر اس کا فون بہ دستور انگیج جارہا تھا۔ دراصل وہ گے گورڈن کو حکم دینا چاہتا تھا کہ مجھے اور پاپا کو فوراً وہاں سے جانے کا راستہ دیا جائے۔ ینم کے سلسلے میں جو تنازعہ ہے، اس سے بعد میں نمٹا جائے گا۔

مگر ادھر فون مسلسل مصروف تھا۔ باپ بیٹے کی باتیں شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہوتی جارہی تھیں۔ ایسے وقت نانا جان نے مجھے فون پر مخاطب کیا۔ میں نے پوچھا۔ "آپ کہاں رہ گئے تھے؟ اتنی دیر کیوں ہوگئی؟ اور یہ کس کے نمبر سے بات کررہے ہیں؟"

انہوں نے کہا۔ "ارے بیٹا! کیا بتاؤں؟ بڑھاپے میں یادداشت کمزور ہوگئی ہے۔ ائرپورٹ میں نہ جانے کہاں موبائل فون بھول کر چلا آیا؟ ابھی قاہرہ پہنچنے کے بعد یہ نیا فون خرید کر تم سے بول رہا ہوں۔"

"نانا جان! میں ینم کے لیے بہت پریشان ہوں۔"

"فکر نہ کرو۔ میرا دستِ راست اپنے کارندوں کے ساتھ اس کی کوٹھی میں پہنچ رہا ہے۔ تم میرے فون کا انتظار کرو۔ میں ابھی ان سے رابطہ کرتا ہوں۔"

انہوں نے مجھ سے رابطہ ختم کرکے اپنے دستِ راست سے پوچھا۔ "کیا ہورہا ہے؟"

اس نے کہا۔ "ہم کوٹھی کے اندر ہیں۔ یہاں ایک خاتون اور دو نوجوان لڑکیاں ہیں۔ خاتون کچھ ایبنارمل سی لگتی ہے۔ کبھی اس لڑکی کو اور کبھی اُس لڑکی کو ینم کہہ رہی ہے۔"

"تم لڑکیوں سے ان کے نام پوچھو۔"

"یہ دونوں سہمی ہوئی تھیں۔ جب میں نے کہا کہ کسی

کو اغوا نہیں کیا جائے گا۔ جو ینم ہے' اسے اس کے بھائی وجاہت علی کے پاس پہنچایا جائے گا' تب ایک لڑکی نے خود کو ینم کہا ہے۔"

"پھر وہی ینم ہے۔ اسے لے آؤ۔"

"سر! اگر وجی بابا اس لڑکی سے فون پر بات کرلیں اور اس کے ینم ہونے کی تصدیق کرلیں تو بہتر ہوگا۔"

"اچھی بات ہے۔ ابھی وجی تم سے بات کرے گا۔"

نانا جان نے مجھے اپنے دستِ راست کا نمبر بتایا۔ پھر کہا۔ "اس سے بات کرو۔ وہاں دو لڑکیاں ہیں۔ یہ پہچانو کہ ان میں سے ینم کون ہے؟ تب ہی اسے وہاں سے لے جایا جائے گا۔"

میں نے ان کے دستِ راست سے رابطہ کیا۔ اس نے فوراً ہی ینم سے میری بات کرائی۔ میں اس کی آواز سنتے ہی پہچان گیا۔ میں نے پوچھا۔ "ینم! اس کوٹھی میں تمہارے ساتھ وہ خاتون اور لڑکی کون ہے؟"

اس نے کہا۔ "یہ میری وائی ماں جمیلہ خاتون ہیں۔ انہوں نے بچپن سے میری پرورش کی ہے۔ یہ دوسری جو میری ہم عمر ہے، اس کا نام عالیہ ہے۔ یہ وائی ماں کی بیٹی ہے۔"

"کیا جمیلہ تمہارے وہاں سے جانے پر اعتراض کررہی ہے؟"

"نہیں... میری یہ ماں جی بہت خوش ہیں کہ میں اپنے پاپا اور بھائیوں کے پاس پہنچ جاؤں گی اور ان پر یہ الزام نہیں آئے گا کہ انہوں نے مجھے پاپا کے حوالے کیا ہے۔ یہ بیان دیں گی کہ چند مسلح افراد یہاں آئے تھے اور وہ مجھے جبراً یہاں سے لے گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ وائی ماں کو یہی بیان دینا چاہیے۔ ویسے رخشی کو ابھی معلوم ہوجانا چاہیے کہ ہم تمہیں حاصل کرچکے ہیں۔ میں ابھی اس سے تمہاری بات کراتا ہوں۔"

میں واش روم سے نکل کر کمرے میں آیا۔ رخشی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے پاپا سے بولا۔ "آپ کے لیے خوش خبری ہے۔ ہماری ینم ہمارے پاس پہنچ رہی ہے۔"

رخشی نے چونک کر بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "جب میں پہلی بار تمہارا فون لے کر واش روم میں گیا تھا' تب ہی ینم سے میرا رابطہ ہوگیا تھا۔ اس کا رہائی پتا معلوم ہوگیا تھا۔ اب تمہیں سمجھ جانا چاہیے کہ ہم یہاں کئی گھنٹے کیوں ضائع کرتے رہے؟ بس یہی انتظار تھا کہ ہماری بہن ہماری تحویل میں آجائے۔ لو... اس سے بات کرو۔"

اس نے فوراً ہی فون لے کر اسے کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ "ینم! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟"

"پتا نہیں آپ کیا سن رہی ہیں؟ اس وقت میں ماں جی اور عالیہ کے ساتھ چار مسلح افراد کے نرغے میں ہوں۔ یہ مجھے یہاں سے لے جانا چاہتے ہیں۔"

"تم نے وجی سے باتیں کی تھیں پھر فون بند کردیا تھا۔ مجھ پر یہ ظاہر کررہی تھیں کہ فون میں خرابی پیدا ہوگئی ہے۔ تم مجھے دھوکا دے رہی ہو۔"

"خالہ جان! مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن پاپا تک پہنچنے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے بھائی جان کو یہاں کا پتا بتادیا تھا۔ اب میں اپنی مرضی سے لہو کے رشتوں کی طرف جارہی ہوں۔"

وہ غصے سے تنتنا کر بولی۔ "تم ہمیں دھوکا دے کر بہت بڑی غلطی کررہی ہو۔"

"جو کرنا تھا' وہ کرچکی ہوں۔ آپ کی طرف واپسی کا راستہ بند ہوچکا ہے۔ خدا حافظ..."

"ابھی خدا حافظ نہ کہو۔ میری بات سنو۔"

دستِ راست کی آواز سنائی دی۔ "اور کوئی بات نہیں ہوگی۔ فون وجی بابا کو دو۔"

رخشی نے ناگواری سے مجھے دیکھا۔ میں نے اس سے فون لے کر کان سے لگالیا۔ دوسری طرف سے ینم کی آواز سنائی دی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا تم نے اپنا فون ضائع کردیا ہے؟"

اس نے کہا۔ "نہیں... میں نے اب تک اسے بند رکھا تھا۔"

"اسے آن رکھو۔ میں پھر کسی وقت بات کروں گا۔ اب وہاں سے جاؤ۔ خدا حافظ..."

میں نے رابطہ ختم کرکے کیبن کے دروازے پر ہاتھ مارا پھر اونچی آواز میں کہا۔ "گے گورڈن! یہاں دروازے کے پاس آؤ۔ ہتھیار پھینک کر دونوں ہاتھ اٹھا کر دوسری طرف گھوم جاؤ۔ ہم تمہیں گن پوائنٹ پر یہاں سے لے جائیں گے۔"

اس وقت وکی فون پر اس دشمن سے یہی کہہ رہا تھا۔ اس نے فون کے ذریعے میری آواز سنی پھر کہا۔ "وجی تم سے کچھ کہہ رہا ہے۔ اس کے پاس جاؤ اور کہو' تم میرے حکم کی تعمیل کررہے ہو۔ انہیں یہاں سے جانے کا راستہ دے رہے ہو۔"

وہ بولا۔ "وجی کیبن سے باہر آکر مجھے گن پوائنٹ پر رکھ کر یہاں سے جانا چاہتا ہے۔ میں فون بند کرکے ادھر جا

رہا ہوں۔"

اس نے کہا۔ "نہیں۔ فون بند نہ کرنا۔ میں سنتا رہوں گا اور سمجھتا رہوں گا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟"

گے گورڈن حکم کا غلام بنا ہوا تھا۔ اس نے دروازے کے پاس آ کر کہا۔ "میں آ گیا ہوں۔ فون میرے کان سے لگا رہے گا۔ وکی معلوم کرتا رہے گا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

پاپا نے رخشی کے پیچھے آ کر اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ اس کی گردن سے ریوالور کی نال لگا کر دروازے کے پاس آ گئے۔

میں نے اس سے کہا۔ "اپنے یار سے کہو لانچ میں اوپر سے نیچے تک جتنے بھی مسلح گارڈز ہیں، وہ سب ہتھیار پھینک دیں۔ ہمارے راستے سے اور سیڑھیوں سے دور رہیں۔ ورنہ تم چشم زدن میں ماری جاؤ گی۔"

رخشی نے اونچی آواز میں میری باتیں دہرائیں۔ ایک منٹ کے بعد ہی ہم کیبن کا دروازہ کھول کر باہر آ گئے۔ گے گورڈن فون کو کان سے لگائے تنہا کھڑا ہوا تھا۔ کتنی ہی گنیں فرش پر پڑی ہوئی تھیں۔ کوئی گارڈ نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے پیچھے سے گے گورڈن کی گردن دبوچ کر اس کے فون کے قریب منہ لے جا کر کہا۔ "وکی! ہم یہاں سے نکل رہے ہیں۔ رخشی اور گے گورڈن ہمارے نشانے پر ہیں۔ خدانخواستہ ہمیں کچھ ہوا تو یتیم کا خیال رکھنا۔ نانا جان سے رابطہ کرنے کے بعد تم بہن تک پہنچ سکو گے۔ وہ نانا جان کی پناہ میں پہنچ گئی ہے۔"

یہ وکی کے لیے بہت بڑی خوش خبری تھی۔ گے گورڈن نے ہمارے نشانے پر وہاں سے چلتے ہوئے رخشی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے کہا۔ "ہاں۔ یہ لوگ بڑی چالاکی سے یتیم کو حاصل کر چکے ہیں۔"

ہم لانچ سے نکل کر ساحل پر آ گئے۔ وہاں پاپا کی اور رخشی کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے کہا۔ "پاپا! ہو سکتا ہے، آپ کی کار میں دھماکا خیز مواد رکھا گیا ہو۔ اس لیے ہمیں رخشی کی گاڑی میں جانا چاہیے۔"

ہم نے رخشی کے ڈرائیور سے گاڑی کی چابی لے لی۔ میں ان دونوں کے ساتھ پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ پاپا نے اسٹیئرنگ سیٹ سنبھال لی۔ گے گورڈن نے پریشان ہو کر کہا۔ "تم دونوں بہ خیریت نکل آئے ہو۔ اب ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "چپ چاپ چلو۔ جب یہ یقین ہو جائے گا کہ ہمارا تعاقب نہیں کیا جا رہا ہے تو ہم تمہیں گاڑی سے باہر پھینک دیں گے۔"

پاپا نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے عقب نما آئینے میں دیکھتے جا رہے تھے۔ بہت دور تک نکل آنے کے بعد یقین ہو رہا تھا کہ ہمارا تعاقب نہیں کیا جا رہا ہے۔ ہم سمندر کے کنارے ویران ساحلی سڑک پر جا رہے تھے۔ پاپا نے ایک جگہ کار روک دی۔

میں نے ان دونوں سے کہا۔ "چلو، باہر آؤ۔"

ہم سب کار سے باہر آ گئے۔ رخشی کا فون ہمارے پاس تھا۔ میں نے گے گورڈن سے بھی اس کا فون لے لیا۔ اس نے عاجزی سے کہا۔ "ہمیں اس ویرانے میں گاڑی نہیں ملے گی۔ فون تو رہنے دو۔ ہم اس کے ذریعے ٹیکسی والوں کو کال کر سکیں گے۔"

میں نے کہا۔ "اس راستے پر گاڑیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ کسی نہ کسی سے لفٹ مل جائے گی۔ اتنی خیر مناؤ کہ ہم تمہیں زندہ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔"

گے گورڈن کا فون اب تک آن تھا۔ میں نے اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ "وکی! کیا تم موجود ہو؟"

اس نے کہا۔ "ہاں۔ یہ فون اپنے پاس رکھو۔ انہیں خوار ہونے دو۔ وہاں سے چلے آؤ۔"

میں اور پاپا اگلی سیٹ پر آ گئے۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے گے گورڈن اور رخشی پر الوداعی نظر ڈالی۔ پھر وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

میں نے فون پر کہا۔ "وکی! میں اور پاپا صبح سے لانچ میں پھنسے ہوئے تھے، دشمنوں پر غالب آنے کے بعد بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ انہیں بری طرح مات دے چکے ہیں۔"

وکی نے کہا۔ "میں نے گے گورڈن کی جتنی کمزوریاں حاصل کی ہیں، ان کے آگے وہ کبھی دم نہیں مار سکے گا۔"

پاپا نے کہا۔ "میری بیٹی مجھے واپس مل رہی ہے۔ اب ہماری کوئی کمزوری دشمنوں کے پاس نہیں رہی ہے۔"

ہم سب مسرتوں سے سرشار ہو رہے تھے۔ ہم نے بہت بڑی فتح حاصل کی تھی۔

وکی نے کہا۔ "ہم سب بیس برسوں سے بچھڑے ہوئے تھے۔ کسی نہ کسی طرح دشمنوں کے زیر اثر تھے اور بدترین حالات سے گزرتے آ رہے تھے۔ واقعی ابھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ ہم نے ایک ہی دن میں تمام حالات پر قابو پا لیا ہے۔ دشمن کو اس طرح زیر کیا ہے کہ وہ آئندہ ہم سے ٹکرانے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔"

پھر اس نے ذرا توقف سے پوچھا۔ ''بائی داوے... ابھی آپ دونوں کہاں جا رہے ہیں؟''

میں نے سر گھما کر پاپا کو دیکھا۔ پھر فون پر کہا۔ ''ہم اپنے گھر جا رہے ہیں۔ ماما کے پاس...''

پاپا نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ دوسری طرف سے وکی نے کہا۔ ''گھر اُسے کہتے ہیں جہاں لہو کے رشتے آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ برسوں بعد ہمارا گھرانا مکمل ہو رہا ہے۔ ایک چار دیواری میں سمٹ رہا ہے۔ میں بھی ماما کی آغوش میں پہنچنے کے لیے بے چین ہوں۔''

''ابھی تم ہو کہاں...؟''

''پیرس میں ہوں۔ فکر نہ کرو۔ جلد ہی اپنی بھابھی کے ساتھ گھر لوٹوں گا۔''

میں زیرِ لب مسکرانے لگا۔ جینا کو تصور میں دیکھنے لگا۔ وکی نے اسے بھابھی کہا تھا اور میں خیالوں میں اسے دلہن بنا ہوا دیکھ رہا تھا۔ وہ خواب خواب سی دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن ان لمحات میں مجھے نصیب ہونے والی خوشیاں خواب نہیں تھیں۔ لہو کے رشتے مل رہے تھے۔ یہ یقین تھا کہ وہ بھی ملنے والی ہے۔

ویسے جھولی بھر کر من کی مرادیں ملتی رہیں تو ڈر لگنے لگتا ہے' کہیں کسی دشمن کی نظر نہ لگ جائے۔ میں خیالوں میں کہیں گم تھا۔ ایسے وقت میرے کانوں میں جیسے رس گھلنے لگا۔ جینا کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وکی نے اپنا فون اسے دے دیا تھا۔ وہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''ہیلو وجی! میں وکی کی باتیں سنتی رہی ہوں۔ ابھی یہ سن کر بہت خوشی ہو رہی ہے کہ تم اور تمہارے پاپا دشمنوں کو بری طرح شکست دے کر گھر لوٹ رہے ہیں۔''

''ہاں جینا! یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے۔ اس نے ہمیں دشمنوں کے مقابلے میں شہ زور بنایا ہے۔ ہم نے اس لانچ میں صبح سے اب تک صرف چند گھنٹے نہیں گزارے بلکہ بیس برسوں کے فاصلے طے کیے ہیں۔''

''تمہاری خوشیاں دیکھ کر اور یہ سب کچھ سن کر اتنی آسودگی مل رہی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ جی تو چاہتا ہے' ابھی اسی وقت اڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔''

پیچھے سے وکی نے شوخ لہجے میں کہا۔ ''اڑنے کے لیے جہاز کے پر چاہئیں بھابھی جان! اور ہمیں اڑانے والا جہاز کل صبح سے پہلے نہیں اڑے گا۔''

میں اس کی بات سن کر ہنسنے لگا۔ ایسے ہی وقت مجھے اپنے پرسنل موبائل فون کی کالنگ ٹون سنائی دی۔ میں نے جینا سے کہا۔ ''جسٹ آمنٹ...''

پھر اپنے فون کو نکال کر دیکھا۔ ننھی سی اسکرین پر حمزہ کے نمبر دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے جینا سے کہا۔ ''میں تمہیں بعد میں کال کرتا ہوں۔''

میں نے اس سے رابطہ ختم کر کے دوسرا فون آن کر کے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں' بولو حمزہ!''

''میں بڑی دیر سے ٹرائی کر رہا ہوں۔ آپ کا فون مسلسل آف جا رہا تھا۔ دراصل... آپ کو ایک خبر سنانا ہے۔''

''کیسی خبر...؟''

''خبر ایسی ہے کہ ایک ہی وقت میں اچھی بھی ہے اور بری بھی...''

میں نے پریشان ہو کر کہا۔ ''پلیز! جلدی بولو' کیا بات ہے؟''

''ہمارے پاس جینا کا فون آیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ وکی زندہ ہے اور جینا آپ کے دھوکے میں اس کے پاس پہنچ گئی ہوئی ہے۔ اب اس کی اصلیت جاننے کے بعد اس کی پناہ سے نکل کر بھاگی ہے۔ کل صبح یہاں لندن پہنچے گی۔ اس نے کہا تھا' وہ ہم سے رابطے میں رہے گی۔ مگر کئی گھنٹے گزرنے کے باوجود اس کی دوسری کال نہیں آئی۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''کیونکہ اب وہ میرے رابطے میں ہے۔''

''پھر تو آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ وکی زندہ ہے' وہ آپ کے لیے مصیبت بن سکتا ہے۔''

''ہاں۔ خدا کا شکر ہے' میرا بھائی زندہ ہے اور میرے لیے باعثِ رحمت بنا ہوا ہے۔''

وہ تعجب سے بولا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

میں اسے تمام حالات تفصیل سے بتانے لگا۔ وہ تمام باتیں سن کر خوش ہو کر بولا۔ ''اس کا مطلب ہے' آپ کو بہت مبارک ہے۔ آپ برسوں پرانے دشمنوں کو چاروں شانے چت کر کے لوٹ رہے ہیں۔ لہو کے رشتے بحال ہو رہے ہیں۔ اس خوشی میں یہاں جشن ہونا چاہیے۔''

میں نے پاپا کو دیکھتے ہوئے فون پر کہا۔ ''واقعی آج کا دن ہمارے لیے عید سے بڑھ کر ہے۔ میرے پاپا گھر لوٹ رہے ہیں۔ کل میرا بھائی بھی آ جائے گا۔ بے شک ابھی ان خوشیوں کو انجوائے کرنا چاہیے۔''

ہم سب ہی مسرتوں سے نہال ہو رہے تھے۔ مجھے ماما کے پاس پہنچنے کی بے چینی تھی۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وکی کو ان کے قدموں میں لا کر رہوں گا۔ مگر اس وقت حالات کچھ اور تھے۔ ہم سب ہی وکی کو مُردہ سمجھ رہے تھے۔ میں نے ماما سے وعدہ تو کر لیا تھا لیکن یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ اس وعدے کو کیسے نبھاؤں گا؟ کیسے ایک مُردہ بیٹے کو زندہ کر کے ماں کے قدموں میں پہنچاؤں گا؟

ماما کو کسی بھی صدمہ پہنچانے والی بات سے بے خبر رکھا تھا۔ لہٰذا انہیں وکی کی ہلاکت کا علم نہیں تھا۔ وہ اپنے ایک بیٹے کے لیے دوسرے بیٹے کی جدائی برداشت کر رہی تھیں لیکن آج فون پر انہوں نے بڑے پیار سے مجھے حکم دیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ میں واپس چلا آؤں۔ ورنہ وہ احتجاجاً کھانا پینا چھوڑ دیں گی۔

یہ اوپر والے کا کرم تھا کہ میں سرخرو ہو کر ماں کے پاس پہنچ رہا تھا۔ خدا نے میرے وعدے کی لاج رکھی تھی۔ یہ بہت بڑی بات تھی کہ وکی ایک بھائی کی اور بیٹے کی حیثیت سے ہمارے قریب آ رہا تھا۔

ایک طویل ڈرائیو کے بعد ہم گھر پہنچ گئے۔ امیر حمزہ اور ماسٹر فو نے ماما کو ہماری آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ پاپا بھی میرے ساتھ وہاں پہنچ رہے ہیں۔ وہ علی بن کر ان کے پاس گئے تھے۔ میرا خیال تھا' وہ انہیں پہلی ہی نظر میں پہچان لیں گی۔ مگر یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ ماما تو کیا' امیر حمزہ اور ماسٹر فو بھی انہیں اجنبی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

ماما نے پوچھا۔ ''یہ کون ہیں؟''

میں نے انہیں دیکھا۔ پھر ماسٹر فو اور امیر حمزہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ پہلے بھی یہاں آئے تھے۔ آپ لوگوں کے ساتھ افطاری کر کے گئے تھے۔ تعجب ہے' آپ میں سے کوئی انہیں پہچان کیوں نہیں پا رہا ہے؟ کیا آپ کو علی بن کر آنے والا مہمان یاد نہیں ہے؟''

پاپا زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔ ماما میری بات سن کر چونک گئیں۔ انہیں سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے مجھ سے بولیں۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ علی... میرا مطلب ہے' قربان واسطی نہیں ہیں۔''

میں نے چونک کر کہا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

امیر حمزہ نے کہا۔ ''میڈم درست کہہ رہی ہیں وجی بابا!''

میں نے پریشان ہو کر پاپا کو دیکھا۔ وہ بہ دستور مسکرا رہے تھے۔ ادھر میرے محافظ الرٹ ہو گئے۔ ان کی مسکراہٹ مجھے الجھا رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے پاپا...! میں ٹینشن میں ہوں اور آپ مسکرا رہے ہیں؟ آخر یہ کیا راز ہے؟ ماما آپ کو پہچان کیوں نہیں رہی ہیں؟''

وہ بولے۔ ''کیونکہ پچھلی بار میں بھیس بدل کر یہاں آیا تھا۔''

''اور اب...؟''

''اب اپنی اصل شکل صورت کے ساتھ آیا ہوں۔ کیونکہ تمہاری ماما نے پہلے کبھی مجھے نہیں دیکھا۔ اس لیے پہچان نہیں پا رہی ہیں کہ میں قربان علی واسطی ہوں۔''

ماما کا دل یکبارگی دھڑکنے لگا۔ ان کا لب و لہجہ اور بولنے کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ وہی ان کے مجازی خدا ہیں۔ پاپا نے ماما کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''قسمت ہم پر مہربان ہو رہی ہے سعدیہ! تمہاری تسبیح کے تین دانے ٹوٹ کر گم ہو گئے تھے نا... اب دیکھو... وہ بکھرے ہوئے دانے ایک ایک کر کے اکٹھے ہو رہے ہیں' تمہارے دامن میں سمٹ رہے ہیں۔''

ماما کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ یک ٹک انہیں تکے جا رہی تھیں۔ آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ حقیقت بن کر سامنے آنے والا مجازی خدا اب بھی خواب خواب سا لگ رہا تھا۔ وہی خواب جس کے لیے شاید ان کا دل ہمیشہ سے یہی کہتا رہا تھا۔

''کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں...''

زندگی میں پہلی بار وہ پورے ہوش و حواس میں رہ کر انہیں اپنے روبرو دیکھ رہی تھیں اور ان لمحات کے لیے انہوں نے بہت ہی طویل اور تھکا دینے والا سفر طے کیا تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے' منزل پر پہنچ کر ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ مزید ایک قدم بھی آگے بڑھانے کا حوصلہ نہیں رہتا۔ یہ آسودگی بھی ملتی رہتی ہے کہ منزل تک تو پہنچ ہی گئے ہیں۔ اب تھک کر گر پڑیں تو کیا...؟

وہ بھی جیسے تھک چکی تھیں۔ شدتِ جذبات سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ میرا سہارا لینے کے باوجود ہیں ایک صوفے پر بیٹھتی چلی گئیں۔

جب دل کا بوجھ اچھی طرح ہلکا ہو گیا تو انہوں نے کہا۔ ''میری تسبیح کے تین دانے جدا ہوئے تھے... میرا وکی کہاں ہے؟''

پاپا نے کہا۔ ''وہ پیرس میں ہے۔ کل ہماری بہو کے ساتھ یہاں پہنچے گا۔''

انہوں نے چونک کر پوچھا۔ ''بہو...؟ کیا اس نے شادی کر لی ہے؟''

''ارے نہیں۔ وہ ہمارے وجی کی ہونے والی دلہن ہے۔''

انہوں نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ پھر پوچھا۔

''کیا جینا مل گئی ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ خوش ہو کر دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھاتے ہوئے بولیں۔ ''اے میرے معبود! میں تیرے کون کون سے کرم کا شکر ادا کروں؟ تُو نے تو یکمشت اتنی ساری مسرتیں میری جھولی میں بھر دی ہیں کہ یہ دامن چھوٹا پڑ رہا ہے۔ تیرا شکر ہے میرے مالک! لاکھ لاکھ شکر ہے...''

ایسے وقت رخشی کے موبائل فون کی کالنگ ٹون نے مجھے مخاطب کیا۔ میں نے اسے نکال کر نام پڑھتے ہوئے پاپا سے کہا۔ ''اس فون کی اسکرین پر لکھا ہوا ہے معلم... یقیناً یہ سلطان ظفر ہوگا۔''

انہوں نے کہا۔ ''کال اٹینڈ کرو۔ سنو، وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟''

میں نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''بول اے نامراد معلم! کیا اپنی ماں کا پتا پوچھنے آیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''میں علم بانٹنے والا معلم ہوں۔ اپنی ماں کی جنت تک پہنچنے کا راستہ جانتا ہوں۔ میرا خیال ہے، تم سب فتح کی خوشی میں ناچ رہے ہوگے؟''

''ہم نے تمہیں، تمہاری ماں کو اور اس کے یار کو تگنی کا ناچ نچایا ہے۔ ظاہر ہے، خوشیاں تو منائیں گے۔''

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''کیا سمجھ رہے ہو؟ بیس برسوں تک ایک دوسرے سے جدا رہنے کے بعد اب متحد ہو کر ایک چھت کے نیچے رہ سکو گے؟''

اس کی ہنسی سنائی دی۔ میں نے کہا۔ ''رسّی جل گئی مگر بل نہیں گئے۔ اب کس بل بوتے پر اکڑ رہے ہو؟''

''ابھی معلوم ہو جائے گا۔ پہلے یہ تو معلوم کرو کہ تمہارا نانا علیم شیرازی کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟''

میں نے پریشان ہو کر پاپا کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ''یہ ہمارے نانا جان کے سلسلے میں چیلنج کر رہا ہے۔ میں ابھی ان سے رابطہ کرتا ہوں۔''

دوسری طرف سے سلطان ظفر نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے، اپنے نانا سے رابطہ کرنے کے بعد مجھے ضرور کال بیک کرو گے۔''

یہ کہہ کر اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ میں نے فوراً ہی نانا جان کے نمبر پنچ کیے۔ فون کو کان سے لگایا تو ان کی آواز سنائی نہیں دی۔ ریکارڈنگ سنائی دے رہی تھی کہ مطلوبہ نمبر بند ہے۔ بعد میں رابطہ کیا جائے۔

میں نے پریشان ہو کر کہا۔ ''اس خبیث کی اولاد نے ضرور کوئی گڑبڑ کی ہے۔ نانا جان سے رابطہ [illegible] ہے۔''

ماما نے شدید پریشانی سے مجھے دیکھا۔ میں [illegible] ان کے نمبر پنچ کیے مگر اس بار بھی مایوسی ہوئی۔ دوسری [illegible] سے وہی ریکارڈنگ سنائی دے رہی تھی۔ ماما نے [illegible] کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ ان سے رابطہ کیوں نہیں [illegible] ہے؟ کیا دشمنوں نے انہیں کسی مصیبت میں [illegible] پلیز وجی! کسی بھی طرح معلوم کرو۔ وہ کہاں ہیں؟ [illegible] میں ہیں؟ میرا تو دل ڈوب رہا ہے۔''

میں نے انہیں تھپکتے ہوئے کہا۔ ''حوصلہ رکھیں۔ [illegible] ابھی معلوم کرتا ہوں۔''

سلطان ظفر نے کہا تھا کہ میں اسے کال بیک کر [illegible] گا۔ مجبوراً مجھے یہی کرنا پڑا۔ رابطہ ہونے پر تھوڑی دیر تک [illegible] کے قہقہے سنائی دیے۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا [illegible] لا پتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''بکواس نہ کرو۔ فوراً بتاؤ، نانا جان کہاں ہیں؟''

''کیوں پریشان ہو رہے ہو؟ آخر وہ میرے [illegible] محترم ہیں۔ مجھے اپنا بیٹا تسلیم کریں گے تو بڑی عزت سے بڑے آرام سے رہیں گے۔''

سیدھی سی سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ انہیں اغوا [illegible] گیا ہے۔

اس نے کہا۔ ''میں زیادہ لمبی بات نہیں کروں گا۔ [illegible] الحال میرے احکامات کی تعمیل کرو۔ جتنی جلدی ہو سکے [illegible] واپس دائی ماں کے پاس پہنچا دو۔ میں اس سے [illegible] پڑھوانے والا ہوں۔''

میں نے پریشان ہو کر پاپا کو دیکھا۔ انہوں نے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہا ہے وہ...؟''

میں نے انہیں اس خبیث کا حکم سنایا۔ دوسری طرف سے اس نے کہا۔ ''جب تک یتیم ہمارے [illegible] نہیں آجاتی، تب تک تم باپ بیٹے ایک جگہ، ایک چھت کے نیچے نہیں رہو گے۔ قربان واسطی کو ابھی اسی [illegible] اپنے گھر سے باہر نکالو۔ ورنہ تمہیں علیم شیرازی کی چیخیں سنائی دیں گی۔''

ایک ہی لمحے میں حالات بدل جاتے ہیں۔ ذرا [illegible] پہلے کیا تھے... اب کیا ہو گئے تھے؟ ہماری خوشیوں کو [illegible] دشمنوں کی نظر لگ گئی تھی۔

اپنی تلاش میں سرگرداں ایک بے شناخت کی اس دلچسپ [illegible]
داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے

اپنے گاہکوں کا مطلوبہ سامان لانے لے جانے پر مامور ایک ایجنٹ کے تجربات - اسے عراق سے کچھ لانے کی ذمے داری سونپی گئی ...لیکن وہاں پہنچ کر اسے اپنے استعمال ہونے کا اندازہ ہوگیا !

کٹھ پتلی

رضوانہ منظر

بین سلیٹر نے کار، پارکنگ میں روکی اور اتر کر ساتویں فلور پر اپنے اپارٹمنٹ میں آیا۔ اس نے ابھی کوٹ اتار کر ٹائی ڈھیلی کی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے ناگواری سے فون کی طرف دیکھا۔ وہ تھکا ہوا تھا اور سکون سے وقت گزارنا چاہتا تھا۔ اس نے میز پر رکھی بوتل سے ایک پیگ بنایا۔ فون کی گھنٹی مستقل بجتی رہی۔ اس نے بادل ناخواستہ فون کا ریسیور اٹھایا۔

''ہیلو... بین سلیٹر بات کر رہا ہوں۔''

''مسٹر سلیٹر... میں آئن پارکر ہوں... تمہارے لیے ایک کام ہے۔''

''میں کام کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''کام نفع بخش ہے اور صرف چند دن کا ہے۔''

''میرے پاس پہلے ہی خاصا کام ہے۔'' اس نے... بے زاری سے کہا اور فون رکھنے لگا۔

''سنو... معاملہ پچاس ہزار ڈالرز کا ہے۔'' دوسری طرف سے بات کرنے والے نے جلدی سے کہا، وہ رک گیا۔

''پچاس ہزار ڈالرز... کس کام کے؟''

''ایک چیز لانی ہے... عراق سے۔''

''عراق سے!'' وہ اچھل پڑا۔ ''تمہیں عراق کا پتا ہے؟''

''اسی بات کے پچاس ہزار ڈالرز دیے جا رہے ہیں۔''

بین سیلٹر ایک طرح سے کوریئر کا کام کرتا تھا۔ وہ لوگوں کا ذاتی سامان کہیں لے جاتا تھا یا کہیں سے لے کر آتا تھا۔ پہلے اس کے ساتھ ایک شخص اور بھی تھا مگر اس نے دھوکے بازی شروع کر دی اور بین کو شبہ تھا کہ وہ اسمگلنگ میں بھی ملوث ہو گیا ہے۔ اس لیے بین نے اس سے علیحدگی بہتر سمجھی۔ اس کے بعد سے بین تنہا کام کر رہا تھا۔ زیادہ تر وہ یورپ کی سطح پر کام کرتا تھا لیکن کبھی کبھی وہ یورپ سے باہر بھی کام لے لیا کرتا تھا۔ گزشتہ سال اسے دو بار افریقا کے ملک مراکش جانا پڑا تھا۔ اس نے اپنی رہائش پیرس میں رکھی تھی کیونکہ اس کے زیادہ تر گاہک فرانس سے تعلق رکھتے تھے۔ خود بین برطانیہ کا شہری تھا اور اس کا باپ آسٹریلیا سے آکر برطانیہ میں آباد ہوا تھا۔

''کام کیا ہے؟''

''مٹی سے بنی ایک تختی لانی ہے... یہ تمہیں شمالی عراق کے ایک قصبے فاتل سے ملے گی۔''

''شمالی عراق سے!'' بین متفکر ہو گیا۔ ''تم جانتے ہو... سب سے زیادہ شورش انہی علاقوں میں ہے۔ ایسے میں پچاس ہزار ڈالرز معاوضہ کم ہے۔''

''یہ مناسب معاوضہ ہے پھر ہم تمہاری حفاظت کا بندوبست بھی کریں گے۔ تم ایک امریکی کنٹریکٹر کے ساتھ سفر کرو گے۔''

''پتھر... سوری! مٹی کی تختی... کیا اس کی کوئی تاریخی حیثیت ہے؟''

''تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔''

''مجھے معلوم ہے کہ عراق سے کسی قسم کا نوادر باہر لے جانے پر پابندی ہے۔ میں وہاں پر گرفتار ہو سکتا ہوں۔ اس لیے مجھے معلوم ہونا چاہیے۔''

''وہ ایک عام سی مٹی سے بنی تختی ہے۔ اس کی کسی طرح سے بھی کوئی تاریخی حیثیت نہیں ہے۔ اگر تمہیں نوادرات کی پہچان ہے تو تم جان جاؤ گے۔''

''اخراجات الگ سے ہوں گے۔'' بین نے شرط پیش کی۔ ''اور نصف معاوضہ پیشگی ہوگا۔''

''منظور ہے... کل تمہیں کوریئر سے پچیس ہزار امریکی ڈالرز اور عراق کا ریٹرن ٹکٹ مل جائے گا۔ تمہیں ایک ہفتے کے اندر یہ تختی لندن میں ایک شخص کے حوالے کرنی ہے۔''

''اس سب کی تفصیلات؟''

''وہ تمہیں رقم اور ٹکٹ کے ساتھ مل جائیں گی۔''

''فلائٹ براہِ راست عراق کے لیے ہے؟''

''نہیں، کویت تک کی ہے... وہاں سے تمہیں بذریعہ سڑک جانا ہوگا۔'' پارکر نامی اس شخص نے بتایا اور فون بند کر دیا۔ اس کے فوراً بعد بین نے مختلف نمبروں پر چند کالز کیں۔

☆☆☆

کویت کا شہر نومبر کے آخر میں سرد اور گرد آلود ہوا کی لپیٹ میں تھا۔ وسط ایشیا سے قریب ہونے کی وجہ سے یہاں موسم سرما سخت ہوتا ہے۔ 1990ء کی خلیج کی جنگ کے آثار شہر کی حد تک مٹ چکے تھے لیکن شہر سے نکلتے ہی بعد میں جنگ کے زمانے کے تباہ شدہ آلات اور گاڑیاں بکھری تھیں۔ بین امریکن کنٹریکٹر کی ایک بس میں روانہ ہوا۔ بس کی حفاظت کے لیے بس کے آگے اور پیچھے دو بکتر بند گاڑیاں تھیں۔ بین کو کویت میں مائیکل نامی امریکی نے ریسیو کیا۔ وہ کویت سے امریکی فوج کے لیے سپلائی کرتا تھا۔

''مسٹر سیلٹر! میں تمہیں بغداد تک لے جاؤں گا۔''

''اور اس سے آگے؟''

''اس سے آگے تم ایک اور پارٹی کے ساتھ جاؤ گے۔''

''عراق میں صورتِ حال کیا ہے؟''

مائیکل نے شانے اچکائے۔ ''اچھی نہیں ہے... آئے دن امریکی کنٹریکٹرز کے خلاف حملے ہوتے ہیں۔ البتہ فوج نے اپنی گرفت مضبوط کر لی ہے۔ ان کے زیرِ قبضہ علاقوں میں امن و امان ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے، مجھے عراق میں قتل کیا جا سکتا ہے۔ مزاحمت کار مجھے اغوا کر کے لے جا سکتے ہیں؟''

''اس کا خطرہ تو ہر امریکی کے لیے ہے۔'' مائیکل نے شانے اچکائے۔

''میں امریکی نہیں ہوں۔''

''عراق میں ہر سفید فام کو امریکی سمجھا جاتا ہے۔'' مائیکل نے بتایا۔ ''خاص طور سے القاعدہ والے ہر سفید فام کے دشمن ہیں۔''

بین کو خیال آیا کہ یہ پچاس ہزار ڈالرز مہنگے نہ پڑ جائیں۔ عراق جنگ زدہ ملک تھا۔ وہاں روزانہ بم دھماکے اور فائرنگ کے واقعات پیش آتے تھے۔ لوگ اغوا کر لیے جاتے تھے یا ان کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ ان حالات میں اس ملک میں قدم رکھنا خطرات کو دعوت دینے کے برابر تھا... جہاں چھاپہ مار غیر ملکیوں کی تاک میں رہا کرتے تھے۔ بس... بی ...... خطرے سے محفوظ علاقے میں تھی۔ بین کو کوریئر سے ملنے والے لفافے میں پچیس ہزار ڈالرز کے ڈرافٹ کے علاوہ ایک واپسی کا ٹکٹ اور ایک کاغذ ملا تھا۔ کاغذ پر اس تختی کا نقشہ اور فاتل کے اس شخص کا پتا درج تھا جس سے بین کو وہ تختی لانی تھی اور پھر اسے لے جا کر لندن میں جان الیگزینڈر نامی شخص کے حوالے کرنی تھی۔ اس سے رابطے کے لیے محض ایک فون نمبر تھا۔ بین کو بقیہ پچیس ہزار ڈالرز جان الیگزینڈر سے ہی ملتے۔ اس کے بعد اس کا کام ختم ہو جاتا۔

بس سیکیورٹی اور امیگریشن چیک پوسٹ سے گزر کر عراق کی حد میں داخل ہوئی۔ سرحد کے دوسری جانب کویت کے پیچھے جانے والے عراقی پناہ گزینوں کی ایک لمبی لائن لگی تھی۔ ان کے گھر اس جنگ میں برباد ہو چکے تھے اور ان کے لیے اپنی سرزمین پر رہنا ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ مائیکل نے بین کو بتایا۔ ''ایسے قافلے شام، اردن، سعودی عرب اور کویت کی طرف جاتے رہتے ہیں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ عراق جلد عراقیوں سے خالی ہو جائے گا۔ جو مرنے سے بچ جائیں گے، وہ کسی اور ملک کو جا چکے ہوں گے۔''

اس ملک میں صورتِ حال اتنی خراب ہے؟ بین حیران ہوا۔ آخر امریکی اور اس کے اتحادی اس ملک میں کیوں آئے تھے؟ ان کے آنے سے پہلے بے شک صدام کی ظالمانہ حکومت تھی مگر عراقی عوام کی جان و مال اپنے گھروں میں تو محفوظ تھی۔ اب تو لاکھوں عراقی مارے جا چکے تھے اور اس سے کہیں زیادہ بے گھر ہو کر دوسرے ملکوں کو جا چکے تھے۔ امریکی فوج کی بربریت کی داستانیں تو حملے کے شروع میں سامنے آنے لگی تھیں... جب ایک امریکی فوجی نے ایک مغربی کیمرا مین کو اس لیے گولی مار دی کیونکہ اس نے اپنا کیمرا بند کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ امریکی فوجی ایک عراقی گاؤں سے عورتوں کو اغوا کر کے لائے تھے اور اپنے ٹینکوں میں ان کی بے حرمتی کر رہے تھے۔

خود بین نے پچھلے دنوں عراق میں ہونے والے ایک سانحے پر بنی فلم دیکھی تھی۔ یہ واقعہ سچا تھا اور فلم میں اسے من و عن دکھایا گیا تھا۔ عراقی مزاحمت کار نے سڑک کے کنارے بم لگا کر ایک امریکی بکتر بند اڑا دی تھی۔ اس کے بعد امریکیوں نے اس پورے علاقے کو گھیرے میں لے لیا۔ اس کے آدمی نزدیک واقع آبادی میں گھس گئے اور انہوں نے بے دریغ وہاں رہنے والے لوگوں کا قتل عام شروع کر دیا اور بلا امتیاز سامنے آنے والے ہر مرد، عورت اور بچے کو قتل کر دیا۔ انہوں نے گھروں میں سوتے ہوئے لوگوں پر بم مارے۔ جب بچ جانے والے باہر بھاگے تو امریکن آرمی نے ان پر نشانے بازی کی مشق کی۔ جب کسی کا نشانہ کامیاب ہو جاتا تو وہ خوشی سے قہقہے لگاتا۔ بین حیران تھا کہ یہ کس منہ سے خود کو مہذب کہتے تھے۔

عراق میں داخل ہوتے ہی فضا بدل گئی تھی۔ اب دو بسوں کے ساتھ تین عدد بکتر بند گاڑیاں تھیں۔ ان میں دو درجن امریکی فوجی ان کی حفاظت کر رہے تھے۔ بسوں کے بیشتر مسافر امریکی فوج کے لیے کام کر رہے تھے۔ بین حیران تھا کہ ایک ایک آدمی کو سیکیورٹی کی ضرورت تھی تو پھر کام کیسے ہوتا تھا؟ ان کا سفر خیریت سے گزرا۔ البتہ شام کے قریب وہ بغداد میں داخل ہوئے تو شہر میں ایک طرف سے دھوئیں کے گہرے بادل اٹھ رہے تھے۔ لگتا تھا کوئی بلاسٹ ہوا ہے۔ بین اور دوسرے لوگ بغداد کے گرین زون میں ایک ہوٹل میں رکے تھے۔

یہ کوئی فائیو اسٹار ہوٹل نہیں تھا مگر ان حالات میں اس کا شمار بغداد کے بہترین ہوٹلوں میں ہوتا تھا۔ یہاں سیکیورٹی کے انتظامات سخت تھے اور حفاظت کے لیے ایک امریکی سیکیورٹی کمپنی کے اہلکار یہاں موجود تھے۔ ماحول بے حد کشیدہ تھا۔ اس کی وجہ بھی جلد سمجھ میں آگئی۔ کچھ ہی دور ایک عمارت پر خودکش حملہ آور نے ٹرک کے ذریعے دھماکا کیا تھا جس میں غیر ملکی مقیم تھے۔ اس حملے میں غیر ملکیوں سمیت کم سے کم سو افراد ہلاک و زخمی ہوئے تھے۔ بین نے گرین زون میں سیکیورٹی کی جو صورتِ حال دیکھی تھی، اس کی سمجھ سے بالاتر تھا کہ بارود سے بھرا ٹرک اندر کیسے آیا؟ یہاں پر حالات اس کے اندازے سے زیادہ خراب تھے۔

اسے اگلے روز فاتل کے لیے روانہ ہونا تھا۔ مائیکل نے اس کے لیے بندوبست کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک عراقی گائیڈ اور دو عدد عراقی محافظ موجود تھے۔ وہ کار میں روانہ ہوئے۔ اپنی مغربی شناخت چھپانے کے لیے بین بھی مقامی عرب لباس پہنتا اور ایک ایسا عراقی بن جاتا جس نے ساری زندگی فرانس میں گزاری ہو۔ وہ فرانسیسی لہجے میں انگریزی بول سکتا تھا۔ رات کے وقت جب وہ کھانا کھا کر سونے کے بارے میں سوچ رہا تھا تو دروازے پر دستک ہوئی۔ دور کہیں سے فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں۔

''کون ہے؟'' اس نے بلند آواز سے پوچھا۔

''مسٹر سیلٹر!'' باہر سے ایک مترنم نسوانی آواز آئی۔ ''میں صبا الحریم ہوں۔''

بین نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے اسکرٹ اور شرٹ میں ایک خوب صورت مقامی لڑکی کھڑی تھی۔ اس کا رنگ سرمئی مائل سفید اور نقوش دلکش تھے۔ غزالی آنکھیں اور چھوٹی سی ناک تھی۔

''یس مس صبا الحریم۔'' بین نے اس کا معائنہ کرتے

ہوئے کہا۔

''مجھے تم سے ملنا ہے۔''

بین نے اندر آنے کے لیے راستہ دیا اور کرسی پیش کی۔ ''میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''خدمت تو میں نے تمہاری کرنی ہے۔'' صبا مسکرائی۔ اس کی انگریزی اگرچہ ٹی اور ڈی کے بغیر تھی لیکن رواں تھی۔ ''کل مجھے تمہارے ساتھ قابل جانا ہے۔''

''تم کس حیثیت سے...؟''

''میں تمہاری راہنمائی کروں گی۔ اصل میں میں خود قابل کی رہنے والی ہوں اور ان دنوں وزارتِ داخلہ کے لیے کام کررہی ہوں۔''

بین کو خوش گوار حیرت ہوئی۔ ''یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کیا تم جانتی ہو کہ میں وہاں کس کے پاس جارہا ہوں؟''

''نہیں... میرا کام تمہاری راہنمائی کرنا ہے... تم جہاں کہو گے میں تمہیں لے جاؤں گی۔''

''تم کچھ پیو گی؟''

''میں رات کو کھانے کے بعد نہیں پیتی۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں تمہیں بتانے آئی تھی کہ ہم صبح ہوتے ہی روانہ ہوجائیں گے۔ تم سات بجے تک تیار رہنا۔''

بین چاہ رہا تھا کہ وہ مزید رکے مگر صبا الحریم کام کی بات کر کے رخصت ہوگئی۔

☆☆☆

یہ ایک عام سی کار تھی۔ امریکی ساختہ سیڈان کار... مضبوط، طاقتور اور تیز رفتار! صبا الحریم اپنے ساتھ دو عراقی فوجی محافظ لے کر آئی تھی مگر وہ عام لباس میں تھے اور انہوں نے لباس کے اندر اسلحہ چھپا رکھا تھا۔ ڈرائیونگ سنبھالنے والے کا نام سعد بن ایان تھا جبکہ دوسرا امید الرہاد تھا۔ وہ دونوں آگے والی نشست پر بیٹھے تھے۔ بین نے سادہ پتلون قمیص کے اوپر عربی عمامہ پہن لیا تھا۔ صبا نے اسے زیتون کا تیل دیا تھا۔ اس کی مدد سے اس کے رنگ میں ہلکا سا سانولا پن شامل ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھیں اور بال سیاہ تھے، اس لیے وہ کسی حد تک عرب لگ رہا تھا۔

''راستے میں پہننے کے لیے جیکٹ لے لو۔'' صبا نے اسے مشورہ دیا۔ ''سردی بہت ہے۔''

''نہیں... میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے انکار کردیا۔ ''سوٹ کیس ڈکی میں ہے... اگر میں نے ضرورت محسوس کی تو میں اس سے نکال لوں گا۔''

ان کی کار بغداد سے نکل کر ایک ہائی وے پر دوڑنے لگی۔ جابجا تباہ شدہ گاڑیاں پڑی تھیں۔ ان میں سے اکثر امریکی طیاروں اور گن شپس کا نشانہ بنی تھیں۔ بین کو یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ان میں اکثریت مسافر بسوں کی تھی۔ اس نے صبا سے کہا۔ ''ان گاڑیوں میں مارے جانے والے مسافروں کا کیا ہوا؟''

''ان گاڑیوں کی حالت دیکھ کر بھی تم یہ سوال کررہے ہو۔'' صبا نے طنز کیا۔ ''ویسے ان کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ پورے عراق میں مُردہ خانے امریکی فوج یا اس کی تربیت یافتہ عراقی ملیشیا کے زیرِانتظام ہیں۔ وہاں لائی جانے والی لاشوں کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا جاتا اور نہ ہی یہ بتایا جاتا ہے کہ لائی جانے والی لاشوں کو کہاں ٹھکانے لگایا جاتا ہے۔''

''حیرت ہے، ان کا ریکارڈ کیوں نہیں رکھا جاتا؟''

صبا اس بار خاموش رہی۔ غالباً وہ ایک غیر ملکی کے سامنے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی جس سے وہ خود مصیبت میں پڑ جائے۔ ''ابھی تین گھنٹے کا سفر ہے... تم چاہو تو آرام کر لو۔'' صبا نے اسے مشورہ دیا۔

''نہیں، میں نے رات کو اچھی نیند لی تھی۔''

راستے میں بکتر بند اور دوسری فوجی گاڑیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ ہر دس کلومیٹر کے بعد کوئی نہ کوئی چیک پوسٹ آجاتی تھی۔ اگر صبا وزارتِ داخلہ کا اجازت نامہ نہ دکھاتی تو انہیں آگے جانے سے روک دیا جاتا۔ ان کے نام بھی اجازت نامے میں شامل تھے۔ بین کا نام رفیق تھا اور اسے بھی عراقی ظاہر کیا گیا تھا۔ وہ چوتھی چیک پوسٹ کے پاس تھے۔ سعد نے کار روک دی۔ دو امریکی میرین فوجی سامنے آئے۔ انہوں نے خودکار رائفلیں تان رکھی تھیں اور وہ اس طرح محتاط تھے جیسے ابھی کار سے ان پر حملہ کردیا جائے گا۔ صبا کی طرف سے اجازت نامہ دکھانے کے باوجود ان کے تاثرات میں کوئی نرمی نہیں آئی تھی۔

''تم رکو... ابھی اس اجازت نامے کی تصدیق ہوگی۔'' فوجی نے صبا سے کہا۔

''کیوں؟'' صبا نے احتجاج کیا۔ ''یہ مصدقہ ہے۔''

''جب تک ہم اس کی خود تصدیق نہیں کرلیتے۔ یہ غیر مصدقہ ہے۔'' فوجی نے رکھائی سے جواب دیا۔ اسی لمحے دوسری طرف سے ایک تیز رفتار کار آئی۔ فوجی اور اس کے دوسرے ساتھی یک دم ہوشیار ہوگئے۔ انہوں نے رائفلیں کار کی طرف تان لیں۔ وہ کار کو رکنے کا اشارہ کررہے تھے۔ بین نے دیکھا کہ کار کی فرنٹ سیٹ پر ایک عورت تھی۔ اس نے حجاب پہن رکھا تھا۔ اس کے برابر میں ایک اور عورت ذرا پیچھے سرک کر بیٹھی تھی۔ اس کے بال کھلے تھے اور چہرے پر

تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ ڈرائیونگ کرنے والی عورت نے بیریئر کے پاس آتے ہوئے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر ہلانا شروع کردیا۔ وہ بیریئر ہٹانے کا اشارہ بھی کررہی تھی۔ بین نے اس کے چلانے کی آواز سنی۔ یہ آخری آوازیں تھیں۔ فوراً ہی فوجیوں کی رائفلیں گرجنے لگیں۔ بین نے کئی گولیاں ڈرائیونگ کرنے والی عورت کے چہرے اور سینے پر لگتی ہوئی دیکھیں۔ کار لہرائی اور بیریئر سے کچھ دور آکر رک گئی۔ امریکی دستور کی کار پر فائرنگ کرتے رہے۔ ونڈ اسکرین پر چھلنی بن گئے تھے۔ بین اور اس کے ساتھی دہشت زدہ ہو گئے تھے۔ صرف صبا ہوش میں تھی، وہ کار سے چلانے لگی۔ ''یہ کیا کررہے ہو... میرے خدا!... یسوع مسیح۔''

بین چونکا۔ ''تم عیسائی ہو؟''

مگر صبا کار سے اتر گئی تھی۔ وہ گولیوں کا نشانہ بننے والی کار کی طرف بھاگ رہی تھی۔ امریکی اب فائرنگ روک کر کار کے گرد پھیل رہے تھے۔ بین بھی کار سے نکل آیا۔ وہ چلایا۔ ''صبا! رک جاؤ... یہ تمہیں بھی ماردیں گے۔''

امریکی اس کا انگریزی لہجہ سن کر چونکے۔ صبا کار کے پاس رکی۔ اس نے کھڑکی سے جھانکا اور منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ بین ہمت کر کے کار کے پاس آیا۔ امریکی اب بھی دور دور تھے۔ بین نے کار میں جھانکا۔ کار میں بس وہی دو عورتیں تھیں اور دونوں مرچکی تھیں' انہیں درجن بھر گولیاں لگی تھیں۔ سب سے افسوس ناک بات یہ تھی کہ دوسری سیٹ پر بیٹھی عورت حاملہ تھی اور اس کا وقت پورا ہوگیا تھا۔ اسے یقیناً اسپتال لے جایا جارہا تھا مگر امریکی فوجیوں نے بے دریغ فائرنگ کر کے انہیں ماردیا تھا۔

''دونوں مرگئیں۔'' روکنے والے فوجی نے اندر جھانک کر غیر جذباتی انداز میں کہا۔

''تم نے دو نہیں، تین جانیں لی ہیں۔'' بین نے تلخ لہجے میں کہا۔

''تم کون ہو؟'' فوجی نے مشکوک لہجے میں کہا۔ ''لہجے

WWW.JBDPRESS.COM

...حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

...معرکہ 300/-
...برت نے بڑے بت کو توڑنے کی ... اور پجاری سلطان کے ... ''ہم اس کے وزن ... لینے تیار ہیں''۔ سلطان کا ... اٹھا اور اس نے جواب دیا ... نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ... ایک ولولہ انگیز تحریر

...ری رات کے مسافر 225/-
... مسلمانوں کی ... سلطنت غرناطہ ... مناظر، بوڑھوں، عورتوں ... رسوائی کی الم ناک داستان

... 300/-
... عرب و عجم کے تاریخی، ... مذہبی حالات اور ... داستان

...یارِ حرم تک 125/-
... میں لکھا جانے والا ایک ...

گمشدہ قافلے 300/-
انگریز کی اسلام دشمنی، بنیئے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز سچی داستان

داستانِ مجاہد 200/-
فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سواروں اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکۃ الآرا داستان

پردیسی درخت 275/-
اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

قافلۂ حجاز 300/-
راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

خاک اور خون 300/-
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

معظم علی 275/-
لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

سفید جزیرہ 150/-
بحرالکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

کلیسا اور آگ 225/-
فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اُندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

پورس کے ہاتھی 125/-
1965ء کی جنگ کے پس منظر میں بنیوں اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

محمد بن قاسم 225/-
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

ثقافت کی تلاش 100/-
نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگھروؤں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

آخری چٹان 275/-
سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاتاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

اور تلوار ٹوٹ گئی 300/-
شیرِ میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کردی

شاہین 275/-
اُندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

سو سال بعد 125/-
گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

انسان اور دیوتا 225/-
برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان جس نے اچھوتوں کو راہِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

یوسف بن تاشفین 225/-
اُندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں روشن کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

جہانگیر بکس
• لاہور 042-7220879 • راولپنڈی 051-5539609 • ملتان 061-4781781 • فیصل آباد 041-2627568 • حیدرآباد 0300-3012131 • کراچی 021-2765086

سے تم برٹش لگ رہے ہو؟''

''میں برطانوی نژاد فرانسیسی ہوں۔'' بین نے کہا۔

صبا نے آگے بڑھ کر اس کے بارے میں بتایا اور دس منٹ بعد ان کو جانے کی اجازت مل گئی اور وہ دکھی دل کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

''یہاں یہ سب ہو رہا ہے۔'' صبا نے آہستہ سے کہا۔

''میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ عراق میں ایسی درندگی ہو رہی ہو گی۔''

''ستم کی بات یہ ہے کہ ایسے واقعات کی کوئی انکوائری نہیں ہوتی۔ ان عورتوں کی لاشیں بھی ان کے پیاروں کو ملنے کے بجائے غائب کر دی جائیں گی۔''

بین چپ رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس موقعے پر کیا کہے۔ صبا واضح طور پر اپنے لوگوں کے لیے دکھی تھی جو امریکی چیرہ دستیوں کا شکار تھے۔ اچانک بین کو یاد آیا۔ سانحہ دیکھ کر صبا نے یسوع مسیح کہا تھا۔ یعنی وہ عیسائی تھی۔ اس نے صبا سے پوچھا۔

''میں تو سمجھتا تھا تم مسلمان ہو؟''

''نہیں، میں عیسائی ہوں... عراق میں بہت بڑی تعداد میں عیسائی بھی ہیں اور یہ اب سے نہیں بلکہ چودہ سو سال سے بھی زیادہ عرصے سے یہاں رہ رہے ہیں۔''

''یعنی تم نسلاً عیسائی ہو؟''

صبا نے سر ہلایا۔ ''مسلم ممالک میں پائے جانے والے غیر مسلم عام طور سے نسلی ہوتے ہیں۔ مسلمان کسی اور مذہب کو قبول نہیں کرتے۔''

''اب کتنی دیر ہے؟'' بین کو اس موضوع سے بوریت ہو رہی تھی۔ اس نے شروع میں صبا کی ذات میں دلچسپی لی تھی مگر ابھی اس نے جو سانحہ دیکھا تھا، اس نے اسے وحشت زدہ کر دیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ جلد از جلد یہ کام ختم کرے اور یہاں سے رخصت ہو جائے۔

''دو گھنٹے کا سفر اور ہے... بشرطیکہ ایسی رکاوٹیں سامنے نہ آئیں۔''

مگر فابل تک پہنچتے پہنچتے شام ہونے لگی تھی۔ یہ پہاڑی ڈھلوانوں پر آباد ایک خوب صورت سا قصبہ تھا۔ اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ یہاں جنگ براہِ راست نہیں پہنچی تھی مگر فابل کے لوگوں کے ستے ہوئے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ بھی خوف و دہشت کے عالم میں زندگی گزار رہے ہیں۔

''تمہیں کہاں جانا ہے؟'' صبا نے اس سے پوچھا۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' بین کار سے اتر کر نیچے آیا۔ وہ صبا کو ایک طرف لے گیا۔ ''مجھے جس شخص سے ملنا ہے، اسے خود تلاش کرنا ہے۔''

''بہت مشکل ہے... تم انگریزی بولو گے تو جلد مشکوک ہو جاؤ گے۔ عراق کا کوئی حصہ چھاپہ ماروں کی نظروں سے دور نہیں ہے اور وہ خاص طور سے غیر ملکیوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔''

''یعنی میں تمہاری مدد کے بغیر نہیں پہنچ سکتا؟''

''ہاں... ایسا کرو کہ تم مجھے اس شخص کا نام اور پتا دو اور تم یہیں کار میں رکو۔ اگر کسی نے پوچھا تو سعد جواب دے گا۔''

''اور تم؟''

''میں اسے تلاش کر کے آتی ہوں۔''

''تمہارے لیے مشکل نہیں ہو گی؟''

''نہیں، میں مقامی ہوں... یہ میرے واقف کار ہیں۔''

''یہاں تمہارا گھر بھی ہے؟''

''میری بہن اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ یہاں رہتی ہے۔'' اس نے کہا۔ بین نے اسے شائستی کا نام اور پتا دیا۔ وہ چلی گئی۔ بین کار میں آ گیا۔ وقت گزرتا رہا۔ صبا ایک گھنٹے بعد آئی۔

''شائستی الواحد... اپنے گھر پر نہیں ہے۔ وہ دو دن سے گھر سے غائب ہے۔''

بین کے لیے یہ تشویش ناک خبر تھی۔ ''وہ کہاں گیا ہے؟''

''اس کے گھر پر اس کی گرل فرینڈ ہے... دو دن پہلے شائستی اپنی کار میں گیس ڈلوانے نکلا تھا اور اس کے بعد واپس نہیں آیا۔''

''یعنی وہ غائب ہے؟''

''لگ تو ایسا ہی رہا ہے... میں نے مقامی پولیس سے اس کے بارے میں معلوم کیا ہے۔ ان کو نہ تو اس کی گم شدگی کی اطلاع ہے اور نہ ہی کوئی لاش ملی ہے۔''

بین سوچنے لگا کہ شائستی کی گم شدگی کا تعلق کہیں اس تختی سے تو نہیں ہے جو وہ لینے آیا تھا؟ ظاہر ہے جس کے حصول کے لیے اتنا خرچ کیا جا رہا تھا اور اسے پچاس ہزار ڈالرز معاوضہ دیا جا رہا تھا، اس کی اصل مالیت اس سے کہیں زیادہ ہو سکتی تھی۔ اسے سوچ میں گم دیکھ کر صبا نے کہا۔ ''سنو! اگر اس سے ملاقات اتنی ہی ضروری ہے تو ہم یہاں رک کر اس کے آنے کا انتظار کر سکتے ہیں۔''

''یہاں کوئی ہوٹل ہے؟''

صبا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم میرے ساتھ میری بہن کے گھر رک جانا۔ یہ دونوں نزدیکی آرمی کیمپ چلے جائیں گے۔''

''یہاں ہمیں خطرہ نہیں ہے؟''

''نہیں... یہاں زیادہ تر عیسائی ہیں اور ہم چھاپہ ماروں سے ہمدردی رکھتے ہیں مگر ان کی عملی مدد سے گریز کرتے ہیں۔''

''کیا چھاپہ مار تمہارے اس رویے سے خوش ہیں؟''

''نہیں، خوش تو نہیں ہیں مگر وہ زیادہ ردعمل بھی ظاہر نہیں کرتے۔''

بین نے محسوس کیا کہ صبا ان دو محافظوں کی موجودگی میں کھل کر بات کر رہی ہے۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ''یہ ہماری باتیں سن رہے ہیں؟''

''فکر مت کرو... یہ سوائے عربی کے اور کوئی زبان نہیں سمجھتے۔'' صبا بولی پھر اس نے عربی میں ان دونوں سے کچھ کہا تو سعد نے کار اسٹارٹ کر دی۔ چند منٹ بعد وہ ایک پُرپیچ قسم کی گلی میں ایک دو منزلہ مکان کے سامنے تھے۔ دونوں محافظ کار سے اترے اور ان سے ہاتھ ملا کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔ صبا مکان کی طرف بڑھی۔ ''بین...! آ جاؤ۔''

دروازہ ایک نوجوان لڑکی نے کھولا۔ اس کے صبیح نقوش میں صبا کی جھلک واضح تھی۔ اس نے عربی لباس پہن رکھا تھا۔ صبا کو دیکھ کر گرم جوشی سے اس کے گلے لگ گئی پھر اس نے چلا کر کچھ کہا۔ اندر سے دو بچے نمودار ہوئے۔ ان کی عمریں پانچ اور سات سال تھیں۔ وہ بھی صبا سے لپٹ گئے۔ پھر صبا کی بہن بین کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس نے شوخ لہجے میں صبا سے کچھ کہا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا اور بین کا تعارف کرایا۔

''یہ بین ہے اور یہ میری چھوٹی بہن مریم ہے۔''

''ہیلو!'' بین نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ''کیسی ہو تم.... تمہارے بچے بہت پیارے ہیں۔''

''یہ انگریزی نہیں سمجھتی۔'' صبا نے بتایا اور بین کے جملے کا عربی میں ترجمہ کیا۔

مریم کھل اٹھی۔ اس نے خوش اخلاقی سے بین کا شکریہ ادا کیا۔ وہ ان دونوں کو اندر لائی۔ چھوٹے بچے ہونے کے باوجود اس کا گھر خوب صورتی سے سجا تھا۔ مریم نے بتایا کہ اس کا شوہر طارق ایک دن کے لیے اپنی زمین کی طرف گیا ہے۔ یہاں سے بیس میل شمال میں اس کی زمین تھی جس پر اس نے باغ لگا رکھے تھے۔ وہ ہفتے میں دو تین بار ان کی دیکھ بھال کرنے جاتا تھا۔ مریم نے موسم کی مناسبت سے بین کے لیے کافی بنائی۔ ساتھ میں مقامی طور پر تیار کیے ہوئے کیک اور بسکٹ بھی تھے۔ بین نے دوپہر کا کھانا راستے میں کھانا تھا مگر چیک پوسٹ پر پیش آنے والے سانحے کی وجہ سے کسی نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اب بین کو بھوک لگ رہی تھی۔

مریم نے اس کے لیے دوسری منزل پر ایک کمرا کھول دیا۔ اس کا مکان خاصا بڑا تھا۔ اس کے برابر والے کمرے میں صبا ٹھہری تھی۔ بین اپنا سامان اوپر لے آیا۔ پانچ بجے اندھیرا چھا گیا تھا۔ مریم نے بتایا کہ وہ سات بجے کھانا لگا دے گی۔ وہ باورچی خانے کی طرف گئی تو صبا کو بھی ساتھ لے گئی۔ بین بچوں سے دل بہلانے لگا۔ اسے عربی نہیں آتی تھی اور بچے صرف عربی بولتے تھے۔ ایک کا نام فہد اور دوسرے کا نام عامر تھا۔ بین حیران تھا کہ یہاں رہنے والے عیسائی رسم و رواج اور ناموں کے لحاظ سے عرب لگتے تھے۔ صرف ایک جگہ صلیب پر یسوع مسیح کی شبیہہ بتاتی تھی کہ مکین عیسائی ہیں۔

ساڑھے چھ بجے صبا کسی بات پر ہنستی ہوئی اندر آئی۔ اس نے بین سے کہا۔ ''میں یہاں آ کر بھول ہی گئی کہ ہم کسی کام سے آئے ہیں۔''

''میں سوچ رہا ہوں کہ ہم خود شائستی کو تلاش کرتے ہیں۔''

''خود... وہ کیسے؟''

''اس کے گھر چلتے ہیں... ممکن ہے اس کی گرل فرینڈ کے علم میں کچھ ہو۔''

صبا نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''کھانے کے بعد چلتے ہیں مگر رات کو یہاں خطرہ ہوتا ہے۔ مریم کا کہنا ہے کہ تاریکی چھاتے ہی سڑکوں پر مسلح افراد نظر آنے لگتے ہیں۔''

''ہم سڑکوں پر جانے سے گریز کریں گے۔'' بین نے جواب دیا۔ وہ شائستی سے ملنے اور تختی لے کر جلد از جلد اس جگہ سے جانے کے لیے بے چین تھا۔

کھانا مزے کا تھا۔ مریم نے عربی طرز کا پلاؤ اور مکس پھلوں سے بنی سوئٹ ڈش تیار کی تھی۔ وہ معذرت کر رہی تھی کہ وہ کوئی خاص اہتمام نہیں کر سکی۔ آخر میں انگور سے مقامی طور پر کشید کی ہوئی شراب تھی۔ کھانے کے بعد بین نے صبا سے چلنے کو کہا۔ اس نے بہن سے بات کی اور دونوں تیار ہو کر باہر آئے۔ رات ہوتے ہی سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ بین نے جیکٹ پہن لی تھی۔ اس کے پاس اسلحہ نہیں تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ صبا مسلح ہے یا نہیں۔ وہ کار میں سوار ہوئے۔ صبا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اسے پتا تھا کہ شائستی کا گھر کہاں ہے۔ وہ چند سڑکوں سے ہوتے ہوئے اس کے گھر کے سامنے پہنچے۔ صبا نے بیل بجائی۔

''کون ہے؟'' چند منٹ بعد ایک سہمی ہوئی نسوانی آواز نے پوچھا۔

''مجھے شائستی سے ملنا ہے۔'' صبا نے جواب دیا۔
''وہ گھر پر نہیں ہے۔'' نسوانی آواز نے جواب دیا۔
''تب میں تم سے بات کروں گی۔''
''میں اکیلی ہوں... دروازہ نہیں کھول سکتی۔''
''سنو! میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔'' صبا نے التجا کی۔ ''پلیز! مجھے اندر آنے دو۔''
اندر کچھ دیر خاموشی رہی پھر لڑکی نے دروازہ کھول دیا مگر بین پر نظر پڑتے ہی اس نے دروازہ بند کرنا چاہا مگر بین نے دروازے میں ٹانگ اڑادی۔ صبا نے دروازہ دھکیلا اور وہ اندر آگئے۔ لڑکی تقریباً بیس سال کی اور بے حد حسین تھی۔ وہ خوف سے لرز رہی تھی۔
''یہ کیا حرکت ہے؟''
''ہم صرف بات کرنے آئے ہیں۔'' صبا بولی۔
''میں کوئی بات نہیں کروں گی۔'' لڑکی نے ہذیانی لہجے میں کہا۔
''سنو لڑکی! میں شائستی سے کچھ لینے کے لیے فرانس سے آیا ہوں۔'' بین نے اس کے سامنے آکر کہا۔ ''اس سے تم اندازہ لگالو... معاملہ کتنا سنجیدہ ہے۔''
''شائستی گھر پر نہیں ہے۔''
''تب تم جانتی ہو گی کہ وہ کہاں ہے؟''
''خدا کے لیے... میں کچھ نہیں جانتی۔'' اس نے سر تھام لیا۔
''شائستی کو کسی نے دھمکی دی تھی؟'' بین نے اندھیرے میں تیر چلایا۔
''تت... تم کیسے جانتے ہو؟'' لڑکی ششدر رہ گئی۔
''میرا اسی سے تعلق ہے۔'' بین کا لہجہ معنی خیز تھا۔ ''وہ کہاں روپوش ہے... جب تک وہ چیز میرے حوالے نہیں کرے گا، اس کے سر پر خطرات منڈلاتے رہیں گے۔''
''مجھے کچھ نہیں معلوم۔'' لڑکی نے ہٹ دھرمی سے جواب دیا۔
اچانک صبا نے اپنے لباس سے ایک عدد ریوالور نکال لیا۔ ''یہ اس طرح نہیں بتائے گی۔ بین! اسے اندر لے چلو۔'' صبا کا نرم و نازک لہجہ اچانک سفاکانہ اور پتھریلا ہو گیا تھا۔
بین نے حیرت سے اسے دیکھا مگر اس نے لڑکی کو بازو سے پکڑ لیا اور اسے مکان کے اندر لے آئے۔ وہ مچل رہی تھی مگر چیخنے چلانے سے گریز کر رہی تھی۔ صبا کے کہنے پر بین نے اسے اس کے مفلر نما دوپٹے سے ایک کرسی کے ساتھ باندھ دیا۔ صبا نے ریوالور کوٹ میں رکھ لیا اور ایک چھوٹا سا چاقو نکال کر اس سے لڑکی کا لباس سامنے سے چاک کر دیا پھر اس نے چاقو کی نوک سے اس کے سینے پر ہلکا سا کٹ لگا کر اہی۔ بین نے کہا۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟''
''تم چپ رہو۔'' صبا غرائی۔ ''یہ اس طرح نہیں بتائے گی۔''
''سنو... یہ شائستی کی ساتھی ہے اور مجھے شائستی کے ساتھیوں نے اس کام کے لیے مقرر کیا ہے۔ ہم اس پر تشدد نہیں کر سکتے۔''
صبا نے اپنی جیب سے ایک ٹیپ نکالا اور اس کا ٹکڑا لڑکی کے منہ پر چپکا دیا۔ ''یہ دشمن کے ساتھ مل کر شائستی کو غائب کر سکتی ہے۔''
لڑکی نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔ یعنی وہ دشمن ایجنٹ ہونے سے انکار کر رہی تھی مگر صبا نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر چاقو سے اس کا اندرونی لباس بھی کاٹ دیا اور سینے کا ایک حصہ چٹکی میں دبا کر بولی۔ ''اگر تم اپنی خوب صورتی کو بدنمائی میں تبدیل نہیں کرنا چاہتیں تو شرافت سے بتا دو کہ شائستی کہاں ہے؟''
لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے مگر اس نے نفی میں سر ہلانا جاری رکھا۔ صبا نے چاقو اس کے جسم پر رکھا، وہ سچ مچ اس کی بوٹی کاٹنے جا رہی تھی۔ بین کانپ گیا۔ اس نے صبا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''یہ کیا کر رہی ہو... یہ ظلم ہے۔''
''یہ اسی طرح بتائے گی۔''
''میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' بین نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھ سے کہا گیا تھا کہ یہاں مجھے شائستی نامی فرد ملے گا اور وہ مجھے ایک شے دے گا۔ اب وہ یہاں نہیں ہے تو اسے تلاش کرنا میری ذمے داری نہیں ہے۔ میں واپس جا کر وہ چیز نہ لانے کی وجہ بتا دوں گا۔''
''نہیں، وہ چیز ہر قیمت پر لے کر جانی ہے... وہ بہت ضروری ہے۔'' صبا ہٹ دھرمی سے بولی۔
''تمہیں اس سے کیا دلچسپی ہے؟''
''تمہارا کیا خیال ہے، مجھے تمہارے ساتھ کیوں لگایا گیا ہے؟'' صبا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ''مسٹر بین... وہ سختی ہر قیمت پر لے کر جانی ہے۔''
بین چونکا۔ ''تم جانتی ہو اس سختی کے بارے میں؟''
''تم پھر غور نہیں کر رہے کہ مجھے تمہارے ساتھ کیوں لگایا گیا ہے۔''
''اس کے باوجود میں اس لڑکی پر اس قسم کے تشدد کی اجازت نہیں دوں گا۔'' بین نے مضبوط لہجے میں کہا تو صبا جھنجلا گئی۔ اس نے جھٹکے سے لڑکی کو چھوڑ دیا۔
''تب تم بتاؤ کہ شائستی کو کیسے تلاش کیا جائے؟''

بین نے سوچا اور لڑکی کے منہ سے ٹیپ ہٹا دیا پھر اس نے نرمی سے کہا۔ ”سنو... ہمیں بہرصورت شائستی سے وہ شے لینی ہے۔“

لڑکی چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں قسم کھاتی ہوں... مجھے شائستی کے بارے میں نہیں معلوم۔“

”دیکھو! وہ اپنی مرضی سے گیا ہے اور اسے بھی اپنی ذمے داری کا پتا ہے۔ وہ تمہیں کچھ نہ کچھ بتا کر گیا ہوگا۔ پلیز! ہماری مدد کرو۔“

”ورنہ اس کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔“ صبا نے اضافہ کیا۔

لڑکی ہچکچائی۔ ”میں واقعی نہیں جانتی مگر قصبے سے باہر شمال کی طرف جانے والی سڑک پر ایک گیس اسٹیشن ہے۔ وہاں پر زکریا نامی شخص ہے۔ وہ جانتا ہے کہ شائستی کہاں ملے گا۔“

”گڈ!“ بین نے سکون کا سانس لیا۔ ”میں تمہارے تعاون کا شکر گزار ہوں۔“

”تم چل کر گاڑی میں بیٹھو، میں اسے بند کر کے آتی ہوں۔“

”مگر کیوں؟“ لڑکی نے احتجاج کیا۔ ”میں نے تعاون کیا ہے۔“

”تم نے اگر ہمیں غلط بتایا ہے یا تم دشمن سے ملی ہو تو تمہیں کسی سے رابطہ کرنے یا فرار ہونے سے روکنا ہے۔ اگر تم بے گناہ ہو تو ہم واپس آ کر تمہیں رہا کر دیں گے۔“

بین باہر آیا۔ صبا دس منٹ بعد آئی تھی۔ ”میں نے اسے ایک اندرونی کمرے میں بند کر دیا ہے۔ وہ وہاں سے نہیں نکل سکتی۔“

وہ کار میں قصبے کے شمال کی طرف روانہ ہوئے۔ سردی شدید تھی اور فضا میں دُھند پھیل رہی تھی جس سے سامنے دیکھنے میں شدید دشواری پیش آ رہی تھی۔ صبا نے روشنیاں تیز کر دیں، اس کے باوجود بیس پچیس گز سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ صبا نے رفتار سست کر لی۔ اس نے خاصی دیر بعد کہا۔ ”مجھے اس لڑکی پر شک تھا۔ وہ ہم سے جھوٹ بول رہی تھی۔“

”تھی... یعنی اس نے سچ کہا ہے؟“

صبا ذرا بوکھلائی۔ ”ہاں... میرا خیال ہے کہ اس نے شائستی کے بارے میں درست کہا ہے۔ وہ ہمیں مل جائے گا۔“

آدھے گھنٹے بعد وہ زکریا کے گیس اسٹیشن کے سامنے تھے۔ زکریا موجود تھا۔ اس نے بین کی بات سنی اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا۔ ”تم رکو... میں آتا ہوں۔“

زکریا تقریباً پچاس برس کا عراقی نقوش کا حامل تنومند تھا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ شائستی سے رابطہ کرنے گیا ہے۔“

مگر چند منٹ بعد اچانک دونوں جانب سے دو مسلح افراد نمودار ہوئے اور انہوں نے ان کو رائفلوں کی زد میں لے کر نیچے اترنے کا حکم دیا۔ ان کے پیچھے زکریا تھا۔ بین نے صبا کی طرف دیکھا اور باہر اتر کر ہاتھ اوپر کر لیے۔ ان کو گیس اسٹیشن کے عقب میں ایک کمرے میں لایا گیا۔ صبا کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ زکریا نے غور سے ان کو دیکھا اور بولا۔ ”تمہیں میرے بارے میں کس نے بتایا؟“

”شائستی کی گرل فرینڈ نے!“ بین نے اپنے لبوں پر زبان پھیری۔

”ہادیہ کہاں ہے؟“ زکریا بولا۔ ”یہ اسی لڑکی کا نام ہے۔“

”اپنے گھر میں!“ بین نے جواب دیا۔

”غلط... وہاں سے کوئی جواب نہیں مل رہا ہے۔“ زکریا بولا۔ ”صحیح صحیح بتاؤ... میرا کس نے بتایا ہے؟ تم دونوں کی لاشوں کا بھی پتا نہیں چلے گا۔“ اس کا لہجہ خوں خوار ہو گیا تھا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ بین نے ہمت کر کے کہا۔ ”ہمیں اس لڑکی نے تمہارے بارے میں بتایا ہے۔ ہمارا شائستی سے رابطہ بے حد ضروری ہے۔“

”کیوں؟“

”اس نے مجھے ایک چیز دینی ہے۔“

”کیا چیز ہے؟“

”یہ مجھے بھی نہیں معلوم۔“ بین نے کسی قدر جھوٹ سے کام لیا اور بولا۔ ”اس نے مجھے جو بھی چیز دی، میں اسے لے جا کر کسی کو دینے کا پابند ہوں۔“

”وہ شخص کون ہے؟“

”وہ لندن میں ہے۔ تم اسے نہیں جانتے اس لیے تمہارا جاننا بے کار ہے۔“

”ٹھیک ہے، اب تم دونوں شائستی کے آنے کا انتظار کرو، اس کے بعد تمہارا فیصلہ ہوگا۔“

”دیکھو، میں ایک فرانسیسی باشندہ ہوں اور فرانس اس جنگ میں شامل نہیں ہے۔ نہ ہی میرا امریکیوں سے کوئی تعلق ہے۔“

”اور یہ؟“ زکریا نے صبا کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ میری راہنما ہے اور قابل کی رہنے والی ہے۔“ بین نے صبا کے بارے میں اختصار سے بتایا۔

”ٹھیک ہے... دیکھو شائستی کب آتا ہے۔“

زکریا اور مسلح افراد ان کو اس کمرے میں بند کر کے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی بین نے سرگوشی کی۔ ”مجھے معاملہ گڑبڑ...

...شائستی کے ساتھی ہیں اور حریت پسند لگتے ہیں... جبکہ تم وزارتِ داخلہ کی افسر ہو... یہ کیا تعلق ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم... مجھے اوپر سے جو حکم دیا گیا ہے، میں وہ پورا کر رہی ہوں۔“

”ہادیہ کیوں نہیں جواب دے رہی ہے؟“

”اس کا بھی مجھے نہیں معلوم۔“

بین کچھ دیر اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا پھر اس نے تنے سے کہا۔ ”فرض کرو، شائستی نے مجھے پہچان لیا مگر تم سے بھی ظاہر کی تو تم سوچ سکتی ہو کہ تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔“

صبا ذرا خوف زدہ ہوئی مگر اس کے طنطنے میں کمی نہیں آئی تھی۔ ”میرے پاس ریوالور ہے، میں اتنی آسانی سے نہیں مروں گی۔“

”خدا کے لیے... تم نے دیکھا نہیں... ان لوگوں کے پاس کتنے خوف ناک ہتھیار ہیں۔ ان کے سامنے تمہارے ننھے سے پستول کی کیا حیثیت ہے؟“

”تم نے یہ کیوں محسوس کیا کہ یہ چھاپہ مار ہیں... عراق میں اس وقت سیکڑوں مسلح گروہ ہیں مگر ان میں سب چھاپہ مار حریت پسند نہیں ہیں۔“

”بس مجھے ان کے انداز سے یہی لگا۔ یہ جرائم پیشہ یا ڈاکو نہیں لگ رہے۔“ بین بولا۔

دو گھنٹے بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک دبلا پتلا اور چھوٹے قد والا مقامی شخص اندر آیا۔ اس کا قد تو ساڑھے پانچ فٹ تھا لیکن اپنی کمزور صحت کی وجہ سے وہ چھوٹا سا لگ رہا تھا۔ اس کے عقب میں مسلح زکریا تھا۔ اس نے روسی ساختہ کلاشنکوف اٹھا رکھی تھی۔ بین نے نئے آدمی کو غور سے دیکھا۔

”تم بین سلیٹر ہو؟“ چھوٹے قد والے آدمی نے پوچھا۔

بین نے سر ہلایا۔ ”ہاں اور تم کون ہو؟“

”شائستی...“ اس شخص نے کہا تو صبا ...

...میں آئی۔ اس نے ریوالور نکال لیا۔

...نے ... کوشش کی تھی مگر شائستی نا...

...میں آ... اور اس نے لپک کر...

...چکی تھی مگر گولی چھت ...

...لڑا سے جھکایا اور دھکا دے ...

...یا۔ اس کی کمر پر پیر رکھ کر اس ...

...دوران میں زکریا ہکا بکا بین...

”خبردار! حرکت مت کرنا۔“ اس...

”صبا! یہ تم نے کیا کیا؟“

شائستی نے صبا کی تلاشی لی اور اسے شانے سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کر دیا۔ وہ جتنا پھرتیلا تھا، اتنا ہی طاقتور بھی تھا۔

”تم نے مجھ پر گولی کیوں چلائی؟“

صبا نے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے... جیسے جواب نہ دینے کا تہیہ کر لیا ہو۔ شائستی کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر بین کی طرف متوجہ ہوا۔ ”مسٹر سلیٹر... مجھے افسوس ہے... لیکن تم ٹریپ ہوئے ہو۔“

”میں اب تک کچھ سمجھنے سے قاصر ہوں۔ مجھے پیرس میں ایک نامعلوم شخص نے کال کر کے اس کام کے لیے ہائر کیا۔ مجھے کوریئر سے پچیس ہزار ڈالرز اور واپسی کے ٹکٹ کے ساتھ ایک ہدایت نامہ ملا جس کے مطابق مجھے تم سے ایک شے لے کر لندن میں ایک شخص کو پہنچانی تھی مگر یہاں پر تو سلسلہ ہی کچھ اور ہے۔“

”یہ عورت تمہیں کہاں ملی؟“

بین نے سوچا اور پھر بولا۔ ”یہ مجھے بغداد کے ایک ہوٹل میں ملی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ قابل کی رہنے والی ہے۔ یہاں اس کی بہن بھی ہے۔ اس نے میری راہنمائی کی ہے۔“

”یہ ایجنٹ ہے۔“ شائستی نے یقین سے کہا۔ ”اور یقیناً مجھے قتل کرنے آئی تھی۔“

بین اچھل پڑا۔ ”قتل کرنے؟“

شائستی نے اسے گھورا۔ ”تمہارے خیال میں اس نے ریوالور مجھے پیش کرنے کے لیے نکالا تھا؟“

”مگر میں...“

”مسٹر سلیٹر... میں جانتا ہوں... تم اس معاملے میں ملوث نہیں ہو... مگر تم استعمال ہوئے ہو، خاص بات یہ ہے کہ مجھے ایسی کوئی...

...میں کھوٹ آجائے تو تمام ... مل سکتی ہے... یا نذرِ آتش ہو سکتی ہے!

...تھا... یعنی ایک ڈسپوزل ... پرانا سامان برائے نام قیمت پر ... کر کے اچھی قیمت پر فروخت ... شے یعنی نوادر بھی اس کے ... ہاتھ لگ جاتا تھا تو اسے منافع میں ... چھ مہینے پہلے اسے ایک نادر ... سو برس پرانی تھی اور امریکا کے زیر استعمال رہی تھی۔ جیف نے صرف تیس ڈالرز میں اسے خریدا تھا اور اسے پچیس ہزار ڈالرز میں نیلام کیا تھا۔

سامان لانے لے جانے کے لیے اس کے پاس درمیانے سائز کا ایک فورڈ ٹرک تھا۔ وہ اس میں سفر کرتا تھا۔ اس کا ڈسپوزل سینٹر واشنگٹن کے پاس ایک نواحی علاقے میں تھا اور وہ اس علاقے میں کام بھی کرتا تھا۔ دریا کے کنارے دونوں طرف دور دور تک چھوٹی چھوٹی کالونیاں اور فارم ہاؤس تھے۔ یہاں زیادہ تر درمیانے طبقے کے لوگ آباد تھے۔

کچھ دولت مند بھی تھے جو تنہائی پسند تھے۔ انہوں نے اس علاقے میں بڑے بڑے ولا زبنا رکھے تھے۔ جیف کو جب کسی ولا سے ڈسپوزل کا کام ملتا تھا تو اس کے وارے نیارے ہو جاتے تھے... مگر ایسا کام کم ہی ملتا تھا۔ زیادہ تر لوگ اسے اپنے گھر کا کچرا دینے کے لیے بلاتے تھے جسے وہ ازخود ٹھکانے لگاتے تو خرچ بھی ہوتا اور ان کا وقت بھی ضائع ہوتا مگر جیف کو ہر کال پر جانا پڑتا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ کہاں سے اسے کام کی چیز ملے گی۔ یہی وجہ تھی کہ اسے جانا پڑتا تھا۔

ویسے تو سارا کام جیف خود کرلیا کرتا تھا مگر اسے کہیں سے کوئی وزنی شے لانی ہوتی تھی تو وہ ولیم کو ساتھ لے جاتا تھا۔ ولیم .... تنومند اور کامل قسم کا سیاہ فام تھا جسے مستقل کام کرنے سے چڑ تھی۔ جیف کے ساتھ کام کر کے وہ ایک دو گھنٹے میں بیس پچیس ڈالرز کما لیا کرتا تھا اور خوش تھا۔ جیف کسی کال پر جانے سے پہلے وضاحت مانگ لیا کرتا تھا کہ سامان بھاری تو نہیں ہے جسے اٹھانے کے لیے ایک سے زیادہ آدمی کی ضرورت پڑے۔ اگر سامان وزنی ہوتا تھا تو وہ ولیم کو ساتھ لے جاتا تھا اور اسے فی گھنٹے کے حساب سے معاوضہ دیا کرتا تھا۔

مگر اس روز جس عورت کا فون آیا، اس نے بتایا کہ اس کے پاس دو عدد سیٹوں والے لیدر کے صوفے ہیں جنہیں وہ سیل کرنا چاہ رہی ہے۔ ''میرا خیال ہے کہ اوسط جسامت کا شخص بہ آسانی ان کو اٹھا سکتا ہے۔ جب میرے شوہر نے یہ صوفے لیے تھے تو وہ ان کو خود لایا تھا۔ اس کا قد ساڑھے پانچ فٹ اور وزن ایک سو پچاس پونڈز تھا۔'' عورت نے اپنا نام مسز کارل بتایا تھا اور پتا ہائی وے انیس کا تھا۔ پتے سے جیف نے اندازہ لگایا کہ وہ عورت الگ تھلگ ولا میں رہتی ہے۔ اس نے وعدہ کیا کہ شام چار بجے تک پہنچ جائے گا۔ اس علاقے میں اگست کا موسم بے حد گرم ہوتا ہے اور دن میں جیف باہر نکلنے سے گریز کرتا تھا... اگر جانا مجبوری نہ ہو۔ اس کے ٹرک میں اے سی نہیں تھا۔

جیف اپنے ڈسپوزل سینٹر کے اوپر دو کمروں کے اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ چالیس سال کا ہونے کے باوجود اس نے شادی نہیں کی تھی۔ اس کا مقولہ تھا کہ جب بازار سے دودھ مل جاتا ہے تو گھر میں گائے پالنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہفتے میں ایک دو بار وہ کسی کال گرل کو لے آتا تھا۔ کبھی کبھی خوش قسمتی سے اسے کسی کالج کی لڑکی بھی مل جاتی تھی۔ اگرچہ کالج کی لڑکیاں زیادہ چارج کرتی تھیں مگر جیف کو وہ زیادہ پسند بھی تھیں۔ اس لیے وہ ان کا زیادہ معاوضہ بھی بہ خوشی برداشت کرلیا کرتا تھا۔ ہفتے میں دو تین دن وہ ایک نائٹ کلب جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر سال شدید سردی کے دو مہینے وہ فلوریڈا کے ساحلوں اور کیوبا میں گزارتا تھا اور ان دنوں میں کھل کر عیاشی اور مزے کرتا تھا۔

جیف نے چار بجے اس خوب صورت مگر چھوٹے سے گھر کے سامنے ٹرک روکا جو ہائی وے سے کچھ ہی دور تھا۔ ایک کچا راستہ اس کی طرف جاتا تھا جس پر دونوں جانب گھنے درخت لگے ہوئے تھے۔ مکان کے سامنے اور دائیں بائیں چھوٹا سا خوب صورت لان تھا اور عقب میں گھنا جنگل تھا۔ اگر عورت اس جگہ اکیلی رہتی تھی تو اس کی ہمت قابلِ داد تھی۔ اس نے اندر جا کر دروازے کی کال بیل کا بٹن دبایا۔ مترنم گھنٹی کے بجنے کے ایک منٹ بعد دروازہ کھلا اور جیف کے سامنے ایک پچاس پچپن برس کی صحت مند عورت کھڑی تھی۔ اس کا حسن یقیناً قابلِ دید تھا اور اس عمر میں بھی وہ ایک دلکش خاتون تھی۔ جیف نے ٹوپی اتاری۔ ''میڈم! میں جیف فاریکس... فاریکس ڈسپوزل سینٹر سے!''

''مجھے اپنا کارڈ دکھاؤ نوجوان؟'' مسز کارل نے مطالبہ کیا۔ ''میں اکیلی عورت ہوں، اس لیے بغیر شناخت کے کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔''

جیف نے اپنا بزنس کارڈ اور ڈرائیونگ لائسنس اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس سے تمہاری تسلی ہو جائے گی۔''

مسز کارل نے دونوں چیزیں دیکھیں اور سر ہلاتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ ''آجاؤ مسٹر فاریکس!''

جیف اندر آیا۔ اس نے گھر دیکھا۔ یہ نفاست اور صفائی سے سجا خوب صورت مکان تھا۔ خاص طور سے نشست گاہ بہت اچھے انداز میں آرائش کی گئی تھی۔ لکڑی سے بنے ایک بُت کو دیکھ کر جیف اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ یہ کوئی فٹ بھر اونچا جنوبی امریکا کی پرانی تہذیب سے تعلق رکھنے والے مذہبی بتوں سے ملتا جلتا تھا۔ مسز کارل نے اس کی دلچسپی بھانپ لی تھی۔

''یہ مجسمہ میرے شوہر پیرو سے خرید کر لائے تھے۔ مجھے تو اس کے بارے میں زیادہ نہیں معلوم مگر کارل کا کہنا ہے کہ یہ بہت قیمتی مجسمہ ہے۔ اس کی تاریخی حیثیت ہے۔''

جیف نے یہ بات محسوس کرلی تھی مگر اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''ہاں، ان مجسموں کی ایسی نقول میں نے بے شمار دیکھی ہیں۔''

''یہ نقل نہیں ہے۔'' مسز کارل نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

''مسز کارل! یہ میرا کام ہے اور مجھے اچھی طرح پتا ہے

کہ کون سی چیز اصل ہوتی ہے اور کون سی نقل... بہرحال، اسے چھوڑیے... مجھے صوفے دکھایئے... مجھے ابھی واپس بھی جانا ہے۔''

''میرے ساتھ آؤ۔'' مسز کارل اسے نشست گاہ سے متصل ایک چھوٹے سے کمرے میں لائی۔ یہ جگہ بھی نشست گاہ کے طور پر ہی استعمال ہوتی تھی کیونکہ یہاں سرخ لیدر سے بنے دو صوفوں، ایک کاؤچ اور ایک میز کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کمرے میں اس سے زیادہ کی گنجائش بھی نہیں تھی۔

''یہ رہے دونوں صوفے!'' مسز کارل نے سرخ لیدر کے دو نشستوں والے صوفوں کی طرف اشارہ کیا۔

''میں ان کو فروخت کرنا چاہتی ہوں۔''

جیف نے صوفوں کا معائنہ کیا۔ یہ بہت اعلیٰ درجے کے چمڑے سے بنے نفیس قسم کے صوفے تھے جن کے اندر لکڑی کے بجائے دھات کا فریم لگا ہوا تھا۔ مسز کارل کے مطابق یہ کوئی بیس سال پرانے تھے مگر آج بھی یہ نئے جیسے لگ رہے تھے۔ معیاری فوم آج بھی دبیز اور ہموار تھا۔ کہیں سے ذرا بھی نہیں دبا تھا۔ نہ تو سلائی خراب ہوئی تھی اور نہ ہی چمڑے کی پالش... بلکہ مسلسل استعمال سے اس میں ریشم جیسی چمک اور نرمی آگئی تھی۔

''اچھے ہیں۔'' جیف نے تسلیم کیا۔ ''لیکن آج کل ان کا فیشن نہیں ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ اس قسم کی چیزوں کا فیشن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بہرحال، مجھے ان کو اس کمرے سے نکالنا ہے اور میرے پاس کوئی اور جگہ نہیں ہے، اس لیے تم ان کو لے جاؤ۔ یہ بتاؤ کہ ان کی کیا قیمت دو گے؟''

جیف دل ہی دل میں حساب لگا رہا تھا... اگر کوئی اچھا گاہک لگ گیا تو ان صوفوں کے پانچ سو ڈالرز دے سکتا تھا۔ اس نے مسز کارل سے کہا۔ ''اگرچہ ان چیزوں کو لانے لے جانے، رکھنے اور ان کی دیکھ بھال میں کافی خرچ ہوتا ہے، وقت الگ لگتا ہے۔ میں نے بتایا کہ ان کا رواج بھی نہ ہونے کے برابر ہے پھر بھی میں ان کے بدلے آپ کو ایک سو ڈالرز دوں گا۔''

مسز کارل کے چہرے پر مایوسی دکھائی دی۔ ''اچھا... میں تو سمجھتی تھی کہ ان کی مالیت اب بھی تین چار سو ڈالرز ہوگی۔''

''مجھے افسوس ہے، میں اس سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ یہ بھی میرا رسک ہے۔ ممکن ہے، یہ سرے سے بکیں ہی نہیں اور میرے سینٹر پر پڑے پڑے خراب ہو جائیں۔''

مسز کارل شرارتی انداز میں مسکرائی۔ ''سچ... مجھے تو لگ رہا ہے کہ تم ان صوفوں کو اچھے داموں بیچ دو گے۔ ممکن ہے تمہیں ان کے پانچ چھ سو ڈالرز مل جائیں۔''

''خدا کرے۔'' جیف نے دل ہی دل میں اس کے اندازے پر حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''مگر مسز کارل! اگر ہمیں فائدہ نہ ہو تو ہم یہ کام کیوں کریں؟''

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ اگر تمہیں فائدہ نہ ہو تو تم یہ کام کیوں کرنے لگے۔''

''تو آپ کو یہ قیمت قبول ہے؟''

''ہاں...'' اس نے سرد آہ بھری۔ ''اگر مجبوری نہ ہوتی تو میں کسی قیمت پر ان کو فروخت نہ کرتی۔ میرے لیے یہ کارل کی نشانی ہیں۔''

''ایسی کیا مجبوری ہے مسز کارل؟'' جیف سودا طے پا جانے پر خوش تھا۔ اس نے جلدی سے پرس سے رقم نکالی۔

''دراصل میں کچھ فزیوتھراپی کراتی ہوں۔ یہ تھراپیز مشینوں کی مدد سے ہوتی ہیں اور وہ مشینیں یہاں لگیں گی۔''

''ان صوفوں کو رکھنے کی اور کوئی جگہ نہیں ہے؟''

''نہیں... تم دیکھ رہے ہو میرا گھر مختصر سا ہے۔ اس میں صوفے رکھنے کی کوئی اور جگہ نہیں ہے۔''

جیف نے باری باری دونوں صوفے اٹھا کر اپنے ٹرک کے عقبی حصے میں رکھے۔ ان پر ترپال ڈال کر ان کو رسی سے باندھ دیا تاکہ دورانِ سفر حرکت نہ کرسکیں۔

''مسز کارل! تم یہاں اکیلی رہتی ہو... کوئی مکان میں گھس آئے تو... تم یہاں اکیلی اور بے بس ہو۔ بہتر ہے کہ اپنے گھر میں حفاظتی الارم لگا دیا کوئی جانور پال لو۔''

''کتے مجھے اچھے نہیں لگتے مگر میرے مکان میں الارم ہے۔ جیسے ہی کوئی اندر داخل ہونے کی کوشش کرے گا، مجھے پتا چل جائے گا۔''

''اوکے!'' جیف نے اپنا کام مکمل کر کے اسے رسید بنا کر دی۔ ''اس پر سائن کردو کہ تم نے یہ صوفے مجھے فروخت کردیے ہیں۔''

''ضرور!'' مسز کارل نے رسید پر دستخط کردیے۔

جیف نے رسید جیب میں رکھی اور مسز کارل سے ہاتھ ملا کر ٹرک میں سوار ہوا۔ ''آئندہ بھی کہیں کچھ ڈسپوزل کرنا ہو تو مجھے یاد کرلینا۔''

''میں تمہیں ہی کال کروں گی۔'' مسز کارل نے نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

جیف روانہ ہوگیا۔ اپنے ڈسپوزل سینٹر پہنچ کر اس نے صوفے اتارے۔ گرد و غبار سے بچانے کے لیے ان پر

شفاف پلاسٹک کی پنی چڑھائی اور ان پر قیمت کی چٹ لگا دی۔ اس نے ایک صوفے کی قیمت تین سو ڈالرز رکھی تھی۔ پھر اس نے یہ صوفے سینٹر میں سامنے نمایاں طور پر رکھ دیے۔ ابھی ان صوفوں کو رکھے چند گھنٹے گزرے تھے کہ ایک جانی پہچانی گاہک مسز شیپرڈ کا وہاں سے گزر ہوا۔ انہیں صوفے اچھے لگے اور ذرا سے بھاؤ تاؤ کے بعد انہوں نے جیف سے یہ صوفے چار سو ستر ڈالرز میں خرید لیے۔ جیف خوش تھا اور اس خوشی میں اس نے بار کا رخ کیا اور وہاں سرخ شراب کا آرڈر دیا۔ بار کے مالک سولون نے گلاس اس کے سامنے رکھا۔ ''لگتا ہے آج تم نے کوئی اچھی رقم کمائی ہے؟''

''ایسا ہی سمجھ لو۔'' جیف نے گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

بار سے نکل کر اس نے ایک اچھے ریستوران کا رخ کیا۔ وہاں ڈٹ کر کھایا اور واپسی میں ایک عدد برانڈی کی بوتل لیتا آیا۔ اس نے گھر آ کر بچ جانے والی رقم ایک خفیہ جگہ چھپا دی۔ بیشتر کاروبار کرنے والوں کی طرح وہ بھی اپنی اصل آمدنی چھپاتا تھا۔ اس کا بینک اکاؤنٹ تھا مگر وہ اس میں اتنی ہی رقم جمع کراتا تھا کہ اسے ٹیکس نہ دینا پڑے۔ باقی رقم وہ اپنے اپارٹمنٹ کی اس خفیہ تجوری میں رکھتا تھا۔ یہ بہ ظاہر اوون تھا مگر اس کے اندر ایک خفیہ خانہ تھا اور اوون خراب تھا۔ اس نے خود اوون میں تبدیلی کر کے اسے تجوری میں بدل لیا تھا۔ اس کے گھر میں کوئی چور آ جاتا تو اس کا دھیان کبھی اوون کی طرف نہ جاتا اور پھر اوون اتنا بڑا تھا کہ اسے اٹھا کر لے جانا آسان کام نہیں تھا۔ اس نے اوون میں رکھی رقم کا جائزہ لیا۔ یہ سترہ ہزار چار سو ڈالرز تھے۔ اسے امید تھی کہ آنے والے ہر موسم سرما میں وہ اتنی رقم جمع کر لے گا کہ برازیل کا ایک چکر لگا سکے۔ یہ اس کی پرانی خواہش تھی کہ برازیل کے سنہرے ساحلوں پر کچھ وقت گزارے جہاں سنہری لڑکیاں پائی جاتی ہیں اور وہ کسی بھی اجنبی کی پذیرائی کرنے سے کبھی نہیں ہچکچاتیں مگر اس سفر کے لیے اسے ابھی اور رقم جمع کرنا تھی... یعنی کم سے کم تیس سے چالیس ہزار ڈالرز!

جیف سستی عیاشی کا قائل نہیں تھا۔ وہ مہینے میں چھ سات ہزار ڈالرز کما لیتا تھا۔ کبھی کوئی ہاتھ لگتا تھا تو یہ رقم دس بارہ ہزار تک پہنچ جاتی تھی۔ اس میں سے وہ اوسطاً ساڑھے چار ہزار ڈالرز ماہانہ خرچ کرتا تھا۔ باقی وہ بچا لیتا تھا۔ اس کا ارادہ جنوری میں برازیل جانے کا تھا یعنی اس کے پاس چار مہینے تھے۔ اس نے حساب لگایا۔ اس رفتار سے وہ تیس ہزار ڈالرز جمع کر سکتا تھا مگر چالیس ہزار ڈالرز مشکل تھے۔

اسے مسز کارل کے گھر میں رکھے مجسمے کا خیال آیا۔ وہ قیمتی مجسمہ اصل تھا اور اس کی مالیت کم سے کم بھی بیس ہزار ڈالرز تھی۔ مگر وہ اسے مسز کارل سے کس طرح حاصل کرتا؟ وہ اسے فروخت کرنے کے لیے تیار بھی ہو جاتی تو نہ جانے اس کی کیا قیمت طلب کرتی؟ جیف نے یہ خیال ذہن سے نکالنا چاہا مگر وہ اس کے ذہن سے جیسے چمٹ کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

جیف نے ٹرک ہائی وے سے اتارا اور اسے اتنی دور لے جا کر درختوں کے درمیان روک دیا کہ وہ ہائی وے سے گزرنے والی پولیس کی کار سے محفوظ رہے۔ ٹرک سے اتر کر اس نے ایک چھوٹا سا کینوس بیگ نکالا اور اسے شانے پر لاد کر درختوں کے درمیان سے ہوتا مسز کارل کے مکان کی طرف بڑھا۔ رات کے دو بج رہے تھے اور آسمان بالکل تاریک تھا۔ مسز کارل کے مکان کی روشنیاں اس تاریکی میں زیادہ ہی نمایاں ہو رہی تھیں۔ اس نے مکان کے عقبی حصے کا رخ کیا جہاں اس کے خیال میں کچن ہونا چاہیے تھا۔ تنہا ہونے کی وجہ سے مسز کارل نے اپنے مکان کے چاروں طرف خوب روشنی کر رکھی تھی۔ اسے کچن کا دروازہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس میں توقع کے عین مطابق شیشہ لگا تھا۔ جیف نے کینوس بیگ نیچے رکھا اور اس سے شیشہ کاٹنے والا اوزار نکالا۔ اسے شیشے پر چپکا کر اس کا پرکار نما حصہ گھمایا جس کے سرے پر ہیرے کا بلیڈ لگا تھا۔ اسے کوئی نصف درجن چکر دیے تو شیشہ کٹ گیا۔ جیف احتیاط سے کام کر رہا تھا تاکہ آواز نہ ہو۔ شیشے کا چھ انچ کا گول حصہ الگ ہو کر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے شیشہ آلے سے الگ کیا اور اسے کیاری میں رکھ دیا۔ آلہ بیگ میں رکھ کر اسے بند کیا اور شانے پر لٹکا لیا۔

کٹے شیشے سے اندر ہاتھ ڈال کر اس نے دروازے کا لاک اور بولٹ کھولا اور اندر آ گیا۔ اس کی توقع کے خلاف الارم نہیں بجا تھا۔ اگر الارم بجتا تو اس کے پاس ایک عدد پستول بھی تھا۔ چہرے پر منڈھے سیاہ نقاب کی وجہ سے مسز کارل اسے کسی صورت نہیں پہچان سکتی تھی۔ اندر آ کر اس نے دروازہ پہلے کی طرح بند کر دیا۔ شیشے میں سوراخ غور سے دیکھے بغیر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ مسز کارل کسی وجہ سے یہاں آئی بھی تو اسے سب معمول کے مطابق نظر آئے گا۔ وہ آگے آیا۔ کچن سے آگے وہ کمرا تھا جہاں سے اس نے صوفے اٹھائے تھے اور اس سے آگے نشست گاہ کا کمرا تھا۔ اسے مسز کارل دکھائی نہیں دی... یعنی وہ اپنے کمرے میں تھی۔

مجسمہ نشست گاہ میں اپنی جگہ موجود تھا۔ اس نے شیشے

کے کارنس سے مجسمہ اٹھایا۔ یہ بے حد پرانا تھا... کم سے کم بھی چھ سات سو سال پرانا! اب جیف کا خیال تھا کہ اس کے لیے اسے کم سے کم تیس ہزار ڈالرز مل سکتے تھے۔ اسے حیرت تھی کہ اتنی قیمتی شے اس عورت نے یوں بے پروائی سے ڈال رکھی تھی۔ ''احمق عورت!'' اس نے زیر لب کہا اور مجسمے کو ایک ریشمی تھیلے میں ڈال کر اور اس کی ڈوری کس کر اسے بھی شانے سے لٹکا لیا۔ وہ احتیاط سے واپس آیا۔ اس نے کچن کا دروازہ کھولا اور الٹے قدموں باہر آیا۔ اس کا دل چاہا کہ اپنی اتنی آسان کامیابی پر ایک زوردار قہقہہ لگائے مگر یہ موقع نہیں تھا۔ یہ کام وہ راستے میں یا گھر جا کر بھی کر سکتا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ حرکت کرتا، اچانک اس کے سر کے عقبی حصے سے کوئی شے آ کر ٹکرائی۔ یہ تصادم اتنا شدید تھا کہ وہ آن واحد میں بے ہوش ہو گیا۔

اسے ہوش آیا تو وہ کسی جگہ بندھا پڑا تھا اور وہاں مکمل تاریکی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے جسم سے لباس اتار لیا گیا تھا اور ایک ہی رسّی سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے تھے۔ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا مگر اس صورت حال نے اسے عارضی طور پر درد بھلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ کہاں تھا؟ اسے کس نے بے ہوش کیا تھا اور اسے کہاں ڈال رکھا تھا؟ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس جگہ سیلن کی بُو تھی۔ شاید وہ کسی تہ خانے میں تھا۔ کیا اسے مسز کارل نے بے ہوش کیا تھا؟ اگر یہ کام مسز کارل نے کیا تھا تو اُسے اس کو پولیس کے حوالے کرنا چاہیے تھا۔ مسز کارل نے اسے اس طرح برہنہ کر کے کیوں باندھ رکھا تھا؟

'کیا بڑھیا... جنسی مریضہ ہے؟' اس نے سوچا اور گلا پھاڑ کر چلّایا۔ ''اے... مجھے کیوں باندھ رکھا ہے... کھولو مجھے۔''

اسی لمحے کہیں پاس دروازہ کھلا مگر روشنی نہیں آئی تھی۔

''خاموش رہو... تم ایک تہ خانے میں ہو... یہ میرے گھر کے عین نیچے ہے۔'' آواز مسز کارل کی تھی۔

''تم نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟'' جیف پھر چلّایا۔

''فکر مت کرو... ابھی تک کچھ نہیں ہوا ہے۔'' مسز کارل نے درشت لہجے میں کہا۔ ''لیکن تم نے میری بات نہ مانی تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔''

جیف کے جسم میں خوف کی سرد لہر سی دوڑ گئی۔ یہ بڑھیا اس کے ساتھ کیا کر سکتی تھی۔ ''تت... تم کیا کرو گی؟''

''کچھ نہیں۔'' مسز کارل نے سادگی سے کہا۔ ''میں تمہیں اس جگہ بندھا چھوڑ جاؤں گی اور تم بھوکے پیاسے مر جاؤ گے... صرف سات آٹھ دن میں!''

اس بار جیف لرز اٹھا۔ بندھے بندھے اس تنگ و تاریک جگہ پر بھوک پیاس سے مرنے کی تکلیف کیسی ہو گی... اس بارے میں سوچ کر اس کی روح فنا ہونے لگی۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتیں۔''

''مجھے کون روکے گا؟''

''خدا کے لیے... تم تو ایک مہربان عورت دکھائی دیتی ہو... یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟''

''میں درحقیقت مہربان عورت ہوں مگر میں اکیلی ہوں۔ اس بڑھاپے میں کمانے سے قاصر ہوں، اس لیے بغیر کام کیے کمانا چاہتی ہوں۔''

جیف اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ ''تمہیں رقم چاہیے... مگر میرے پاس زیادہ رقم نہیں ہے۔''

''غلط... تم کاروباری لوگ اپنی رقم اپنے پاس رکھتے ہو تاکہ تمہیں ٹیکس ادا نہ کرنا پڑے۔ تم نے بھی اپنی رقم چھپا کر رکھی ہو گی۔''

''میرے پاس زیادہ رقم نہیں ہے۔'' جیف نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

''تمہارے پاس خاصی رقم ہے۔'' مسز کارل نے یقین سے کہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے نزدیک تمہاری زندگی کی کیا قیمت ہے؟''

جیف کو اب کسی قدر دکھائی دے رہا تھا۔ یہ ایک خالی کمرا تھا، البتہ اس کے عقب میں کچھ سامان پڑا تھا۔ مسز کارل نے آنکھوں پر تاریکی میں دیکھنے والی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کے سبز شیشے دکھائی دے رہے تھے۔ نہ جانے کیوں اس نے روشنی نہیں کی تھی۔ اس عجیب و غریب سوال پر جیف چونکا تھا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب واضح ہے... اگر تمہاری زندگی خطرے میں ہو تو تم اسے بچانے کے لیے کیا قیمت ادا کر سکتے ہو؟''

''جو کچھ میرے پاس ہو۔'' اس نے ہچکچا کر کہا۔

''تو میں وہی مانگ رہی ہوں جو تمہارے پاس ہے۔ اگر تمہارے نزدیک وہ رقم جو تم نے کہیں چھپا رکھی ہے، تمہاری زندگی کا متبادل ہے تو شوق سے ایسے ہی رہو۔''

مسز کارل چلی گئی اور جیف اسے آوازیں دیتا رہ گیا۔ دروازہ بند ہو گیا اور تہ خانے میں گھور اندھیرا ہو گیا۔ جیف کا زندگی میں پہلی بار اس قسم کی صورت حال سے واسطہ پڑا تھا۔ اس کا رُواں رُواں کھڑا ہو گیا تھا۔ اگر سچ مچ بڑھیا نے اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیا تو وہ سترہ ہزار چار سو ڈالرز اس کی جان سے زیادہ قیمتی نہیں تھے۔ اس نے فوراً فیصلہ کیا کہ وہ رقم

بڑھیا کو دے دے گا۔ ایک بار اسے رہائی مل جائے تو وہ اسے دیکھ لے گا... مگر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ مسز کارل نے رقم لے کر بھی اسے رہا نہ کیا تو وہ کیا کرے گا؟ بلکہ امکان یہی تھا کہ مسز کارل اسے رہا نہیں کرے گی۔ اسے بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرنے کے لیے یہاں چھوڑ دے گی اور جب وہ مر جائے گا تو اس کی لاش تہ خانے سے نکال کر اپنے گھر کے عقب میں واقع جنگل میں دفنا دے گی۔ بڑھیا کے انداز سے لگ رہا تھا کہ یہ اس کے لیے پہلا موقع نہیں تھا۔ وہ اس طرح اور بھی لوگوں کو یہاں لا کر قید کر چکی تھی... بہ قول اس کے، اس کا روزگار یہی تھا۔

نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ گرمی تھی اور وہ حبس سے بے حال ہو چکا تھا۔ پسینا پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور اسے پیاس لگنے لگی تھی۔ اس موسم میں وہ شاید تین چار دن سے زیادہ زندہ نہ رہ پاتا۔ اس نے ایک بار پھر چلا کر مسز کارل کو آواز دی... مگر اس کی طرف سے کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ وہ کئی بار چلایا حتیٰ کہ اس کا گلا بیٹھ گیا اور وہ دبی زبان میں مسز کارل کو گالیاں دینے لگا۔ وہ بوڑھی چڑیل اسے اس عذاب میں ڈال کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی؟ جیف پر غشی سی طاری ہو رہی تھی۔ اس کیفیت میں اسے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

''ایک ہی دن میں تمہاری یہ حالت ہو گئی ہے۔'' مسز کارل ہنسی۔

''خدا کے لیے...'' جیف فوراً چونک گیا۔ ''تم نے جو لینا ہے لے لو اور مجھے جانے دو۔''

''تم نے رقم کہاں چھپا کر رکھی ہے؟''

جیف نے اسے بتا دیا اور التجا کی۔ ''خدا کے لیے... مجھے پانی تو دے دو۔''

''نہیں... جب تک مجھے رقم نہیں مل جاتی، میں تمہیں نہ تو پانی دوں گی اور نہ آزاد کروں گی۔''

دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ جیف کا اندازہ تھا کہ مسز کارل کو جانے اور آنے میں دو گھنٹے لگیں گے۔ وہ تن بہ تقدیر انتظار کرنے لگا مگر یہ انتظار طویل تر ہوتا چلا گیا۔ دو کے بجائے شاید پانچ یا چھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ پیاس شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ یہ سوچ کر اس کی روح لرزنے لگی کہ شاید مسز کارل اسے مرنے کے لیے یہاں چھوڑ چکی ہے اور اب وہ اس کے مرنے پر ہی آئے گی... اس کی لاش ٹھکانے لگانے کے لیے!

جیف نے از خود آزاد ہونے کی کوشش شروع کر دی۔ اس نے ادھر ادھر لڑھک کر یہ جاننے کی کوشش کی کہ تہ خانے میں کیا کچھ ہے۔ ممکن ہے، اسے کوئی ایسی شے مل جائے جس سے وہ خود کو آزاد کر سکے۔ اسے چند ڈبے ملے۔ اس نے ان کو ہلایا تو ان میں کوئی مائع شے تھی۔ جیف نے اپنی ناک استعمال کی تو اسے پیٹرول کی بو آئی۔ یعنی ان ڈبوں میں پیٹرول تھا۔ اس نے کوشش جاری رکھی۔ آخر کار اسے ایک درانتی نما آلہ مل گیا اور اس نے اس کی کند دھار پر اپنی کلائی کی رسی رگڑنا شروع کر دی۔ اس دوران میں مستقل حرکت کرنے، حبس اور بے تحاشا پسینہ بہنے سے اس کی پیاس اور کمزوری مزید شدت اختیار کر گئی تھی۔ آخر کار رسی کٹ گئی۔ بہت دیر تک تو اس میں ہمت ہی نہیں ہوئی کہ پیر کی رسی کاٹ سکے۔ اس نے یہ کام کیا اور آخر اٹھ کر دروازہ چیک کیا۔ وہ باہر سے بند تھا۔ یہ ٹھوس لکڑی کا مضبوط دروازہ تھا جسے وہ توڑ نہیں سکتا تھا۔ ظاہر ہے، مسز کارل نے اس قید خانے کو ہر لحاظ سے مضبوط بنایا تھا۔ پھر بھی اس نے درانتی سے وار کر کے دروازہ توڑنے کی کوشش کی مگر درانتی خاصی چھوٹی اور کمزور تھی۔ ایک بار اس نے بھرپور قوت سے وار کیا تو درانتی اس کے ہاتھ سے نکل کر زور سے زمین پر گری۔ اس کے فرش سے ٹکرانے سے چنگاری سی اڑی۔ اس نے فرش پر لیٹ کر ہانپنا شروع کر دیا۔

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ اس پر جنون سوار ہو رہا تھا۔ اس نے اچانک زمین پر پڑے ہوئے پیٹرول کے ڈبے لڑھکا دیے۔ پورے کمرے میں پیٹرول کی مہک پھیل گئی اور فرش تیل سے تر ہو گیا۔ ''کتیا!'' جیف نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''تو کیا سمجھتی ہے، میں اکیلا مروں گا اور وہ بھی اتنی اذیت سے... نہیں، میں تجھے ساتھ لے کر مروں گا۔ میں مروں گا تو تو بھی نہیں بچے گی۔'' اس نے فرش سے درانتی اٹھائی اور اسے زور سے زمین پر مارا مگر اس سے چنگاری نہیں اٹھی۔ اس نے پھر اسے فرش پر مارا۔ اس بار بھی چنگاری پیدا نہیں ہوئی۔ جیف کمزور ہو رہا تھا۔ وہ اتنی قوت سے فرش پر درانتی کا پھل نہیں مار پا رہا تھا۔ آخر اس نے ہاتھ اوپر کیا اور اسے پوری قوت سے فرش پر مارا۔ چنگاری اڑی اور پیٹرول میں آگ لگ گئی۔ جیف نے پہلی بار اس کمرے کو دیکھا۔ اچانک وہ دہشت زدہ رہ گیا۔ یہ تو اس کے ڈسپوزل سینٹر کا دفتر تھا۔ مگر اس کا سارا سامان غائب تھا۔ دیواروں پر پوسٹر لگے تھے۔ وہ دیوانہ وار دروازے کی طرف لپکا مگر اسے توڑنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔ مسز کارل نے اسے پوری طرح بے وقوف بنایا تھا۔

میں کینٹ اسٹیشن کے برابر میں واقع ہوٹل ''مسافر'' سے نکلا اور ٹہلنے کے سے انداز میں رفتہ رفتہ آگے بڑھنے لگا۔ سڑکوں پر ہر طرف ٹریفک رواں دواں تھا۔ کراچی میں تو دیسے بھی اس قدر ٹریفک ہوتا ہے کہ باہر سے آنے والا اسے دیکھ کر چکرا جائے۔ یہ شہر نہیں، انسانوں کا ایک سمندر ہے۔ میں بھاگتی دوڑتی گاڑیوں اور اِدھر اُدھر جاتے انسانوں کو غور سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس تیز رفتار زندگی نے انسان کا امن و سکون غارت کر دیا ہے۔ میں سگنل کے پاس پہنچا ہی تھا کہ ایک رکشا میرے پاس آ کر رک گیا۔ وہ خالی تھا۔ رکشا والا امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا کہ شاید میں اس کی خدمات حاصل کر لوں۔ میں نے اسے مایوس نہ کیا اور رکشا میں بیٹھتے ہوئے اس سے کہا۔ ''آئی آئی چندریگر روڈ چلو۔''

بہت سے لوگوں کو معلوم ہے کہ آئی آئی چندریگر روڈ دراصل اخبارات کی بستی ہے۔ شہر کے تمام بڑے اخبارات کے دفاتر اسی سڑک پر ہیں۔ ان کے علاوہ بینکوں کے صدر دفاتر اور بہت سے مالیاتی اداروں کے دفتر بھی اسی سڑک پر واقع ہیں۔ شاید اسی لیے یہ سڑک چوبیس گھنٹے پُررونق رہتی ہے اور وہاں آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

رکشا آئی آئی چندریگر روڈ کی طرف یکساں رفتار سے دوڑتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی میرے خیالات کا گھوڑا بھی

اپنے محسن کی خبر گیری میں تاخیر کے مجرم کی کیفیات — اسے اپنے جرم کا احساس شدت سے تھا — بالآخر اس نے اس کا ازالہ کرنے کا فیصلہ کر لیا!

احساسِ جرم

مدیحہ شاہ

سرپٹ بھاگتا رہا۔ میں اس وقت اپنے بچپن کے دوست اکبر شاہ سے ملنے جارہا تھا۔ وہ کہکشاں ٹاورز میں روزنامہ ''نئی ہوا'' کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ یہ اس کی پہلی ملازمت تھی۔ جب سے اکبر کو یہ ملازمت ملی تھی، اس وقت سے وہ اسی کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اب اسے روزنامہ ''نئی ہوا'' سے وابستہ ہوئے دس سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔

ہم دونوں بچپن سے ساتھ تھے اور ہم نے ایک ساتھ ہر طرح کا وقت گزارا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے دکھ سکھ سے خوب اچھی طرح واقف تھے۔ ہم نے اس دوران زمانے کے سرد وگرم کو خوب دیکھا تھا۔ ہم دونوں اکثر شام کو شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے تھے۔ کبھی کسی ہوٹل میں چائے پیتے تو کبھی فٹ پاتھ پر بنے ہوئے کیبن سے سگریٹ پیتے اور پان لے کر کھاتے۔ ہم نے فٹ پاتھ پر بنے ہوئے ان ہوٹلوں سے کھانا کھایا تھا جہاں سڑک کے کنارے بڑے بڑے پتیلوں میں ''ون ڈش'' ہوتی تھی۔

وہ کھانا جیسا بھی ہوتا تھا، اس نے مشکل وقت میں ہمارا پیٹ بھرا تھا اور ہم آج اسی کی وجہ سے زندہ بھی تھے۔ اگر وہ کھانا بھی نہ ملتا تو شاید ہم فاقے کرکر کے مرجاتے۔ اس سے بہتر کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک بار اکبر شاہ نے فرمائش کی کہ شاہین کمپلیکس کے ریوالونگ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پی جائے اور وہاں سے اس جگمگاتے شہر کا نظارہ بھی کیا جائے مگر ہماری جیب میں اتنی رقم نہ تھی کہ ہم اس ریسٹورنٹ میں جاپاتے۔ اس دوران مختلف لڑکیاں ہم دونوں کی زندگیوں میں آئیں مگر شاید انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ ہم آوارہ گرد ہیں۔ کہیں رک کر، کسی کے ہو کر نہیں رہ سکتے، چنانچہ وہ ہماری زندگیوں سے اسی خاموشی سے نکل گئیں جس خاموشی سے آئی تھیں۔

آئی آئی چندریگر روڈ پر پہنچ کر میں رکشا سے اتر گیا اور کہکشاں ٹاورز کی طرف بڑھا جس میں روزنامہ ''نئی ہوا'' کا دفتر تھا۔ میں نے استقبالیہ پر رک کر اپنا نام بتایا اور استقبالیہ کلرک نے اکبر شاہ کے مہمان کی حیثیت سے میرے نام کی پرچی بنا کر میرے ہاتھ میں تھما دی۔ لفٹ میں اچھا خاصا رش تھا۔ اکبر شاہ کا دفتر چوتھی منزل پر تھا۔ میں نے سیڑھیوں سے ہی اوپر جانے کا فیصلہ کیا۔ چند منٹ بعد میں چوتھی منزل پر تھا۔

صاف ستھرے کوریڈور سے ہو کر میں آگے بڑھا۔ روزنامہ ''نئی ہوا'' کے دفتر میں داخل ہونے پر میں نے وہاں موجود گارڈ کو پرچی دکھائی۔ اس نے پرچی دیکھ کر مجھے اندر جانے دیا۔ یہ دفتر دس سال میں خاصا بدل چکا تھا۔ ہر طرف کمپیوٹر نظر آرہے تھے جن پر بیٹھے لوگ مستعدی سے اپنے کام میں مصروف تھے۔ تھوڑی دیر میں، میں نے اکبر شاہ کو دیکھ لیا۔ وہ لکڑی کے ایک کیبن میں بیٹھا کمپیوٹر پر کچھ کررہا تھا۔ اس کے سامنے کاغذات اور تصاویر کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

میں نے اسے سلام کیا تو اس نے سر اٹھائے بغیر میرے سلام کا جواب دیا اور بولا۔ ''جی فرمایئے؟''

میں دیکھ رہا تھا کہ وہ پہلے سے موٹا ہوگیا تھا۔ اس نے مونچھیں بھی رکھ لی تھیں۔ میری طرف سے جواب نہ پا کر اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر ''میرا دوست، میرا عامر کریم'' کہتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کے انداز میں وہی ہمیشہ والی گرم جوشی تھی۔

''کیسا ہے تو؟ کہاں رہا اب تک؟ کب آیا؟'' اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کرڈالے۔

''دھیرج...... میرے دوست! سب بتا دوں گا مگر مجھے سانس تو لینے دو۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ میرا دوست اتنے عرصے بعد مجھ سے ملنے آیا ہے۔'' وہ مجھے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے بولا۔ یہ کہتے ہوئے اچانک وہ سنجیدہ ہوگیا۔ اس کی بدلتی ہوئی کیفیت مجھ سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ یقیناً کوئی خاص بات تھی۔

''اکبر شاہ! کیا بات ہے... تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''ہاں یار! وہ اپنے چچا نواز علی تھے نا؟''

''تھے سے کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''وہ ہیں...... اور رہیں گے۔''

''نہیں دوست! چچا نواز علی کا انتقال ہوگیا ہے۔'' اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

چچا نواز کا نام سنتے ہی میرے دماغ میں ماضی کی فلم چلنے لگی۔ چچا نواز کی وجہ سے ہی تو میں کراچی آیا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ میں ان کی وجہ سے اپنی منزل کی طرف جاتے ہوئے کراچی میں رکا تھا۔ دراصل میں سنگاپور سے آرہا تھا۔ میری منزل لاہور تھی مگر چچا کی خیریت معلوم کرنے کے لیے میں کراچی رک گیا تھا۔

چچا نواز علی کی بھی عجیب کہانی تھی۔ وہ ایک نیک دل انسان تھے۔ ان کی بیوی کو ہم چچی کے بجائے خالہ کہتے تھے۔ خالہ زبیدہ مجھے اور اکبر شاہ کو بہت چاہتی تھیں۔ وہ میاں بیوی بے اولاد تھے۔ انہوں نے ہمیں ایک یتیم خانے سے لے کر

پالا تھا اور ایسی محبت دی تھی جیسی وہ اپنے بچوں کو دیتے۔ زبیدہ خالہ ہم دونوں پر جان چھڑکتی تھیں مگر ہم دونوں ہی باغی نکلے۔ بڑے ہو کر ان کے گھر سے فرار ہوگئے۔ دراصل ہمیں یتیم خانے سے بھاگنا تھا۔ جب چچا نواز علی اور زبیدہ خالہ ہمارے سرپرست بن گئے تو ہمیں یتیم خانے سے نکلنے کا موقع مل گیا مگر چونکہ ہمارے مزاج میں آوارہ گردی شامل ہو چکی تھی، اس لیے ہم چچا اور خالہ کے بھی ہو کر نہ رہ سکے۔ موقع ملتے ہی ان کو چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

اکبر شاہ نے تو پھر بھی چچا نواز علی کی محنت اور تربیت کا حق ادا کرلیا۔ اسے اخبار میں نوکری مل گئی مگر میں چونکہ کہیں ٹک کر رہنے والا نہیں تھا، اس لیے یہ شہر ہی چھوڑ گیا۔

''اکبر! چچا کا انتقال کیسے ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ رپورٹ ملی ہے کہ انہوں نے خود کو گولی مار لی ہے۔'' اکبر نے جواب دیا۔

یہ سنتے ہی میرے اندر تکلیف کی لہر سی اٹھی۔ وہ چچا ہی تو تھے جن کی وجہ سے ہماری زندگی کو ایک مقصد ملا تھا... ورنہ یتیم خانے میں تو نہ جانے ہمارا کیا حشر ہوتا۔ انہوں نے ہمیں خوف اور سختی کے ماحول سے نکالا اور اعتماد دیا۔ انہوں نے ہماری ہر طرح حوصلہ افزائی کی تھی۔ ہمیں سر اٹھا کر فخر کے ساتھ جینا سکھایا۔ میں محسوس کررہا تھا کہ چچا نواز علی اور زبیدہ خالہ کا ہم پر ایک بے عنوان قرض تھا جسے ہمیں بہرحال لوٹانا تھا.. مگر کیسے؟

''اور کیا معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی موت کے بارے میں؟'' میں نے اکبر سے سوال کیا۔

''بس، یہی معلوم ہوا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ایسا کرتے ہیں، ہم دونوں چل کر خود دیکھتے ہیں۔''

''تم نے چچا اور خالہ کے ساتھ رابطہ تو رکھا تھا نا؟'' میں نے اکبر شاہ سے پوچھا۔

''جب بھی موقع ملتا، میں ان سے ملنے ضرور جاتا تھا۔'' اکبر نے کہا۔ ''چھ ماہ پہلے زبیدہ خالہ بھی تو وفات پا گئی تھیں۔ انہیں کینسر ہوگیا تھا۔''

یہ سن کر مجھے مزید صدمہ ہوا۔ ایک اور دھچکا سا لگا۔ زبیدہ خالہ بہت ہی نیک خاتون تھیں۔ انہوں نے ہمیں حقیقی ماؤں کی محبت دی تھی۔ ہمارے لیے وہ راتوں کو جاگتی تھیں۔ وہ بھی مرگئیں اور مجھے پتا بھی نہ چلا۔

''تم ان کے انتقال پر گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اکبر شاہ نے انکار میں سر ہلایا۔ ''زبیدہ خالہ کے انتقال کے وقت میں کراچی میں نہیں تھا، اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ واپسی پر یہ اطلاع ملی تھی۔ مجھے بے حد افسوس ہوا کہ جس وقت چچا نواز علی کو میری ضرورت تھی، اس وقت میں یہاں نہیں تھا۔''

''کیا زبیدہ خالہ کی وفات کے بعد چچا نواز علی اکیلے ہی رہ رہے تھے؟''

''نہیں۔'' اکبر شاہ نے کہا۔ ''ظاہر ہے، وہ خاصے ضعیف ہوگئے تھے۔ ستر سے اوپر کے تھے۔ ان کے پڑوس میں دو میاں بیوی رہتے ہیں، شہاب علوی اور فرزانہ علوی۔ دونوں ہی نیک دل انسان ہیں۔ چچا کو تنہا دیکھ کر انہوں نے چچا سے ضد کی کہ وہ ان کے ساتھ ان کے گھر چل کر رہیں۔''

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''ظاہر ہے، زبیدہ خالہ کے بعد چچا نواز علی اکیلے رہ گئے تھے۔ انہیں دیکھ بھال کے لیے کسی کی ضرورت تو تھی لہٰذا وہ شہاب علوی اور فرزانہ علوی کے ساتھ ان کے گھر چلے گئے تھے۔'' اکبر شاہ نے کہا۔

چند لمحے رک کر وہ بولا۔ ''چچا کو تمہاری بہت فکر رہتی

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیئے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

برسا برس سے ہمارے ماہر طب خصوصاً ایسے مریضوں کے لیے جو ابنی ناسمجھی کی بنا پر پیچیدہ امراض میں مبتلا ہو کر طرح طرح کے علاج سے مایوس ہو گئے تھے کے لیے اپنے تجربہ تحقیقات انتھک محنت لگن اور کاوشوں سے ایسا نسخہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جس نے کئی ناکارہ بوڑھوں کو بہت کم دنوں میں جوان مرد بنا دیا اور مایوس گئے گزرے کمزور نوجوان ایک ایک نسخہ آزما کر یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ جوہر واقعی بے پناہ قوت کا سرچشمہ ہے آپکی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں کہ اس کے استعمال سے جسم میں نیا اور تازہ خون پیدا ہونے لگتا ہے چہرے پہ سرخی ہاتھوں پیروں میں چستی توانائی ظاہر کر کے صحت کو قابل رشک بنا دیتا ہے اور آپکو وہ تمام خوشیاں میسر ہو جائینگی جسکے لیے آپ ایک مدت سے محروم رہے ہیں آج ہی ایک خط اپنی مکمل کیفیت لکھ کر جوابی لفافے کے ہمراہ ہمیں روانہ کریں آپکو یہ نسخہ فوراً روانہ کر دیا جائے گا۔

حکیم اینڈ سنٹر
پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

تھی۔ اکثر تمہارے بارے میں پوچھتے تھے۔ مگر میں انہیں کیا بتاتا کہ تم جوئے، سٹے کے شوقین ہو گئے ہو؟'' یہ کہتے کہتے اکبر شاہ کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے ہم پولیس اسٹیشن چلیں گے۔'' اکبر نے کہا تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا مگر میں نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور اکبر شاہ کو اندازہ نہیں ہونے دیا کہ پولیس کا نام سن کر مجھے چکر سا آ گیا ہے۔

''اس کے بعد؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے بعد ہم شہاب علوی اور فرزانہ علوی سے ملنے چلیں گے۔ ہمیں چچا کی تدفین کے انتظامات بھی تو کرنے ہیں۔''

''ہاں، بالکل...... کوئی کمی نہیں رہنی چاہیے۔ چچا نواز علی کو پورے احترام کے ساتھ سپردِ خاک کیا جائے۔'' میں نے بھاری لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، چلو...'' اکبر شاہ نے کہا۔ ''نیچے میری کار موجود ہے، ہم اسی میں چلیں گے۔''

میں اکبر شاہ کے ساتھ چل دیا۔ چچا نواز ایک صحت مند انسان تھے۔ انہوں نے خود کو شوٹ کیوں کیا تھا؟ یہ بات میرے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی۔ ضرور اس کے پیچھے کوئی خاص وجہ تھی۔ میری بھی تو غلطی تھی، میں نے ان کے ساتھ کوئی رابطہ ہی نہیں رکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان کے لیے صرف اکبر ہی کافی ہے۔ اس طرح میں نے اپنی ذمے داری سے راہِ فرار اختیار کی تھی جس کا مجھے اب افسوس ہو رہا تھا۔

گارڈن پولیس اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوتے ہی اکبر شاہ باوردی پولیس افسران اور دوسرے لوگوں سے سلام دعا کرنے لگا جبکہ میں ایک طرف لاتعلقی کے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد میں اور اکبر شاہ اسٹیشن کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئے۔

''کسے ڈھونڈ رہے ہو؟'' میں نے اکبر سے پوچھا۔

''انسپکٹر فیصل کو۔'' اکبر نے جواب دیا۔ ''وہ میرا دوست ہے۔ ہمیں چچا نواز علی کے حوالے سے ساری معلومات وہی دے سکے گا۔''

میں جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا، ویسے ویسے میری گھبراہٹ بھی بڑھ رہی تھی۔ آخر میں اور اکبر ایک کمرے میں داخل ہو گئے جہاں صحت مند جسم کا مالک ایک دراز قد اور باوردی شخص بیٹھا تھا۔ اکبر کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''آؤ آؤ، اکبر شاہ! بڑے دن بعد درشن دیے۔'' اس نے کہا اور میری طرف دیکھا تو اکبر نے میرا تعارف کرایا۔

''یہ عامر کریم ہے... میرا بچپن کا دوست!''

انسپکٹر فیصل نے ہم دونوں سے ہاتھ ملایا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ کی گرفت خاصی سخت تھی اور اس کی نظریں گویا میرا ایکسرے کر رہی تھیں۔

''آپ کی شکل جانی پہچانی سی لگ رہی ہے۔ شاید میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔''

''انسپکٹر! میں اس شہر میں نہیں رہتا، ضرور آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''انسپکٹر!'' اکبر شاہ نے کہا۔ ''میں تمہارے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ آج صبح گارڈن کے علاقے میں نواز علی نامی ایک ضعیف شخص نے خود کو گولی مار کر ہلاک کر لیا ہے۔ مجھے اس سے متعلق معلومات درکار ہے۔''

''میں نے اس کیس کو دیکھا ہے مگر ابھی تفتیش شروع نہیں کی ہے۔'' انسپکٹر فیصل نے کہا۔ ''مسئلہ کیا ہے؟ تمہیں اس کیس میں کیوں دلچسپی ہے؟''

اکبر شاہ نے انسپکٹر کو پوری بات تفصیل سے بتائی کہ چچا نواز علی اور زبیدہ خالہ نے کس طرح ہم دونوں کو یتیم خانے سے نجات دلا کر خود پالا پوسا تھا۔

''اچھا! تو یہ بات ہے۔'' یہ کہہ کر انسپکٹر فیصل نے اپنی میز کی دراز سے ایک فائل نکالی اور اسے کھول کر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ ''مرنے والے کا نام نواز علی، عمر ستّر سال۔ آج صبح نو بج کر چالیس منٹ پر ہمیں فرزانہ علوی نامی کسی عورت نے فون کیا تھا۔ یہاں موجود ایس آئی جائے وقوعہ پر پہنچا تو اس نے پاجامے اور کرتے میں ملبوس نواز علی کو اپنے بستر پر مردہ حالت میں پڑے دیکھا۔ مرنے والے کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے اپنی دائیں کنپٹی پر گولی ماری تھی جس سے وہ فوراً ہی مر گیا تھا۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق اس کو مرے ہوئے چار گھنٹے گزر چکے تھے۔''

''کیا اس عورت فرزانہ علوی نے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی تھی؟'' میں نے سوال کیا۔

''اس کا کہنا ہے کہ اس نے کوئی آواز نہیں سنی۔''

''حیرت ہے!'' اکبر شاہ نے کہا۔

''ممکن ہے، آواز زیادہ نہ ہوئی ہو۔'' انسپکٹر فیصل نے کہا۔ ''یا وہ اسے کسی رکشا یا کار کا بیک فائر سمجھی ہو اور اس نے اس پر توجہ نہ دی ہو۔ ممکن ہے، فرزانہ اور اس کا شوہر گہری نیند

سونے کے عادی ہوں۔''

''فرزانہ علوی کو اس بات کا کیسے پتا چلا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے نواز علی کو ناشتے کے لیے آواز دی تھی مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا۔ پھر بھی جواب نہ ملا تو اس نے دروازے کو دھکیلا مگر وہ اندر سے لاک تھا۔ آخر فرزانہ دوسری چابی لے کر آئی اور اس نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ نواز علی خودکشی کر چکا تھا۔''

''انسپکٹر! چچا نواز علی اور خودکشی... بات سمجھ میں نہیں آتی۔'' اکبر شاہ نے کہا پھر پوچھا۔ ''اسپتال سے میت کب ملے گی؟''

''کل۔'' انسپکٹر فیصل نے جواب دیا۔

''شکریہ انسپکٹر!'' یہ کہہ کر اکبر کھڑا ہو گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گیا۔

''مجھے افسوس ہے... بہرحال، موت سے کون بچ سکتا ہے؟ اللہ کا جو حکم تھا، وہ ہو گیا۔'' انسپکٹر فیصل نے اکبر شاہ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''پھر بھی اگر کوئی مسئلہ ہو تو مجھ سے رابطہ کر لینا۔'' یہ کہہ کر وہ میری طرف گھوما۔ ''میں نے نہیں...'' کہتے کہتے وہ رکا، مسکرایا اور بولا۔ ''ہم کبھی نہ کبھی ضرور ملیں گے۔''

''شاید ایسا ممکن نہ ہو کیونکہ میرا کراچی بہت کم آنا ہوتا ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' انسپکٹر نے اکبر شاہ سے پوچھا۔

''ابھی تو میں شہاب علوی اور فرزانہ علوی کی طرف جاؤں گا۔ اس کے بعد دفتر... بہرحال، چچا نواز علی کی تدفین کے سلسلے میں، میں شہاب اور فرزانہ سے ضرور مشورہ کروں گا۔ آخر چچا انہی کے ہاں رہ رہے تھے۔ مجھے ان کی رائے ضرور لینی چاہیے۔''

ہم دونوں گارڈن پولیس اسٹیشن سے باہر آ گئے۔

''عامر! تمہاری فلائٹ کب کی ہے؟'' باہر آتے ہی اکبر شاہ نے مجھ سے سوال کیا۔

''رات کی ہے مگر...''

''تم اپنی فلائٹ مس نہ کرو، چلے جاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''میں چچا نواز علی کی تدفین کرا دوں گا۔''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے اس کی کار میں بیٹھ گیا۔ کار چل پڑی۔

مجھے یاد آ رہا تھا کہ جب چچا نواز علی اور زبیدہ خالہ مجھے اور اکبر شاہ کو یتیم خانے سے لائے تھے، اس وقت وہ کافی بڑے مکان... بلکہ بنگلے میں رہتے تھے۔ ان کا بنگلہ نارتھ ناظم آباد میں واقع تھا مگر جب ہم دونوں ان کے گھر سے چلے آئے تو انہوں نے وہ گھر ہی چھوڑ دیا اور گارڈن کے علاقے میں ایک چھوٹا گھر لے لیا تھا۔ وہ کہتے تھے۔ ''ہم دو بڈھے بڑھیا کے لیے کسی بڑے گھر کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں کافی عرصے سے کراچی نہیں آیا تھا اس لیے مجھے ان کے دوسرے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا۔ یہ بھی میری بدنصیبی ہی تھی۔

اچانک کار رک گئی۔ میں چونک کر اپنے خیالوں سے باہر نکل آیا۔ اکبر شاہ نے ایک منزلہ مکان کے سامنے کار روکی تھی۔

''یہ ہے وہ گھر جس میں چچا نواز علی، زبیدہ خالہ کے ساتھ رہتے تھے۔'' اکبر شاہ نے سرد آہ بھرتے ہوئے مجھے بتایا۔

میں نے مکان کی طرف دیکھا۔ اس پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ یہ کوئی بہت مہنگا مکان نہیں تھا جبکہ چچا نواز علی خاصے دولت مند تھے۔ انہوں نے یہ عام سا مکان کیوں خریدا تھا؟ یہ بات مجھے الجھائے دے رہی تھی۔ یہ ممکن تھا کہ چچا نے اپنی سادگی کی وجہ سے یہ مکان لے لیا ہو کیونکہ وہ نہایت سادہ مزاج انسان تھے۔

''زبیدہ خالہ کے انتقال کے بعد چچا کے پڑوسی شہاب اور اس کی بیوی فرزانہ نے چچا کو اکیلا نہ رہنے دیا اور اپنے گھر لے گئے تھے۔'' اکبر شاہ نے بتایا۔

''مگر چچا تنہائی سے گھبرانے والے نہیں تھے۔'' میں نے کہا۔

''اب وہ خاصے بدل چکے تھے۔ بڑھاپا انسان میں بہت سی تبدیلیاں لے آتا ہے۔'' اکبر نے کہا۔

''لیکن چچا نے خود کو شوٹ کیوں کیا؟'' میں نے اکبر شاہ سے جرح کی۔ ''کیا وہ اس قدر مایوس اور دل شکستہ ہو گئے تھے کہ زبیدہ خالہ کے بغیر رہ نہ سکے؟''

''شاید یہی بات ہے۔'' اکبر نے کہا۔ ''وہ زبیدہ خالہ کی جدائی برداشت نہیں کر سکے۔''

''زبیدہ خالہ کیسے مری تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اچانک ہی اور چلتے ہاتھ پیروں چل بسیں۔'' اکبر شاہ نے کہا۔ ''ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ خالہ کا سوتے میں انتقال ہوا ہے۔ وہ رات کو بھلی چنگی سوئی تھیں مگر ایسی سوئیں کہ کبھی نہ اٹھ سکیں۔''

''یار! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ انسان اس طرح نہیں مرا کرتا۔'' میں نے کہا۔

''وہ... دراصل... میرا خیال ہے کہ چچا نواز علی نے ہی...'' کہتے کہتے اکبر رک گیا اور میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔

''کیا تمہارا مطلب ہے، خود چچا نے ہی زبیدہ خالہ کو سوتے میں ہلاک کیا تھا؟'' میں نے تیزی سے کہا۔

''چچا، زبیدہ خالہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ ممکن ہے، ڈاکٹر نے جب انہیں یہ بتایا ہو کہ خالہ کو کینسر ہے تو چچا نے خالہ کو اذیت ناک زندگی سے بچانے کے لیے یہ قدم اٹھا لیا ہو۔'' اکبر شاہ نے کہا۔ ''مگر یہ میرا صرف اندازہ ہے، کوئی قطعی بات نہیں ہے۔''

''آخر خالہ کس طرح مریں؟'' میں نے کہا۔ ''کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ چچا نواز علی نے سوتے میں ان کے منہ پر تکیہ رکھ دیا ہو...؟ شاید اسی لیے بعد میں چچا اپنے احساسِ جرم کی وجہ سے اس قدر بدل گئے تھے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' اکبر شاہ نے کہا۔ ''یہ بات میرے دل کو بھی لگ رہی ہے۔ ضرور اسی احساسِ جرم سے تنگ آکر چچا نے خودکشی کی ہے۔''

ہم دونوں چچا نواز علی کے برابر والے مکان کے دروازے پر پہنچے اور کال بیل کا بٹن دبایا۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ ایک عورت دروازے میں کھڑی تھی۔ وہ بہ مشکل پینتیس چھتیس سال کی ہوگی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے تیزی اور طراری عیاں تھی۔ اس کا چہرہ اور ہونٹ بتا رہے تھے کہ وہ سخت مزاج عورت ہے۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کرسکتی ہے۔

''آؤ، اکبر شاہ!'' عورت نے اکبر پر نظر پڑتے ہی گرم جوشی سے کہا۔ اکبر نے میرا تعارف بھی کرایا تو وہ بولی۔ ''چلو، اچھا ہوا... آج چچا نواز علی کے دونوں بیٹوں کو ایک ساتھ دیکھ لیا۔'' پھر وہ میری طرف رخ کرکے بولی۔ ''چچا اور خالہ تمہیں بہت یاد کرتے تھے۔ دونوں کا انداز ایسا ہوتا تھا جیسے تم کوئی ننھے منے بچے ہو اور اپنے گھر کا راستہ بھول گئے ہو۔'' میں سمجھ گیا کہ وہ فرزانہ علوی ہے مگر اس کا شوہر شہاب علوی نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید وہ اندر کہیں تھا۔

ہم دونوں فرزانہ کے کہنے پر آگے بڑھے تو اندر والے کمرے میں ہماری ملاقات شہاب سے ہوئی۔ وہ چالیس کے پیٹے میں تھا۔ خاصے بھرے بھرے جسم کا مالک تھا۔ اس کے چہرے پر بڑا اطمینان تھا جیسے وہ اپنی زندگی سے بہت خوش ہو۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی جس سے وہ چسکیاں لے رہا تھا۔

''آؤ اکبر شاہ! بولو کیا پیو گے... چائے یا ٹھنڈا؟'' اس نے اٹھ کر ہم دونوں سے ہاتھ ملایا۔ ''تم شاید عامر کریم ہو؟''

''جی ہاں۔'' میں نے کہا تو وہ مسکرا دیا۔ نہ جانے کیوں مجھے وہ شخص پسند نہیں آیا۔ فرزانہ بھی مجھے کچھ اچھی عورت نہیں لگی تھی۔ دونوں میاں بیوی کے چہروں پر ماسک سا چڑھا ہوا لگ رہا تھا۔ چچا نواز علی نے صبح خودکشی کی تھی... اسی گھر میں... اور وہ دونوں میاں بیوی بہت خوش اور مطمئن نظر آرہے تھے۔ یہ بات مجھے بہت عجیب لگی۔

''تم لوگوں کو چچا کے اس طرح اس دنیا سے چلے جانے کا دکھ تو ہوا ہوگا... ہے نا؟'' اکبر شاہ نے کہا۔

''ہاں، ہوا تو ہے مگر خدا کے حکم کے سامنے سر جھکانے کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔'' شہاب علوی نے کہا۔

''ہم نے ان کی بہت خدمت کی تھی۔'' فرزانہ جلدی سے بولی۔ ''یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ زبیدہ خالہ کے انتقال کے بعد ہم چچا کو اپنے گھر لے آئے تھے اور انہیں اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔'' فرزانہ علوی کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اپنے احسانوں کی تفصیل بیان کررہی ہے۔

''یہ تو آپ کی نیکی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر چچا نے ایسا کیوں کیا؟ میرا مطلب ہے خودکشی...!''

''ہمیں کیا معلوم۔'' فرزانہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہ اس عمر میں ایسی حرکت کریں گے کہ ہمارے لیے لوگوں کو جواب دینا مشکل ہوجائے گا۔ جسے دیکھو ہم سے ہی پوچھتا ہے کہ چچا نے ایسا کیوں کیا؟ ارے بھئی انہوں نے ہم سے پوچھ کر تو یہ کام نہیں کیا۔ نہ جانے ان کے دل میں کیا سمائی کہ خود ہی کو شوٹ کرلیا۔'' میں نے اور اکبر شاہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس عورت کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ اچھی خاصی مشتعل تھی۔

''چچا کے معمولات کیسے تھے؟'' اکبر شاہ نے فرزانہ کے بجائے شہاب کی طرف رخ کرکے پوچھا۔

''اوہ! بے چارے چچا... ساری ساری رات جاگتے رہتے تھے۔ کمرے میں ٹہلتے رہتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے نیند کی دیوی ان سے روٹھ گئی ہے۔ انہیں ڈراؤنے خواب نظر آتے تھے۔ وہ بار بار اپنے گھر جانے کی ضد کرتے تھے مگر ہم انہیں سمجھاتے تھے کہ ضد چھوڑ دیں۔ واقعی ان کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ وہ اکیلے نہیں رہ سکتے تھے۔''

میں سوچ رہا تھا کہ چچا ایسے تو نہ تھے کہ کسی کے گھر جا کر پڑ جائیں۔ وہ کسی کا احسان کبھی قبول نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنی ذات میں مگن رہنے والے انسان تھے۔ آخر کیا وجہ تھی کہ وہ شہاب اور فرزانہ کے آگے بے بس ہوکر رہ گئے تھے۔

''چچا نے کبھی زبردستی اپنے گھر جانے کی کوشش تو نہیں کی؟'' میں نے پوچھا تو شہاب علوی نے کہا۔ ''کی تھی... مگر ہم ہوشیار تھے اس لیے...''

''شہاب! تم کچھ زیادہ نہیں بولنے لگے ہو؟'' فرزانہ علوی نے غصے سے اپنے شوہر کو گھورتے ہوئے کہا۔

''ان لوگوں کو آخرکار سب کچھ معلوم تو ہونا ہی ہے... کیوں نہ میں ہی بتا دوں۔'' شہاب بولا۔

''کیا معلوم ہونا ہے؟ کیا کہہ رہے ہو؟'' اکبر شاہ نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

''مرحوم کی وصیت!'' شہاب نے کہا۔ ''انہوں نے اپنا سب کچھ ہمارے نام کردیا کیونکہ ان کے بہ قول ہم نے ان کی بہت خدمت کی ہے۔''

اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ دونوں میاں بیوی اس قدر خوش کیوں تھے۔ اکبر بھی یہ بات سن کر حیران رہ گیا تھا۔ اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے تم دونوں اس پر حیران ہورہے ہو کہ چچا نواز نے اپنا سب کچھ تمہارے نام کیوں نہیں کیا؟'' فرزانہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''بات یہ ہے کہ ایک تو تم ان کی حقیقی اولاد نہیں ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ بڑے ہوکر تم نے ان کی کوئی خدمت نہیں کی۔ وہ تمہیں یتیم خانے سے لائے تھے اور تمہیں انسان بنانے کے لیے زبیدہ خالہ اور چچا نواز نے کیا کچھ نہیں کیا مگر تم نے ان کی محبت کا حق ادا نہیں کیا۔ اکبر شاہ! نہ تم انہیں پلٹ کر پوچھتے تھے اور نہ تمہارا یہ دوست... رہی ہم دونوں کی بات تو ہم نے ان کی ہر طرح خدمت کی۔ ان کے آرام کا خیال رکھا، ان کا دکھ بانٹا، ان کی تنہائی دور کی۔ یہاں تک کہ انہیں اپنے گھر لے آئے۔ اب اگر مرحوم نے اپنا سب کچھ ہمارے نام کردیا ہے تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔''

''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔'' اکبر شاہ نے فرزانہ اور شہاب سے کہا۔ ''میں تو چچا کی تدفین کے سلسلے میں تم لوگوں سے مشورہ کرنے آیا تھا مگر... شاید تم لوگ جو کرسکتے تھے وہ کرچکے ہو۔ آگے کا کام ہمیں خود کرنا ہوگا۔''

''ہاں اکبر! وہ کام ہمیں خود ہی کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''چچا کی میت ایدھی کے ہاں پہنچوا دو۔ وہیں سے قبرستان لے جائیں گے۔ کسی مسجد میں کہہ دو کہ مدرسے کے بچے قرآن ختم کرلیں تاکہ اس کا ثواب چچا کی روح کو پہنچ جائے۔ کچھ غریبوں کو کھانا کھلوا دو...''

وہ دونوں میاں بیوی خاموش رہے۔ انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جیسا ہمارا دل چاہے، کریں۔ وہ نہ کچھ کریں گے اور نہ بولیں گے۔ لیکن دونوں کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک نمایاں تھی۔

آپ بیتی، جگ بیتی، دور و نزدیک کی سچی کہانیاں
زندگی کی ہفت رنگ سچائی کا آئینہ دار
ماہنامہ سرگزشت کراچی
شمارہ مارچ 2009ء کی جھلکیاں

شرارت نگار
معروف ادیب عظیم بیگ چغتائی کی سوانح حیات
آدم خان درخانئی
صوبہ سرحد کی لازوال عشقیہ داستان
حاضر دماغ
ایک دلچسپ واقعہ، حاضر دماغی کی مثال
ماہِ کنعان
حضرت یوسفؑ کی زندگی کے وہ ابواب جو کم کم بیان ہوئے ہیں

سچا رشتہ، نصیب اپنا اپنا اور پردہ جیسی چونکا دینے والی سچ بیانیوں کے ساتھ مزید چھ سچ بیانیاں، بہت سی جگ بیتیاں اور اس ادارے سے نکلنے والے رسالوں میں سے اپنی پسند کا کوئی ایک رسالہ مفت حاصل کرنے کا علمی مقابلہ، پسندیدہ اشعار

اس کے علاوہ
بھی بہت کچھ بس ایک دفعہ پڑھنے کی دیر ہے۔ پھر آپ بھی اس کے گرویدہ ہو جائیں گے

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون 5895313 فیکس 5802551

''آؤ چلیں۔'' اکبر شاہ نے کہا تو میں اس کے ساتھ اٹھ کر باہر آگیا۔ نہ فرزانہ نے ہمیں روکا اور نہ ہی شہاب نے... بلکہ انہوں نے ہمیں خدا حافظ تک نہ کہا۔

''اکبر!'' باہر آتے ہی میں پھٹ پڑا۔ ''مجھے یہ دونوں میاں بیوی مشکوک لگتے ہیں۔ خودغرض اور لالچی! یہ تو نہ جانے کب سے چچا کی موت کے منتظر ہوں گے تاکہ ان کی دولت اور جائیداد پر قابض ہو سکیں۔''

''تم کیا کہنے کی کوشش کر رہے ہو؟'' اکبر شاہ نے پوچھا۔

''چچا کی خودکشی کے پیچھے ان کا ہاتھ ہے۔'' میں نے کہا تو اکبر شاہ پُرخیال نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو میں اس میں بیٹھ گیا۔ اس نے کچھ کہے بغیر گیئر لگایا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

''اکبر! تم مجھے میرے ہوٹل ڈراپ کر دو۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''میں نہا دھو کر آرام کروں گا۔ اس کے بعد شام کو تمہارے دفتر آ جاؤں گا۔ وہاں سے ہم برنس روڈ چلیں گے۔ آج برنس روڈ کی نہاری کھانے کا موڈ ہو رہا ہے۔ کئی سال ہو گئے ہیں اسے چکھے ہوئے۔''

''ٹھیک ہے... مجھے بھی دفتر جانا ہے۔'' اکبر نے کہا۔ ''انسپکٹر فیصل بتا ہی چکا ہے کہ چچا کی میت کل ملے گی۔ میں ایدھی سینٹر فون کر دوں گا۔ وہیں چچا نواز کی تجہیز و تکفین کے انتظامات ہو جائیں گے۔''

ہوٹل ''مسافر'' کے سامنے اکبر شاہ نے گاڑی روک دی۔ میں اترا اور اسے خدا حافظ کہہ کر اندر چلا گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے غسل کیا پھر بستر پر دراز ہو کر آرام کرنے لگا۔ اس دوران میں آگے کی پلاننگ کر رہا تھا۔ مجھے آج ہی لاہور کی فلائٹ پکڑنی تھی۔ وقت کم تھا اور کئی کام کرنے تھے۔ میرے دانت سختی سے بھینچے ہوئے تھے اور نظروں کے سامنے فرزانہ اور شہاب کے چہرے ناچ رہے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے ان دونوں پر شک ہو رہا تھا کہ چچا نواز کی موت کے پیچھے ان کا ہاتھ ہے... مگر کیسے؟ اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ یکایک میرے سامنے چچا نواز اور زبیدہ خالہ کے شفیق چہرے نمودار ہوئے۔ ان کی محبت اور چاہت کی یادوں نے میری آنکھیں نم کر دیں۔

ہوٹل میں آتے وقت میں نے جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کی تھیں کہ دوسروں کی نظر میں آ جاؤں۔ میں نے استقبالیہ کلرک سے سلام دعا کی تھی۔ اس سے چابی لینے کے بعد میں نے گارڈ سے اس کی خیریت دریافت کی تھی اور سبھی سے زور زور سے باتیں کی تھیں۔ اس طرح گویا میں نے لوگوں کو گواہ بنا لیا تھا کہ میں اس وقت اپنے ہوٹل میں تھا مگر میری پلاننگ دوسری تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں اٹھا، لباس بدلا اور کمرے سے نکل آیا۔ باہر آنے سے پہلے میں اپنا پستول لینا نہیں بھولا تھا۔

اس بار میں نے ہوٹل کا عقبی راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور استقبالیہ کلرک کی نظر میں آئے بغیر سیڑھیوں سے اتر کر کچن کی طرف چلا گیا۔ اس کا ایک دروازہ گندی گلی میں کھل رہا تھا۔ اتفاق سے اس وقت کچن میں کوئی نہیں تھا۔ میں تیزی سے کچن میں سے ہوتا ہوا گندی گلی میں آ گیا۔ گلی میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے۔ بدبو سے میرا دماغ پھٹنے لگا تھا مگر میں ناک بند کر کے تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد سڑک پر آ گیا۔ ہوٹل مسافر میں کسی نے مجھے باہر آتے نہیں دیکھا تھا۔

سڑک پر بہت سی ٹیکسیاں نظر آئیں۔ میں نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور اس میں بیٹھ کر گارڈن چلنے کو کہا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ شاید وہ بغیر میٹر چلنے کے موڈ میں تھا لیکن جب میں نے اسے اشارہ دیا تو وہ چل پڑا۔ وہ خوش تھا کہ مجھ سے منہ مانگا کرایہ وصول کرے گا۔ مجھے بھی اس وقت کوئی خطرہ مول نہیں لینا تھا۔ ٹیکسی ٹریفک کے ازدحام میں رینگتی ہوئی بڑھتی رہی اور خدا خدا کر کے گارڈن کا علاقہ آ گیا۔

شہاب اور فرزانہ کا گھر میں دیکھ چکا تھا لہٰذا میں نے ان کے گھر سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی رکوائی اور دو سو روپے ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھ پر رکھ کر آگے بڑھنے لگا۔ ڈرائیور کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''صاحب! کیا واپس بھی جائیں گے؟''

''جاؤں گا تو سہی... مگر تھوڑا وقت لگ جائے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''کوئی بات نہیں صاحب! میں انتظار کر لوں گا۔'' ڈرائیور نے دانت نکالتے ہوئے کہا تو میں اثبات میں سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

پہلے چچا نواز علی کا گھر آیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی میرا دل بھر آیا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور تیزی سے شہاب علوی کے گھر کی طرف بڑھا۔ یہ وقت جذباتی ہونے کا نہیں تھا۔ شہاب کے گھر کے آگے باڑھ لگی ہوئی تھی۔ میں نے لان میں داخل ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی نظر نہ آیا تو میں نے دروازے پر دباؤ ڈالا۔ قسمت مجھ پر مہربان لگ رہی تھی کیونکہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دونوں میاں بیوی خاصے بے پروا لگ رہے تھے۔ کراچی میں آئے دن چوری اور ڈکیتی کی

وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ دن دہاڑے ڈاکو گھر میں گھس کر گھر والوں کو لوٹ لیتے ہیں اور ان لوگوں نے اپنا دروازہ تک بند کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

میں نے دروازے کو آہستگی سے دھکیلا اور اندر داخل ہو کر اسے بند کر دیا۔ ڈرائنگ روم سے ان دونوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''شہاب! تم نے ان لوگوں کے سامنے ضرورت سے زیادہ باتیں کی تھیں۔ یہ احمقانہ حرکت تھی۔'' فرزانہ علوی کی آواز میں غصہ تھا۔

''میں نے جو کیا، ٹھیک کیا۔'' شہاب کو بھی غصہ آ گیا۔ ''تم پاگل ہو... تمہیں صرف چچا کے بارے میں بات کرنی چاہیے تھی... ان کی وصیت کے بارے میں نہیں۔'' فرزانہ علوی نے کہا۔

''بعد میں جب انہیں وصیت کے بارے میں پتا چلتا، اس وقت وہ ہم پر شک کرتے کہ ہم نے ان سے یہ اہم بات کیوں چھپائی۔'' شہاب بولا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' فرزانہ نے کہا۔ ''تم اگر خاموش رہتے تو تمہارا کیا نقصان تھا؟ میں تمہیں متعدد بار بتا چکی ہوں کہ خاموشی میں ہی ہماری بھلائی ہے۔''

''ہم خطرے میں ہیں۔'' شہاب نے کہا۔ ''کم از کم اس وقت تک خطرہ ہمارے سر پر منڈلا رہا ہے جب تک چچا نواز علی کی تدفین نہیں ہو جاتی۔''

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ گویا میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ میں نے جیب سے پستول نکالا اور ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ فرزانہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں شہاب پر جمی ہوئی تھیں جو صوفے پر بیٹھا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ان دونوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ فرزانہ کا منہ حیرت سے کھلا اور بند ہو گیا مگر اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ البتہ شہاب لرزنے لگا تھا۔

''یہ کیا حرکت ہے؟ اس طرح آنے کا مقصد؟'' فرزانہ نے پستول کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔ وہ پستول دیکھ کر بھی نہیں ڈری تھی۔ اس کی آواز میں اب بھی اکڑ تھی۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''مگر بات کیا ہے؟''

''تم سے کچھ پوچھنا ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''چچا نواز علی کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ میں بالکل سچ سننا چاہتا ہوں۔''

''وہ مر گئے... بلکہ انہوں نے خودکشی کر لی۔ یہی سچ

بیرونِ ملک مقیم قارئین
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ، ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
کے
سالانہ خریدار
بن کر بذریعہ رجسٹرڈ ائیرمیل
اپنا پسندیدہ ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کریں
ایشیا یورپ اور افریقہ کے لیے فی ڈائجسٹ
زرسالانہ 4000 روپے یا 65 امریکی ڈالر
امریکہ، آسٹریلیا، کینیڈا اور نیوزی لینڈ کے لیے فی ڈائجسٹ
زرسالانہ 5000 روپے یا 80 امریکی ڈالر
اپنے ڈرافٹ اور منی آرڈر ادارے کے نام، درج ذیل پتے پر ارسال کریں۔ یہ کراچی میں قابل ادائیگی ہونا ضروری ہیں۔ بیرونِ شہر ادائیگی کی صورت میں کوریئر چارجز اور بینک کمیشن کے 500 روپے اور بیرونِ ملک ادائیگی والے ڈرافٹ وغیرہ پر اس مد میں 20 امریکی ڈالر کا اضافہ کر لیں
رابطے کے لیے
ثمر عباس: 0301-2454188
یا
بدرالدین سرکولیشن منیجر
فون نمبر 5802552,5804200(21)(92)
فیکس نمبر 5802551 (21)(92)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C PHASE II EXTENSION,
D.H.A., MAIN KORANGI ROAD,
,KARACHI 75500
E-MAIL :JDPGROUP@HOTMAIL.COM

ہے۔" فرزانہ نے کہا۔
"نہیں، انہوں نے خودکشی نہیں کی۔" میں نے کہا۔
"وہ بوڑھے تھے، زیادہ عرصے زندہ رہنے کے خواہش مند نہیں تھے اس لیے انہوں نے خود ہی اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔ سیدھی سی بات ہے۔" فرزانہ نے جواب دیا۔
"نہیں، ایسا نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔
"تو پھر کیسا ہوا ہے؟" فرزانہ نے چڑ کر کہا۔ "تم بتادو۔"
"تم دونوں میاں بیوی نے انہیں اس حال کو پہنچایا تھا کہ وہ... میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ خودکشی کرنے پر کیوں مجبور ہوئے؟"

شہاب نے لرزتے ہوئے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "وہ... زبیدہ خالہ والی بات بتادو اسے۔"
"تم خود بتا دو، اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" فرزانہ نے بے پروائی سے کہا۔
"بات یہ ہے۔" شہاب علوی نے میری طرف گھوم کر کہا۔ "جب ہم نے یہ محسوس کیا کہ زبیدہ خالہ کی موت کے بعد چچا نواز علی رات رات بھر جاگتے رہتے ہیں اور اپنے گھر میں گھومتے رہتے ہیں تو ہمیں تشویش ہوئی۔ ہم نے ان کی مدد کرنے کی کوشش کی۔ انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہا۔ انہیں خواب آور گولیاں لاکر دیں۔ انہیں سکون بخش دوائیں بھی دیں مگر وہ نہ مانے۔ بہت مشکل سے انہوں نے نیند کی گولیاں کھانی شروع تو کرلیں مگر وہ بھی انہیں سُلا نہ سکیں۔ ایک رات وہ سوئے ہی تھے کہ بڑبڑانے لگے۔ شاید انہوں نے کوئی خوفناک خواب دیکھا تھا اور اس دوران ان کے منہ سے کچھ ایسے الفاظ نکل گئے۔" یہ کہہ کر شہاب علی خاموش ہوگیا۔
"کیسے الفاظ؟" میں نے پوچھا۔
"انہوں نے زبیدہ خالہ کو سوتے میں منہ پر تکیہ رکھ کر ہلاک کیا تھا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ خالہ کو کینسر ہے تو وہ یہ برداشت نہ کرسکے۔ انہوں نے خالہ کو اذیت ناک زندگی سے نجات دلا دی تھی۔ یہ بات انہوں نے سوتے میں بڑبڑاتے ہوئے کہہ دی۔" شہاب علوی نے کہا تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے حالات کا بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا۔
"اوہ! تو تم نے یہ راز جاننے کے بعد چچا کو بلیک میل کیا، انہیں زبردستی اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کیا... اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنا سب کچھ تم دونوں کے نام کردیں... ہے نا؟" یہ کہہ کر میں نے خوں خوار نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"یہ بات نہیں، ہم نے تو محض خدا ترسی کے تحت ان کی دیکھ بھال کی تھی۔" شہاب نے کہا۔ "کسی کو یہ بات معلوم بھی نہیں کہ ہم نے مرحوم کی کتنی خدمت کی تھی۔ ہم نے تو خالہ زبیدہ کا بھی ہر طرح خیال رکھا تھا۔ اگر ہماری نیکی سے خوش ہوکر چچا نواز علی نے ہمیں کچھ دے دیا تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟"
"میں سمجھتا ہوں... خوب سمجھتا ہوں۔" میں نے محسوس کیا کہ غصے کی وجہ سے میری آواز لرزنے لگی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ چچا نواز علی ان دونوں ظالم میاں بیوی کے سامنے کس قدر بے بس و لاچار ہوگئے ہوں گے اور انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی ہوگی کہ سب کچھ ان کے نام کرکے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیں۔
مجھے اس قصے کا کچھ کچھ اندازہ ہوچکا تھا مگر میں پوری کہانی سننا چاہتا تھا، لہٰذا میں نے شہاب اور فرزانہ کی طرف پستول لہراتے ہوئے کہا۔ "یہ ادھوری کہانی ہے۔ میں پوری کہانی سننا چاہتا ہوں۔"
"پوری... کہانی... کیا مطلب؟" شہاب نے کہا۔
"چچا نواز علی کی موت کیسے واقع ہوئی تھی؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
"میں نے سب کچھ بتا دیا ہے تمہیں..." شہاب نے کہا۔ "اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔"
میں نے اس کا جواب سنتے ہی پستول سے فائر کیا اور اس کے سامنے دیوار پر لگا ہوا آئینہ کرچی کرچی ہوگیا۔
"اگر تم نے مجھے سچ نہیں بتایا تو اگلی گولی تمہاری پیشانی میں پیوست ہوجائے گی۔" میں نے دھمکی دی۔ "میں سن رہا ہوں، تم شروع ہوجاؤ۔"
"مگر..."
"تم نے دوسروں کو جو کچھ بتایا وہ محض بکواس تھی مگر میں سچ سننا چاہتا ہوں... سوچ لو... سچ بولنا ہے یا جان دینی ہے؟" میں نے خوں خوار لہجے میں کہا۔
"بتادو... اسے سب کچھ بتا دو ورنہ یہ مجھے مار ڈالے گا۔" شہاب نے فرزانہ سے کہا۔
"تم اس سے خوف زدہ کیوں ہو رہے ہو؟ کہنے دو اسے۔ یہ محض ہمیں ڈرا رہا ہے۔" فرزانہ علوی نے بے خوف لہجے میں کہا۔
"تم پاگل ہوگئی ہو... مجھے مروانا چاہتی ہو؟" شہاب علوی ایک دم چیخ اٹھا۔ "کروتم ...... اور بھروں میں؟" یہ سنتے ہی فرزانہ اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ وہ دونوں ہاتھ آگے کی طرف

شہاب پر جھپٹی۔
"اے خاتون! ایک طرف کھڑی ہوجاؤ۔" میں نے خبردار کرتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں تم دونوں کا کھیل نہیں آیا بلکہ سچ جاننے آیا ہوں۔"
"میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گی۔" فرزانہ نے اب بھی ... میں نے پستول والا ہاتھ بلند کیا مگر وہ عورت نہ ... جبکہ شہاب کی حالت غیر ہورہی تھی۔ اس کا پورا چہرہ پسینے ... تھا۔ میں نے پستول کا رخ شہاب علوی کے سر کی طرف ...

"میں بتاتا ہوں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم نے ... کے سونے کا انتظار کیا۔ جب وہ سوگئے تو تم نے ان ... میں گولی ماری اور پستول ان کے ہاتھ میں تھمادیا۔ ... تو تمہارے خیال میں اس سلسلے میں کوئی تم سے کچھ نہیں ... اگر پوچھتا تو تمہارے پاس بنا بنایا جواب موجود تھا کہ ... اپنے ضمیر کے مجرم تھے۔ چونکہ انہوں نے اپنی بیوی کو ... کیا تھا۔ اس لیے وہ چین سے نہ رہ سکے اور آخر کار ... نے خودکشی کرلی۔"
میری بات سن کر فرزانہ اور شہاب کی آنکھیں ذرا کھل گئیں۔
"تت ..... تمہیں یہ کیسے پتا چلا؟" شہاب نے بڑی فکر سے پوچھا۔
"چچا نواز علی کو ہتھیاروں سے نفرت تھی۔ ایک بار بچپن میں پستول لے آیا تھا تو چچا نے مجھے بہت ڈانٹا تھا۔ وہ ... بہانے والی چیزوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے نصیحت کی تھی کہ کبھی کسی پستول یا دوسرے ہتھیار کے قریب بھی نہ جاؤں۔ اگر چچا کو خودکشی کرنی تھی تو وہ کم از کم پستول استعمال نہ کرتے۔ ان کے ہاتھ میں جس طرح پستول ... گیا تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پستول استعمال کرنے ... ماہر تھے۔ بس یہیں تم غلطی کرگئے۔" میں نے کہا اور شہاب اور فرزانہ کو دیکھنے لگا۔ ان دونوں کے چہرے دھواں ... تھے۔
"مگر تم کچھ بھی ثابت نہیں کرسکتے۔" فرزانہ نے کہا۔ ... لہجے میں ابھی تک ہٹ دھرمی تھی۔
"ہاں... میرے پاس نہ ثبوت ہے اور نہ ہی پولیس اس ... میں دلچسپی لے رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے ... میں تمہیں مجرم سمجھتا ہوں کیونکہ میں نے تمہارے سامنے ... پورا نقشہ کھینچ دیا جس نے تمہیں حیران کردیا۔ یہی تمہارا ... اعتراف جرم ہے اور میں تمہیں اس کی سزا خود دوں گا۔"

"کک... کیا... مطلب...؟" فرزانہ اور شہاب میرے منہ سے یہ دھمکی سنتے ہی پریشان ہوگئے۔ ان کے ہوش اڑ گئے۔ فرزانہ نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے فائر کیا۔ گولی اس کی پیشانی پر لگی۔ وہ آنکھوں میں حیرت لیے لڑھک گئی۔ میں نے شہاب کو سوچنے سمجھنے کا موقع بھی نہ دیا اور اس کے سر کو نشانہ بنا کر اسے بھی دنیا سے چلتا کردیا۔ میرے پستول کی نال پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا اس لیے گولی چلنے کی آواز کمرے تک ہی محدود رہی۔
ان دونوں کو قتل کرنے کے بعد میں نے اطمینان سے لاشوں کا معائنہ کیا۔ مجھے کوئی گھبراہٹ یا پریشانی نہیں تھی اور نہ ہی کسی قسم کا احساسِ جرم تھا۔ اس طرح کی کیفیات سے میں اکثر گزرتا رہتا تھا۔ لاشیں، قتل، خون میرے لیے کوئی نئی باتیں نہ تھیں۔ چچا نواز علی اکثر مجھ سے کہا کرتے تھے۔ "عامر! تو بہت بے حس انسان ہے۔ ہم دونوں کے دکھ درد پر تیرا دل ذرا بھی نہیں پسیجتا۔"
میں تیزی سے باہر نکلا۔ دوسری گلی میں وہ ٹیکسی والا ابھی تک موجود تھا جو مجھے لایا تھا۔ بڑے انعام کے چکر میں وہ وہیں کھڑا رہا تھا۔ میں ٹیکسی میں بیٹھا تو ٹیکسی فوراً ہی آگے بڑھ گئی۔ اس کا رخ کینٹ کی طرف تھا۔ میرا ارادہ واپس ہوٹل مسافر جانے کا تھا۔ ہوٹل سے کچھ پہلے ہی میں نے ٹیکسی چھوڑ دی اور ڈرائیور کو تگڑا انعام دے کر ہوٹل کی عقبی گلی میں داخل ہوگیا۔ وہاں ایک کھلا گٹر تھا جس میں بہت تیز پانی بہہ رہا تھا۔ میں نے اپنی جیب سے پستول نکال کر اس گٹر میں بہا دیا اور کچن سے ہوتا ہوا ہوٹل میں داخل ہوا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس بار بھی کوئی میری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچا اور سوگیا۔

☆☆☆

شام کو حسب وعدہ میں اکبر شاہ سے ملنے کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس نے مجھے کہکشاں ٹاورز میں واقع اپنے دفتر بلایا تھا۔ راستے بھر میں چچا اور خالہ کو یاد کرتا رہا۔ گزرے ہوئے واقعات میرے ذہن کے پردے پر دوڑتے رہے۔ میں تو یہ سوچ کر کراچی آیا تھا کہ کچھ وقت اکبر شاہ، چچا نواز علی اور زبیدہ خالہ کے ساتھ گزاروں گا اور رات کی فلائٹ سے واپس چلا جاؤں گا مگر یہاں آکر تو حالات ہی بدل گئے تھے۔ چچا اور خالہ کا تو میں دیدار تک نہ کرسکا۔
روزنامہ "نئی ہوا" کے دفتر میں اکبر شاہ موجود تھا اور میرا ہی انتظار کررہا تھا۔
"سب کام ہوگیا ہے۔ اسپتال سے چچا کی میت ایدھی

سینٹر جائے گی۔ وہاں ان کو غسل دیا جائے گا۔ وہیں سے وہ سیدھا قبرستان لے جائیں گے۔ قرآن خوانی کا انتظام بھی کرادیا ہے اور فاتحہ خوانی کا بھی۔ میں نے سوچا کہ شہاب اور فرزانہ کو کیوں تکلیف دوں۔ تمام اخراجات ہم دونوں آدھے آدھے ادا کردیں گے۔''

''ٹھیک کیا تم نے... ہمیں اب شہاب اور فرزانہ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' میں نے کہا

''میں نے تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ دونوں ایسے لالچی ہوسکتے ہیں۔'' اکبر شاہ نے کہا۔

''ہاں... یہ دنیا ہے، یہاں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر ہزار ہزار والے آٹھ دس نوٹ نکالے اور اکبر کو تھما دیے۔ ''یہ میری طرف سے... میرے پاس چچا کی تدفین تک رکنے کا وقت نہیں ہے، مجھے جانا ہے۔'' میں نے کہا تو اکبر شاہ نے افسردگی سے سر جھکا دیا۔

''ایک آدھ دن بھی نہیں رک سکتے؟'' اس نے کہا۔

''ذرا سوچو کہ اس انسان کی آخری رسوم ہونی ہیں جس نے ہمیں پالا پوسا، انسان بنایا تھا۔''

''جانتا ہوں... مگر کیا کروں، مجبور ہوں۔'' میں نے کہا۔

میری نظروں کے سامنے شہاب اور فرزانہ کی خون آلود لاشیں تھیں۔ میں جانتا تھا کہ ان دونوں کے قتل کا الزام مجھ پر نہیں لگ سکتا پھر بھی میں ڈر رہا تھا کہ خوامخواہ کسی مشکل میں نہ پڑ جاؤں۔ میں پولیس کے تصور سے ہی کانپ اٹھتا تھا۔

''اکبر! اگر میں اس وقت نہ گیا تو پھر شاید کبھی نہ جاسکوں۔ سمجھ رہے ہو نا؟'' میں نے کہا۔

''خوب سمجھ رہا ہوں۔'' اکبر شاہ نے کہا ''میں نہیں سمجھوں گا تو اور کون سمجھے گا؟'' اس کی آواز میں تلخی تھی۔ ''تم نے چچا کی زندگی میں کون سا انہیں پوچھ لیا تھا جواب پوچھو گے۔ ان کی زندگی میں تم کبھی ان سے ملنے نہ آئے اور نہ ان کی خیریت دریافت کی۔ وہ مر گئے، بات ختم ہوگئی... تمہیں اس سے کیا؟''

''بہرحال، میں چلتا ہوں۔'' میں نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے پیٹھ موڑ لی۔

میں کندھے جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ میرا رخ لفٹ کی طرف تھا۔ اسی وقت میری نظر انسپکٹر فیصل پر پڑی جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اسی طرف آرہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آگئی جس نے میرا دل دھڑکا دیا۔ اس کی آنکھوں میں پُراسرار چمک تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اسے شہاب اور فرزانہ کا تو ابھی پتا نہیں چلا ہوگا مگر میری اصلیت ضرور معلوم ہوگئی ہوگی۔ میں اس کی نگاہوں کے نرغے میں تھا۔ ابھی بھاگنا فضول تھا۔ سیڑھیوں سے بہت سے باوردی سپاہی اوپر آرہے تھے۔ تھوڑی دیر میں ان سب نے مجھے گھیر لیا۔

اچانک اکبر شاہ بھاگتا ہوا میری طرف آیا۔ وہ حیرت سے کبھی مجھے دیکھ رہا تھا اور کبھی انسپکٹر فیصل کو۔

''کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟'' اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

''میں تمہارے اس دوست کو گرفتار کرنے آیا ہوں۔'' انسپکٹر فیصل نے کہا۔ ''مجھے اسے پہچاننے میں تھوڑی سی دیر تو لگی مگر بالآخر مجھے یاد آگیا کہ یہ کون ہے۔ ذرا اس کا حوصلہ دیکھو کہ یہ پولیس اسٹیشن چلا آیا۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟ کون ہے یہ؟'' اکبر شاہ نے مجھ سے پوچھا۔ ''یہ تو میرے بچپن کا دوست عامر کریم ہے۔''

''یہ اس کا صرف ایک نام ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''اس نے تو نہ جانے کتنے نام رکھے ہوئے ہیں اپنے... کوئی درجن بھر تو ہوں گے۔ یہ ایک بدنام زمانہ مجرم اور سفاک قاتل ہے۔ برسوں سے پولیس کو اسی کی تلاش تھی۔ اس کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر لاکھوں کا انعام بھی ہے۔ اس پر کئی افراد کو قتل کرنے کا الزام ہے۔ حال ہی میں اس نے ایک قتل فیصل آباد میں کیا تھا، دوسرا سیالکوٹ میں اور تیسرا ملتان میں۔ ان وارداتوں کے بعد یہ سنگاپور بھاگ گیا تھا اور کئی ماہ وہاں گزارنے کے بعد کراچی آیا تو ہمیں اس کی آمد کی اطلاع مل گئی۔ یہاں سے اسے لاہور جانا تھا مگر شکر ہے کہ میں نے اسے گرفتار کرلیا۔'' یہ کہہ کر انسپکٹر فیصل نے اپنی بیلٹ سے ہتھکڑی نکال کر میرے ہاتھ میں ڈال دی۔

جس کہکشاں ٹاورز کی عمارت میں آج صبح میں ایک شان کے ساتھ آیا تھا، شام کو اسی جگہ سے ذلیل و خوار ہوکر جارہا تھا۔ اکبر شاہ سن ہوکر رہ گیا تھا۔ میری ذات کے حوالے سے ہونے والے انکشاف نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کراچی آئے کیوں تھے؟'' اکبر شاہ نے کہا۔ ''تم نے زندگی میں چچا نواز علی کو کبھی کوئی سکھ نہیں دیا تھا تو اب کیوں آئے تھے؟ دیکھ لو، یہاں آنے کا نتیجہ!'' میں نے اس کی بات سنی اور مسکرا کر انسپکٹر کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھنا، ان کے کام آنا ہر شخص کی ذمے داری ہے ...خواہ آدمی کا پیشہ کچھ بھی ہو- شریف اور معزز شہریوں کی طرح جرائم پیشہ اور قاتل بھی آخر کسی نہ کسی کے پڑوسی ہوتے ہیں ...اور ان کی بھی کچھ ذمے داری ہوتی ہے!

ہمسائے

بابر نعیم

رافیل لفٹ میں داخل ہوا تو اس میں دو موٹے آدمی پہلے سے موجود تھے۔ ان کو دیکھتے ہی رافیل کو اپنے ہاتھوں میں سنسنی کا احساس ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے سنسنی کا احساس کب ہوتا تھا۔ اس نے پہلی بار ان کو دیکھا تھا۔ وہ آپس میں بات کررہے تھے اور انہوں نے رافیل کو دیکھ کر بھی اپنی گفتگو کا سلسلہ نہیں روکا تھا۔

رافیل ان کی طرف پیٹھ کرکے کھڑا تھا۔ اس کا اپارٹمنٹ ساتویں فلور پر تھا اور یہ اوپر سے آرہے تھے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔ ''اتنا بڑا اپارٹمنٹ ہے... چار بیڈ رومز والا۔ اور اس میں کتنے لوگ رہتے ہیں... ایک نوّے سال کا بوڑھا اور ایک لالچی عورت!''

''ایک ہم ہیں۔'' دوسرے نے سرد آہ بھری۔ ''کھولیوں میں رہ رہے ہیں۔ یہ کتیا اس بڈھے کی دولت چاہتی ہے اور بس۔''

''بڈھا ابھی مرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔'' پہلے نے ہنکارا بھرا۔ ''نوّے سال کا ہوکر بھی نہیں مر رہا۔ اس کتیا کے لیے سب سے مایوس کن بات یہی ہے۔''

رافیل جان گیا تھا کہ وہ کن لوگوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ اس کے خیال میں دونوں محض بکواس کر رہے تھے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ دونوں آدمی کون تھے لیکن اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ بوڑھا اور اس کی بیوی دونوں اچھے انسان ہیں۔ اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ دوسرے نے پھر سرد آہ بھری۔

''وہ پانچ سال سے اس سے چمٹی ہوئی ہے۔''

اس دوران میں لفٹ گراؤنڈ فلور پر جا پہنچی۔ دونوں افراد اُتر کر چلے گئے۔ رافیل رکا رہا پھر اس نے مرکزی دروازے کے نگران سے ان کے بارے میں پوچھا۔ ''یہ دونوں افراد کون ہیں؟ ان کو پہلی بار دیکھا ہے۔''

''یہ مسٹر گارفیلڈ کے بیٹے ہیں۔'' نگران نے بتایا۔

''عجیب ہے، اس سے پہلے میں نے ان کو یہاں نہیں دیکھا۔''

''یہ مسٹر گارفیلڈ کے ساتھ نہیں رہتے۔ جب سے انہوں نے ڈونا ٹیرس سے شادی کی ہے، یہ پہلی بار یہاں آئے ہیں۔'' نگران نے وضاحت کی۔

رافیل کا شک درست نکلا۔ دونوں موٹے افراد مسٹر گارفیلڈ اور اس کی بیوی ڈونا کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ البتہ یہ جان کر اسے افسوس ہوا تھا کہ وہ ہنرک گارفیلڈز کے بیٹے تھے۔ رافیل چار سال پہلے اس اپارٹمنٹ میں آیا تھا اور اس کے گارفیلڈ اور اس کی بیوی سے اچھے تعلقات تھے۔ دونوں میاں بیوی خوش اخلاق اور ملنسار تھے۔ ہفتے میں دو تین بار آتے جاتے رافیل کی ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ رافیل ان کی خیریت دریافت کرتا اور ان میں خوش گوار جملوں کا تبادلہ ہوتا تھا۔ وہ رافیل کے عین اوپر والے اپارٹمنٹ میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی رافیل تھیٹر کے لیے ان کے ساتھ چلا جاتا تھا اور ممکن ہوتا تو ان کی مدد بھی کرتا تھا۔ ڈونا ٹیرس ایک ستر سالہ خوب صورت اور خوش اخلاق عورت تھی۔ رافیل نے کبھی اسے غصے یا معیار سے گرے جملے استعمال کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ اچھے انداز میں بات کرتی تھی۔ وہ اپنے شوہر کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ باہر جاتے ہوئے بھی وہ اس کا ہاتھ تھامے رکھتی تھی۔ نوّے سال کی عمر میں ہنرک گارفیلڈ نہایت کمزور تھا اور وہ سہارے کے بغیر زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا۔ رافیل کو ڈونا کسی طرح بھی ایسی عورت دکھائی نہیں دی تھی جو دولت کے لیے کسی سے شادی کرے۔

جس دن رافیل نے گارفیلڈ کے بیٹوں کی گفتگو سنی تھی اس روز کے بعد سے وہ ہنرک گارفیلڈ اور ڈونا کے طرزِ عمل کو خاص طور سے نوٹ کرنے لگا تھا۔ اس نے دیکھا کہ گارفیلڈ کے ساتھ ڈونا کا رویہ محبت بھرا اور دیکھ بھال کرنے والی بیوی کا سا تھا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ ہنرک گارفیلڈ دولت مند آدمی تھا۔ اس عمارت اور علاقے میں ہر ایک اپارٹمنٹ نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ وہ اور ڈونا اعلیٰ درجے کے ملبوسات پہنتے تھے۔ ان کے پاس رولز رائس کار بھی تھی۔

رافیل نے محسوس کیا تھا کہ ڈونا ہنرک گارفیلڈ کی دیکھ بھال ایک گہری لگن اور محبت کے جذبے کے ساتھ کرتی تھی۔ اس عمارت کی کوئی اور عورت اپنے شوہر سے اس طرح پیش نہیں آتی تھی جیسے ڈونا اپنے شوہر سے پیش آتی تھی۔ مسٹر گارفیلڈ کے لڑکے ڈونا کے خلاف بکواس کر رہے تھے اور ان کا انداز محرومی کیے جانے والے حاسدوں جیسا تھا۔

رافیل ایک ضروری کام سے ٹورنٹو چلا گیا۔ اسے کام کے سلسلے میں اکثر جانا پڑتا تھا جب وہ واپس آیا تو اسے یہ افسوسناک خبر ملی کہ ہنرک گارفیلڈ فالج کے حملے کا شکار ہو گیا ہے۔ رافیل نے اس کے لیے پھول بھیجے جس کے جواب میں ڈونا نے اسے شکریے کا کفون کیا۔ اس کے ایک ہفتے بعد رافیل نے بیچ جاتے ہوئے لفٹ میں ڈونا اور ہنرک کو دیکھا۔ ہنرک وہیل چیئر پر تھا اور اسے سہارا دینے کے لیے بیلٹ سے باندھا گیا تھا۔ یعنی وہ خود سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ رافیل نے جھک کر کہا۔

''ہیلو مسز گارفیلڈ... تم کیسے ہو؟''

اس نے منہ ٹیڑھا کر کے سر ہلایا۔ اس کی طرف سے ڈونا نے جواب دیا۔ ''اس کی طبیعت اب بہتر ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ تم لوگ ٹہلنے جا رہے ہو؟''

ڈونا نے سر ہلایا۔ ''ہاں... ہنرک کی طبیعت گھبراتی ہے تو میں اسے باہر لے جاتی ہوں۔ کیوں ڈیئر! تم پارک میں جانا پسند کرتے ہو؟'' ہنرک نے زور سے سر ہلایا۔

''اگر تم پسند کرو تو میں بھی چلتا ہوں۔'' رافیل نے وہیل چیئر تھام لی۔ اس نے محسوس کیا کہ نیند اور آرام کی کمی سے ڈونا بھی کمزور ہو رہی تھی۔ اس نے راستے میں کہا۔ ''مسز گارفیلڈ کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟''

''ظاہر ہے... میں۔'' ڈونا نے کہا۔

انہوں نے پارک کا ایک چکر لگایا اور ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ اچانک ہنرک کو کھانسی اٹھی اور اس کے منہ سے تھوک بہہ نکلا۔ ڈونا نے جلدی سے ٹیشو نکالا اور اس کا منہ صاف کیا۔ رافیل نے دیکھا کہ ایسا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''ہنرک زندگی سے بھرپور آدمی تھا۔'' اس نے دھیمے لہجے میں نہایت افسردگی سے کہا۔

''اس کی زندگی تم ہو۔'' رافیل نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ ''مگر تم اپنا خیال رکھو۔''

یہ اور بات تھی کہ ڈونا ہنرک کی وجہ سے اپنا خیال نہیں رکھ پا رہی تھی۔ وہ اپنے شوہر کی بیماری خود پر جھیل رہی تھی۔ وہ ستر سال کی تھی مگر اپنی عمر سے زیادہ کی دکھائی دینے لگی تھی۔ اس کا وزن خاصا کم ہو گیا تھا اور چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ ایسی صورتِ حال تھی جس میں ایک بیمار شخص اپنے تیمار دار کو بھی غیر کیے دے رہا تھا۔

اس بار رافیل کو اپنے کام کے سلسلے میں برازیل کے شہر ساؤ پالو جانا پڑا۔ ایک شخص اس کے مؤکل کے لیے مسئلہ بنا ہوا تھا۔ اس کے مؤکل اسے کہیں بھی بھیج دیا کرتے تھے اور اس کا کام ایک قاصد کا سا تھا۔ اسے جانا ہی پڑتا تھا۔ خلافِ توقع اس کام میں زیادہ دن لگ گئے تھے اور وہ ایک ہفتے بعد واپس آ سکا تھا۔ ایک دن آرام کرنے کے بعد رافیل اپنے پڑوسیوں کے اپارٹمنٹ پہنچا۔ دروازہ ڈونا نے کھولا تھا۔ وہ بہت کمزور اور بیمار لگ رہی تھی۔ رافیل نے اسے ہمدردی سے دیکھا۔

''مسز گارفیلڈ! تمہیں ایک نرس رکھ لینی چاہیے۔ اس طرح تو تم خود بیمار پڑ جاؤ گی۔''

''ہنرک ایسا نہیں چاہتا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس کی خواہش ہے کہ اس کا سارا کام اور اس کی دیکھ بھال میں کروں۔ یہ میری ذمے داری ہے۔ ایک نرس بھلا اس کی دیکھ بھال اس طرح کیسے کر سکتی ہے جیسے میں کرتی ہوں۔''

رافیل کو پہلی بار ہنرک گارفیلڈ پر غصہ آیا۔ وہ دولت مند آدمی تھا۔ ایک چھوڑ دو نرسوں کا خرچ برداشت کر سکتا تھا اور اسے ڈونا کی پروا نہیں تھی جس کی حالت دن بہ دن تباہ ہوتی جا رہی تھی۔ ستر برس کی عمر میں ایک بیمار آدمی کو مکمل طور پر سنبھالنا حد سے زیادہ دشوار کام ہوتا ہے۔ رافیل اس سے ہمدردی کر کے واپس اپنے اپارٹمنٹ میں آ گیا۔ دو دن بعد پھر اسے کام کے سلسلے میں جانا پڑا۔ اس بار ایک گاہک کے ''ی گارڈ نے ذرا مسئلہ کیا تھا مگر رافیل نے خوش اسلوبی سے ملے کو سنبھال لیا۔ اس بار وہ چوتھے روز واپس لوٹا۔ اسے ...ن جانا پڑا تھا۔

رافیل کی واپسی میں ہنرک گارفیلڈ کے دونوں بیٹوں سے لفٹ میں ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ دو دبلی عورتیں تھیں اور ان کا رویہ دوستانہ تھا۔ وہ رافیل کو دیکھ کر مسکرائی بھی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں جوان اور حسین تھیں۔ جب وہ اوپر چلے گئے تو رافیل نے لفٹ کے نگران سے پوچھا۔ ''یہ دونوں مسٹر گارفیلڈ کے بیٹے تھیں؟''

جواب میں ایک ملازمہ نے دروازہ کھولا۔ ''مجھے ڈونا ٹیرس

غلطیاں

سب ایک دوسرے کی غلطیوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سیاست دان غلطیاں زیادہ کرنے لگتے ہیں تو مارشل لا والے آجاتے ہیں۔ مارشل لا والے غلطیاں کرنے لگتے ہیں تو خود سیاست دانوں کو لے آتے ہیں اور ان دونوں کی غلطیوں کا خمیازہ ملک کو بھگتنا پڑتا ہے۔

محمود شام کی شب بخیر سے اقتباس۔

مطالعہ: شرف الدین جیلانی، ٹنڈوالہ یار

سے ملنا ہے۔''

ملازمہ نے جواب میں دروازہ ایک جھٹکے سے بند کر دیا۔ رافیل نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے پھر بیل بجائی۔ اس بار ملازمہ نے دروازہ کھولنے کی زحمت نہیں کی۔ وہ اندر سے چلائی۔ ''ڈونا ٹیرس سے ملنے کوئی نہیں آتا۔''

رافیل بھی چلایا۔ ''کیا تم بات کرنے کے لیے دروازہ کھولو گی؟''

''مجھے کہا گیا ہے کہ کسی اجنبی کے لیے دروازہ نہ کھولوں۔''

رافیل مجبوراً واپس چلا آیا۔ دو دن بعد اس نے صبح کے وقت دونوں عورتوں کو شاپنگ کے لیے باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ بارہ بجے ملازمہ بھی چھٹی کر کے چلی گئی اور جب لفٹ کا نگران بھی کھانا کھانے چلا گیا تو رافیل نے اوپر کا رخ کیا۔ اس نے کال بیل بجائی۔ جواب میں ایک موٹے شخص نے دروازہ کھولا۔ اوپر آنے سے پہلے رافیل نے کمپیوٹر کا سامان رکھنے والی دراز سے ایک چرمی کیس نکالا تھا اور اس میں سے ایک خاص چیز لی تھی۔ اس نے موٹے شخص سے کہا۔ ''میں ڈونا ٹیرس سے ملنے آیا ہوں۔''

''وہ کسی سے نہیں مل سکتی۔'' موٹے شخص نے غرّا کر کہا۔ ''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

اس نے دروازہ بند کرنا چاہا مگر آج رافیل ناکام واپس جانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ اس نے دروازے کو زور سے دھکیلا جو جا کر موٹے شخص کے منہ پر لگا۔ اسے دھکیل کر رافیل اندر آ گیا۔ دوسرا موٹا شخص نشست گاہ کے سامنے کھڑا تھا۔ رافیل نے اسے گھورا۔ ''ڈونا کہاں ہے؟ فوراً بتاؤ۔''

جواب میں اس نے ایک کمرے کی نشان دہی کی جہاں ڈونا موجود تھی۔ منہ پر دروازہ کھانے والا شخص بھی... بھیگی بلی بنا کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور خون بہہ رہا تھا۔ رافیل نے ان کو اندر چلنے کا حکم دیا تو انہوں نے فرماں برداری سے تعمیل کی۔ اندر ڈونا ٹیرس بے حد ابتر حالت میں بستر سے بندھی پڑی تھی۔ اس کے کپڑے میلے تھے اور ان سے بدبو کے بھبکے آ رہے تھے۔ وہ بے حد کمزور اور بیمار لگ رہی تھی۔ شاید اسے کھانے کو بھی نہیں دیا جاتا تھا۔

''اسے کھولو... حرام زادے!'' رافیل کی آنکھوں اور لہجے میں خون اتر آیا تھا۔ ''کتیا کے بچوں... تم نے اسے مارنے کے لیے باندھا تھا؟''

''یہ پاگل ہے۔'' زخمی شخص نے منمنا کر کہا۔ ''اسی وجہ سے اسے باندھ رکھا ہے۔''

''یہ پاگل ہے!'' رافیل نے اس کے سر پر پستول کا دستہ مارا تو اس کا سر بھی پھٹ گیا۔ چرمی کیس سے وہ پستول نکال کر لایا تھا۔ اس کی وجہ سے دونوں افراد بھیگی بلی بنے ہوئے تھے۔ اس نے ڈونا کو کھول دیا مگر وہ نقاہت کے باعث اٹھ نہیں پا رہی تھی۔ ''تم ٹھیک ہو نا؟'' رافیل نے جھک کر پوچھا۔

''ہاں، میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

''کیا تم راز رکھنا جانتی ہو؟''

ڈونا نے اسے غور سے دیکھا اور سر ہلایا۔ ''ہاں، میں راز رکھنا جانتی ہوں۔''

''راز بہت خوفناک ہے۔''

''میں ہر راز کو صرف راز سمجھتی ہوں مسٹر جوز!'' ڈونا نے مضبوط لہجے میں کہا۔

رافیل نے سر ہلایا اور پستول لہرا کر دونوں موٹے آدمیوں کو باتھ روم میں چلنے کا حکم دیا۔ وہاں پر اس نے ان دونوں کو ٹب میں سر جھکانے کو کہا اور جب انہوں نے حکم کی تعمیل کی تو اس نے بے حد سرعت سے ایک ایک گولی ان کے سر میں اتار دی... وہ ہمیشہ سر میں گولی مارتا تھا اور اسے اپنے شکاروں کی تعداد بھی یاد نہیں تھی۔ دونوں موٹے افراد فوراً مر گئے اور ان کے سروں سے نکلنے والا خون ٹب میں جمع ہونے لگا۔ رافیل کو یقین تھا کہ گولی چلنے کی آواز اپارٹمنٹ سے باہر نہیں گئی ہو گی۔ اس کے بعد رافیل نے ان کے پرس، کریڈٹ کارڈز اور گھڑیاں لے لیں۔ وہ واپس کمرے میں آیا اور بستر پر دراز ڈونا سے کہا۔

''میں نے ان حرام زادوں کو قتل کر دیا ہے۔ مگر میرا نام کسی صورت سامنے نہیں آنا چاہیے... تم پولیس سے یہی کہو گی کہ یہ کسی ڈاکو کا کام ہے اور تم نے کچھ نہیں دیکھا، صرف گولی چلنے کی آواز سنی تھی۔''

ڈونا کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے خوف نظر آیا پھر اس نے سر ہلا دیا۔ ''میں ایسا ہی کروں گی۔''

رافیل نے ایک نظر باتھ روم میں ڈالی۔ وہ اسی وقت ہی جان گیا تھا کہ کسی دن یہ موٹے افراد اس کے ہاتھوں مارے جائیں گے جب ان کو دیکھ کر اسے اپنے ہاتھوں میں سنسنی کا احساس ہوا تھا۔ اپنے شکار کو دیکھ کر اسے ہمیشہ ایسا ہی محسوس ہوتا تھا۔ پھر اس نے بیڈ رومز میں جا کر درازوں میں رکھی جیولری سمیٹی اور اپارٹمنٹ سے نکل گیا۔ جانے سے پہلے وہ اپنے ہاتھوں کے نشانات صاف کرنا نہیں بھولا تھا۔ اپنے اپارٹمنٹ میں آ کر اس نے کئی شاپرز نکالے۔ پرس، کریڈٹ کارڈز، گھڑیاں اور جیولری تھوڑی تھوڑی کر کے ان شاپرز

...ڈال لی۔ اس نے پستول صاف کر کے اور اس میں گولیاں ...کرا کے دوبارہ چرمی کیس میں رکھ دیا۔ اس کے بعد اس ...باہر آ کر ٹیکسی لی اور شہر کے دوسرے حصے میں آ گیا۔ وہاں ...نے شاپرز مختلف کچرے دانوں میں ڈال دیے اور واپس ...گیا۔ اس وقت تک پولیس آ چکی تھی۔

''مسٹر گارفیلڈ کے اپارٹمنٹ میں ڈکیتی کی واردات ...ہے۔'' لفٹ کے نگران نے اسے مستعدی سے آگاہ کیا۔ ...ن کے دونوں بیٹے قتل کر دیے گئے ہیں۔''

''سچ؟'' اس نے تعجب سے کہا۔ ''یہ کیسے ہوا؟''

''مجھے نہیں معلوم... میں کھانا کھانے گیا ہوا تھا۔'' اس ...نے جواب دیا۔

''اور ڈونا کیسی ہے؟''

''وہ ٹھیک ہے... اسی نے پولیس کو کال کی تھی۔''

جیسے ہی پولیس اپنا کام کر کے رخصت ہوئی، رافیل پھر ڈونا کے اپارٹمنٹ میں گیا۔ موٹے آدمیوں کی بیویاں رو رہی تھیں۔ ''تم دونوں اپنا سامان اٹھاؤ اور یہاں سے چلتی بنو۔'' ...افیل نے خطرناک لہجے میں کہا۔ ''اب یہاں نظر مت آنا۔ ...یہ اپارٹمنٹ ڈونا کا ہے۔''

''تم کون ہوتے ہو ہمیں یہاں سے نکالنے والے؟'' ...ایک عورت چلائی۔

''اپنے شوہروں کے انجام سے عبرت پکڑو۔'' رافیل ...نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اپنا سامان باندھنے کے لیے تمہارے ...پاس صرف ایک گھنٹا ہے۔''

رافیل کے خطرناک لہجے کو محسوس کرنے کے بعد ان عورتوں نے رخصت ہونے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ ان کے جانے کے بعد ڈونا نے رافیل کے ہاتھوں کو آنسوؤں بھرا بوسہ دیا۔ ''تم میرے لیے فرشتہ ثابت ہوئے ہو... ورنہ میں تو یہاں پڑے پڑے مر جاتی۔''

''اور میرا راز؟'' رافیل نے اسے یاد دلایا۔

''وہ تمہارا نہیں، ہمارا راز ہے... ایک پڑوسی کا دوسرے ...پر اتنا حق تو ہوتا ہے۔'' ڈونا مسکرائی۔ ''یہ راز مرتے دم تک ...میرے سینے میں محفوظ رہے گا۔''

رافیل نے اپنے اپارٹمنٹ کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔ 'ہونہہ... فرشتہ... میں صرف ایک کرائے کا قاتل ہوں ...جو رقم لے کر قتل کرتا ہے۔'

مگر کبھی کبھی بغیر کسی مالی منفعت کے بھی قتل کرنا پڑتا ہے...!

ماہنامہ پاکیزہ کراچی
مارچ 2009ء
بہار نمبر کے شمارے
کی ایک جھلک

محبت ہم سفر میری
سوزِ محبت کا رنگ لیے، محبت کے حصار میں مقید کرداروں
کی پُراثر داستان۔ **انجم انصار** کے قلم سے

خوشبو کا سفر
عالیہ بخاری کا سلسلے وار ناول

مرگئی تھی زندگی میرے وجود میں
دل شکن حالات میں یاسیت اور قنوطیت سے انکار نہیں لیکن
حوصلہ مندی کے طاقوں میں رکھے چراغ اپنے کچھ روشن پہلو
ضرور رکھتے ہیں اسی تناظر میں **نگہت سیما** کا ناولٹ

مایوس دلوں کو روشنی بخشتے لفظوں سے مزین
صائمہ اکرم، اور **فرحانہ ناز ملک** کے ناولٹ

روگ
کبھی محبت عمل یا کیفیت سے نہیں ہوتی ایسے ہوتی ہے کہ
... بیٹھے رہے تصورِ جاناں کیے ہوئے کچھ ایسی ہی محبت کا
احوال **ناہید فاطمہ حسنین** کے قلم سے

زندگی کے تلاطم میں عقل و دانش کی آگاہی لیے **ریحانہ زیدی**
نازیہ کنول نازی، رابعہ فیاض قادری،
روشانے سبعین، اور **عالیہ حرا** کی یادگار تحریریں

اس کے علاوہ
آپ کی آرا و نگارشات سے سجے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون: 3035313 فیکس: 5802551

پسِ آئینہ

سلطانہ خان

کسی کی خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دینا بڑے حوصلے کا کام ہے ... اور پھر اسے اپنی قربانی کی خبر بھی نہ ہونے دینا اس سے بھی بڑا ظرف مانگتا ہے- ایسے ہی حوصلے اور ظرف کی حامل ایک ہستی کے ایثار کا ماجرا- اپنے چاہنے والوں کی خیر خواہی اس کے نزدیک ہر شے سے بڑھ کر تھی!

ثاقب کے والد یعقوب صاحب نے موٹر وہیکل ٹیکنیشن آفس کے سامنے فٹ پاتھ پر ایک میز ایک کرسی ڈال کر بطور انشورنس ایجنٹ اپنی معاشی جدوجہد کا آغاز کیا تھا مگر تین چار برس کے تجربے نے انہیں بتادیا کہ اس کام میں ترقی کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کچھ کمی یا کچھ بیشی کے ساتھ ایک مقررہ آمدنی ہوتی رہتی ہے جس میں بڑھتی ہوئی ضروریات کی نسبت سے اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ شادی کے چوتھے سال جب ان کے یہاں دوسرا بچہ اور پہلا بیٹا ثاقب پیدا ہوا تو انہوں نے اپنی لائن تبدیل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ پچھلے چار برسوں میں انہیں بے شمار اقسام اور ماڈل کی کاروں اور موٹر سائیکلوں سے سابقہ پڑا تھا۔ چنانچہ کافی غور و فکر کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ سیکنڈ ہینڈ کاروں اور موٹر سائیکلوں کی خرید و فروخت کا بزنس کیا جائے' حسنِ اتفاق سے ان کے والد کے ایک دوست کو ریٹائرمنٹ پر جو مختلف فنڈز وغیرہ ملے تھے وہ انہیں کسی معقول تجارت میں لگانا چاہتے تھے۔ یعقوب صاحب نے ان کے سامنے اپنا منصوبہ پیش کیا اور والد کے دوست سرمایہ کاری پر آمادہ ہوگئے۔

ایک غیر آباد خالی پلاٹ کرائے پر لے کر یونائٹیڈ موٹرز کے نام سے بزنس کا آغاز کردیا گیا۔ یہ آغاز کچھ ایسی مبارک گھڑی میں ہوا کہ دو تین سال کے اندر ہی کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ اب مختلف کنڈیشن کی آٹھ دس کاریں اور دس بارہ موٹر سائیکلیں ہر وقت ان کے شو روم کے باہر کھڑی رہتی تھیں' پھر ایسا اتفاق ہوا کہ والد صاحب کے دوست کا انتقال ہوگیا۔ ان کے وارثوں کو بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی' وہ وراثت میں اپنا اپنا حصہ چاہتے تھے۔ انہوں نے یعقوب صاحب سے مطالبہ کیا کہ وہ بزنس میں لگا ہوا سرمایہ واپس کردیں۔ ایسا کرنا گویا کاروبار کی کمر توڑ دینے کے مترادف تھا لیکن اتنی مدت میں یعقوب صاحب نے مارکیٹ میں اچھی خاصی ساکھ قائم کرلی تھی۔ انہوں نے دو تین مختلف پارٹیوں سے قرض لے کر وارثوں کو تمام سرمایہ واپس کردیا (منافع وہ ہر چھ ماہ بعد دے دیے تھے) پھر تقدیر کی خوبی اور اپنی شب و روز محنت سے قسط وار ادائیگی کے ذریعے تمام قرض ادا کردیا۔

ان کے صرف تین بچے تھے۔ بڑی لڑکی' اس کے بعد ثاقب اور ثاقب کے بعد ایک اور لڑکی ناہید۔ کاروبار کافی منافع بخش تھا۔ یعقوب صاحب نہیں چاہتے تھے کہ وہ ان کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوجائے۔ مزید یہ کہ انہوں نے شو روم کے علاوہ ورکشاپ کی بنیاد بھی ڈال دی تھی۔ اس لیے وہ ثاقب کو اپنے جانشین کی حیثیت سے تیار کرنا چاہتے تھے۔ ثاقب نے بھی ان کی توقعات کا ساتھ دیا اور آٹو موبائل انجینئرنگ کی ڈگری امتیازی پوزیشن سے حاصل کرکے ان کے ساتھ ہی کام کرنے لگا اور جلد ہی بڑی خوش اسلوبی سے پورا بزنس سنبھال لیا۔ تب تک بڑی بیٹی کی شادی ہوچکی تھی اور چھوٹی بیٹی ناہید کی منگنی بھی پھوپی زاد بھائی اقبال سے ہوچکی تھی جو ایک امپورٹ ایکسپورٹ کی مقامی کمپنی میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے سروس کررہا تھا۔

جس محلے میں یعقوب صاحب رہتے تھے وہیں ایک حکیم آفاق احمد بھی رہائش پذیر تھے۔ بدقسمتی سے ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے پس ماندگان میں صرف ایک بیوہ اور ایک بیٹی فوزیہ شامل تھے۔ فوزیہ کی والدہ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ شوہر کی وفات کے بعد انہوں نے اپنی اور بیٹی کی گزر اوقات کے لیے ایک سیکنڈری گرلز اسکول میں ملازمت کرلی تھی۔ ہمسائیگی اور اچھے تعلقات کی وجہ سے دونوں گھرانوں میں کافی

میل ملاپ تھا۔ ثاقب اسی زمانے سے فوزیہ کو پسند کرتا تھا۔ یہ پسندیدگی یک طرفہ بھی نہیں تھی۔ سن بلوغت اور سن شعور کو پہنچنے تک یہ چاہت کافی گہری ہو چکی تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ فوزیہ گریجویشن کر کے فارغ ہوئی تو اس کی ماں جوڑوں کے درد میں مبتلا ہو گئیں۔ یہ بیماری اتنی بڑھی کہ انہیں اپنی ملازمت سے بھی استعفیٰ دینا پڑا۔ اب کفالت اور گزر اوقات کی ذمے داری فوزیہ کے کندھوں پر آگئی۔ ملازمت کے حصول کو آسان بنانے کے لیے اس نے ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کا کورس بھی پاس کر لیا۔ اگرچہ اس کی ماں نے کوشش کی تھی کہ جس اسکول میں وہ سروس کرتی رہی تھیں' وہیں ان کی بیٹی کو بھی جگہ مل جائے مگر تب تک ملازمت کی شرائط پہلے کے مقابلے میں سخت ہو گئی تھیں۔ ملازمت کے لیے ٹیچنگ کورس پاس کرنا ضروری تھا بلکہ عموماً بی ایڈ کو ترجیح دی جاتی تھی۔ فوزیہ کی نوعمر اور ناتجربہ کاری بھی ایک رکاوٹ تھی۔ مزید یہ کہ خود فوزیہ کو بھی پڑھانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کسی آفس میں ملازمت کرنا چاہتی تھی۔

ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ کا کورس پاس کرنے کے بعد اسے اقبال کی سفارش سے اس کی کمپنی میں اسٹینو ٹائپسٹ کی جاب مل گئی۔ ویسے اقبال کی سفارش برائے نام ہی تھی۔ انٹرویو ہوا تھا تو فوزیہ خود اپنی سفارش بن گئی تھی۔ وہ خوب صورت خدوخال اور دلکش قدوقامت کی حسین لڑکی تھی۔

دوسری جانب کمپنی کے پرانے مالک جن کی انتھک جدوجہد' شرافت' خلوص اور مثالی اخلاق نے کمپنی کو انتہائی منافع بخش کاروبار بنا دیا تھا' انتقال کر چکے تھے اور ان کی جگہ زمام کار ان کے نوجوان اکلوتے بیٹے سجاد کے ہاتھوں میں آگئی تھی۔ سجاد لڑکپن سے ہی بے فکر اور لاابالی مزاج رکھتا تھا۔ تعلیمی میدان میں بھی وہ کبھی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکا۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو وہ بی اے میں تیسری مرتبہ فیل ہوا تھا۔ کالج ہی کے زمانے سے اسے آوارگی کے علاوہ شراب پینے اور جوا کھیلنے کی عادتیں پڑ چکی تھیں۔ کمپنی میں باپ کی کرسی سنبھالنے کے بعد ہوش میں آنے کے بجائے اس کی مدہوشی مزید بڑھ گئی۔ وہ بڑی بے دردی سے روپیہ پانی کی طرح بہانے لگا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ کمپنی کے اسٹاف میں دو تین ایسے تجربہ کار افراد شامل تھے جو سجاد کی نااہلی کے باوجود بزنس کو کسی نہ کسی حد تک سنبھالے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی سجاد کو سمجھانے کی کوشش بھی کرتے رہتے تھے مگر اپنے مشوروں کو بے اثر دیکھتے ہوئے انہیں اندیشہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو تین سال کی مدت میں کمپنی دیوالیہ ہو جائے گی۔

امیدواروں کا انٹرویو سجاد نے لیا تھا اور وہ فوزیہ کو دیکھتے ہی اس کا اتنا گرویدہ ہو گیا تھا کہ اگر فوزیہ کو ٹائپ اور شارٹ ہینڈ نہ بھی آتی ہوتی تب بھی وہ اسی کا انتخاب کرتا لیکن فوزیہ بڑی سمجھ دار اور معاملہ فہم اور مضبوط کردار کی لڑکی تھی۔ پھر یہ کہ اس کا سجاد سے براہ راست تعلق بھی نہیں تھا۔ اس لیے اس نے تین چار ماہ تک بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سجاد کی پیش دستیوں کا مقابلہ کیا جو فی الحال کسی نہ کسی بہانے اسے اپنے آفس میں بلانے یا چھٹی کے بعد گھر تک چھوڑ آنے کی لفٹ پیش کش تک محدود تھیں۔

فوزیہ کی والدہ نے بیماری کے باعث ملازمت سے استعفیٰ دیا اور ان کی گزر اوقات کا مسئلہ پیدا ہوا تب ہی ثاقب کے ذہن میں خیال آیا تھا کہ وہ اپنی ماں سے فوزیہ کے سلسلے میں بات کرے۔ رشتہ دینے کے لیے کہے مگر تب وہ انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا۔ شادی کا مطلب تعلیم میں رخنہ اندازی ہوتا۔ ساتھ ہی اسے فوزیہ سے بھی یہ معلوم ہوا کہ اس کی والدہ کو پراویڈنٹ فنڈ کی شکل میں کچھ رقم مل گئی ہے اس لیے فوری طور پر گزر بسر کا کوئی مسئلہ نہیں ہے اس لیے ثاقب نے والدہ سے بات کرنے کے ارادے کو کسی مناسب موقع تک ملتوی کر دیا۔ اس نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ والد کا بزنس بھی سنبھال لیا۔ اس میں سال ڈیڑھ سال سے زیادہ عرصہ نہیں لگا۔ اگرچہ اس دوران میں فوزیہ نے ملازمت کر لی تھی اس کا ملازمت کرنا ثاقب کو پسند نہیں تھا۔ اس نے اعتراض بھی کیا تھا لیکن فوزیہ نے جواب دیا کہ وہ وقتی ضرورت کے تحت سروس کر رہی ہے جب بھی ثاقب نے کسی اختیار کے تحت اسے حکم دیا وہ فوراً استعفیٰ دے دے گی۔

ناہید کی منگنی اقبال سے ہونے کے بعد ثاقب کی والدہ کو بیٹے کے سر پر بھی سہرا دیکھنے کی خواہش بے تاب کرنے لگی تھی۔ گھر میں اس کے لیے لڑکی تلاش کرنے کے تذکرے ہونے لگے تو ثاقب نے مناسب انداز میں ماں کو اپنی پسند سے آگاہ کر دیا۔ وہ خود بھی فوزیہ کو بہت چاہتی تھیں۔ بلا تامل مان گئیں۔ بات یعقوب صاحب تک پہنچی۔ خاصے دولت مند ہونے کے باوجود یعقوب صاحب کا دماغ خراب نہیں [illegible] تھا۔ وہ اس پوزیشن میں تھے کہ چاہتے تو بڑے سے بڑے خاندان کی بیٹی کے لیے رشتہ دے سکتے تھے مگر انہوں نے بیٹے کے جذبات کا پاس کیا اور اس رشتے کے لیے اپنی رضامندی دے دی۔ فوزیہ کی ماں اپنی بیماری اور تنگ دستی کے پیش نظر شب و روز فوزیہ کے مستقبل کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان رہتی تھیں۔ انہیں ایسا اچھا رشتہ آنے کی بعید ترین

[illegible] بھی نہیں تھی۔ خوشی کے آنسوؤں سے نم آنکھوں کے [illegible] انہوں نے ثاقب کی والدہ کو گلے سے لگا لیا اور پھر ایک [illegible] ہفتے کے اندر باقاعدہ منگنی بھی ہو گئی۔

○☆○

پھوپی زاد بھائی ہونے کی وجہ سے ثاقب کے گھر میں [illegible] کی آمدورفت فطری بات تھی اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ناہید شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں مگر جب منگنی ہو گئی تو قدرتی بات تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں سوچنے لگے پھر یہ سوچ نمایاں [illegible] میں بدل گئی۔ یعقوب صاحب بدلتے وقت کے ساتھ ناگزیر تبدیلیوں کو برا نہیں سمجھتے تھے۔ ایک دو نسل پہلے تو یہ دستور عام تھا کہ منگنی سے قبل رشتوں کے بھائی بہنوں کے درمیان کوئی پردہ نہ بھی ہو تب بھی منگنی ہوتے ہی دونوں کے لیے ایک دوسرے کو دیکھنا ناممکن بنا دیا جاتا تھا۔ پردے کا اتنا شدید اہتمام ہوتا کہ ادھر لڑکے کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور ادھر لڑکی کو کسی کمرے میں بند کر دیا گیا۔ چنانچہ اقبال اور ناہید منگنی کے بعد بھی ایک دوسرے کے سامنے آتے رہے۔ آپس میں باتیں بھی کرتے رہے۔ تعلق خاطر بڑھا تو اقبال زیادہ آنے جانے لگا اور اس پر بھی کسی نے کوئی اعتراض کرنا تو کجا کچھ خیال بھی نہیں کیا۔

حد اعتدال سے نکل کر مفید کے بھی مضر ہونے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ سوئے اتفاق سے یوں ہوا کہ ایک دن کمپنی میں ہاف ڈے کی چھٹی ہونے پر اقبال گھر جانے کے بجائے ماموں کے ہاں پہنچ گیا۔ یعقوب صاحب کبھی کبھی دل بہلانے کے لیے شوروم چلے جاتے تھے۔ اس روز بھی گئے ہوئے تھے۔ ثاقب کی والدہ پڑوس میں فوزیہ کی امی سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔ گھر میں ناہید بالکل اکیلی تھی۔ ایسی تنہائی کبھی میسر نہیں آئی تھی۔ اقبال نے کچھ پیش دستی کی' ناہید نے کوئی خاص مزاحمت نہیں کی۔ جذبات کو بھڑکنے کا موقع ملا۔ شیطان نے فریب دیا کہ ان دونوں کا ملاپ یقینی ہے۔ منگنی [illegible] ہے۔ شادی بھی ہو جاتی اگر یعقوب صاحب یہ اصرار [illegible] کرتے کہ ناہید بی اے فائنل میں ہے۔ اس وقت شادی [illegible] تو تعلیم کی تکمیل نہ ہو سکے گی۔ آٹھ دس مہینے کی [illegible] ہے۔ وہ بی اے کر لے تو شادی کی کوئی مناسب تاریخ مقرر کر دی جائے گی۔ اس مدت کا نصف تو گزر ہی چکا ہے۔ [illegible] لیے شادی میں چند ماہ ہی باقی رہ گئے ہیں۔ ان سے کیا فرق [illegible] ہے۔ آخر انہیں ایک دوسرے کا ہی ہونا ہے تو کوئی حد [illegible] کی کیا ضروری ہے۔ اس پرکشش فریب کے مقابلے میں اگر ضمیر کی جانب سے کوئی دھڑکا تھا بھی تو وہ سیلاب میں تنکے کے مانند بہہ گیا۔

ہوش ٹھکانے آئے تو دونوں شرمندہ اور پشیمان تھے۔ ناہید تو رونے بھی لگی مگر اقبال نے اسے بڑے مخلصانہ لب و لہجے میں تسکین دی کہ وہ ہرگز کسی ایسے ارادے کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ جو کچھ ہوا جذبات کی رو میں بہہ جانے سے ہوا۔ اس میں قصوروار ہیں تو دونوں ہیں اور بے قصور ہیں تو دونوں ہیں لیکن ناہید کو بالکل بھی پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اس کے ساتھ بے وفائی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ چند مہینے بعد ہی ان کی شادی ہو جائے گی اور تب اس حادثے کی کوئی حیثیت نہیں رہ جائے گی۔ دونوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ اس جذباتی لغزش کو فراموش کر دیں اور کسی اندیشے میں مبتلا نہ ہوں۔ نہ ہی ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہرائیں۔ اپنا طرز عمل معمول کے مطابق رکھیں اور یہ کہ آئندہ کوئی ایسا [illegible] نہ آنے دیں جس سے شیطان پھر انہیں بہکانے میں کامیاب ہو سکے۔

اس گفتگو سے ناہید کے کچھ زیادہ ہی گھبرائے ہوئے دل کو بڑی تسکین ملی۔ اس نے اقبال سے وعدہ لیا کہ وہ کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑے گا اور فائنل امتحان ہونے کے بعد۔ جو اگلے ماہ سے شروع ہو رہے ہیں۔ اپنے والدین سے اصرار

کمزور اور بے اولاد مریض
مردانہ صحت کی مکمل بحالی، مردانہ
جرثوموں کی کمی و کمزوری
اور خوشگوار ازدواجی زندگی کے لئے
15 اپریل 2008 سے کلینک کے لئے نئے اوقات کار نوٹ فرمالیں
صبح 9 بجے تا 3 بجے دوپہر
دوسرے شہروں کے رہنے والے مریض فون پر رابطہ کرسکتے ہیں
ڈاکٹر محمد لطیف شاہین
ایم بی بی ایس، بی ایس سی (آنرز)
معالج امراض مخصوصہ و بانجھ پن
شاہین ملٹی سسٹم کلینک
نزد ریلوے کراسنگ
گوجرہ روڈ جھنگ صدر
موبائل 0321-6528001
فون 047-7625822

کرکے جلد از جلد شادی کی تاریخ مقرر کرانے کی کوشش کرے گا۔ اقبال نے قسم کھا کر وعدہ کرلیا اور اس سے ناہید کو مزید اطمینان حاصل ہوا۔ دونوں نے یہ بھی بہتر سمجھا کہ اقبال ناہید کی امی کی واپسی کا انتظار نہ کرے فوراً واپس چلا جائے اور ناہید اور وہ دونوں اس بات کا خیال رکھیں کہ اس وقت اقبال کی آمد کے بارے میں کبھی کسی کے سامنے کوئی تذکرہ نہ کیا جائے۔ چنانچہ اقبال، ناہید کو ایک بار پھر تسلی دیتے ہوئے رخصت ہوگیا۔

○☆○

سجاد اس کثرت سے شراب پینے لگا تھا کہ دفتری اوقات میں بھی وہ عموماً کم یا زیادہ نشے کے عالم میں ہوتا تھا۔ اس نے فوزیہ کو پرچانے کی کوشش میں، میں ناکام ہوکر ایک دوسرا طریقہ سوچا۔ سردست فوزیہ کے فرائض اس سے براہِ راست متعلق نہیں تھے۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ فوزیہ کو کسی بہانے سے قریب لاسکے تو بات زیادہ آسان ہوسکتی ہے۔ غلام محمد صاحب اس کے والد کے زمانے سے سیکریٹری کے فرائض سنبھالے ہوئے تھے۔ انہیں نہ صرف کاروبار کے ہر شعبے کا علم تھا بلکہ ملکی اور غیر ملکی اداروں سے ہونے والی تمام خط و کتابت بھی زیادہ تر وہی کرتے تھے۔ اپنی آوارگیوں اور عیاشیوں کے باوجود سجاد کو اتنا ہوش ضرور تھا کہ وہ غلام محمد کی اہمیت بخوبی سمجھتا تھا جب سے اس نے دفتر میں بیٹھنا شروع کیا تھا۔ تب سے اس نے سوائے متعلقہ کاغذات پر دستخط کرنے کے اور کچھ نہیں کیا تھا۔ غلام محمد اپنے مقدور بھر تمام کام سنبھالے ہوئے تھے۔

فوزیہ کو قریب لانے کے لیے سجاد کے دماغ میں پہلا خیال یہ آیا کہ اسے غلام محمد کی جگہ سیکریٹری مقرر کردے مگر ایسا کرنا خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا۔ یہ دوسری بات تھی۔ خواہ اسے اس کا احساس ہو یا نہ ہو کہ وہ اب بھی اسی شاخ کو مسلسل کاٹ رہا تھا جس پر بیٹھا ہوا تھا۔ کافی سوچنے کے بعد آخر سجاد کو ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ اس نے پرسنل سیکریٹری کی ایک نئی جاب نکالی اور اس پر فوزیہ کا تقرر کردیا۔ جواز یہ نکالا کہ وہ غلام محمد کو ان کے کام میں مدد دینے کے علاوہ فائلنگ اور ڈسپیچنگ کا کام سرانجام دے گی۔ مزید یہ کہ اس کے ذاتی اپائنٹ منٹ کا خیال رکھے گی اور کچھ خط و کتابت اگر وہ خود کرنا چاہے گا تو اس کا ڈکٹیشن لے گی اور خطوط ٹائپ کرے گی۔

فوزیہ اتنی نادان نہیں تھی کہ اس ترقی کی وجہ نہ سمجھ سکتی مگر ایک تو تنخواہ میں معقول اضافہ ہو رہا تھا۔ دوسرے اسے اپنے اوپر اعتماد تھا کہ وہ ہر صورت حال کا مقابلہ کرسکتی ہے اس لیے اس نے نئی ذمے داری قبول کرلی۔ سجاد نے سوچا تو یہ تھا کہ وہ اپنے آفس میں ہی فوزیہ کے لیے ایک میز کرسی رکھوا دے لیکن چونکہ اب وہ دفتر میں بھی گاہے گاہے چند جرعے پینے کا عادی ہوتا جارہا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ فوزیہ اس کی شراب نوشی سے واقف ہو اس لیے اپنے آفس سے ملحقہ کمرا اس کے لیے خالی کرادیا۔

سجاد نے پہلے اشاروں کنایوں میں اپنی محبت کا اظہار کیا۔ وہ ڈکٹیشن دینے کے بہانے فوزیہ کو بلاتا اور پھر خط لکھوانے کی آڑ میں اظہارِ محبت شروع کردیتا۔ فوزیہ خاموشی سے سب کچھ سنتی اور لکھتی رہتی اور پھر انہی الفاظ میں خطوط ٹائپ کرکے سجاد کی میز پر رکھ آتی۔ تنگ آکر سجاد نے آخر براہِ راست اقدام کا فیصلہ کرلیا۔ ایک دن اس نے فوزیہ کو بلالیا۔ فوزیہ حسبِ معمول نوٹ بک اور پنسل لیے آفس میں داخل ہوئی۔

"بیٹھ جاؤ۔" سجاد بولا "میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"فرمائیے۔" فوزیہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا تمہیں اب تک اس بات کا اندازہ نہیں ہوا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"مختلف انسانی جذبات کی طرح محبت بھی ایک جذبہ ہے۔" فوزیہ نے سنجیدگی سے جواب دیا "اور ہر آدمی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے طور پر کسی دوسرے فرد کے لیے اپنے دل میں جو جذبہ چاہے رکھ سکتا ہے۔"

"لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم میری محبت کا جواب محبت سے دو۔"

"ضروری نہیں کہ جو جذبہ مجھے دیکھ کر آپ کے دل میں پیدا ہوا ہو وہی جذبہ آپ کو دیکھ کر میرے دل میں بھی پیدا ہو۔ میں نہ آپ سے محبت کرتی ہوں اور نہ ہی کرسکتی ہوں۔"

"مگر کیوں؟"

"اول اس لیے کہ محبت زبردستی نہیں کی جاتی۔" فوزیہ بدستور سنجیدہ تھی "دوسرے اس لیے کہ میری منگنی ہوچکی ہے.... عنقریب شادی بھی ہوجائے گی۔ میں اپنے منگیتر کو پسند کرتی ہوں اور اس اصول کی قائل ہوں کہ لڑکیوں کو صرف اپنے شوہر سے محبت کرنا چاہیے۔"

"تمہاری منگنی ہوچکی ہے!" سجاد چونکا "کس سے؟"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے لیکن آپ جاننا ہی چاہتے ہیں تو مجھے بتانے میں کوئی اعتراض نہیں۔ میری منگنی ثاقب

چڑیا گھر

مشہور ہے کہ مغل فرماں روا جہانگیر کو پرندوں اور جانوروں کا بڑا شوق تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کل 28532 جانور ... ان میں 86 شیر بھی تھے۔ جہانگیر نے باقاعدہ ایک جانور خانہ بنایا تھا لیکن وہ عجائب خانہ تھا۔ جس میں شاہین، باشہ ... چنچنک، کوا، بٹیر، تیتر، پودنہ، عقاب اور باز وغیرہ تھے۔ اس کے جانور خانہ میں ایک طوطی سے مشابہ پرندہ بھی تھا، اس ... صورت پرندے کے متعلق وہ خود لکھتا ہے۔

"اس پرندے کا رنگ طوطے کی طرح تھا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جس شاخ پر اسے رات کو بٹھا دیا ... وہ لٹا لٹک کر چہکتا رہتا تھا اور دن کے وقت اس شاخ کے اوپر بیٹھا رہتا تھا۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ اس طرح وہ اللہ کی عبادت کرتا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ یہ اس کا فطری فعل ہے۔ یہ پرندہ پانی نہیں پیتا۔ پانی اس کے لیے زہر قاتل ہے ... نکہ ہر جاندار کے لیے پانی ضروری ہے۔"

ایک دفعہ اس نے ایک شیر کو مارا تو اس کے اندر کا جائزہ اس طرح پیش کیا۔

"شیر بہادر کی بہادری مانی ہوئی بات ہے۔ میں نے اس کی بہادری کی وجہ معلوم کرنے کے لیے اس کا پیٹ چاک کروایا تو معلوم ہوا کہ اس کا پتا، جگر سے باہر ہونے کے بجائے اس کے اندر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر ببر کی بہادری کی وجہ یہی ہے۔"

مرسلہ: عنصر شہزاد پرنم، کوٹلی آزاد کشمیر

... صاحب سے ہوئی ہے جو پاکستان موٹرز کے مالک ہیں۔"

"ثاقب۔" سجاد نے سوچتے ہوئے کہا "یہ وہی صاحب ... ہیں جن کی بہن سے اقبال کی منگنی ہوئی ہے۔"

"وہی ہیں۔ مگر آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ ان کی بہن سے اقبال کی منگنی ہوچکی ہے۔"

"اقبال نے مجھے اپنی منگنی کی تقریب میں شرکت کی دعوت دی تھی تب ہی اس نے بتایا تھا۔"

"آپ نے مجھے کیا اسی موضوع پر بات کرنے کے لیے بلایا تھا۔"

"ہاں۔"

"تب میں اجازت چاہوں گی۔ میری نجی زندگی اور اس ... معاملات کا میرے دفتری فرائض سے کوئی تعلق نہیں ..."

"ثاقب سے تمہاری منگنی ہی تو ہوئی ہے۔ شادی تو ... نہیں ہوئی۔" سجاد بولا "تم یہ منگنی توڑ دو۔ کیونکہ میں تم سے ... کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں آپ سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔"

"نہ سہی مگر تمہیں میری محبت کا جواب محبت سے دینا ... گا۔" سجاد کھڑا ہوگیا۔

"میں کہہ چکی ہوں کہ محبت زبردستی نہیں کی جاتی۔"

"لیکن میں زبردستی بھی کرسکتا ہوں۔" سجاد نے کہا۔

وہ گھوم کر فوزیہ کی طرف آیا اور اس کا ہاتھ پکڑلیا۔ فوزیہ بھی کھڑی ہوگئی۔

"میرا ہاتھ چھوڑدیں سجاد صاحب!" وہ بولی۔

"نہ چھوڑوں تو کیا کرلوگی۔"

"یہ۔" فوزیہ نے جواب دیا اور ساتھ ہی ایک زوردار تھپڑ سجاد کے منہ پر رسید کردیا۔

"تمہیں یہ گستاخی بہت مہنگی پڑے گی۔" سجاد نے غصے سے کہا۔

"آپ زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتے ہیں تاکہ مجھے ملازمت سے برطرف کردیں۔" فوزیہ نے بھی تیزی سے جواب دیا "تو میں خود ایسی سروس پر لعنت بھیجتی ہوں جہاں میری خودداری اور عزتِ نفس محفوظ نہ ہو۔ میں جارہی ہوں۔ تھوڑی دیر میں میرا استعفا آپ کی میز پر پہنچ جائے گا اور آپ سارے اسٹاف کے سامنے اپنی بے عزتی نہیں کرانا چاہتے تو میرا مشورہ ہے کہ اس معاملے کو یہیں ختم کردیں۔"

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ سجاد اسے غصیلی نظروں سے گھورتا رہ گیا پھر اپنا گال سہلاتے ہوئے بڑبڑایا۔

”تمہیں یہ تھپڑ بہت مہنگا پڑے گا فوزیہ۔ میں اس آسانی سے تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ آج نہیں تو کل میں تم سے اپنی توہین کا انتقام لے کر رہوں گا۔“

○☆○

فوزیہ نے محض دھمکی نہیں دی تھی۔ اس نے سچ مچ اسی روز استعفا دے دیا۔ یوں اس کا رابطہ کمپنی یا سجاد سے بالکل ختم ہوگیا۔ لیکن سجاد کو اپنے انتقام لینے کی منصوبہ بندی کرنے کے لیے فوزیہ کے بارے میں مکمل معلومات کی ضرورت تھی اور اب یہ معلومات اقبال کے ذریعے ہی حاصل ہوسکتی تھیں۔ اقبال، ثاقب کی بہن کا منگیتر تھا اور ثاقب کی شادی فوزیہ سے ہونے والی تھی۔ سجاد نے سوچا کہ وہ اقبال سے براہ راست تو معلومات حاصل نہیں کرسکتا مگر یہ ممکن ہے کہ اقبال دفتر سے کبھی فوزیہ یا ثاقب کو فون کرے یا اس کے لیے فوزیہ، ثاقب یا اس کی منگیتر ناہید کا فون آئے اور ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سے سجاد کو اپنے مطلب کی کوئی بات معلوم ہوسکے۔ یہ کام کمپنی کے ٹیلی فون آپریٹر کی مدد کے بغیر ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس نے ٹیلی فون آپریٹر پرویز کو اپنے آفس میں بلایا۔

”اگر تمہاری آمدنی میں ایک ہزار روپیہ ماہانہ کا اضافہ ہوجائے تو کیسا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”بہت ہی اچھا ہو سر۔“ پرویز نے فوراً جواب دیا ”میری بہت سی گھریلو مشکلیں آسان ہوجائیں گی۔“

”مگر اس کے لیے تمہیں میرا ایک چھوٹا سا کام انتہائی رازداری کے ساتھ کرنا ہوگا۔“

”میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔“

”مجھے شبہ ہے کہ اقبال ہماری کمپنی کے مفاد کے خلاف کام کررہا ہے۔“ سجاد نے کہا ”اس کا رابطہ میرے کسی دشمن سے ہے جو مجھے نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ میں اپنے اس شبہے کی تصدیق یا تردید کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس کی روشنی میں کوئی فیصلہ کرسکوں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آج سے اقبال کے نام کوئی بھی فون آئے یا وہ کسی کو فون کرے تو تم اس کی تمام باتیں سنو اور مجھے ہر گفتگو کی رپورٹ پیش کرو۔ خیال رہے تمہیں ہر گفتگو سننا ہے اور اس کے بارے میں رپورٹ کرنا ہے خواہ وہ تمہیں کتنی ہی غیر اہم، پرائیویٹ یا عام نوعیت کی محسوس ہورہی ہو۔ سمجھ گئے۔“

”یس سر۔“ پرویز نے مستعدی سے جواب دیا ”اقبال کے لیے کوئی فون آئے یا وہ خود کسی سے بھی بات کرے۔ مجھے وہ گفتگو سننا ہے اور آپ کو بتانا ہے۔“

”بالکل ٹھیک۔“ سجاد نے سر ہلایا ”اس خدمت کے بدلے میں ہر مہینہ ذاتی طور پر تمہیں ایک ہزار روپیہ ادا کروں گا۔ اگر تم نے رازداری اور ذمے داری سے یہ کام انجام دیا تو ضرورت ختم ہونے کے بعد تمہاری تنخواہ میں معقول اضافہ کردیا جائے گا۔ بس اب تم جاسکتے ہو۔“

”بہت بہت شکریہ سر۔ میں یہ کام پوری ذمے داری سے انجام دوں گا۔“ پرویز نے یقین دلایا۔

پرویز کے لیے اپنی نئی ڈیوٹی بہت ہی آسان ثابت ہوئی۔ اقبال خود بھی بہت کم کسی کو فون کرتا تھا اور اس کے لیے بھی کبھی کبھار ہی کوئی کال آتی تھی۔ ان کبھی کبھی آنے والی کالوں میں زیادہ تر ناہید کے فون ہوتے تھے۔ جس کے ذریعے وہ کبھی گھر سے باہر کہیں ملنے کا پروگرام طے کرتے تھے لیکن جب سے وہ حادثہ ہوا تھا تب سے دونوں ہی بہت محتاط ہوگئے تھے۔ گھر سے باہر ملنا تو بالکل بند کردیا تھا۔ اقبال نے ماموں کے گھر آمد و رفت بھی کم کردی تھی اور کبھی آتا بھی تو زیادہ دیر نہیں ٹھہرتا تھا۔ اور ناہید سے بھی ضرورت سے زیادہ باتیں نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ کئی ہفتے گزر گئے اور پرویز سجاد کے نقطہ نظر سے کوئی مفید اطلاع فراہم نہیں کرسکا۔ اس دوران اقبال کے لیے تو کوئی فون آیا ہی نہیں تھا البتہ اقبال نے دو تین فون ضرور کیے تھے اور یہ سب اس نے اپنے گھر پر کیے تھے۔ اس کی والدہ کی طبیعت کچھ خراب چل رہی تھی۔ وہ ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے ایک ہفتہ اسپتال میں بھی رہی تھیں۔ چنانچہ ان تمام کالوں کا مقصد ان کی طبیعت کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔

مگر پھر ایک دن پرویز نے ایک لڑکی کی کال ریسیو کی جو اقبال سے بات کرنا چاہتی تھی۔ پرویز نے حسب معمول اقبال سے کنکشن تو ملا دیا مگر خود بھی تمام گفتگو سنتا رہا۔

”ہیلو۔ اقبال۔“

”میں بات کررہا ہوں۔“

”میں ناہید بول رہی ہوں۔“

”تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی مگر خیریت تو ہے۔ اس وقت کیسے فون کیا؟“

”خیریت بالکل نہیں ہے۔“ ناہید کی آواز سے معلوم ہورہا تھا کہ وہ خود پر قابو پانے کی انتہائی کوشش کررہی ہے ”میں اس وقت ایک پرائیویٹ اسپتال کے پبلک فون سے بات کررہی ہوں۔“

”اسپتال!“ اقبال چونکا ”تم وہاں کیا کررہی ہو؟“

”دو تین دن سے میری طبیعت کچھ خراب تھی۔ مجھے ... کچھ شبہ ہوا اور چیک اپ کے لیے اسپتال آگئی اور ... لیڈی ڈاکٹر نے میرے شبہے کی تصدیق کردی ہے۔“

”کیا شبہ۔ کیسی تصدیق؟ صاف صاف کیوں نہیں ... بتاتیں۔“

”میں۔ میں۔ ماں بننے والی ہوں۔“ ناہید باقاعدہ رونے ...

اقبال یہ بات سن کر سناٹے میں رہ گیا۔ ان کی لغزش انجام کو پہنچے گی اسے کبھی گمان بھی نہ تھا مگر اب تو جو ہونا تھا ہوچکا تھا۔ اس نے فوراً خود کو سنبھالا۔

”تم بالکل مت گھبراؤ۔“ وہ پُرعزم لہجے میں بولا ”تمہارے امتحان کب ختم ہورہے ہیں؟“

”دو پرچے باقی رہ گئے ہیں۔“

”تم پورے اطمینان اور سکون سے امتحان دو۔“ اقبال نے کہا ”میں امی سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ وہ ماموں جان پر جلد شادی کے لیے زور دیں اور میرا خیال ہے کہ انہوں نے کچھ بات کی بھی ہے۔ میں آج ہی ان سے پھر کہوں گا کہ امتحان کا نتیجہ نکلنے تک انتظار کرنا ضروری نہیں ہے۔ جیسے ہی امتحان ختم ہوں، شادی کی تاریخ مقرر کردی جائے۔ تمہارا ... ریکارڈ ہمیشہ اچھا رہا ہے۔ یقیناً اس مرتبہ بھی پاس ہوجاؤ گی۔ یقین رکھو میں اس آزمائش میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ ہماری طرف سے پورا زور ڈالا جائے گا تو ماموں جان انکار نہیں کرسکیں گے۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ خدا نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ میں اسی مہینے شادی کی کوئی تاریخ مقرر کرانے کی پوری کوشش کروں گا۔“

”جو کچھ کرنا ہے جلدی کریں۔“ ناہید قدرے پُرسکون لہجے میں بولی ”دیر ہوئی تو میں اور میرے گھر والے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ شکر ہے کہ میں نے جلدی چیک اپ کرالیا۔ ورنہ ایک مہینے کی تاخیر بھی تباہ کن ہوسکتی ہے۔“

”تم بالکل مت گھبراؤ۔“ اقبال نے پھر تسلی دی ”میں امی سے بات کروں گا۔ وہ دو تین دن کے اندر ہی ... تاریخ مقرر کرانے کے لیے پہنچ جائیں گی۔“

○☆○

پرویز نے یہ تمام گفتگو مکمل تفصیل کے ساتھ سجاد تک پہنچا دی اگرچہ اس کے اپنے خیال میں یہ قطعی ایک نجی بات تھی اور اس کا کمپنی کے کسی معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا تھا مگر یہ سب کچھ سوچنا اس کا کام نہیں تھا، اس سے ہر گفتگو کی رپورٹ کرنے کے لیے کہا گیا تھا اور وہ اس نے کردی۔ دوسری جانب سجاد بھی فوری طور پر اس معلومات سے فائدہ اٹھانے کا کوئی پہلو نہیں سوچ پایا۔ اتنا تو وہ سمجھ گیا کہ ناہید اور اقبال اپنے تعلق میں حد سے آگے نکل گئے تھے۔ جس کا یہ نتیجہ نکلا مگر یہ کہ ان دونوں کی شادی طے تھی اس لیے بات کھلنے سے پہلے بھی ہوسکتی ہے۔ وہ اگر اس راز کو فاش کردے تب بھی زیادہ سے زیادہ ناہید اور اقبال متاثر ہوں گے اور بزرگوں نے سمجھ داری سے کام لیا تب بھی نتیجہ ان دونوں کی شادی ہی ہوسکتا ہے۔ وہ اس معلومات سے فوزیہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور نہ ہی ثاقب کا کچھ بگاڑ سکتا ہے کہ براہ راست نہ سہی تو بالواسطہ طور پر فوزیہ کو صدمہ پہنچا سکے مگر اس نے یہ تفصیل ذہن میں محفوظ ضرور کرلی کہ شاید کبھی اس سے کام لیا جاسکے اور ایسا کرتے وقت خود اسے بھی بالکل اندازہ نہیں تھا کہ بظاہر یہ فوزیہ سے غیر متعلق سی بات چند ہی دنوں میں کتنی اہم اور فوزیہ سے کس قدر براہِ راست متعلق بن جائے گی۔

○☆○

اقبال کو مسئلے کی نزاکت کا پورا احساس تھا۔ محض پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اگر قدرت فوراً ہی نتیجہ برآمد کرنے پر نہ تل جاتی تو شادی کبھی بھی ہوتی، اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ وہ پہلے بھی ناہید سے محبت کرتا تھا اور اب تو اسے چھوڑنے کے بارے میں سوچنا بھی ظلم تھا۔ بلاشبہ وہ اپنے والدین سے جلد سے جلد شادی کرنے کے لیے اصرار کرسکتا ہے۔ وہ اس کی خاطر ناہید کے والدین پر زور بھی دے سکتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ مسئلے کی نوعیت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے وہ عجلت کی ضرورت اور نزاکت کو نہیں سمجھ سکتے۔ ان سب کو جلد سے جلد شادی کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے کسی موثر اور معقول دلیل کی ضرورت تھی۔ اقبال نے بہت سوچا۔ بہت غور کیا اور آخر اس کی عقل نے ایک ترکیب سجھا دی۔

اس نے اپنے والدین سے کہا کہ اس کی کمپنی کی ایک شاخ لاہور میں کھولنے کے امکان کا جائزہ لیا جارہا ہے۔ اگر یہ فیصلہ ہوگیا تو ابتدا میں مقامی اسٹاف بھرتی کرنے کے علاوہ ہیڈ آفس سے ایک دو سینئر افراد کو وہاں بھیجا جائے گا۔ اسے معلوم ہوا ہے کہ اس سلسلے میں اس کا نام بھی زیرِ غور ہے اور اگر وہ لاہور چلا گیا تو کم سے کم ایک سال سے پہلے چھٹی ملنے کا کوئی امکان نہیں ہوگا۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ ناہید کے امتحان سے فارغ ہوتے ہی شادی کردی جائے۔ اس سے دو

فائدے ہوں گے۔ اوّل یہ کہ وہ لاہور جانے کے بعد بغیر کسی دشواری کے ناہید کو بھی وہیں بلالے گا اور اس کے لیے اسے چھٹی لینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ دوسرے ممکن ہے پھر کمپنی بھی اسے بھیجتے ہوئے ہچکچائے کہ شادی شدہ ہونے کی صورت میں کمپنی کو اس کے لیے ایک مکان بھی فراہم کرنا ہوگا اور شاید اس اضافی خرچ کے پیش نظر وہ اسے بھیجنے کا ارادہ ملتوی کردیں۔

اقبال کی ترکیب کام کرگئی۔ ناہید کے والدین اگلے ماہ کی سترہ تاریخ کو شادی کرنے کے لیے آمادہ ہوگئے۔ لیکن یہ عجلت اقبال کے والدین کے لیے ایک آزمائش تھی۔ بیٹے کی شادی میں بلاشبہ بیٹی کی شادی کے مقابلے میں کم خرچ ہوتا ہے مگر دلہن کے لیے روایتی اعتبار سے کم سے کم سات جوڑے (جن میں دو تین جوڑوں کا بھاری اور قیمتی ہونا ضروری تھا) بہرحال درکار ہوتے ہیں پھر کچھ زیورات بھی چاہئیں۔ ولیمے کی دعوت بھی لازمی تھی۔ جوڑے تو کم و بیش تیار تھے لیکن زیورات اور ولیمے کے لیے بیس پچیس ہزار کہاں سے فراہم ہوں گے۔ اقبال کے والد سرکاری ملازم تھے آمدنی بس اتنی ہی تھی کہ سفید پوشی کے ساتھ گزر اوقات ہوتی رہے۔ بیٹی کی شادی کے سلسلے میں ڈیڑھ ماہ قبل اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے جو قرض لیا تھا اس کی تین چار قسطیں باقی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ قسطیں ادا کرکے پانچ سات مہینے بعد جب بیٹے کی شادی کا وقت آئے گا تو پھر قرض لے لیں گے مگر ایک قرض اترنے سے پہلے دوسرے قرض کی درخواست کیسے کریں اور کریں بھی۔۔ اور خوش قسمتی سے منظور بھی ہوجائے تو دس ہزار سے زیادہ تو ہرگز نہیں مل سکتے۔

انہوں نے اقبال سے اپنی مشکل کا ذکر کیا کہ تمہارے اصرار پر شادی کی تاریخ تو طے ہوگئی مگر ضروری اخراجات سے نمٹنے کے لیے رقم کہاں سے آئے گی۔ اس پر اقبال نے جواب دیا کہ وہ اپنی کمپنی سے بیس ہزار روپیہ قرض لینے کی کوشش کرے گا اور اسے امید ہے کہ اس کی درخواست منظور ہوجائے گی۔ احتیاطاً اس کے والد بھی قرض کی درخواست دے دیں۔ کسی سے قرض لینے کی کوشش بھی کریں۔ اگر مطلوبہ رقم فراہم ہوگئی تو ٹھیک ورنہ جو کچھ کیا جاسکتا ہو وہی کردیا جائے۔ ماموں بھی ان کی مالی پوزیشن سمجھتے ہیں۔ آخر شادی غیروں میں نہیں اپنوں میں ہورہی ہے۔ کسی کے لیے کوئی اعتراض کرنے کی گنجائش ہی پیدا نہیں ہونا چاہیے۔

○☆○

اقبال نے دوسرے دن ہی بیس ہزار قرض کے لیے درخواست دے دی۔ اکاؤنٹ ڈیپارٹمنٹ کے انچارج نے اس کی سفارش بھی کردی۔ درخواست سیکریٹری غلام اکبر تک پہنچی تو انہوں نے کوئی ریمارک دینے کے بجائے صرف فارورڈ لکھ کر سجاد کے پاس بھجوا دی۔ سجاد نے درخواست پڑھی۔ تھوڑا سا غور کیا اور اچھل پڑا۔ اس کے سازشی ذہن نے ایک ایسی ترکیب سوچ لی تھی جس پر کامیابی سے عمل کرکے وہ فوزیہ سے اپنا انتقام لے سکتا تھا۔ اس نے اقبال کو اپنے آفس میں بلایا۔ شادی کی تاریخ طے ہونے پر مبارک باد دی۔

"کیا تم یا تمہارے والد کہیں اور سے ضروری رقم کا انتظام نہیں کرسکتے۔" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" اقبال نے جواب دیا "والد صاحب میری بڑی بہن کی شادی کے موقع پر اپنے فنڈ سے رقم قرض لے چکے ہیں وہی ابھی مکمل طور پر ادا نہیں ہوا ہے۔ وہ مزید قرض کی درخواست دیں اور وہ منظور بھی ہوجائے۔ جو بظاہر بہت مشکل ہے تب بھی انہیں مطلوبہ رقم بہرحال نہیں مل سکتی۔ کسی اور ذریعے سے قرض ملنے کا بھی امکان نہیں ہے۔ میں نے بدرجہ مجبوری یہ درخواست دی ہے کہ اب اس کے سوا کوئی صورت ممکن نظر نہیں آئی۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" سجاد نے سر ہلایا "ابھی تم جاؤ۔ میں غور کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔"

"سر آپ اندازہ نہیں کرسکتے کہ اس وقت مجھے اس رقم کی کتنی ضرورت ہے۔" اقبال نے کہا "آپ یہ قرض منظور کرلیں تو میں اسے بڑا احسان سمجھوں گا۔ چاہے آپ میری نصف تنخواہ قرض کی مد میں کاٹ لیا کریں۔"

"نصف تنخواہ۔" سجاد ہلکی مسکراہٹ سے بولا "آدھی تنخواہ میں اور وہ بھی شادی ہونے کے بعد کیسے گزارا کرو گے۔"

"مجبوری آدمی سے سب کچھ کرالیتی ہے سر۔"

"میں نے کہا نا کہ میں غور کروں گا۔ ممکن ہے تمہاری درخواست منظور ہی کرلوں۔ فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے سکتا۔"

"پھر کب تک جواب کی امید رکھوں۔"

"دو چار دن تو لگ ہی جائیں گے۔" سجاد نے فائل بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

اقبال کچھ مایوس سا اس کے آفس سے نکلا۔ وہ سجاد کے طرزِ عمل سے کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ مگر ظاہر تھا کہ اس کے پاس انتظار کرنے کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا۔ البتہ نماز پڑھ کر وہ دعائیں ضرور کررہا تھا کہ پروردگار اس کی لغزش کو رسوا ہونے سے بچالے اور تمام رکاوٹیں اس کی رحمت سے اس طرح دور ہوتی چلی جائیں کہ ناہید کے ساتھ اس کی شادی مقررہ تاریخ کو بخیر و خوبی انجام پائے۔

تیسرے دن سجاد نے اقبال کو پھر اپنے آفس میں طلب کیا۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری درخواست منظور کرلی جائے۔" اس نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ سر۔" اقبال ایک دم خوش ہوگیا "آپ نے مجھے بہت بڑی پریشانی سے بچالیا۔ میں آپ کا۔۔"

"پہلے میری پوری بات سن لو۔" سجاد نے ہاتھ اٹھاکر اسے خاموش کرا دیا "یہ قرض تمہیں صرف اس شرط پر مل سکتا ہے کہ تم بھی میرے کچھ کام آؤ۔"

"میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔" اقبال نے بڑی مستعدی سے جواب دیا۔

"آج کل میں بھی ایک پریشانی میں مبتلا ہوں۔" سجاد نے بتایا "میں جانتا ہوں کہ میرے اندر کئی برائیاں ہیں۔ میں ان پر قابو پانے کی کوشش بھی کررہا ہوں۔ ایک بدمعاش اور جرائم پیشہ آدمی نے میری کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چند ایسے فوٹو اتار لیے کہ اگر وہ منظرِ عام پر آگئے تو میں اخلاقی طور پر بدنام ہی نہیں مالی اعتبار سے بھی دیوالیہ ہوجاؤں گا۔ وہ بدمعاش بہت دن سے مجھے بلیک میل کررہا ہے۔ تنگ آکر میں نے اس سے کہا کہ وہ ایک مرتبہ ہی جو کچھ چاہتا ہے مانگ لے اور وہ فوٹو نیز ان کے نیگیٹو مجھے واپس کردے۔ بڑی مشکل سے بالآخر وہ راضی ہوگیا کہ ایک خاص رقم اسے دے دی جائے تو وہ میرا پیچھا چھوڑ دے گا۔ وہ رقم آج سہ پہر تین بجے ایک خاص مکان پر ادا کی جانی ہے۔ میں وہاں خود نہیں جاسکتا۔ وہ بدمعاش پہلے میرا دوست تھا۔ اس کی دغابازی کے بعد اب مجھے اپنے کسی ساتھی پر اعتماد نہیں رہا ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم یہ کام انجام دو۔ میں ایک بند لفافہ میں مطلوبہ رقم کا چیک تمہارے حوالے کروں گا۔ اس مکان کا پتا بتادوں گا۔ تم تین بجے وہاں جاؤ گے اور اس مکان پر جو شخص بھی ملے اسے وہ لفافہ دے کر اس سے فوٹو اور نیگیٹو حاصل کرلو گے۔ دفتر واپس آؤ گے وہ چیزیں میرے حوالے کردو گے اور بس۔"

اقبال یہ سب کچھ سن کر حیران نہیں ہوا۔ دفتر میں سب لوگ سجاد کی شراب نوشی اور عیاشی سے کچھ نہ کچھ واقف تھے۔ اور یہ عین ممکن تھا کہ کوئی چالاک آدمی سجاد کی کسی کمزوری سے فائدہ اٹھا رہا ہو۔

"اس شخص کا نام کیا ہے اور میں اسے پہچانوں گا کیسے۔" اقبال نے سوال کیا۔

"تمہیں یہ سب کچھ جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کہا نا کہ اس مکان پر جو بھی ملے تم اسے لفافہ دے دینا۔ ویسے اس کا نام دلاور ہے۔"

کسی ایسی سرگرمی میں شامل ہونا اقبال کے لیے بھی خطرہ بن سکتا تھا۔ اسی خیال کے پیش نظر اس نے پوچھا۔

"بالفرض اس آدمی نے لفافہ لینے کے بعد بھی فوٹو اور نیگیٹو واپس نہیں کیے تب۔"

"میں اسی لیے کیش نہیں بیرر چیک دے رہا ہوں۔" سجاد نے جواب دیا "اگر اس نے دھوکا دیا تو میں پے منٹ رکوا دوں گا۔"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ مجھ پر الزام عائد کردے کہ اس نے تو فوٹو اور نیگیٹو مجھے دے دیے تھے مگر میں نے ہی آپ کو واپس نہیں کیے۔"

"میں احمق نہیں ہوں کہ اس کی کسی ایسی بات پر یقین کرلوں۔" سجاد نے کہا "تم گھبراؤ مت۔ تم دلاور کے لیے اجنبی ہو وہ تمہارے لیے اجنبی ہے۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ چیک کا لفافہ اس تک پہنچا دو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مطلوبہ چیزیں ضرور واپس کردے گا لیکن انکار بھی کردے تو تمہیں اس سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے، تم خاموشی سے واپس چلے آنا پھر خواہ میری پریشانی ختم ہو یا نہ ہو، کل تمہیں بیس ہزار بطور قرض حسنہ ضرور مل جائیں گے۔"

○☆○

اقبال دفتر سے ڈھائی بجے روانہ ہوگیا۔ سجاد نے لفافہ دینے کے علاوہ اسے ٹیکسی سے آنے جانے کے لیے صرف رقم بھی دی تھی۔ پتا جو اس نے بتایا تھا وہ شہر کی ایک ایسی پرانی آبادی میں واقع مکان کا تھا۔ جہاں تنگ و تاریک گلیاں، پرانی طرز کے چھوٹے چھوٹے مکانات۔ تنگ و گنجان بازار اب بھی ایک دو صدی پہلے کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ اقبال کو ٹیکسی مکان سے کافی دور چھوڑنا پڑی کہ تانگوں اور ٹھیلوں کے ہجوم میں اس کا اندر جانا ناممکن تھا دس پندرہ منٹ کی تلاش کے بعد آخر وہ مطلوبہ مکان تک پہنچ ہی گیا۔ دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں کے بعد ایک ایسے آدمی نے پٹ کھول کر جھانکا جس کے چہرے سے ہی اس کی مجرمانہ فطرت کی غمازی ہورہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے سجاد صاحب نے بھیجا ہے اور میں دلاور سے ملنا چاہتا ہوں۔" اقبال نے جواب دیا۔

"رقم لائے ہو۔"

"ہاں۔"

"تو اندر آجاؤ۔"

دروازے کا پٹ کھلا۔ اقبال نے اندر قدم رکھا اور دروازہ دوبارہ اندر سے بند کردیا گیا۔ چند لمحے بعد وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں صورت سے ہی خونخوار نظر آنے والے شخص کے سامنے کھڑا تھا۔ اس آدمی نے اقبال سے لفافہ لیا۔ اسے چاک کرکے چیک نکالا۔ اسے غور سے دیکھا۔

"چیک تو ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔

"تب پھر فوٹو اور ان کے نیگٹیو واپس کرو۔ مجھے جلد سے جلد دفتر واپس پہنچنا ہے۔" اقبال بولا۔

"اتنی جلدی نہیں۔" دلاور کے موٹے ہونٹوں پر خوفناک مسکراہٹ ابھری "سجاد خود کو بہت چالاک خیال کرتا ہے۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ میں تمہیں فوٹو اور نیگٹیو دے دوں اور سجاد کل بینک کو فون کرکے اس چیک کی ادائیگی نہ رکوا دے۔ نہیں میرے دوست تم آج کی رات ہمارے مہمان رہو گے۔ کل جب بینک سے چیک کیش ہوجائے گا تب میں تمہیں واپس جانے کی اجازت دوں گا۔ اطمینان رکھو تم خالی ہاتھ نہیں جاؤ گے جو وعدہ میں نے کیا ہے اسے میں بھی پورا کروں گا۔"

اور اس سے پہلے کہ اقبال کوئی احتجاج کرسکے اسی کمرے کو اس کا قید خانہ بنا دیا گیا۔

○☆○

شام کے سات بجے جبکہ اقبال کے گھر والے اس کے ابھی تک دفتر سے نہ آنے کے بارے میں قدرے فکرمند تھے (قدرے فکرمند اس لیے کہ وہ عموماً دفتر سے سیدھا گھر آتا تھا اور چھ بجے تک پہنچ جاتا تھا) تو ایک ٹیلی فون کال موصول ہوئی۔

"آپ کے بیٹے اقبال کو ہم نے اغوا کرلیا ہے۔ اب وہ ہمارے قبضے میں ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے اسے بہت آرام کے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ آپ لوگوں سے دوری کے علاوہ اسے اور کوئی تکلیف نہیں ہے۔ یہ اغوا ظاہر ہے کہ رقم کی وصولی کے لیے کیا گیا ہے۔ آپ کی مالی حیثیت بھی ہم جانتے ہیں۔ اس لیے ہمارا مطالبہ صرف پچیس ہزار ہے آپ اس رقم کا انتظام کریں۔ ہم دو دن کے بعد پھر فون کریں گے جس میں یہ بتایا جائے گا کہ آپ مطلوبہ رقم کس طرح ہم تک پہنچائیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ معاملہ صرف ہمارے اور آپ کے درمیان رہنا چاہیے۔ اگر پولیس تک بات گئی تو پھر آپ کو اقبال نہیں اس کی لاش ملے گی اور وہ بھی مختلف ٹکڑوں کی شکل میں۔"

اور پھر اس سے پہلے کہ اقبال کے والد جو یہ کال سن رہے تھے، کوئی بات کرتے یا پوچھتے دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔

○☆○

قدرتی بات تھی کہ اس خوفناک اطلاع سے پورے گھر میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ ثاقب کو مشورے کے لیے بلایا گیا۔ اس نے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد یہی مشورہ دیا کہ اس بات کی پبلسٹی کرنے یا پولیس میں رپورٹ کرنے سے کسی فائدے سے زیادہ نقصان کا اندیشہ ہے۔

"آپ رقم کی فکر نہ کریں۔ پچیس ہزار کوئی بڑی رقم نہیں ہے اس کا انتظام میں کردوں گا۔ وہ شخص دوسری بار فون کرے تو آپ ادائیگی کی حامی بھرلیں۔ خدا نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔"

"برا نہ ماننا ثاقب میاں۔" اقبال کے والد نے کہا "میں تم سے رقم نہیں لے سکتا۔ اگر تمہارا مشورہ یہی ہے کہ رقم ادا کردی جائے تو اس کا بندوبست میں کرلوں گا۔"

"مگر آپ یہ انتظام کیسے کرسکیں گے؟"

"اقبال نے اپنی کمپنی سے بیس یا پچیس ہزار قرض لینے کی درخواست کی تھی۔" اس کے والد نے بتایا "اور اس کا کہنا تھا کہ کمپنی کا مالک سجاد قرض دینے پر آمادہ معلوم ہوتا ہے۔ میں کل خود جاکر اس سے بات کروں گا۔"

"شاید آپ کے جانے سے بات نہ بنے۔" ثاقب نے کہا "فوزیہ اس کمپنی میں کام کرتی رہی ہے میں اس سے کہوں گا۔ وہ جاکر بات کرے گی تو زیادہ مناسب ہوگا۔"

"فوزیہ کی طرف میرا خیال نہیں گیا تھا۔" اقبال کے والد نے جواب دیا "تمہارا مشورہ درست ہے فوزیہ بات کرے تو کامیابی کی امید زیادہ ہے۔"

فوزیہ نے استعفا دیا تھا تو گھر والوں کو اس کی وجہ صرف یہ بتائی تھی کہ ثاقب اس کے ملازمت کرنے کو پسند نہیں کرتا اس لیے اس نے سروس چھوڑ دی ہے۔ اس لیے فطری طور پر ثاقب فوزیہ کے استعفے کے پس منظر سے واقف نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے میں اس سے کہہ دوں گا۔" اس نے جواب دیا "لیکن کمپنی سے قرض نہ مل سکے تب تو آپ کو میرے

تعاون سے انکار نہیں ہونا چاہیے آپ نے ایسا کیا تو اس سے مجھے افسوس ہوگا۔"

فوزیہ جانا نہیں چاہتی تھی مگر ثاقب کے کہنے اور ناہید کے مگیتر اقبال کی سلامتی کے لیے اسے کمپنی کے دفتر جانا ہی پڑا۔ اس نے سجاد سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو سجاد نے اسے فوراً ہی بلا لیا۔

"آج اقبال دفتر کیوں نہیں آیا۔" سجاد نے پوچھا۔

"ان کی کچھ طبیعت خراب ہے۔" فوزیہ نے جواب دیا۔ "شاید وہ دو چار دن تک نہ آسکیں۔"

"تم نے آنے کی زحمت کیسے کی؟"

"میں معلوم کرنے آئی ہوں کہ آپ نے اقبال کو جو رقم قرض دینے کا وعدہ کیا تھا وہ کب تک دے سکیں گے۔ ہمیں کچھ وجوہات کے باعث اس کی فوری ضرورت ہے۔"

"تم مجھ سے حقیقت چھپانے کی کوشش کررہی ہو۔"

"کیسی حقیقت؟" فوزیہ چونکی۔

"کیا یہ سچ نہیں کہ اقبال کو اغوا کرلیا گیا ہے۔"

"یہ بات آپ کو کیسے معلوم ہوئی!" فوزیہ حیران رہ گئی۔

"اس طرح کہ اغوا کرنے والوں نے مجھے بھی فون کیا تھا۔" سجاد نے جواب دیا "ان کا کہنا تھا کہ اگر مجھے اپنی کمپنی کا ایک اچھا کارکن واپس درکار ہے تو اقبال کے والدین کو رقم قرض دینے سے انکار نہ کروں۔"

"تب پھر آپ نے کیا جواب دیا۔"

"وہی جو اقبال کو دیا تھا۔" سجاد بولا "میں رقم دینے کے لیے تیار ہوں مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے قرض اپنی شادی کے سلسلے میں لینا چاہا تھا۔ اب اگر یہ رقم اغوا کرنے والوں کو دے دی گئی تب پھر شادی کے لیے رقم کہاں سے آئے گی؟"

"وہ بعد کا مسئلہ ہے۔ سردست ہمیں اقبال کو رہائی دلانا ہے۔ شادی ملتوی بھی کی جاسکتی ہے۔"

"تمہاری اصل پرابلم یہی ہے مس فوزیہ کہ تم یہ شادی ہوتی نہیں کرسکتیں۔" سجاد نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔" فوزیہ نے چونکتے ہوئے کہا۔

"تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ اقبال کو اچانک فوری شادی پر اتنا اصرار کیوں ہے؟"

"اس کا کہنا ہے کہ کمپنی کی ایک شاخ لاہور میں کھولی جارہی ہے۔ جس میں ہیڈ آفس سے بھی چند افراد ٹرانسفر کیے جائیں گے۔"

"آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" سجاد نے بات کاٹی "کمپنی کہیں کوئی برانچ نہیں کھول رہی ہے اور نہ ہی اقبال کو کہیں ٹرانسفر کیا جارہا ہے۔"

"تب پھر اس نے یہ غلط بیانی کیوں کی؟"

"اس لیے کہ اس کے اندر سچ کہنے کی ہمت نہیں تھی۔"

"کیسا سچ!"

"یہ کہ ناہید اور اقبال اپنے تعلقات میں بہت آگے نکل گئے تھے۔" سجاد نے جیسے مزہ لیتے ہوئے کہا "ناہید اقبال کے بچے کی ماں بننے والی ہے اور اگر ان دونوں کی شادی جلد سے جلد نہیں ہوگئی تو تم خود اندازہ لگا سکتی ہو کہ دونوں خاندانوں کی کس قدر رسوائی ہوگی۔"

"آپ بکواس کررہے ہیں۔" فوزیہ نے غصے سے کہا۔

"یہ اگر بکواس ہے تو تم خود ناہید سے اس کی تصدیق کرسکتی ہو یا کہو تو میں تمہیں اس اسپتال کا نام بتا دوں جہاں وہ چیک اپ کے لیے گئی تھی۔"

فوزیہ جیسے سکتے میں رہ گئی۔ سجاد محض بلف کے طور پر اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔

"میں اس آزمائش کی گھڑی میں تمہارے کام آسکتا ہوں۔" سجاد نے فوزیہ کو خاموش پاکر اپنی بات جاری رکھی "میں نہ صرف اغوا کرنے والوں کو رقم ادا کرنے کے لیے پچیس ہزار دے دوں گا بلکہ یہ شادی ضرور ہوجائے اس کے لیے بھی میں پچیس ہزار دینے پر آمادہ ہوں اور تم چاہو تو یہ رقم قرض بھی نہیں ہوگی۔"

"میں چاہوں تو سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

"یہ کہ اتنی بڑی رقم میں صرف ایک شرط پہ دے سکتا ہوں۔"

"اور وہ شرط کیا ہے؟"

"تم خود اندازہ نہیں لگا سکتیں۔"

"آپ اپنی زبان سے بتا دیں تو زیادہ اچھا ہے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" سجاد مسکرایا "میری صرف ایک ہی شرط ہے اور وہ یہ کہ تمہیں مجھ سے شادی کرنا پڑے گی۔"

فوزیہ ایک بار پھر خاموش ہوگئی۔

"آپ کو ناہید کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"ناہید نے اسپتال سے اقبال کو فون کیا تھا۔ اتفاق سے اس کے اور اقبال کے درمیان ہونے والی گفتگو میرے ٹیلی

فون آپریٹر نے سن لی اور اس نے مجھے بتادی۔ حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ تاکید اسے میں نے ہی کی تھی کہ دفتر میں جملہ اسٹاف کے نام آنے والی فون کالوں کی رپورٹ مجھے دیتا رہے۔ مجھے شبہ تھا اور اب بھی ہے کہ کوئی فرد دفتر کے حسابات میں گڑبڑ کررہا ہے۔"

"یہ گڑبڑ کوئی اور نہیں خود آپ کررہے ہیں۔" فوزیہ نے جواب دیا "اور اب رفتہ رفتہ آپ کی پوری سازش میری سمجھ میں آتی جارہی ہے۔"

"کیسی سازش؟"

"مجھے شبہ ہے کہ اقبال کے اغوا میں آپ کا ہاتھ ہے۔"

"تو پھر یہاں بیٹھی کیا کررہی ہو۔" سجاد نے طنز کیا "جاؤ اور پولیس میں میرے خلاف رپورٹ کردو۔"

"آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں ایسا نہیں کرسکتی۔" فوزیہ بڑی بے بسی سے بولی "نہ صرف یہ کہ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ اس تمام معاملے میں ایک ایسا پہلو بھی شامل ہے جس کا انکشاف میں گوارا نہیں کرسکتی۔"

"تب پھر کیا فیصلہ ہے۔"

"میں ناہید سے بات کرنے سے قبل کوئی جواب نہیں دے سکتی۔"

"ٹھیک ہے۔ تم اس سے مل کر تصدیق کرلو کہ میں نے سچ کہا ہے یا غلط۔" سجاد نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

○☆○

فوزیہ کمپنی کے دفتر سے سیدھی ثاقب کے گھر پہنچی۔ جیسے کہ اسے توقع تھی ناہید گھر میں اکیلی ہی ملی دوپہر کے اوقات میں اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کھانے سے فارغ ہوکر ثاقب کی والدہ پڑوس میں کہیں بلکہ زیادہ تر فوزیہ کے گھر چلی جاتی تھیں اور ثاقب ظاہر ہے کہ اپنے دفتر میں ہوتا تھا اور آج تو اقبال کے اغوا کی وجہ سے ناہید کی والدہ کا اس کے گھر ہونا اور بھی زیادہ متوقع تھا۔ فطری بات تھی کہ اقبال کے غائب ہونے سے ناہید کو دوہرا غم تھا۔ وہ اس وقت بھی آنسو بہا رہی تھی۔ فوزیہ کو دیکھ کر جلدی سے آنسو خشک کیے۔

"کہیے باجی کوئی انتظام ہوا۔" اس نے بے تابی سے پوچھا۔ گزشتہ شام ثاقب نے تمام باتیں اپنے گھر میں بھی بتا دی تھیں۔

"انتظام تو خدا نے چاہا ہو ہی جائے گا۔" فوزیہ نے کہا۔ "لیکن میں اس وقت تم سے ایک خاص بات پوچھنے آئی ہوں اور اس کا بالکل سچ سچ جواب چاہتی ہوں۔"

"پوچھیے۔" ناہید نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔ اسے شبہ ہوگیا تھا کہ فوزیہ کیا پوچھنے والی ہے۔

"کیا یہ سچ ہے کہ تم اور اقبال اپنے تعلقات میں حد سے آگے نکل گئے تھے۔" فوزیہ نے پوچھا۔

سوال سنتے ہی ناہید نے رونا شروع کردیا۔ اس کی یہ اشک ریزی ہی فوزیہ کی بات کا جواب تھی پھر بھی فوزیہ نے اسپتال جاکر چیک کرآنے تک کا اس سے اعتراف کرانا ضروری سمجھا۔

"تمہیں شاید کبھی بھی یہ اندازہ نہ ہو کہ تمہاری ایک جذباتی لغزش نے کیسے کیسے نتائج مرتب کیے ہیں۔" فوزیہ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "مگر تم گھبراؤ نہیں اب تمہاری عزت صرف تمہارے یا تمہارے خاندان کے لیے نہیں بلکہ ہمارے لیے بھی انتہائی اہمیت اختیار کرچکی ہے۔ میں اپنا سب کچھ قربان کرکے بھی تم دونوں کا مستقبل برباد نہیں ہونے دوں گی۔"

○☆○

پچاس ہزار کی رقم ثاقب سے بھی لی جاسکتی تھی لیکن اب اس معاملے میں اقبال کے والدین کی عزتِ نفس کے علاوہ سجاد جیسے شیطان کا دھڑکا بھی شامل ہوچکا تھا۔ فوزیہ کو اس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ اقبال کو کسی نہ کسی طرح سجاد نے ہی اغوا کرایا ہے۔ اگر اس کی پیشکش ٹھکرا کر کہیں اور سے رقم کا انتظام کیا گیا تو اس جیسے شیطان سے یہ بھی غیر متوقع نہیں تھا کہ وہ اقبال کو ختم کرادے اور یوں ایک عزیز زندگی سے ہاتھ دھونے کے علاوہ ناہید کی ذلت و رسوائی بھی برداشت کرنا پڑے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ حقیقت کا علم ہونے کے بعد فوزیہ کی والدہ کا ردِعمل اتنا شدید ہو کہ وہ فوزیہ اور ثاقب کا رشتہ بھی ختم کرادیں۔ گویا دونوں صورتوں کا انجام ثاقب سے جدائی پہ ہوتا نظر آرہا تھا۔ فوزیہ نے بہت سوچا بہت غور کیا اور بالآخر اس فیصلے پر پہنچی کہ اپنے جذبات کی قربانی دے کر وہ اقبال اور ناہید کو بچانے میں کامیاب ہوجائے تو یہ بھی بڑی کامیابی ہے۔

وہ دوسرے دن پھر سجاد کے آفس میں اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔

"مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔" اس نے سنجیدہ اور مضبوط لہجے میں کہا "لیکن اب میں مزید کسی سازش یا کسی فریب کا شکار ہونا نہیں چاہتی۔ میں تم سے شادی کا پختہ وعدہ کرتی ہوں مگر یہ شادی ناہید اور اقبال کی شادی کے بعد ہوگی۔"

"اور اگر اقبال کی شادی کے بعد تم اپنے وعدے سے پھر گئیں تب؟"

"میرا وعدہ ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔"

"صرف الفاظ سے میرا اطمینان نہیں ہوگا۔"

"پھر کیا چاہتے ہو؟"

"کوئی گارنٹی۔"

"کیسی گارنٹی؟"

"تمہیں میرے نام ایک خط لکھنا ہوگا۔" سجاد نے کہا۔ "جس میں تم تحریر کروگی کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ اس لیے میری شادی کی پیشکش منظور کرتی ہو اور وعدہ کرتی ہو کہ جلد سے جلد ثاقب سے منگنی توڑ کر اس سے شادی کرنے سے انکار کردوگی۔"

فوزیہ نے اندازہ کرلیا تھا کہ سجاد کی سازش اور حالات کی ستم ظریفی اتنی مکمل ہے کہ اگر اس نے اپنا خیال کیا تو اقبال و ناہید کی زندگی برباد ہوجائے گی اور جو ذلت و رسوائی ہوگی وہ علیحدہ۔ ان دونوں کو تباہی سے بچانے کے لیے اسے اپنی قربانی دینا ہی ہوگی۔ چنانچہ اس نے وہ سب کچھ لکھ دیا جو سجاد چاہتا تھا۔

"اب تم اطمینان سے گھر واپس جاؤ۔" سجاد نے خط تہ کرکے اپنی میز کی دراز میں رکھتے ہوئے کہا "اور اقبال کے والد سے کہہ دو کہ اب اگر اغوا کرنے والے کا فون آئے تو وہ اسے مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی تاکید کریں اور یقین دلائیں کہ میں رقم ادا کرنے کے لیے تیار ہوں پھر اغوا کرنے والے جس طرح جس وقت اور جس انداز میں رقم کی ادائیگی چاہیں گے میں ادا کردوں گا۔ میری پوری کوشش ہوگی کہ اقبال صحیح سلامت گھر پہنچ جائے۔"

○☆○

سجاد نہیں چاہتا تھا کہ اقبال کو ذرا بھی شک ہوسکے کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا اس میں کسی بھی طرح سجاد کا ہاتھ ہے۔ اس کی ہدایت پر اس کے ساتھیوں نے اقبال کے والد کو دوبارہ فون کیا۔ اقبال کے والد نے بولنے والے سے وہی سب کچھ کہہ دیا۔ جو فوزیہ نے انہیں بتایا تھا۔ سہ پہر کو سجاد پرانے شہر کے اس مکان میں پہنچ گیا جہاں اقبال کو زیرِ حراست رکھا گیا تھا۔ سجاد پہنچا تو اسے سامنے لایا گیا اس وقت اس کے ہاتھ بھی بندھے ہوئے تھے۔

"تم نے سراسر معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے دلاور۔" سجاد نے جیسے بڑے غصے سے کہا "میں نے تمہیں چیک بھجوا دیا تھا اس کے بعد تمہیں میرے آدمی کو اپنی قید میں رکھنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" دلاور بولا "لیکن میں ہمیشہ سے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا عادی ہوں اس لیے میں نے سوچا۔"

"کہ اقبال کو قید کرکے اس کے گھر والوں پر یہ ظاہر کرو گے کہ جیسے تم نے اسے اغوا کرلیا ہے۔" سجاد نے درمیان سے اس کی بات اچک لی "اور پھر اس کی رہائی کے لیے مزید رقم وصول کرسکو گے۔"

"کیوں نہیں۔ مفت ہاتھ آئی دولت کسے بری لگتی ہے۔"

"خیر تم نے جو چاہا تھا وہ ہوگیا۔" سجاد نے کہا "میں تمہیں پچیس ہزار نقد ادا کرچکا ہوں اب اقبال کو چھوڑ دو اور میری چیزیں بھی میرے حوالے کردو۔"

"ضرور۔ جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔" دلاور نے جواب دیا اور ایک بڑا سا لفافہ سجاد کی طرف بڑھا دیا "اس میں یہ تمام فوٹو اور ان کے نیگیٹو موجود ہیں۔ اقبال کو بھی تم اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو مگر یاد رکھنا کہ کسی بھی طرف سے پولیس تک بات نہ پہنچے ورنہ تم مجھے جانتے ہو۔ اپنی سلامتی کے لیے مجھے تمہیں یا کسی کو بھی قتل کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوگا' دس خون پہلے ہی کرچکا ہوں۔ مزید دو چار سے کوئی

بے نظیر و بے مثال عطر، صد بہار

صدیوں پر محیط اطباء کے تجربات اور جدید سائنسی تحقیق نے ثابت کردیا ہے خوشبو کی ایک لہر تھکے ہوئے انسانی ذہن کیلئے اکسیر ہے صد بہار عطر جسکی دلفریب خوشبو انتہائی فرحت بخش اور روح پرور ہے یہ بے مثال خوشبو مقوی دل و دماغ ہے بے خوابی دور کرکے نیند لاتی ہے ضعف بصارت جنون مالیخولیا اختلاج قلب خون کی گرمی بلڈ پریشر فالج لقوہ مرگی رعشہ تشنج بدہضمی قے اسہال میں مفید ہے ورم جگر و معدہ اور کن پیڑوں MUMPS میں سونگھنا اور لگانا مفید ہے۔

صد بہار عطر قیمت فی پیکنگ 400 روپے محصول ڈاک 50 روپے گھر بیٹھے ایک خط لکھ کر وی پی پارسل طلب فرمائیں یا E-Mail کریں۔

دوکاندار حضرات ہول سیل نرخ پر ہر قسم کی خوشبوعات ٹوپی تسبیح رومال جا نماز سرمہ نگینے شیشے منگوانے کیلئے لکھیں۔

fairy.perfumers@hotmail.com

fp فیئری پرفیومرس پوسٹ بکس نمبر 2209 کراچی 74600

فرق نہیں پڑے گا۔"

اقبال کے ہاتھ کھول دیے گئے۔ سجاد نے لفافہ اپنے بریف کیس میں رکھ لیا اور اقبال کو ساتھ لے کر مکان سے باہر نکل آیا۔ کچھ فاصلے پر اس کی کار کھڑی تھی۔ دونوں کار میں بیٹھ گئے۔

"دلاور نے تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک تو نہیں کیا۔" سجاد نے پوچھا۔

"نہیں۔ سوائے کمرے میں بند کرنے کے اس نے اور کوئی تکلیف نہیں دی۔" اقبال نے جواب دیا "مگر یہ پچیس ہزار کی بات کیا تھی کیا واقعی اس نے میرے گھر فون کیا تھا کہ اس نے مجھے اغوا کرلیا ہے۔"

"ہاں۔ جیسا کہ اس نے خود بتایا وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا پسند کرتا ہے۔" سجاد نے جواب دیا۔

اور اسے پوری تفصیل سے سارے حالات بتادیے۔

"اس کا مطلب ہے کہ میری رہائی کے لیے پچیس ہزار کی رقم آپ نے ادا کی ہے۔"

"پھر کیا ہوا۔ تم میرے اسٹاف کے ایک محنتی، قابل اور ایمان دار آدمی ہو۔" سجاد نے کہا "مزید یہ کہ تم اس مصیبت میں میری وجہ سے ہی پھنسے تھے۔ تمہیں آزاد کرانا میرا فرض تھا۔ اتنا ہی نہیں، میں نے تمہاری شادی کے لیے بیس ہزار کے قرضے کی درخواست بھی منظور کرلی ہے۔"

"آپ سچ مچ بہت اچھے انسان ہیں۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔"

"احسان کی کوئی بات نہیں بلکہ سچ پوچھو تو تمہاری مدد سے میں خود ایک بڑی پریشانی سے بچ نکلا ہوں۔ اس لیے احسان وغیرہ کی بات مت سوچو۔ ہم نے صرف ایک دوسرے کی مدد کی ہے لیکن تمہیں میری تھوڑی سی مدد اور کرنا ہوگی۔"

"میں ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔"

"میں نہیں چاہتا کہ کسی کو بھی یہ بات معلوم ہوسکے کہ دلاور مجھے بلیک میل کررہا تھا اور میں نے تمہیں اس کے پاس بھیجا تھا۔" سجاد نے کہا "اس بات کو راز رکھنے کے لیے تمہیں اپنے گھر والوں سے اور سب سے یہی کہنا ہوگا کہ تم دفتر سے گھر جانے کے لیے باہر نکل رہے تھے کہ دلاور اور اس کے تین چار آدمیوں نے تمہیں زبردستی پکڑ کر ریوالور کے بل پر ایک ٹیکسی میں بٹھایا اور اغوا کرکے لے گئے۔ راستے میں انہوں نے تمہاری آنکھوں پر پٹی بھی باندھ دی تھی اس لیے تم کچھ نہیں بتاسکتے کہ وہ تمہیں کہاں لے گئے تھے۔ اسی طرح تمہیں رہا کرتے وقت بھی اس نے تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھی اور تمہیں دفتر کے قریب اسی جگہ چھوڑ گیا جہاں سے اس نے تمہیں اغوا کیا تھا۔"

"آپ اطمینان رکھیں جیسا آپ چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔" اقبال نے جواب دیا۔

○☆○

اقبال اور ناہید کی شادی بخیر و خوبی ہوگئی۔ اقبال نے شادی اور ولیمے کا دعوت نامہ سجاد کو بھی دیا تھا مگر وہ دونوں تقاریب میں شامل نہیں ہوا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت خراب ہے اور تین چار دن سے اسپتال میں داخل ہے۔ شادی کے سلسلے میں اقبال نے دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی لی تھی۔ رخصت ختم ہونے پر جب وہ دفتر پہنچا تو سجاد نے اسے شادی کی مبارک باد دی۔ اپنے شریک نہ ہوسکنے پر معذرت چاہی اور اقبال کے پوچھنے پر بتایا کہ اچانک ہی اس کے گردے میں شدید درد اٹھا تھا جس کے باعث اسے چار پانچ دن اسپتال میں رہنا پڑا۔

دوسری طرف فوزیہ نے ایک دن ثاقب سے اس کے دفتر میں ملاقات کی اور اسے بتایا کہ چند وجوہات سے جن کی تفصیل وہ بتانا نہیں چاہتی وہ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ثاقب سے شادی کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ منگنی توڑ دی جائے۔ فطری طور پر فوزیہ کے اس اچانک فیصلے سے ثاقب کو بہت صدمہ ہوا۔ اس نے ہر چند کرید کرید کر فوزیہ سے اس فیصلے کی وجہ معلوم کرنا چاہی مگر فوزیہ نے اس کے ہر سوال کا جواب کم و بیش یہی دیا کہ وہ اپنے ذاتی معاملات کو کسی دوسرے کے علم میں لانا نہیں چاہتی۔ ثاقب یہی سمجھ لے کہ تقدیر کو ان دونوں کی رفاقت منظور نہیں تھی۔

اس گفتگو کے فوراً بعد سجاد نے اپنی ماں کے ذریعے فوزیہ سے شادی کا پیام دے دیا۔ جب اس رشتے کی خبر ثاقب تک پہنچی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ فوزیہ نے اپنی ماں کو مجبور کردیا ہے کہ وہ سجاد کا پیام قبول کرلیں تو قدرتی طور پر اسے یہ خیال آیا کہ فوزیہ نے سجاد کی دولت کی خاطر اسے ٹھکرا دیا ہے۔ اس نے ملازمت بھی اس لیے نہیں چھوڑی تھی کہ ثاقب اس کی ملازمت پسند نہیں کرتا تھا بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس کے اور سجاد کے درمیان شادی کی بات ہوچکی تھی۔ یہ طے کرلیا گیا تھا کہ سجاد شادی کا پیام دے گا چنانچہ دنیا کو یہ کہنے کا موقع نہ دینے کے لیے کہ ملازمت کے دوران میں ان دونوں کے درمیان کسی قسم کے تعلقات قائم

ہوچکے تھے اس نے سروس میں چھوڑ دی۔ اس بظاہر بے وفائی پر ثاقب کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے فوزیہ کو فون کرکے برا بھلا بھی کہا۔

"یہ بات اب میری سمجھ میں آئی ہے کہ تم نے منگنی کیوں توڑی تھی۔" اس نے کہا "دراصل تم بھی عام لڑکیوں کی طرح زیادہ سے زیادہ دولت اور شان و شوکت پر جان دیتی ہو۔ تم نے مجھے صرف اس لیے ٹھکرا دیا کہ میں سجاد کے مقابلے میں زیادہ دولت مند نہیں ہوں۔ تم نے مجھے اپنی محبت کا فریب دیا۔ میرے ساتھ بے وفائی کی۔"

"اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو یونہی سہی۔" فوزیہ نے انتہائی ضبط کے ساتھ سپاٹ لہجے میں جواب دیا "ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مستقبل کی زیادہ سے زیادہ بہتری کے لیے جو مناسب سمجھے کرے۔ آپ نے اب تو مجھے فون کردیا مگر میں درخواست کرتی ہوں کہ آئندہ کسی بھی طرح مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہ کریں۔ خدا حافظ!"

اور اس کے ساتھ ہی ریسیور خاموش ہوگیا۔

○☆○

ایک مہینے کے اندر سجاد اور فوزیہ کی شادی ہوگئی۔ فوزیہ کے اصرار پر اس تقریب کو بے حد سادہ اور صرف عزیز و اقارب کی حد تک رکھا گیا تھا لیکن سجاد اپنی کامیابی پر اس قدر خوش تھا بلکہ جذبات میں جامہ سے باہر ہوا جارہا تھا کہ اس نے رخصتی کے بعد اپنے بنگلے پر دوستوں کے ساتھ شراب نوشی کی محفل جمائی جہاں رات کے ایک بجے تک جام پر جام چڑھائے گئے اور جب تقریباً ایک بج کر پندرہ منٹ پر اس کے دوست رخصت ہوئے تو سجاد کی مدہوشی کا یہ عالم تھا کہ اس سے سیدھا کھڑا بھی نہیں ہوا جارہا تھا۔ جملہ عروسی پہلی منزل پر سجایا گیا تھا۔ اس نے زینے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو پشت کے عقبی حصے سے درد کی ایک تیز لہر اٹھی۔ سجاد نے وہیں ٹھہر کر درد کے ختم ہونے کا انتظار کیا کچھ کمی محسوس ہوئی تو وہ تین چار سیڑھیاں اور چڑھ گیا۔ گرنے سے بچنے کے لیے اس نے زینے کے جنگلے کا سہارا لے رکھا تھا۔ ایک دم سے درد کی دوسری لہر اٹھی اور وہ اتنی شدید تھی کہ ضبط کرنے میں ناکام رہ کر سجاد کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اس نے کمر پر درد کی جگہ ہاتھ رکھنا چاہا تو توازن بگڑ گیا اور وہ ساتویں سیڑھی سے گر کر لڑھکتا ہوا فرش پر آگیا۔

چیخ سن کر سجاد کی ماں اور گھر کے ملازم ہی نہیں فوزیہ بھی اپنے عروسی لباس اور نئی دلہن ہونے کی پروا نہ کرتے ہوئے بھاگی چلی آئی۔ سجاد درد سے مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس

ہم اور کھیل

پانچویں جماعت میں سالانہ اسپورٹس کی دوڑ میں ہمارا اکیسواں نمبر آیا تھا۔ دوڑ میں اتنے ہی لڑکے شریک ہوئے تھے۔ کچھ فٹ بال سے بھی سر مارا۔ آخری لمحے تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ اس فٹ بال پر اپنا دایاں پاؤں ماریں یا بایاں زیادہ مناسب رہے گا۔ دودھ کے دانت ٹوٹنے سے پہلے ہی ہم خاصے دبیز شیشے کی عینک لگانے لگے تھے۔ جو حضرات ضعف بصارت سے محروم ہوں، ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اب ہم کبھی عینک اتار کر آئینہ دیکھتے ہیں تو یہ خدا اپنے کان نظر نہیں آتے۔ کئی دفعہ عینک توڑنے کے بعد اب ہم نے اسے اتار دیا اور بے خطر کھیلنے لگے۔ کھیلتے کیا تھے، ہر ایک سے مینڈھے کی طرح ٹکریں لیتے پھرتے تھے۔ مخالف ٹیم میں پاپولر ہمیشہ اس لیے رہے کہ اپنی ہی ٹیم سے گیند چھیننے اور انہی کو فاؤل مارتے پھرتے تھے۔ کھیل کے شروع میں ٹاس کیا جاتا جو کپتان ہار جاتا، وہ ہمیں اپنی ٹیم میں شامل کرنے کا پابند ہوتا۔

اقتباس از: مشتاق احمد یوسفی کی کتاب زرگزشت۔
مطالعہ: شرف الدین جیلانی، ٹنڈوالہ یار

کی ماں نے فوراً ڈاکٹر شفیق کو فون کیا جو اس پرائیویٹ اسپتال کے انچارج تھے جہاں گزشتہ ماہ سجاد کا علاج ہوا تھا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ڈاکٹر شفیق رات کی ڈیوٹی ہونے کی وجہ سے موجود تھے۔ سجاد کی کیفیت سن کر وہ خود پندرہ منٹ میں ایمبولینس لے کر پہنچ گئے۔ اتنی دیر میں فوزیہ نے اپنا عروسی جوڑا اتار کر سادہ لباس پہن لیا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہی اسپتال روانہ ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب نے آتے ہی ایک انجکشن دے دیا تھا جس سے درد میں بھی کمی ہوئی اور سجاد جو کہ پہلے ہی شراب کے نشے میں دھت تھا، سوگیا۔ اسپتال پہنچ کر ڈاکٹر شفیق نے دو تین ٹیسٹ کیے۔ ایکسرے لیے۔ مزید ایک انجکشن دیا اور پھر اسے پرائیویٹ وارڈ میں داخل کرلیا۔

"اب آپ واپس جاسکتی ہیں۔" ڈاکٹر شفیق نے فوزیہ سے کہا "کوئی فوری خطرہ درپیش نہیں ہے۔ سجاد صبح تک آرام سے سوتا رہے گا۔"

"مگر انہیں مرض کیا ہے یہ ڈاکٹر صاحب!" فوزیہ نے سوال کیا۔

"کیا آپ نہیں جانتیں۔"

"جی نہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہماری آج ہی شادی ہوئی ہے۔ شادی سے پہلے میں ان کے دفتر میں کام کرچکی ہوں مگر اس موضوع پر کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔"

فوزیہ نے جواب دیا۔

"کثرت شراب نوشی نے اس کے جگر کو بھی خراب کیا ہے اور گردوں کو بھی۔" ڈاکٹر شفیق نے بتایا "خاص طور پر ایک گردہ تو بالکل بیکار ہوچکا ہے۔ پچھلے مہینے جب وہ میرے زیر علاج تھا تب میں نے اسے واضح طور پر بتادیا تھا کہ اسے اپنی زندگی عزیز ہے تو شراب بالکل چھوڑنا پڑے گی۔ اس نے وعدہ بھی کیا تھا لیکن مجھے امید نہیں کہ اس پر عمل بھی کیا ہوگا۔ خاص طور پر آج رات اس نے اتنی شراب پی رکھی ہے کہ بلڈ ٹیسٹ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی رگوں میں خون نہیں شراب دوڑ رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا جو ہوا۔"

"ان کی زندگی کو تو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔" فوزیہ نے پوچھا۔

"یہ میں کل، آج لیے گئے ٹیسٹوں کی رپورٹ آنے پر بتاسکوں گا۔"

"میں رات کو یہیں رک جاؤں تو آپ کو اعتراض تو نہیں۔"

"مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے لیکن اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یوں آپ کی مرضی۔ پرائیویٹ وارڈ میں مریض کے ساتھ رہا جاسکتا ہے۔"

فوزیہ نے اسپتال سے ہی سجاد کی والدہ کو فون کرکے اطمینان دلایا کہ اب حالت بہتر ہے اور وہ آرام سے سو رہے ہیں۔ نیز اس نے یہیں رکنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اول تو خدانخواستہ کوئی اندیشے کی بات نہیں لیکن ضرورت ہوئی تو وہ انہیں فون کردے گی۔

رات تو عافیت سے گزر گئی۔ دوسرے دن ٹیسٹوں کی رپورٹیں دیکھنے کے بعد ڈاکٹر شفیق نے مزید کچھ ٹیسٹ کیے۔ ایکسرے بھی دوبارہ لیے گئے۔ شام کو انہوں نے فوزیہ اور سجاد کی والدہ کو۔ جو صبح ہوتے ہی اسپتال آگئی تھیں۔ بڑے فکرمند لہجے میں بتایا کہ جیسا کہ انہیں پچھلی مرتبہ ہی اندیشہ ہوگیا تھا۔ سجاد کے ایک گردے نے کام کرنا تقریباً بند کردیا ہے۔ دوسرا گردہ بھی بری طرح متاثر ہے اور کسی بھی وقت بیکار ہوسکتا ہے۔ ایسی صورت میں فوری طور پر کم سے کم ایک گردہ تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ اخبار میں گردے کے حصول کے لیے اشتہار دے دیں فوزیہ نے اپنا ایک گردہ دینے کی پیشکش کی۔ اس کے بلڈ وغیرہ کا ٹیسٹ لیا گیا مگر معلوم ہوا کہ اس کا گردہ سجاد کے کام نہیں آسکتا۔

چنانچہ دوسرے دن اخبار میں اشتہار دے دیا گیا۔ گردے کے عوض معقول رقم دینے کا اعلان بھی کیا گیا تھا مگر اس کے باوجود تین چار دن تک کسی فرد کی جانب سے کوئی پیشکش نہیں کی گئی۔ اس دوران میں سجاد کی حالت روز بروز خراب ہوتی جارہی تھی۔ اسے محسوس ہورہا تھا کہ وہ لمحہ بہ لمحہ موت کے قریب تر ہوتا جارہا ہے اور جب آدمی زندگی سے مایوس ہوجائے تب ہی وہ لمحہ آتا ہے جب وہ اپنی گزری ہوئی زندگی پر نظرثانی کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ سجاد کو بھی اپنی گناہگار زندگی کے ایک ایک پل پر شدت سے ندامت اور شرمندگی کا احساس ہورہا تھا۔ ہرچند اس کی بیماری کی اصل وجہ کثرت شراب نوشی تھی مگر اس کے دل میں یہ خیال جم گیا تھا کہ اس نے فوزیہ کو حاصل کرنے کے لیے اقبال ناہید ثاقب اور خود فوزیہ پر جو ظلم کیا ہے یہ اسے اسی ظلم کی سزا مل رہی ہے۔

دوسرے اشتہار کے جواب میں ایک ضرورت مند نے رابطہ قائم کیا۔ ضروری معائنہ اور ٹیسٹوں کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اس کا گردہ کام آسکتا ہے چنانچہ آپریشن کا فیصلہ کرلیا گیا۔ سجاد کو بھی اس بارے میں بتادیا گیا۔ اگلے دن صبح گیارہ بجے آپریشن تھا۔ سجاد نے خواہش ظاہر کی کہ وہ فوزیہ اور ثاقب سے تنہائی میں ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ ثاقب سے فون پر رابطہ قائم کیا گیا۔ اسے بھی سجاد کی بیماری کی خبر ہوچکی تھی لیکن جملہ حالات کا علم نہیں تھا۔ سجاد کی والدہ نے اسے فون پر پوری کیفیت بتائی اور کہا کہ سجاد صرف اسی صورت میں آپریشن کرانے پر تیار ہوا ہے کہ اسے آپریشن سے پہلے ثاقب اور فوزیہ سے تنہائی میں ملاقات کا موقع دیا جائے۔ ثاقب نے سب کچھ سننے کے بعد وعدہ کیا کہ وہ صبح نو بجے اسپتال پہنچ جائے گا۔

○☆○

کمرے سے نرس تک کو باہر نکالنے کے بعد سجاد نے ایک افسردہ مسکراہٹ سے اپنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ثاقب اور فوزیہ کی طرف دیکھا۔

"مجھے یقین ہے کہ میں آپریشن سے بچ نہیں سکوں گا۔" اس نے آہستہ مگر مضبوط لہجے میں کہا "میں بہت گناہگار آدمی ہوں۔ اپنی تیس سالہ زندگی میں اتنے گناہ کرچکا ہوں جتنے کوئی سو سال کی عمر میں بھی شاید ہی کرتا ہوں لیکن جس گناہ کا بوجھ سب سے زیادہ اپنے سینے پر محسوس کررہا ہوں، اس کا تعلق آپ دونوں کی ذات سے ہے۔"

"غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں۔" فوزیہ نے نرمی سے کہا "آپ بلاوجہ پریشان نہ ہوں۔ خدا نے چاہا تو آپریشن ضرور کامیاب ہوگا۔ یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں۔ پہلے آپ صحت یاب ہوجائیں پھر جو کہنا چاہیں کہہ دیں۔"

"مجھے مت روکو فوزیہ۔" سجاد نے کہا "جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں مجھے کہنے دو۔ میں جانتا ہوں کہ زندگی نے مجھے مہلت دے دی تب بھی میں دوبارہ اپنے اندر اعترافِ گناہ کا حوصلہ پیدا نہیں کرسکوں گا۔"

اس نے ثاقب کی طرف دیکھا۔

"میں آپ کا اور فوزیہ کا مجرم ہوں۔ فوزیہ میری کمپنی میں کام کرتی تھی۔ میں نے اسے بھی دوسری لڑکیوں کی طرح حاصل کرنا چاہا مگر فوزیہ نے میرے منہ پر تھپڑ رسید کرکے ملازمت سے استعفا دے دیا۔ میں ایسی شکست کا عادی نہیں تھا۔ میں نے اس سے انتقام لینے کا فیصلہ کرلیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ فوزیہ کی شادی آپ سے ہونے والی ہے اور یہ کہ آپ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ مجھے یہ بھی پتا چلا کہ آپ کی بہن ناہید کی شادی اقبال سے ہونے والی ہے۔ اقبال بھی میرے دفتر میں ملازم تھا۔ میں نے فوزیہ سے انتقام لینے کے لیے اسے اپنا ذریعہ بنایا۔ اپنے ساتھیوں کی مدد سے اسے اغوا کرلیا۔ تاوان کی رقم اس قدر کم رکھی کہ اقبال کے والد فطری طور پر کمپنی سے قرض لینے کے بارے میں سوچیں خاص طور سے اس لیے بھی کہ اقبال نے شادی کے سلسلے میں قرض کی درخواست دے رکھی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ قرض کی رقم کے سلسلے میں بات کرنے کے لیے فوزیہ کو میرے پاس بھیجا جائے گا۔ یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ نہ بھی ہوتا تب بھی میں فوزیہ کو فون کرکے اس مسئلے پر بات کرنے کے لیے اپنے آفس بلالیتا۔ آپ کے اور آپ کے واسطے سے ناہید کے مستقبل کو بچانے کے لیے اس کا اقبال [illegible] کے معاملے سے دلچسپی لینا لازمی تھا۔ بہرحال فوزیہ میرے پاس آئی اور میں نے اس پر واضح کردیا کہ اقبال کا اغوا یا رہائی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ نہ ہی پچیس ہزار کی رقم کی کوئی اہمیت ہے۔ اقبال میرے ایک فون کرنے پر ایک گھنٹے کے اندر صحیح سلامت گھر واپس پہنچ سکتا ہے لیکن اس کی واپسی کی پہلی اور آخری شرط ہے کہ فوزیہ مجھ سے شادی کرلے۔ دوسری صورت میں اقبال کو ختم کردیا جائے گا اور فوزیہ اقبال اور ناہید کی خاطر اپنی محبت قربان کرنے پر آمادہ ہوگئی۔ باقی حالات آپ جانتے ہی ہیں۔ اقبال اور ناہید کی شادی ہوگئی۔ فوزیہ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور مجھ سے شادی کرلی مگر تقدیر کوئی اور ہی فیصلہ کرچکی تھی۔ میں فوزیہ سے شادی کرنے کے باوجود اسے نہیں پاسکا۔ شادی کی رات ہی سے میری طبیعت خراب ہوگئی۔ چنانچہ فوزیہ اب بھی اسی طرح پاکیزہ ہے جیسی شادی سے پہلے تھی۔ موت کو اتنے قریب پاکر مجھے اپنے ظلم کا احساس ہوچکا ہے۔ اب میں اس کا تدارک کرنا چاہتا ہوں اور آپ کی موجودگی میں اسے اپنے نکاح سے آزاد کرتا ہوں۔ میں مرجاؤں یا بچ جاؤں فوزیہ آپ کی امانت ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ اسے اپنانے سے گریز نہیں کریں گے۔

منگنی توڑنے اور شادی سے انکار کرنے پر فوزیہ کے خلاف آپ کے دل میں جو بھی خیالات پیدا ہوئے ہوں، اب آپ کو معلوم ہوچکا ہے کہ اصل حقیقت کیا تھی۔ ہرچند میں اس قابل تو نہیں مگر مجھے آپ کی اور فوزیہ کی اعلیٰ ظرفی سے امید ہے کہ مجھے معاف کردیں گے۔ بس مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔"

اتنی طویل گفتگو سے سجاد انتہائی نقاہت کے سبب نیم بے ہوش سا ہوکر خاموش ہوگیا۔ فوزیہ اور ثاقب کے جو تاثرات تھے ان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جہاں ثاقب اپنی غلط فہمی پر شرمندہ تھا وہیں فوزیہ کے دل میں موت و زندگی کے درمیان لٹکتے ہوئے سجاد کے لیے رحم اور ہمدردی کے بے پایاں جذبات پیدا ہوچکے تھے۔ سجاد نے اپنی بات اس طرح بیان کی تھی کہ اقبال اور ناہید کی لغزش کو بالکل ہی چھپایا گیا تھا اور بسترِ مرگ پر لیٹے ہوئے سجاد کی یہ نیکی فوزیہ کے خیال

اطمینان

ایک دیہاتی شہر سے پیسے کما کر گھر جارہا تھا۔ اس کی ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ انہوں نے پوچھا۔

"کیوں بھئی، گاؤں واپس جارہے ہو؟ کتنے پیسے جمع کیے؟"

"پانچ سو روپے۔"

"ان کا کیا کروگے؟"

"تھری ناٹ تھری کی رائفل خریدوں گا۔"

"لیکن وہ تو بہت مہنگی ہے۔ اتنے پیسوں میں نہیں آئے گی۔"

"کوئی بات نہیں، باقی رقم بیوی بیچ کر حاصل کرلوں گا۔"

"بہت افسوس کی بات ہے، بیوی کو فروخت کردینا اچھی بات تو نہیں۔"

"بس مجھے رائفل خرید لینے دو۔ جونہی رائفل مل گئی، اپنی بیوی واپس لے لوں گا۔" دیہاتی نے اطمینان سے جواب دیا۔

(افتخار احمد... کھلاپور)

میں اتنی پُر خلوص اور پاکیزہ تھی کہ اس نے دل ہی دل میں بے ساختہ دعا کی کہ پروردگار اس نیکی کے صلے میں سجاد کے تمام گناہ معاف کردے۔

○☆○

ایک گھنٹے کے بعد سجاد کو آپریشن روم میں لے جایا گیا۔ گردہ دینے والے شخص کا آپریشن کرکے گردہ پہلے ہی حاصل کرلیا گیا تھا۔ وہ شخص آپریشن کے بعد ہر اعتبار سے ٹھیک تھا۔ اسے مقررہ معاوضہ ادا کردیا گیا تھا اور وہ تقریباً دس دن اسپتال میں زیر علاج و نگرانی رکھنے کے بعد صحت یاب ہونے پر اسپتال سے رخصت کیا گیا تھا۔

آپریشن کئی گھنٹے جاری رہا۔ گردے کی پیوند کاری کامیابی سے کردی گئی۔ آپریشن کے بعد دو دن سجاد نے خیر و عافیت سے گزار لیے مگر تیسرے دن اچانک اس کی حالت بگڑ گئی۔ اس کے دوسرے گردے نے اچانک کام کرنا بند کردیا۔ جس کے نتیجے میں لگائے گئے گردے کا فعل بھی متاثر ہوا اور ڈاکٹروں کی تمام تر کوشش کے باوجود سجاد کو بچایا نہیں جاسکا۔ اسپتال میں داخل ہونے کے پانچویں روز وہ اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

غالباً سجاد نے آپریشن کے بعد اپنی ماں کو بھی تمام حالات بتادیے تھے کہ اس کی ماں نے تدفین کے فوراً بعد ہی فوزیہ کو اس کے گھر واپس بھیج دیا۔ رخصت کرتے ہوئے انہوں نے صرف اتنا کہا۔

"میرے بیٹے نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی۔ وہ اپنے انجام کو بھی پہنچ گیا پھر بھی ہوسکے تو تم اور ثاقب اسے معاف کردینا۔"

یوں تو فوزیہ سجاد کی بیوہ نہیں تھی کیونکہ اس نے اس سے قبل طلاق دے دی تھی لیکن ان تمام واقعات اور المناک موت نے فوزیہ کو بے حد متاثر کیا تھا۔ دنیا سے حالات چھپانے کے لیے ہی نہیں خود اپنے جذبات کو دوبارہ نارمل انداز میں واپس لانے کے لیے بھی فوزیہ نے پورا ایک سال گزار دیا۔

ثاقب اس سے سجاد کی موت سے قبل ہی اپنے رویے کی معافی مانگ چکا تھا۔

"میں اپنی غلط سوچ پر شرمندہ ہوں۔" اس نے کہا تھا "کیا تم مجھے معاف نہیں کروگی۔"

"معافی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" فوزیہ نے جواب دیا "آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی رائے قائم کرتا۔"

"مگر تم نے مجھ سے اصل واقعات کیوں چھپائے؟"

"اگر میں بتادیتی تب کیا اس خوش اسلوبی سے اقبال اور ناہید کی شادی ہوسکتی تھی۔ آپ یقیناً کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنے پر زور دیتے۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ ان حالات میں اس کے سوا اور کچھ کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" ثاقب نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "پھر اب آئندہ کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

"یہ وقت اس گفتگو کے لیے موزوں نہیں۔" فوزیہ بولی "میں دل سے چاہتی ہوں کہ سجاد کا آپریشن کامیاب ہوجائے اس کے بعد مناسب وقت آنے پر غور کرلیا جائے گا۔"

○☆○

اور بالآخر ایک سال کے بعد وہ مناسب وقت آ ہی گیا۔ اس دوران میں ناہید ایک بیٹے کی ماں بھی بن چکی تھی۔ بچہ ساتویں مہینے میں پیدا ہوا تھا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوجاتا ہے اس لیے لوگوں کو کچھ زیادہ حیرت نہیں تھی مگر چند رشتے داروں کے نقطہ نظر سے یہ بات عجیب ضرور تھی کہ ساتویں ماہ پیدا ہونے والے بچے عموماً کمزور ہوتے ہیں جبکہ ناہید کا بیٹا پوری طرح صحت مند اور ساڑھے آٹھ پاؤنڈ کا پیدا ہوا تھا۔

ٹوٹی منگنی کو دوبارہ جوڑنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے ثاقب اور فوزیہ کی شادی بہت سادگی کے ساتھ انجام پائی اور اس طرح دو محبت کرنے والے دل۔ جن کے ملنے کی ظاہری حالات میں کوئی توقع نہیں رہ گئی تھی آخر کار قسمت کی مہربانی سے رفاقت کے دائمی رشتے میں منسلک ہوگئے۔ قابل ذکر بات یہ تھی کہ شادی میں سجاد کی ماں بھی شریک ہوئی تھیں۔ وہ از خود آئی تھیں اور انہوں نے ثاقب کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں تمہیں سجاد ہی کی طرح اپنا بیٹا خیال کرتی ہوں۔ سجاد نے مرنے سے قبل وصیت کی تھی کہ جب بھی تمہاری شادی ہو وہ تمام زیور جو میں نے سجاد کی دلہن کے لیے رکھے تھے، تمہاری دلہن کو دے دوں۔ مجھے امید ہے کہ تم میرے مرحوم بیٹے کی اس خواہش کا احترام کروگے۔"

جواب میں ثاقب اس غم رسیدہ ماں کی گود میں سر چھپانے کے علاوہ اور کیا کرسکتا تھا اور اس نے ایسا ہی کیا۔

*

تعاقب

عمیرہ سکندر

سیرو تفریح کا پروگرام ہو یا دعوت - مشاغل ہوں یا پیشہ ورانہ مصروفیات ' حادثات و سانحات تو جیسے شر لاک ہومز کے ہم رکاب رہتے ہیں - یہ بات بہت لوگوں کو شاید معلوم نہ ہو کہ مو صوف ٹائی ٹینک کے پہلے ...اور آخری سفر کے مسافروں میں بھی شامل تھے - جہاز ڈوبنے سے پہلے انہوں نے ایک کیس حل کر ہی لیا - ذرا ملاحظہ کیجیے-

زندگی کے آخری حصے میں یہ تحریر لکھنے کا ایک ہی مقصد ہے کہ اپریل 1912ء میں ہونے والے اس غیر معمولی واقعے کے بارے میں کچھ نہ کچھ ریکارڈ باقی رہنا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے، میرا مکمل ریکارڈ میرے دوست اور ساتھی ڈاکٹر واٹسن نے ترتیب دے رکھا ہے۔ 1904ء میں جب میں

نے ایک جاسوس کے طور پر پریکٹس سے ریٹائرمنٹ لے لی تھی، تب سے میری ڈاکٹر واٹسن سے ملاقات کم ہوگئی تھی۔ صرف اسی وقت اسے دیکھتا تھا جب وہ میرے پاس چھٹی میں آتا تھا۔ ان دنوں میں سسیکس کے علاقے میں انگلش چینل کے سامنے ایک خوب صورت بنگلے میں مقیم تھا۔ ہم عام طور سے مہینے یا دو مہینے میں ایک بار ملتے تھے۔ ڈاکٹر واٹسن صبح سویرے آتا تھا اور شام کو واپس چلا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ ہم 1914ء میں پہلی جنگ عظیم کے آغاز سے پہلے اپنی آخری مہم کے لیے جمع ہوئے تھے۔ یہ ایک مشہور ترین مہم تھی۔

دو سال سے مجھے ایک پیشکش تھی۔ یہ پیشکش مجھے وائٹ اسٹار لائن کے صدر کی جانب سے تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی کمپنی کے نئے بننے والے بحری جہاز آر ایم ایس ٹائی ٹینک کے پہلے سفر میں اس پر سوار ہوں۔ اس سفر کے لیے پورے برطانیہ سے منتخب افراد کو مدعو کیا جارہا تھا۔ ٹائی ٹینک اپنے اولین سفر میں نیویارک جارہا تھا اور اسے بحرِ اوقیانوس عبور کرنا تھا اگرچہ کسی بحری جہاز کے لیے یہ غیر معمولی سفر ہوتا ہے جسے پہلی بار سمندر میں اتارا جارہا ہو مگر ٹائی ٹینک کے بارے میں اس کے بنانے والوں کا دعویٰ تھا کہ یہ دنیا کا مضبوط اور محفوظ ترین بحری جہاز ہے اور اس کا ڈوبنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس لیے اسے سمندر میں اتارنے کے بعد پہلا سفر ہی دنیا کے دشوار ترین سمندر میں دشوار ترین راستے پر کرنا تھا۔ گزشتہ چند برسوں میں، میں نے چند چھوٹے موٹے کام کیے تھے مگر ان کا ذکر ڈاکٹر واٹسن کے نوٹس میں سرسری سا آیا ہے۔ اس لیے وہ میرے ساتھ ایک مکمل مہم کے لیے بے تاب تھا۔

اس پیشکش کو قبول کرنے کی کئی ایک وجوہات تھیں مگر سب سے سادہ سی وجہ یہ تھی کہ میں بور ہوگیا تھا۔ ابھی میں پچپن برس کا نہیں ہوا تھا اور میری صحت بھی بہترین تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد میرا زیادہ تر وقت گھر میں گزرتا تھا۔ کبھی کبھی میں اپنی بوڑھی ہاؤس کیپر سے گپ شپ کرتا تھا۔ ڈاکٹر واٹسن نے میرے کیسز پر مبنی جو ناول شائع کرائے تھے، ان کا مطالعہ کرتا تھا۔

جب مجھے وائٹ اسٹار لائن کے صدر کی جانب سے ٹائی ٹینک پر سفر کا دعوت نامہ ملا تو میرا اولین ردِعمل یہ تھا کہ مجھے اسے نظرانداز کر دینا چاہیے۔ مجھے دنیا کی سیاحت کا خاص شوق نہیں ہے۔ سوائے ان دنوں کے جب میں نے سارا تبت اور مشرقِ وسطیٰ گھوما تھا۔ مگر رفتہ رفتہ میں اس پیشکش میں دلچسپی لینے لگا۔ اس کی چند وجوہات تھیں۔ ان میں سے ایک مجھے امریکا سے ملنے والی دعوتیں تھیں۔ پہلی دعوت عظیم میدان کی سیر کی تھی اور دوسری پنسلوانیا کی کوئلے کی کانوں کو دیکھنے کی تھی۔ میں امریکا جا کر ان علاقوں کو دیکھ سکتا تھا۔ چند دن سوچنے کے بعد میں نے ٹائی ٹینک پر سفر کرنے کی پیشکش قبول کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میری ایک شرط تھی کہ میں ایک فرضی نام سے سفر کروں گا۔ مسٹر اسمتھ... یہ نام دیگر پانچ مسافروں اور ٹائی ٹینک کے کپتان کا بھی تھا۔ وائٹ اسٹار لائن نے میری یہ شرط مان لی تھی۔ میں نے سفر کی تیاری کرلی۔

اپریل کے آغاز میں مجھے ڈاکٹر واٹسن کی معذرت موصول ہوئی تھی کہ وہ اس سفر میں میرے ساتھ نہیں جاسکے گا۔ ''میرے عزیز دوست... میں شدید خواہش کے باوجود اس سفر پر تمہارے ساتھ جانے سے معذرت چاہوں گا۔ گزشتہ دنوں میں شدید بیمار رہا اور ابھی ڈاکٹر نے مجھے مکمل آرام کرنے کو کہا ہے۔''

مجھے واٹسن کے نہ چلنے کا افسوس تھا۔ بہرحال ایک سرد صبح میں لندن سے ساؤتھمپٹن جانے کے لیے نکلا۔ صبح ساڑھے گیارہ بجے بھی سورج بادلوں میں چھپا تھا اور سرد ہوا چل رہی تھی۔ بوٹ کے فرسٹ کلاس کے حصے میں میری نشست ایک نوجوان امریکن کے برابر میں تھی۔ اس کا نام فرٹیل جیکوئیس تھا اور وہ مصنف اور صحافی تھا۔ وہ متوسط قامت کا نوجوان تھا۔ لڑکوں جیسا چہرہ اور سیاہ گھنے بال تھے جو اس کے ماتھے تک آرہے تھے۔ اس نے ہلکے فریم کی عینک اور بوٹائی پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں سفید دستانے تھے اور وہ معمول کے مطابق تیار دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے نام سے مجھے غلط فہمی ہوئی تھی اور پہلے میں اسے فرانسیسی سمجھا تھا مگر اس نے فوراً ہی میری یہ غلط فہمی دور کردی تھی۔

''سر! میں جارجین ہوں اور بوسٹن سے تعلق ہے۔'' اس نے کہا۔ ''امید ہے اس سے میرے آباؤ اجداد کی وضاحت ہوجائے گی۔''

''مگر تمہارا نام تو...''

''میں فرانسیسی نژاد ہی ہوں سر... میرا خاندان آج بھی زیادہ تر فرانس میں آباد ہے۔ اور تم...؟''

''میں اسمتھ ہوں۔'' میں نے اپنا فرضی نام بتایا۔

''خوب!'' اس نے کہا اور ذرا دور ایک خوب صورت اور پُرکشش نوجوان عورت کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ میری بیوی ہے۔ مے جیکوئیس... یہ بھی مصنف ہے۔''

مے ہمارے پاس آئی۔ ''تم بھی صحافی ہو... اپنے شوہر کی طرح؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اور میرے شوہر دونوں فکشن لکھتے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔ ''میری پہلی کہانی اخبار سیٹر ڈے ایوننگ پوسٹ میں چند برس پہلے شائع ہوئی تھی۔'' اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ ''ٹائی ٹینک کا سفر تمہارے لیے اچھا رہے گا۔ تم اپنے سابقہ اخبار کے لیے اچھا آرٹیکل لکھ سکو گے۔''

وہ ہنسا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ میرے اس سفرنامے سے زیادہ دوسری تحریروں کے لیے بے تاب ہیں۔ خاص طور سے میری مختصر تحریروں کا مطالبہ جاری ہے اور میں بھی اس بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں۔''

''ممکن ہے، میں نے تمہاری کتابیں پڑھی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سسیکس میں میرا زیادہ وقت مختلف قسم کے موضوعات پر کتابیں پڑھتے گزرتا تھا۔ اس میں ایک بڑا حصہ پاپولر فکشن کا تھا جسے میں ماضی میں ہمیشہ نظرانداز کرتا رہا تھا۔

میرے سوال کا جواب مے نے دیا۔ ''تین برس پہلے اس کا ناول ''ڈائمنڈ ماسٹر'' شائع ہوا تھا۔ میرے حساب سے وہ اس کا بہترین رومانی ناول ہے۔ مگر اکثر لوگ اس کی جاسوسی کی تحریروں کو پسند کرتے ہیں۔''

اس کے الفاظ نے میری یادداشت کو جھنجھوڑ دیا۔ ''بالکل فرٹیل... مجھے یاد آگیا... میں نے تمہاری کتاب ''دی پرابلم آف دی سیل نمبر تھرٹین'' پڑھی ہے بلکہ میں نے اسے کئی بار پڑھا ہے۔''

جیکوئیس شرمیلے انداز میں مسکرایا۔ ''اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میں خاصا مقبول ہوں۔ میرا اخبار اسے ہفتے میں چھ دن شائع کرتا تھا اور درست معمے حل کرنے والوں کو انعام دیا جاتا تھا۔''

''تمہارے جاسوس کو ''سوچنے کی مشین'' کہا جاتا ہے۔''

اس کی مسکراہٹ میں مزید کشادگی آگئی۔ ''میں نے پروفیسر آکسٹس وان ڈیوسن پر گزشتہ سات برسوں میں کوئی پچاس کہانیاں لکھی ہیں اور آنے والے سات برسوں میں اس سیریز کو لکھنے کا ارادہ ہے... میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ مقبول کردار اور کوئی نہیں ہے۔''

پچاس کہانیاں! میں نے حیرت سے سوچا۔ ان کی تعداد ان کہانیوں سے کہیں زیادہ تھی جو ڈاکٹر واٹسن نے میرے لیسز پر لکھی تھیں۔ اور یہ بھی درست تھا کہ پروفیسر آکسٹس کا کردار کہیں زیادہ مقبول تھا۔ ''کبھی تم نے اورے نے مل کر کچھ لکھا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

کلیاتِ خلیل جبران

ماں

دنیائے فردوس کے پرمسرت ترانوں میں وہ کشش نہیں اور نہ ربط شیریں سے نکلے ہوئے نغموں میں وہ شیرینی ہے۔ پہاڑی جھرنوں کی سہانی آواز ایسی مسرور کن نہیں اور نہ ہی سمندری ہواؤں کے جلترنگ میں وہ لطافت ہے۔

ماہ چاردہم کی تابانی اس قدر پرکیف نہیں اور نہ ہی حسین پھولوں کے حسن میں اس قدر دل کشی ہے۔

کائنات کی دل فریبیاں اس پیارے نام کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ اس کے تمام افسوں، ماں کے مقدس جسم کے آگے ہیچ ہیں، اس ذرہ ناچیز کی طرح جو مہر عالم تاب کا مقابلہ کرنے سے معذور ہے۔

دنیا کی تمام مسرتیں اس ایک لفظ میں مجتمع ہیں اور تمام لطافتیں اسی میں پوشیدہ۔ دہر کی تمام خوبیوں کا مجموعہ یہی مقدس ترین ہستی ہے اور محفل حیات کی آرائش جس کا وجود اس شیریں راگ سے کم نہیں جو سنسان اور تاریک راتوں میں سب کو متوجہ کرلیتا ہے۔ ازسرِنو حیات عطا کرتا ہے۔

ماں ایک نعمت ہے۔ نایاب نعمت! اس کا نعم البدل ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن! زمین کی گہرائیاں اس جواہر کو اگلنے کے قابل نہیں اور آسمان ایسا فرشتہ رحمت بھیجنے سے قاصر۔

خوش نصیب ہیں وہ ہستیاں۔ جو اس بے بہا نعمت سے مالا مال ہیں۔ جن کے سروں پر ماں کا مقدس سایہ ہے اور اس کے بیٹھے بیٹھے سانسوں میں پوشیدہ جنت۔ اور اس بدنصیب کا کیا ذکر جو اس مخزن لطف و کرم سے محروم ہے۔ جس کی بہار حیات پر وقت سے پہلے ہی خزاں نے غلبہ پالیا۔

☆.....☆.....☆

میرے کاغذات اور دعوت نامہ دیکھتے ہی مستعد عملے نے مجھے میرے کیبن تک پہنچا دیا۔ میرا کیبن سوٹ بی سیون تھا۔ یہ اسٹار بورڈ پر برج ڈیک بی میں واقع تھا اور اس کا شمار بحری جہاز کے بہترین لگژری سوٹ میں ہوتا تھا۔ اس میں لکڑی اور آئرن کا بڑا شاندار بستر تھا جس پر آرام دہ گدا تھا۔ دوسرا فرنیچر بہترین پلائی کا بنا ہوا تھا۔ اس کے برابر میں ایک وارڈ روب روم تھا اور اس سے بھلے بہترین قسم کی نشست گاہ تھی۔ سوٹ کو گرم کرنے کے لیے بجلی سے چلنے والا ہیٹر فین تھا۔ اگر ضرورت پڑتی تو یہ کمرے کو گرم کر سکتا تھا۔ دو کھڑکیاں تھیں، ایک نشست گاہ میں اور ایک باتھ روم میں! باتھ روم بہترین ٹائلز سے سجا تھا اس میں سنک اور شاور کے علاوہ ایک باتھ ٹب بھی تھا۔ بے اختیار میرے دل میں خواہش جاگی کہ کاش ڈاکٹر واٹسن بھی اس سفر میں میرے ساتھ ہوتا۔

میں بحری جہاز کی روانگی سے محض نصف گھنٹے پہلے اس پر سوار ہوا تھا۔ بحری جہاز ٹھیک دوپہر کے وقت حرکت میں آیا۔ ایک ٹگ بوٹ اسے بندرگاہ سے کھینچ کر دریا کے راستے کھلے سمندر میں لے جانے لگی۔ میں اپنے کیبن سے نکل کر عرشے پر آیا۔ ریلنگ سے ٹک کر میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور جھک کر ڈاک پر جمع ہجوم کو دیکھنے لگا جو اپنے پیاروں کو رخصت کرنے اور دنیا کے سب سے بڑے بحری جہاز کی رخصتی کا منظر دیکھنے آئے تھے۔ وہ ہاتھ لہرا کر اور ٹوپیاں اچھال کر اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ اس دوران میں بحری جہاز رک گیا تھا کیونکہ سامنے سے ایک بڑا بحری جہاز آ رہا تھا اور تصادم سے بچنے کے لیے رکنا لازمی تھا۔ اس کے بعد ہم دوبارہ روانہ ہوئے۔ اس میں اگلے چوبیس گھنٹے بے حد بور اور مایوس کن تھے کیونکہ بحری جہاز انگلش چینل میں رینگتا رہا۔ خدا خدا کر کے اس سے نکلے اور بسکے بورگ میں رکے جہاں سے مزید دو سو چوہتر مسافر سوار ہوئے تھے۔

رات کے وقت بحری جہاز کوئنز ٹاؤن جزیرے کے پاس سے گزرا۔ یہ آئرلینڈ کا ایک حصہ ہے۔ یہاں بحری جہاز ساحل سے صرف دو میل دور کھڑا ہوا تھا اور اس پر مزید مسافر سوار ہوئے تھے۔ یہ آخری لنگر گاہ جو گرایا گیا تھا، اس کے بعد ٹائی ٹینک کو نیویارک پہنچ کر ہی لنگر ڈالنا تھا۔ کیپٹن اسمتھ نے ایک نوٹس جاری کیا کہ دو ہزار دو سو ستائیس افراد جن میں مسافر اور عملہ بھی تھا... بحری جہاز پر موجود ہے۔ یہ حتمی نوٹس نہیں تھا۔ بحری جہاز پر کل افراد کی گنجائش تین ہزار تین سو سات تھی۔ یعنی کل گنجائش کا دو تہائی ہی استعمال ہوا تھا۔

میں جمعرات کی دوپہر ڈیڑھ بجے عرشے پر کھڑا سمندر کا نظارہ کر رہا تھا۔ یہ گیارہ اپریل 1912ء کا دن تھا۔ میں نے ایک بار پلٹ کر دیکھا تو مجھے پاس ہی سرخ بالوں والی ایک نوجوان اور پرکشش عورت دکھائی دی۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ مسکرائی۔ ''کیا یہ تمہارا پہلا سفر ہے؟''

''بحر اوقیانوس کے پار پہلا سفر ہے۔'' میں نے تصدیق کی۔

''میرا نام مارگو لیئر ہے اور یہ میرا بھی پہلا سفر ہے۔''

میں نے اس کا جائزہ لیا۔ متناسب جسامت کے ساتھ اس کا چہرہ قبول صورت تھا۔ اپنی آنکھوں سے وہ ذہین لگ رہی تھی اور شاید اکیلی تھی۔ اسے کسی ساتھی کی تلاش تھی۔ میری عمر اتنی نہیں تھی کہ وہ مجھے ساتھی کے طور پر منتخب نہ کرتی۔ ''تم سے مل کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مجھے جان اسمتھ کہتے ہیں۔''

اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''میرا خیال ہے کہ تم فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے ہو؟''

''درست! اور تم امریکن ہو... تمہارے لہجے سے لگ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ایسا شاید تم میرے سرخ بالوں کی وجہ سے کہہ رہے ہو؟''

میں مسکرایا۔ ''کیا تمام امریکن سرخ بال رکھتے ہیں؟''

''ان کی وجہ سے بعض اوقات مجھے مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھار میں سوچتی ہوں کہ کاش میرے سرخ بال نہ ہوتے۔''

''تم جیسی حسین خاتون کو کیا مشکل ہو سکتی ہے؟''

اس کے تاثرات یک دم بدل گئے اور وہ بے حد سنجیدہ دکھائی دینے لگی۔ ''ایک آدمی میرے لیے مشکل بنا ہوا ہے وہ میرا تعاقب کرتا ہوا اس جہاز تک آیا ہے مسٹر ہومز۔''

اس نے میرا اصل نام لیا تو مجھے اچانک شاک سا لگا۔ ''تم مجھے جانتی ہو مس کولیئر؟''

''تمہاری نشان دہی بحری جہاز کے افسران نے کی ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ بحری جہاز پر مشہور شخصیات ہیں جیسے جان جیکب آسٹر، بنجامن گوگنہیم اور مسٹر شرلاک ہومز... وغیرہ وغیرہ۔''

میں ہنسا۔ ''مجھے ان لوگوں سے ملانا درست نہیں ہوگا۔ یہ سب عظیم ہیں اور میں اپنے شعبے کا ایک معمولی سا آدمی ہوں۔ ویسے تم نے مجھے کیوں تلاش کیا... کیا تم کسی معاملے میں میری مدد چاہتی ہو؟''

اس نے اپنے کھلے اور پھیلے ہوئے بال سمیٹے۔ ''ہاں...

شخص میرا تعاقب کرتا ہوا آیا تھا اور میرے پیچھے جہاز پر سوار ہوا۔''

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ''مس کولیئر! کوئی بھی اوپن ٹائی ٹینک جیسے طویل سفر کرنے والے بحری جہاز پر سوار نہیں ہو سکتا... خاص طور سے جب وہ تمہاری جیسی حسین خاتون کا تعاقب کر رہا ہو۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہارے رویے سے بہ خوبی واقف ہوگا۔ اگر یہ درست ہے تو تمہارا بیان غلط ثابت ہوتا ہے۔''

وہ نروس دکھائی دینے لگی۔ ''میں نے جو کہا ہے، درست کہا ہے۔ کیا تم کل مجھ سے ڈیک اے کے فرسٹ کلاس لاؤنج میں مل سکتے ہو؟ میں وضاحت کرنے کی کوشش کروں گی۔''

میں نے سوچا، اس سفر میں مجھے نہ تو کوئی اور مصروفیت تھی اور نہ ہی میرا کوئی ساتھی تھا۔ اس لیے میں نے سر ہلا دیا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''تو کل صبح گیارہ بجے... فرسٹ کلاس لاؤنج میں۔''

''ہم پھر ملیں گے مس کولیئر!'' میں نے اسے یقین دلایا۔

☆☆☆

جمعے کی صبح ہوا میں ایک یخ بستہ کاٹ تھی مگر موسم صاف تھا۔ دراصل ہم آرکٹک کے سمندر سے زیادہ دور نہیں تھے اور سرد ہوا اسی طرف سے بہہ رہی تھی۔ کیپٹن اسمتھ نے لاؤڈ اسپیکر پر بتایا کہ کوئنز ٹاؤن کی بندرگاہ سے روانگی کے بعد سے ٹائی ٹینک نے اب تک تین سو چھیاسی سمندری میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ میں نے صبح سویرے ناشتا فرسٹ کلاس کے ڈائننگ سیلون میں کر لیا تھا۔ اس کے بعد عرشے کا ایک چکر لگایا پھر کچھ وقت اسٹار بورڈ کے پاس جمنازیم میں گزارا۔ وہاں مجھے ایک مشین نے بے حد متاثر کیا اور میں اسے استعمال کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے ڈاکٹر واٹسن کا خیال آیا۔ اگر وہ اس موقعے پر موجود ہوتا تو میری توجہ میری عمر کی طرف ضرور دلاتا۔ بالآخر گیارہ بجے سے ذرا پہلے میں نے سیڑھیوں سے نیچے اے ڈیک کے فرسٹ کلاس لاؤنج کا رخ کیا۔

ویٹنگ روم میں مس کولیئر ایک میز پر اکیلی بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ اس کے برابر میں لکھنے اور پڑھنے کے کمرے بنے تھے۔ ویٹنگ روم سے ان میں رکھی خوب صورت کرسیاں اور میزیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ یہاں کا فرنیچر اعلیٰ درجے کا تھا۔ میں مس کولیئر کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''گڈ مورننگ مس کولیئر... مجھے امید ہے کہ رات تمہیں اچھی نیند آئی ہوگی؟''

''توقع کے مطابق نہیں آئی۔'' اس نے زیرلب بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔ ''وہ شخص جو میرا تعاقب کرتا اس جہاز پر آیا تھا اس وقت بھی لاؤنج میں ہے۔ وہ جو سیڑھیوں کے قریب کھڑکی کے سامنے کھڑا ہے۔''

میں نے ذرا سی کرسی گھمائی اور عقب میں دیکھا تو مجھے ایک میز پر فرٹیل اورے دکھائی دیے۔ ان کے ساتھ ایک سیاہ سوٹ میں ملبوس بوڑھا آدمی بھی تھا۔ میں نے مس کولیئر سے معذرت کی اور اٹھ کر ان کے پاس آیا۔ یہاں میں کھڑکی کے پاس موجود شخص کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ان سے رسمی جملوں کا تبادلہ کیا۔ اس دوران میں سیاہ سوٹ والا چائے کے کپوں میں تیرتی پتیوں کا معائنہ کر رہا تھا۔

''مسٹر اسمتھ!'' مے نے خوشی سے کہا۔ ''تمہیں مسٹر فرینکلن فرینکلن سے ضرور ملنا چاہیے۔ یہ برطانیہ کے ماہر ارواح ہیں۔''

اس بار مسٹر فرینکلن نے اوپر دیکھا اور کھڑے ہو کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ''مسٹر اسمتھ... تم کیا کام کرتے ہو؟''

''میں ایک تحقیقی کام سے ریٹائر ہوا ہوں اور ان دنوں اس سفر سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اس وقت بھی کام پر ہو۔ چائے کے پتوں میں رومانیت تلاش کر رہے ہو۔''

''مسٹر جیکوئیس نے اس سفر کے بارے میں سوال کیا تھا۔''

''تب تم جانتے رہو دوست۔'' میں نے اس سے کہا اور اپنے راستے پر آگے بڑھ گیا۔ لاؤنج مکمل طور پر لکڑی کے پینلز سے بنا تھا اور وہ شخص جس کی نشان دہی مارگو کولیئر نے کی تھی، وہ کھڑکی سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ وہ طویل قامت تھا اور اس کا جسم موٹاپے کی طرف مائل تھا۔ چہرے پر پہلے ہی ڈھیری ٹھڈی نکل آئی تھی۔ وہ ایک راکنگ اسٹک مضبوطی سے بائیں ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا۔ جیسے ہی میں اس کے پاس پہنچا، وہ میری طرف گھوما اور چمکتی آنکھوں کے ساتھ بولا۔

''کیا اس نے تمہیں تصدیق کے لیے بھیجا ہے سر؟''

''مس کولیئر کا کہنا ہے کہ تم اس کا تعاقب کر رہے ہو۔ تم نے اس غریب عورت کو موت کی حد تک خوف زدہ کر دیا ہے۔ کیا تم اپنی شناخت کرانا پسند کرو گے؟''

اپنا تعارف کرانے سے پہلے وہ شخص ممکنہ حد تک تن کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں پیری گلاسٹ ہوں اور مارگو لیئر میری بیوی ہے۔''

میں نے فوری طور پر اس کی بات پر یقین نہیں کیا.... میں نے دیکھا، اس کی کسی بھی انگلی میں انگوٹھی تو نہیں تھی البتہ اس کے حلقے کا نشان ضرور تھا۔ یہ حال میں ہی شادی ختم ہونے کی علامت بھی ہوسکتی تھی۔ دوسرے مس کولیئر نے جس طرح مجھ سے یہ بات کی تھی، اس سے میرے لیے اس شخص کی بات پر یقین کرنا دشوار تھا۔

''مجھے اس بات پر یقین نہیں آرہا ہے۔'' میں نے اسے بے تکلفی سے بتادیا۔

''اس سے پوچھو۔ ہماری شادی ایک برس سے بھی زیادہ عرصے رہی تھی۔ اب ہم میں علیحدگی ہوئی ہے۔''

''علیحدگی کس وجہ سے ہوئی؟''

''یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے سر!''

''تم نے اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس بحری جہاز پر بالکل آخری لمحے میں کس طرح بکنگ کرالی؟''

''جہاز اپنی گنجائش کے مطابق بک نہیں تھا، اس لیے مجھے اس کی بکنگ مل گئی۔''

''میں معذرت خواہ ہوں... اگر میں نے تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی کی ہو۔'' میں نے اس سے کہا اور ویٹنگ روم میں لوٹ آیا جہاں مس کولیئر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی بے تابی سے کہا۔

''کیا تم نے اس سے تصدیق کرلی ہے مسٹر ہومز؟''

''ہاں۔'' میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اس کا دعویٰ ہے کہ تم اس کی قانونی بیوی ہو۔''

''یہ درست ہے... لیکن اب ہمارے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے اور اب اسے کوئی حق نہیں ہے کہ میرا اس طرح سے تعاقب کرے۔''

''میں معذرت خواہ ہوں مسز گلاسٹ یا تم جو بھی ہو... میں ایک نجی جاسوس ہوں، کوئی شادی کا کونسلر نہیں ہوں۔''

''مسٹر ہومز!'' اس نے التجا کی۔

''میں معذرت خواہ ہوں مادام... میں تمہاری مزید مدد نہیں کرسکتا۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور مڑ کر باہر جانے والے راستے پر چل پڑا۔ یہ دن اور اس سے اگلا دن میں نے آرام اور تفریح کرتے ہوئے گزارا۔ میں نے مارگو کولیئر اور پیری گلاسٹ کے بارے میں سوچنے سے بھی گریز کیا تھا۔ اس دوران میں بحری جہاز ٹائی ٹینک سمندر میں مزید پانچ سو انیس میل کا سفر طے کر چکا تھا۔ نیویارک کی طرف سے آنے والے تمام ہی بحری جہازوں نے کپتان اسمتھ کو سمندر میں تیرتے بھاری برفانی تودوں سے خبردار کیا تھا جو قطب کی برفانی چادر سے الگ ہو کر جنوب کی جانب سفر کرتے تھے اور پھر پگھل کر ختم ہو جاتے ہیں۔ کپتان اسمتھ نے اس کے بارے میں نوٹس لگایا کہ اپریل کے مہینے میں برفانی تودے عام طور سے سمندر میں ملتے ہیں۔ ہفتے کی شام میں نے فرٹیل، ے اور ماہر روحانیات فرینکلن کے ساتھ ڈنر کیا تھا۔ فرینکلن ایک نرم خو اور شائستہ شخص تھا۔ وہ ایک خاص نرمی کے ساتھ بات کرتا تھا۔ فرٹیل خاص طور سے اس میں دلچسپی لے رہا تھا۔ میرے خیال میں وہ دراصل اپنی آنے والی جاسوسی کہانیوں کے بارے میں فرینکلن سے تحقیق کررہا تھا۔ فرینکلن نے بتایا کہ وہ امریکا روحانیات کے بارے میں لیکچر دینے اور اس موضوع پر ہونے والی کانفرنسوں میں شرکت کرنے جارہا ہے۔

''تب تم شومین ہوئے۔'' میں نے کہا۔ میرے ذہن میں اس کے لیے سب سے موزوں لفظ یہی آیا تھا۔

''نہیں... نہیں۔'' اس نے مزاحمت کی۔ ''روحانیت ایک طرح کی سائنس ہے۔ تم اسے دوسرے شعبدہ بازوں کی طرح مت سمجھو۔''

ے فرٹیل نے کہا۔ ''مسٹر فرینکلن نے ڈنر کے بعد ہمیں اپنے کیبن میں مدعو کیا ہے... یہ ہمیں اپنے کام میں استعمال ہونے والے چند آلات دکھائے گا۔'' پھر اس نے فرینکلن کی طرف دیکھا۔ ''کیا مسٹر اسمتھ ہمارے ساتھ شامل ہوسکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں ان کو بھی دعوت دیتا ہوں۔''

''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔'' فرٹیل نے نیپکن سے منہ صاف کیا۔

ہم لفٹ کے ذریعے اوپری عرشے پر آئے جہاں ڈیک پروی آئی پی اسٹیٹ رومز تھے۔ یہ میرے سوٹ سے بڑا تھا اور شاہانہ انداز میں سجا تھا۔ میرا خیال تھا کہ فرینکلن اسٹار لائن کا خاص مہمان تھا۔ فرینکلن سیدھا اپنے چرمی سوٹ کیس کی طرف گیا۔ اس نے اسے کھولا اور اندر سے ایک شیشے کی گیند نکالی جو لکڑی کے گول ٹکڑے پر نصب تھی۔ گولے کا قطر چھ انچ تھا اور اس کے نیچے سے ایک برقی تار نکلا ہوا تھا۔ اس نے کیبن میں لگے برقی ہیٹر کا پلگ نکالا اور اس کی جگہ گولے سے نکلی تار ساکٹ میں لگادی۔ فوراً ہی گولے میں ایک چمک اور زندگی کی روشنی نمودار ہوئی۔

''اس میں دیکھو مسٹر اسمتھ! لیکن زیادہ دیر کے لیے نہیں... ورنہ تم بینائی کھو سکتے ہو۔''

''مجھے اس میں کیا دکھائی دے سکتا ہے؟'' میں نے ... کیا۔

''ممکن ہے، وہ لوگ جو تم سے پہلے اس دنیا کو چھوڑ کر ... معلوم مقام کی طرف جاچکے ہیں۔''

گولا اب بے حد تیز روشنی دے رہا تھا۔ میں نے صرف ... اسے دیکھا اور فوراً ہی آنکھیں ہٹانے پر مجبور ہوگیا۔ ... تھا جیسے میری آنکھ کی پتلی جل جائے گی۔ ''میں اپنے ... کوئی حصہ اس میں نہیں دیکھ سکا۔'' میں نے اسے بتایا۔ ... میں اس میں مستقبل کے بارے میں کچھ دیکھ سکتا ... ؟''

... نے گولے کی تار نکال دی اور وہ بجھ گیا۔ پھر اس ... پتوں کی ایک بڑی سی گڈی نکالی۔ مجھے شبہ ہونے لگا کہ وہ ... روحانیات کے ماہر سے زیادہ کوئی جادوگر ہے۔ اس نے یہ ... گڈی ہمارے سامنے کی اور مجھ سے بولا۔

''مسٹر اسمتھ! تم دوسری دنیا پر یقین رکھنے والوں میں ... نہیں ہو۔ اس دنیا پر جہاں ہمارے آباؤاجداد ہمارا انتظار ... رہے ہیں۔ جہاں پریاں رہتی ہیں اور جہاں دیومالائی ... جانور انوکھی چراگاہوں میں چرتے ہیں۔ ایسی چراگاہیں ... جہاں ہمیشہ بہار رہتی ہے اور جس کی گھاس کبھی نہیں مرجھاتی۔''

''میں دوسری دنیا پر یقین رکھتا ہوں مسٹر فرینکلن۔'' ... دھیرے سے مسکرایا۔ ''لیکن اس کے لیے میرا اپنا ایک ... تصور ہے جو تمہارے تصور سے ذرا مختلف ہے۔''

... فرٹیل کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ اس کیبن ... میں آنے کو اپنی حماقت سمجھ رہی تھی۔ اس نے جیکوئیس کا بازو ... تھاما۔ ''ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔''

ماہر روحانیات نے اپنے ہاتھ جھٹکے۔ ''ڈنر کا شکریہ۔ مجھے سچ مچ بہت مزہ آیا۔ اور مسٹر اسمتھ... مجھے امید ہے ہم ... اپنے نقطۂ نظر اور تصور پر بحث کرسکیں گے، اس سے پہلے کہ ... جہاز نیویارک میں لنگر انداز ہو۔''

''ممکن ہے۔'' میں نے اس سے اتفاق کیا۔

ہم اس کے کیبن سے نکلے اور چند قدم کے فاصلے پر ... آگئے۔ ''مجھے تو یہ شخص فراڈ لگ رہا ہے۔'' ے نے ... غصے سے کہا۔ ''مگر جیکوئیس کا خیال تھا کہ ہمیں اس ... کہانی کا خیال مل سکتا ہے۔''

''اس کا امکان تو ہر شخص سے رہتا ہے۔'' میں نے مسکرا ... کہا۔

لفٹ نیچے پہنچی اور اس کا دروازہ کھلا۔ میں نے ان ... کے لیے سرکنے والا جالی دار دروازہ کھولا۔ فرٹیل نے

مکالمے

''ساری محفل دیوانہ وار اس کا گانا سن رہی ہے مگر تم مسلسل اسے گھورے جارہی ہو۔''

''میرے گھورنے کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ اتنا اچھا گارہا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''گانے والا میرا شوہر ہے۔''

☆......☆......☆

''بھائیو! مدد کرو۔ میں ایک یتیم بچے کا باپ اور ایک بیوہ عورت کا شوہر ہوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے ماں باپ ہیں۔''

☆......☆......☆

''شرم بھی نہیں آتی کیسے گھور گھور کے دیکھے جارہا ہے، بدمعاش کہیں کا۔''

''کہیں کا نہیں، یہیں کا ہے۔''

☆......☆......☆

''ہمیں تم ہی جیسے قوی آدمی کی ضرورت تھی جو ہماری کمپنی میں چوکیداری کے فرائض انجام دے سکے۔''

''جی ہاں، ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنی صلاحیت کا عملی ثبوت دے کر آیا ہوں۔''

''وہ کیسے؟''

''دروازے پر کھڑے گیارہ آدمی جو ملازمت کے امیدوار تھے، ان سب کو مار بھگایا۔''

☆......☆......☆

''وہ بڑا خبیث آدمی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے اسے گالی دے دوں۔''

''جی ہاں، وہ میرا بھی دشمن ہے۔ میرا دل چاہتا ہے اسے گولی ماردوں۔ مگر کیا کروں بہت طاقتور آدمی ہے۔ کئی قتل کرچکا ہے۔''

''آؤ آج ہم دونوں اپنی اپنی خواہش پوری کرلیں۔ پہلے تم اسے گولی مارو، پھر میں اسے گالی دے کر بھاگ جاؤں گا۔''

میری طرف دیکھا۔ ''اگر اسے بہت ذاتی سوال نہ سمجھا جائے تو میں پوچھوں گا کہ تم جاسوس تو نہیں ہو؟''

''تم نے یہ کیوں پوچھا؟''

''ہمارے حصے کے اسٹیوارڈ نے بتایا ہے کہ تم معروف جاسوس شرلاک ہومز ہو۔''

میں ہنسا اور باہر آکر لفٹ کا دروازہ بند کردیا۔ ''ایسا لگ رہا ہے کہ میرا یہ چھوٹا سا راز زیادہ دیر راز نہیں رہے گا۔ اور شاید نیویارک پہنچنے سے پہلے سب ہی جان چکے ہوں گے کہ میں شرلاک ہومز ہوں۔''

"ہم کسی سے نہیں کہیں گے۔" مے نے وعدہ کیا۔ "میرا خیال ہے کہ مسٹر فرنیکلن کو بھی اس کی اطلاع ہے۔ شاید وہ دوسروں کو بتا دے۔ بہرحال تم سے ملنا میرے لیے بہت بڑے اعزاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیکوئیس نے تمہارے کارناموں پر مشتمل ڈاکٹر واٹسن کی کہانیوں سے متاثر ہو کر جاسوس کہانیاں لکھنا شروع کی تھیں۔"

"میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر واٹسن نے مجھے کچھ زیادہ ہی گلیمرائز کر دیا ہے۔"

"تمہارا یہ دوست کیسا ہے؟" فرٹیل نے پوچھا۔

"اچھا ہے... اکثر مواقعوں پر مجھ سے ملنے آتا ہے۔ وہ واحد شخص ہے جس کے ساتھ رہ کر مجھے ہمیشہ خوشی ملتی ہے۔ وہ واقعی بہت اچھا دوست ہے۔"

ہم نیچے والے عرشے تک پہنچے جہاں سے ہمیں اپنے اپنے کیبنوں کی طرف جانا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم کل پھر ملیں گے۔" میں نے کہا۔

"شب بہ خیر... مسٹر ہو... اسمتھ۔" فرٹیل نے نام لیتے لیتے درستگی کی۔

"شب بہ خیر!" میں نے مسکرا کر جواب دیا اور اپنے راستے کی طرف بڑھ گیا۔

اتوار چودہ اپریل کا دن... یہ میری زندگی کا سب سے طویل دن تھا۔ اس کا آغاز فرسٹ کلاس ڈائننگ سیلون میں ناشتے سے ہوا۔ میں زیادہ دیر سو لیا تھا اور جب میں ناشتے کے لیے ہال میں پہنچا تو صبح کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ شکر ہے کہ اس وقت ناشتا فراہم کیا جا رہا تھا۔ اس دوران میں میری مارگو کولیئر سے دوسری ملاقات ہوئی۔ وہ بھی تاخیر سے ناشتے کے لیے آئی تھی۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی، وہ تیر کی طرح میری طرف آئی تھی۔

"ہیلو مسٹر ہومز!"

"ہیلو مسز گلاسٹ۔"

"خدا کے لیے مجھے اس نام سے مت پکارو۔ اگر تم مجھے کچھ وقت دو تو میں اس معاملے کی وضاحت کر سکتی ہوں۔"

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ مجھے اس کے ساتھ اپنے سابقہ رویے پر افسوس ہونے لگا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ تم رات ڈنر میرے ساتھ کرو۔ میں آٹھ بجے فرسٹ کلاس سیلون میں بیرونی استقبالیہ کے پاس تمہارا انتظار کروں گا۔"

"میں ٹھیک وقت پر آ جاؤں گی۔" اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس نے میرے ساتھ ہی ناشتا کیا اور رخصت ہو گئی۔

میں نے دن کا بیشتر حصہ عرشے پر گزارا۔ اس دوران میں نے دو آفیسرز کو بات کرتے سنا۔ مغرب سے آنے والے تمام بحری جہاز برفانی تودوں کے بارے میں خبردار کر رہے تھے۔ عام لوگوں کے لیے یہ تعجب خیز بات ہو گی کہ جب اپریل میں موسم بہتر ہونا شروع ہو جاتا ہے، تب سمندر میں برفانی تودے کیوں دکھائی دیتے ہیں؟ اس کی معمولی سی وجہ ہے۔ گرمی بڑھنے سے شمالی قطب کی برفانی چادر سے بڑے بڑے ٹکڑے الگ ہو کر جنوب کی طرف سفر کرتے ہیں۔ سرما کے موسم میں برف نہیں ٹوٹتی ہے۔ اس وقت تک بحری جہاز مزید کوئی چھ سو میل کا فاصلہ طے کر چکا تھا اور ہم نیو فاؤنڈ لینڈ کے پاس تھے۔ جب تک سورج رہتا تھا، درجہ حرارت چالیس سے پچاس ڈگری سینٹی گریڈ تک رہتا تھا... مگر جیسے ہی سورج غروب ہوتا تھا یہ گر کر نقطۂ انجماد کے آس پاس چلا جاتا تھا۔ شام کے وقت کیپٹن اسمتھ نے اعلان کیا کہ اس نے جہاز کا رخ کسی قدر جنوب مغرب کی طرف کر دیا ہے تاکہ راستے میں آنے والے ممکنہ برفانی تودوں سے بچا جا سکے۔ اس کے علاوہ کئی عملے پر مشتمل ایک دستہ رات بھر ٹائی ٹینک کے بلند حصوں سے ممکنہ طور پر راستے میں آنے والے برفانی تودوں پر نظر رکھے گا۔ دو افراد ایک مستول پر رہتے تھے تاکہ ایک غافل نہ ہو جائے۔ ٹھیک آٹھ بجے مارگو کولیئر مجھ سے ڈائننگ سیلون میں ملی۔ وہ خود سے اندر نہیں آ سکتی تھی۔ "میرا کیبن سیکنڈ کلاس میں ہے۔" اس نے اعتراف کرنے کے انداز میں کہا۔ "مجھے خطرہ تھا کہ وہ میرے کمرے میں دوسرے بستر پر کسی اور عورت کو بک کر لیں گے مگر میری خوش نصیبی ہے کہ میں اس کیبن میں اکیلی ہوں۔"

"یہ واقعی اچھی بات ہے۔" میز کی طرف آتے ہوئے میں نے اس کی تائید کی۔

"تم جانتے ہو، سی کلاس کے مسافر جس جگہ کھانا کھاتے ہیں وہ کیسی ہوتی ہے؟ میں نے دیکھی ہے۔ میں نے جہاز کا ٹور کرتے ہوئے اس جگہ کو دیکھا ہے۔ وہاں صرف ایک لمبی سی میز ہے جس کے دونوں طرف بنچز لگی ہیں اور وہ ان پر بیٹھ کر دھاتی برتنوں میں کھانا کھاتے ہیں۔"

"اس بحری جہاز پر... اس کا میں نے سوچا نہیں تھا۔" میں نے اعتراف کیا۔ "مگر کروزر بحری جہازوں میں یہ عام سی بات ہے۔"

ڈائننگ سیلون کے آخر میں آرکسٹرا نے دُھن بجانا شروع کر دی تھی۔ مینو بہترین تھا اور اس میں دنوں کے حساب سے تبدیلیاں لائی جاتی تھیں۔ مارگو کولیئر نے بھنی ہوئی بطخ اور

ساس کا آرڈر دیا۔ کسی قدر دشواری کے ساتھ میں نے روسٹ اور فرانی فش میں موخرالذکر کا انتخاب کیا۔ اس ساتھ میں نے اُبلے آلو اور کریم لگی گاجروں کا انتخاب کیا خر میں بارلے کا کریم سوپ اور آئس کریم تھی۔

"اب ہم کام کی بات پر آتے ہیں۔" میں نے نیپکن منہ صاف کیا۔ "مجھے اپنی پیری سے شادی کے بارے ؤ۔"

اس نے آنکھیں جھکائیں اور اپنی کہانی شروع کر دی۔ جیسا کہ تم نے دیکھا، ہماری عمروں میں کتنا فرق ہے۔ میں سے چیرز بورگ میں ایک ویک اینڈ پر ملی تھی اور اس نے مجھے اپنے لیے کام کرنے پر راضی کر لیا تھا۔"

"کام... کس نوعیت کا کام؟"

"وہ بھی ایک نجی جاسوس ہے... تمہاری طرح مسٹر ہومز!"

"خوب! وہ بھی جاسوس ہے۔" میں نے تبصرہ کیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ سابقہ میاں بیوی مجھے اچھی طرح جانتے تھے بلکہ مجھے شبہ تھا کہ یہ بات اب سارے ہی جہاز پر پھیل چکی تھی۔

"وہ کس قسم کی جاسوسی کرتا تھا... شادی کے بارے میں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ خاندانی معاملات کا ماہر ہے لیکن آج کل وہ ہوٹلوں میں ہونے والی پارٹیوں کی نگرانی اور حفاظت کرتا ہے۔ ان پارٹیوں میں شرکت کے لیے اسے ایک عورت کی ضرورت تھی جسے وہ اپنی بیوی ظاہر کرے۔ وہ بہ ظاہر ایک شریف آدمی ہے۔ اس نے کہا کہ ہمیں سچ مچ شادی کر لینی چاہیے کیونکہ ہم ہوٹل میں ایک کمرے میں رہتے ہیں۔"

"اور تم راضی ہو گئیں؟" میں نے پوچھا۔ میری آواز میں خشکی تھی۔

"پہلے میں نہیں مانی تھی کیونکہ ایک ایسے مرد سے... جو عمر میں مجھ سے دگنا ہو اور جو سفید ڈاڑھی اور چلنے کے لیے ہاتھ میں چھڑی رکھتا ہو، اس سے میں نے شادی کا سوچا بھی نہیں ...بے شک وہ نام کی شادی ہو اور محض کاروباری نقطۂ نظر سے کی جا رہی ہو۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ اس کی پیشکش ...ہے اور میں ایک سال کے لیے اس سے شادی کر ...وں۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"میں نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ اس کی بات مان ...لی۔ اس نے ایک باقاعدہ تقریب میں مجھ سے سول میرج ...کر لی مگر جلد ہی مجھے پتا چل گیا کہ میں نے اپنی زندگی کی بدترین حماقت کی تھی۔ اس سے پہلے اس کا رویہ ایک شریف آدمی کا سا تھا۔ وہ جب میرے ساتھ کسی ہوٹل کے ایک کمرے میں رکتا تھا تو کسی صوفے پر سو جاتا اور اس نے کبھی میرے لیے مسئلہ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر اس نام نہاد شادی کے بعد اس میں تبدیلی آنے لگی۔ اس نے شکایت کی کہ صوفے پر لیٹنے سے اس کے پیروں میں تکلیف ہو جاتی ہے۔ میں نے اسے اجازت دے دی کہ وہ بستر پر لیٹ جایا کرے۔ اس کے بعد وہ مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے مجھے یاد دلایا کہ ہم قانونی طور پر میاں بیوی ہیں۔ میں نے اس کی بات مسترد کر دی۔ ہمارے درمیان یہ کشمکش چند مہینے تک جاری رہی پھر ہم الگ ہو گئے۔"

"اور تب سے وہ تمہارا تعاقب کر رہا ہے؟"

"نہیں... اس کا آغاز اس وقت ہوا جب میں نے امریکا جانے کا فیصلہ کیا اور ٹائی ٹینک کا ٹکٹ خریدا، تب میں نے اسے دوبارہ دیکھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں وہیں رہوں۔"

میں نے پڈنگ کی ایک ڈش اور منگوائی تھی اور اس بوڑھے جاسوس کے کیسز کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ "کیا وہ صرف طلاق کے کیسز لیتا تھا؟"

"نہیں... نہیں۔ بعض افراد اسے دولت مند بیواؤں کو شادی کے لیے آمادہ کرنے کو بھی کہتے تھے۔ مجھے اسی قسم کے دو کیس یاد ہیں۔ ایک کیس میں ہمیں ایک بھاگ جانے والی بیوی اور اس کے آشنا کو تلاش کرنے کا کام ملا تھا۔ ہم ان دونوں کے تعاقب میں پیرس جا پہنچے تھے۔" اس کے ہونٹوں پر وہ وقت یاد کر کے مسکراہٹ آ گئی تھی۔ "ہم نے وہاں کچھ اچھا وقت گزارا تھا۔"

"تب تم میرا تحفظ کیوں حاصل کرنا چاہ رہی ہو؟"

احتیاطاً

ایک آدمی دوسرے آدمی سے شرط لگا بیٹھا۔ اگر وہ سیون اپ کی دو درجن بوتلیں یکے بعد دیگرے پی جائے تو اسے پانچ سو روپے انعام دیا جائے گا۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکا تو نہ صرف فریق مخالف کو پانچ سو روپے جرمانہ دینا پڑے گا بلکہ بوتلوں کی قیمت بھی ادا کرنی ہو گی۔ شرط لگانے والا تھوڑی دیر کے لیے بازار چلا گیا۔ واپس آ کر دو درجن سیون اپ حسب شرط پی گیا۔

وہاں کھڑے ایک آدمی نے اس سے پوچھا کہ تم بازار کیا کرنے گئے تھے؟ اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

"میں نے کبھی پہلے اتنی بوتلیں نہیں پی تھیں۔ اندازہ کرنے کے لیے میں احتیاطاً دو درجن بوتلیں پی آیا ہوں۔"

''وہ اس سے زیادہ چاہتا تھا، جتنا میں نے اسے دیا۔'' اس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''جب میں نے اسے جہاز پر دیکھا تو میں ڈر گئی کہ وہ مجھے امریکا جانے سے روکنے کے لیے لڑائی کرے گا۔''

''نیویارک میں لنگر انداز ہونے سے پہلے میں ایک بار پھر اس سے بات کروں گا۔'' میں نے وعدہ کیا۔ ''ممکن ہے، میں اسے قائل کرلوں کہ وہ تمہیں اکیلا چھوڑ دے۔''

جب ہم گیارہ بجے اپنے اپنے کیبنوں میں جانے کے لیے نکلنے لگے تو آرکسٹرا ''دی ٹیلز آف ہون مان'' بجا رہا تھا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے کیبن میں جانے سے پہلے ذرا چہل قدمی کرلوں۔ میں نے زیادہ کھالیا تھا اس لیے میں نے بوٹ ڈیک کا رخ کیا۔ درجہ حرارت صفر سے نیچے جاچکا تھا اور ہوا میں ایک کاٹ سی آگئی تھی۔ وہاں ٹہلتے ہوئے مجھے اوپر مستولوں پر ٹنگے غریب ملاحوں کا خیال آیا جو تاریکی میں برفانی تودے دیکھنے کی کوشش کررہے تھے۔ کچھ دیر بعد میں نے ڈیک اے فرسٹ کلاس اسموکنگ روم کا رخ کیا۔ وہاں مجھے بار روم میں فرٹیل دکھائی دیا۔ ے تھک کر رات ہوتے ہی کیبن میں چلی گئی تھی۔ میں نے ارادہ تبدیل کیا اور فرٹیل کے پاس جا بیٹھا۔ وہ نائٹ کیپ نامی وھسکی سے لطف اندوز ہو رہا تھا جو میری بھی پسندیدہ تھی۔ میں نے ایک گلاس کا آرڈر دیا اور پھر ہم جاسوس کہانیوں پر بات کرنے لگے۔ اچانک ہی جہاز کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔

''برفانی تودہ!'' کوئی باہر سے چلایا اور ہم سب افراتفری میں باہر کی طرف بھاگے۔ میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا تودہ تھا جس سے ٹائی ٹینک رگڑ کھاتا گزر رہا تھا۔ اس کی بلندی ڈیک اے کے برابر تھی اور یہ دُھند کی وجہ سے نظر نہیں آسکا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ ہم بال بال بچے ہیں۔'' فرٹیل نے کہا۔ ''جہاز اسے چھوتا ہوا گزرا ہے۔''

تشویش کی کوئی بات نہ محسوس کرتے ہوئے ہم واپس بار روم میں آئے اور اپنے گلاس ختم کرنے لگے۔ کوئی دس منٹ بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے گلاس میں وھسکی کی سطح جہاز کے اگلے حصے کی طرف جھکنے لگی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اس بات پر غور کرتا، اچانک ہی مارگو کولیئر وہاں آگئی۔ وہ بھاگتی ہوئی آئی تھی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

''کیا ہوا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''میں ہر جگہ تمہیں دیکھتی رہی ہوں مسٹر ہومز۔'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''میرا شوہر لفٹ والے خلا... میں گر گیا ہے، وہ مر چکا ہے۔''

یہ درست تھا۔ ایک فرسٹ کلاس کے اسٹیوارڈ نے لفٹ کا دروازہ کھلا دیکھ کر اندر جھانکا تو اسے چار منزل نیچے لفٹ کی چھت پر پڑی لاش دکھائی دی تھی۔ جب میں اور فرٹیل وہاں پہنچے تو پیری گلاسٹ کی ٹوٹی پھوٹی لاش نکال لی گئی تھی۔ اس کا چہرہ مسخ ہوگیا تھا اور جب اسے راہ داری میں لٹایا جارہا تھا تب میں بڑی مشکل سے اس کی طرف دیکھ سکا تھا۔ خاصا عرصہ ہوا میں نے لاشیں دیکھنا چھوڑ دی تھیں۔

''مجھے ذرا آگے جانے دو۔'' میں نے وہاں موجود جہاز کے عملے سے کہا۔

''معاف کرنا سر... تم لفٹ کے خلا کے زیادہ ہی قریب ہو۔'' ایک افسر نے مجھ سے کہا۔

''میں قریب سے اس کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''سر! یہاں کچھ نہیں ہے... سوائے لفٹ کے تاروں کے۔''

اس کا کہنا درست تھا۔ لفٹ کے اوپر سوائے رسّوں اور تاروں کے کچھ نہیں تھا۔

''کیا تم اسے اوپر لا سکتے ہو؟ میں اس کی چھت کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔''

فرٹیل مسکرایا۔ ''کیا تم اس کی چھت پر کوئی ہتھیار تلاش کرنا چاہتے ہو مسٹر ہومز؟''

میں نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ میں اوپر آتی لفٹ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی چھت خالی تھی۔ اس پر کچھ نہیں تھا' میرا اندازہ تھا کہ اس لفٹ کو صرف فرسٹ کلاس کے مسافر استعمال کرتے تھے، عملے کے لیے سروس لفٹ اور سیڑھیاں تھیں۔

''یہ جہاز آگے کی طرف کیوں جھک رہا ہے؟'' کسی آدمی نے سوال کیا۔

''ہم ابھی اس کی وجہ تلاش کررہے ہیں۔'' ایک آفیسر نے جواب دیا۔ پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ ہم آگے کی طرف جھک رہے تھے۔ مجھے اپنے گلاس کی وھسکی یاد آگئی۔ کیا جہاز کے اگلے حصے میں کوئی مسئلہ ہوا تھا؟ ڈائننگ روم کی جانب سے آرکسٹرا کی آواز بہ دستور آرہی تھی۔ اس دوران میں ماہر روحانیات مسٹر فرنیکلن ..... افراتفری میں سیڑھیوں سے نمودار ہوا۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''جہاز کا عملہ کشتیاں اتار رہا ہے۔''

اسی اثنا میں کپتان اسمتھ خود بھی وہاں آگیا۔ اس نے

دیکلن کا سوال سن لیا تھا۔ ''یہ صرف احتیاطی تدبیر ہے۔'' نے تسلی دی۔ ''ورنہ جہاز پانی پر تیر رہا ہے۔''

''یہ برفانی تودے کی وجہ سے ہو رہا ہے؟'' فرٹیل نے ہا کیا۔

''ہاں... میری درخواست ہے کہ تم سب اپنے گھر کو جمع کرو اور اپنی حفاظتی کشتیوں کے اسٹیشن تک چلے جاؤ۔'' کپتان اسمتھ بولا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ ی خطرہ ہے۔

مس کولیئر دہشت زدہ نظر آنے لگی تھی۔ ''یہ جہاز ڈوب نہیں سکتا۔ اس میں دُہرے واٹر پروف خانے ہیں۔ میں نے ا کے بارے میں پڑھا ہے، مجھے جہاز کی ساخت کا اندازہ ہے۔''

''پلیز! میری ہدایات پر عمل کرو۔'' اس پر کپتان نے ذرا تیز لہجے میں کہا...... ''اس لاش کو اسی جگہ چھوڑ دو۔''

''مجھے ے کو لانا ہوگا۔'' فرٹیل بولا اور اپنے کیبن کی طرف بھاگا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اب وقت کم رہ گیا تھا۔ کم ے کم کپتان کے لہجے سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ چند منٹ کے اندر ہم سامان اور ے سمیت کشتیوں والے حصے میں تھے۔ اس نے اپنے شوہر کو اتنی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا جیسے اسے کہیں بھی جانے کی اجازت نہیں دے گی۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

''کیا یہاں پر تمام مسافروں کے لیے کافی لائف بوٹس ہیں؟'' ے نے سوال کیا۔

میرا خیال تھا کہ کشتیاں کافی تھیں کیونکہ ٹائی ٹینک اپنی پوری گنجائش کے صرف دو تہائی عملے اور مسافروں کو لے جارہا تھا۔ اس لحاظ سے کشتیاں ایک تہائی زیادہ ہی تھیں۔ بارہ بج کر پچیس منٹ پر کپتان کی طرف سے حکم آیا کہ عورتیں اور بچے جہاز چھوڑ دیں۔ میں حیران تھا کہ ابھی برفانی تودے سے تصادم کو محض ایک گھنٹا ہی گزرا تھا۔

''جیکو ئیس!'' ے چیخی۔ فرٹیل اسے نزدیکی لائف بوٹ کی طرف لے جارہا تھا۔

''اب کیا خیال ہے؟'' فرٹیل نے ے کو کشتی میں بٹھا کر مجھ سے کہا۔ ''کیا ہم مقتول کے پاس واپس چلیں؟''

''قتل... تمہارا خیال ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے؟'' میں نے واپس جاتے ہوئے کہا۔

''یہ تو بعد میں پتا چلے گا۔'' وہ بولا۔

''تم نے کچھ نوٹ کیا ہے؟''

''ہاں، اس کی چھڑی غائب ہے۔'' اس نے میرے

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مارچ 2009ء کی پرکاریاں

دوراہا

آخری صفحات کے لیے کاشف زبیر کی یادگار داستان

عہدِ ہارون

عباسی دور کے معروف اور ہردل عزیز خلیفہ کے اقتدار کا احوال

حضرت صالحؑ

ایمان افروز واقعات۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تحقیق

سنگین مذاق

مرزا امجد بیگ کی ڈائری میں محفوظ دلچسپ مگر عبرت اثر کیس

اس کے علاوہ

دیوتا، اناڑی، محفل شعر و سخن، آپ کے خط

نیز

طاہر جاوید مغل، ڈاکٹر شیر شاہ سید، احمد صغیر صدیقی، یعقوب جمیل و دیگر مصنفین کی مختصر کہانیاں

اور وہ سب جو آپ سسپنس میں دیکھنا چاہتے ہیں!

تازہ شمارہ فوری حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 5895313 فیکس: 5802551

ساتھ جلتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اسے صرف ایک بار دیکھا ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ چھڑی کی مدد کے بغیر نہیں چل سکتا۔''

''درست!'' میں نے تائید کی۔ ''میں نے بھی اسے دیکھا ہے اور وہ اس چھڑی کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا۔ چھڑی لفٹ کی چھت پر نہیں تھی۔ لفٹ اور دیواروں کے درمیان اتنی جگہ نہیں ہے کہ چھڑی اس میں پھنس جائے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ حادثاتی طور پر خلا میں نہیں گرا تھا۔''

ہم سیڑھیوں سے اوپر پہنچے اور اپنے مطلوبہ فرد کو دیکھ لیا۔ وہ فرینکلن تھا۔ ہماری آہٹ پر وہ بدک کر ہماری طرف مڑا اور اس نے جلدی سے ریوالور اپنے کوٹ میں چھپا لیا۔ اس نے غرا کر کہا۔

''تم لعنتی ہو مز... تم اس جہاز کے ساتھ نیچے جاؤ گے۔''

''ہم سب جائیں گے مسٹر فرینکلن۔ ابھی صرف عورتوں اور بچوں کو اتارا جا رہا ہے۔ ہم سب مردوں کو یہاں رکنا ہوگا۔ اصل بات یہ ہے کہ گلاسٹ تمہارے تعاقب میں تھا۔ تم کسی سے فراڈ کر کے بھاگے ہو۔ تم نے یہ بات جان لی اور کسی بہانے سے اسے اپنے کیبن میں لے گئے۔ وہاں اسے اپنی شیشے کی تیز چمک سے عارضی طور پر اندھا کر دیا اور پھر اسے چھوڑنے کے بہانے لفٹ تک لائے۔ لفٹ نیچے بھیج کر تم نے اسے تاریک خلا میں دھکا دے دیا۔ تم سے صرف ایک غلطی ہوئی کہ تم اس کی چھڑی لانا بھول گئے۔ اور وہ اب بھی ممکنہ طور پر تمہارے کمرے میں ہے۔ اس کی سابقہ بیوی سمجھ رہی تھی کہ وہ اس کے تعاقب میں ہے۔ اصل میں وہ تمہاری نگرانی کر رہا تھا مسٹر فرینکلن۔''

جہاز نے اچانک آگے کی طرف جھکاؤ لیا اور ہم سب سیڑھیوں کی ریلنگ سے جا ٹکرائے۔

فرینکلن مسکرایا۔ ''میں نے یہاں سے نکلنے کا راستہ تلاش کر لیا ہے۔ میں اپنے کمرے میں جا کر عورت کا لباس پہنوں گا اور کسی بھی کشتی میں بیٹھ جاؤں گا۔''

اس نے یہ کہتے ہی اچانک ریوالور سے میرا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ اسی لمحے فرنیل اس کا ارادہ بھانپ کر اس کے اور میرے درمیان میں آ گیا۔ جو گولی میرے لیے چلائی گئی تھی، وہ اس کے جسم میں اتر گئی۔ وہ فرینکلن کی طرف جھپٹا اور اسے لے کر سیڑھیوں کی ریلنگ سے نیچے اتر گیا۔

☆☆☆

اس یادداشت کا آخری حصہ میں بہت دکھ سے لکھ رہا تھا۔ فرینکلن اور فرنیل تاریکی میں کسی نامعلوم جگہ جا گرے تھے۔ میں اندھیرے میں ان کو تلاش کرتا رہا۔ اس دوران میں جہاز بہ تدریج سامنے کی طرف جھک رہا تھا۔ پھر میں اوپری عرشے پر پہنچا جہاں عورتوں اور بچوں کو کشتیوں میں اتارا جا رہا تھا۔ اس طرف بھی تاریکی بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ بحری جہاز کی برقی طاقت آہستہ آہستہ جواب دے رہی تھی۔ اچانک کسی نے عقب سے میرا بازو پکڑا اور مجھے ایک کونے میں اتاری جانے والی کشتی کی طرف لے گیا۔ اس میں خاصی جگہ تھی اور اسے ابھی سے نیچے اتارا جا رہا تھا۔

''سر! اس میں ابھی درجن بھر سے بھی زیادہ افراد کی گنجائش ہے۔ تم اس میں جا سکتے ہو۔''

''میں نہیں جاؤں گا۔'' میں نے مزاحمت کی۔

لیکن مجھے بازو سے پکڑنے والے نے اچانک ہی زور سے دھکا دیا اور میں چار فٹ نیچے کشتی میں جا گرا۔ فوراً ہی دو ہاتھوں نے مجھے سنبھال لیا اور کسی نے مجھے لائف جیکٹ دی جو میں نے پہن لی۔ چند منٹ کے بعد ہماری کشتی ٹائی ٹینک سے دور جا رہی تھی۔ ہمارے اردگرد درجنوں کشتیاں تھیں اور اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ ٹائی ٹینک پر اتنی کشتیاں نہیں تھیں جتنی کہ ہونی چاہیے تھیں۔ اس وجہ سے بے شمار افراد جو جہاز سے نکل کر اپنی جان بچا سکتے تھے جہاز کے ساتھ ڈوبنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ بہت بڑا سانحہ تھا جو برسوں گزر جانے کے بعد بھی میرے ذہن میں پوری طرح موجود ہے۔

اس کے ایک گھنٹے بعد بھی میں نے نصف میل کے فاصلے سے عظیم الشان ٹائی ٹینک کو ڈوبتے دیکھا۔ ہزاروں دوسرے افراد کے ساتھ اس میں ایک مقتول جاسوس، ایک قاتل شعبدے باز اور ایک بہت پیارا انسان تھا جس نے اپنی جان مجھ پر قربان کر دی۔ میں اس کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔ دو گھنٹے بعد ایک بحری جہاز یو ایس ایس کارپاتھیا نے ہماری کشتی کے لوگوں کو سمندر سے نکال لیا تھا۔ دوسری بے شمار کشتیاں بھی اس بحری جہاز پر بار کی گئی تھیں۔

دو دن بعد ہم نیویارک میں تھے۔ مجھے معلوم تھا مارگو کو لیئر بھی بچ گئی تھی لیکن میں اسے دوبارہ نہیں دیکھ سکا۔

(یہ نوٹ ڈاکٹر واٹسن کی طرف سے ہے۔ 1918ء میں جب پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی تو یہ کہانی شائع نہ ہو سکی تھی کیونکہ میرا پبلشنگ ایجنٹ آرتھر کانن ڈائل روحانیت کی طرف مائل ہو گیا تھا اور اس نے ایسی کہانی شائع کرنے سے انکار کر دیا جس میں ایک ماہر روحانیات کو مجرم اور قاتل دکھایا جائے۔ اس وجہ سے یہ کہانی تا حال غیر شائع شدہ ہے)

ایک شوہر کی اپنی بیوی سے شدید محبت کا عالم – وہ یہ محبت اور شدت قائم رکھنا چاہتا تھا... اور اس لیے اپنی بیوی سے علیحدگی کا متمنی تھا!

بنیاد

احمد صغیر صدیقی

بجلی صرف پانچ منٹ کے لیے گئی تھی مگر آئی بہت غلط وقت پر!

جان مارسی سوپ اسپون ہاتھ میں لیے رات کا کھانا شروع کرنے کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ خاصا بھوکا تھا۔

اس کی بیوی انجیلا کچن سے سوپ کی پلیٹ لے کر آئی اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھی ہی تھی کہ مکان کی لائٹیں جھپکیں اور پھر گل ہو گئیں۔

''یہ لو۔'' انجلا کے منہ سے نکلا۔ ''اب ذرا تم جا کر لیونگ روم کی کھڑکی سے جھانکو... ہمارے ہمسائے کی لائٹیں جل رہی ہیں یا یہ مصیبت صرف میرے ہی گھر پر نازل ہوئی ہے۔''

جان نے فرماں برداری سے چمچ رکھ دیا اور اندھیرے میں لیونگ روم کی طرف گیا پھر آواز لگائی۔ ''سب طرف اندھیرا ہے۔ سڑک کی بجلی بھی بند ہے۔'' اس نے کہا۔ ''شاید یہ کوئی جنرل پاور فیلیئر ہے۔''

وہ اندھیرے میں اپنی بیوی انجیلا کو بھی ڈائننگ روم میں چلتے دیکھ رہا تھا۔ ''میں نے موم بتی نکال لی ہے۔'' ادھر سے وہ بولی۔ ''ذرا کافی ٹیبل سے ماچس اٹھانا۔''

جان نے احتیاط سے کافی ٹیبل کو تلاش کیا اور اس پر ہاتھ پھیرا۔ ماچس ہمیشہ ایش ٹرے کے پاس ہی رکھی ہوتی تھی۔ ابھی اس کا ہاتھ وہاں پڑا ہی تھا کہ ڈائننگ روم میں کسی ماچس کی تیلی کا شعلہ بھڑکا۔ پھر جلد ہی دو موم بتیاں جل اٹھیں۔ انہیں ٹیبل پر موجود کینڈل اسٹک میں رکھ دیا گیا جس سے اندھیرے میں کمی ہوگئی تھی۔

''رہنے دو جان!'' انجیلا نے کہا۔ ''مجھے ایک ماچس میز کی دراز سے مل گئی ہے۔ آجاؤ اور اپنا سوپ پیو۔ ورنہ یہ ٹھنڈا ہوجائے گا۔''

مگر اس کے ڈائننگ ٹیبل تک پہنچنے سے پہلے ہی بجلی آگئی۔

''اوہ!'' انجیلا نے اطمینان کی سانس لی۔ اس نے موم بتیاں نہیں بجھائی تھیں۔

جان نے کرسی پر بیٹھ کر اپنا چمچ اٹھایا مگر پھر کچھ سوچتے ہوئے اسے دوبارہ رکھ دیا۔ اس نے سامنے بیٹھی انجیلا کو دیکھا جس کی نیلی آنکھیں اسی کی سمت نگراں تھیں۔

''کیوں؟ کیا سوپ ٹھنڈا ہوگیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''میرا تو ٹھیک ہے۔''

جان نے نفی میں گردن ہلا دی۔ 'کیا ہی اچھی ہے یہ عورت۔' اس نے سوچا۔ 'اور میں ہوں کہ دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگتا ہوں۔' اس کے اندر نرم جذبات نے کروٹ لی اور ایک غیر معمولی شرمندگی کی لہر سے مغلوب ہوکر اس نے سر جھکا لیا۔

''نہیں... یہ ٹھنڈا نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''بس مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''یہ یلو پی سوپ ہے جان... تمہارا پسندیدہ!''

''مجھے معلوم ہے۔'' اس نے سر اٹھایا۔ ''اور انجیلا... تم بھی میری پسندیدہ ہو۔''

انجیلا کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''اب ان باتوں کو مت شروع کرو۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

جان نے کہا۔ ''میں ایک احمق آدمی ہوں انجیلا! میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں دوسری عورتوں کے چکر میں پڑ جاتا ہوں۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔''

انجیلا نے اپنے آنسوؤں کو ہاتھ سے صاف کیا پھر وہ اٹھ گئی۔ ''تم نے میری بھوک ختم کر دی ہے۔'' اس نے کہا اور سوپ کی دونوں پلیٹیں اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔

☆☆☆

''میں اسے طلاق دینا چاہتا ہوں۔'' جان ماری نے دوسرے دن اپنے وکیل سے کہا۔

وکیل بارلی نے جو جان کا دوست بھی تھا، اس کی طرف ناپسندیدگی سے دیکھا۔ ''طلاق دینا چاہتے ہو؟'' اس نے کہا۔ ''یعنی اسے چھوڑنا چاہتے ہو؟''

''ہاں!''

''جان... مذاق مت کرو۔ پورے قصبے میں سبھی اُس سے کہتے ہیں کہ اسے چاہیے تمہیں طلاق دے دے... اور مجھے معلوم ہے۔ میرے ساتھ مذاق مت کرو۔ مجھے یاد ہے وہ مقدمہ جو تم پر معاہدہ شکنی کے سبب چلا تھا اور میں نے بڑی مشکل سے اسے سیٹل کرایا تھا۔''

''وہ مجھے بھی یاد ہے۔ اسے چھوڑو۔ میں انجیلا کو طلاق دینا چاہتا ہوں اور اس ضمن میں مجھے تمہارا مشورہ درکار ہے کہ میں کیا کروں؟ یہ ایک سادہ سی بات ہے۔''

''نہیں... اتنی سادہ بھی نہیں۔ آخر کیوں؟''

''کیا؟''

''میں پوچھ رہا ہوں تم انجیلا کو طلاق کیوں دینا چاہتے ہو؟ کئی برس سے تو تمہاری گاڑی اسی طرح چل رہی ہے۔''

''میں اسے اس لیے طلاق دے رہا ہوں کیونکہ وہ مجھے طلاق نہیں دے رہی ہے۔ میں اب اس سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔''

''وہ تمہیں کیوں نہیں چھوڑ رہی ہے؟''

''تم مان لوگے... اگر میں بتاؤں؟''

''کیوں نہیں..''

''وہ ابھی تک مجھے چاہتی ہے۔ اسی لیے وہ طلاق نہیں دے رہی ہے۔''

''یہ کوئی سبب نہیں۔'' بارلی نے کہا۔

''وہ نہیں چاہتی کہ کوئی دوسری عورت میرے گھر آئے۔''

''کیا یہ بات خود انجیلا نے کہی ہے؟''

''نہیں... الفاظ میں تو نہیں... مگر میں سمجھتا ہوں۔ اس کے احساسات یہی ہیں۔''

''یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟''

''اس کے رویّے کے پیشِ نظر جو ان دنوں میں دیکھ رہا ہوں۔''

''یعنی تم ذہنی اذیت رسانی کو بنیاد بنانا چاہتے ہو؟''

''تم سمجھ سکتے ہو۔''

''دیکھو، اس کے لیے کوئی مضبوط جواز ضروری ہے۔''

''یہ جواز کیا کم ہے کہ میں بس اسے طلاق دے رہا ہوں۔''

''میں نے کہا نا... تمہارے پاس جواز ہونا چاہیے اور ... کے پاس جواز ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ تم عورتوں کے ... تمہارے پاس کوئی گراؤنڈ نہیں۔'' بارلی نے رک کر ... سے پوچھا۔ ''ویسے یہ خیال تمہارے دماغ میں کب آیا؟''

جان نے کہا۔ ''کل رات... ڈنر ٹیبل پر!''

''کیا ہوا تھا؟''

''بجلی چلی گئی تھی۔''

''اچھا؟ مگر اس سے...''

''یہ ایک اہم بات تھی۔'' جان نے بارلی کی بات کاٹ ... ''بجلی بس ذرا سی دیر کے لیے گئی تھی اور انہی چند لمحوں ... بارلی' میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کے دل میں ... کے لیے کیا ہے۔''

''خوب! اندھیرے میں تم پر انکشافات ہوئے تھے۔ ... کیا کیا تھا اس نے؟''

''ابھی میری بات جاری ہے۔'' جان نے کہا۔ اس نے لمبی سانس بھری۔ ''میں تمہیں بتاتا ہوں... انجیلا اسی ... میرے لیے سوپ لائی تھی۔ ہم اسے کھانے ہی والے ... کہ لائٹ چلی گئی تھی۔''

''آگے۔''

''پھر...'' جان نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''پھر مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ مجھے مار ڈالنا چاہتی ہے۔''

''کیا کہا... مار ڈالنا چاہتی تھی؟''

''ہاں، میں نے یہی کہا ہے۔ وہ مجھے زہر دینا چاہتی تھی۔ اس نے میرے سوپ میں زہر ملا دیا تھا۔''

بارلی نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''مگر وہاں تو اندھیرا ...''

''خدا کا شکر ہے کہ بجلی چلی گئی تھی۔ وہ نہ جاتی تو میں مرچکا ... میں نے سوپ پی لیا ہوتا۔'' بات کرتے ہوئے پہلی بار ... مسکرایا۔ ''میرے سوپ میں یلو فاسفورس ملا ہوا تھا۔''

''... تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''میں نے تھوڑی سی کیمسٹری پڑھی ہوئی ہے۔ بجلی چلی ... تھی۔ اس کے جاتے ہی میرے سوپ نے چمکنا شروع کر ... ۔''

بارلی نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''قتلِ عمد!''

دعائے مغفرت

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بلاشبہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی بندے کے والدین وفات پاجاتے ہیں یا دونوں میں سے ایک فوت ہوجاتا ہے، اس حال میں کہ یہ شخص ان کی زندگی میں ان کی نافرمانی کرتا رہا اور ستاتا رہا اب موت کے بعد ان کے لیے دعا کرتا رہتا ہے اور استغفار کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے والوں میں لکھ دیتا ہے۔'' (بیہقی)

(کوئٹہ سے خالدہ کی عنایت)

''کیا یہ گراؤنڈ طلاق کے لیے بہتر نہیں؟''

''بہت زیادہ!'' بارلی نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

''اور میری پیاری انجیلا نے سوپ کی سمت سے میری توجہ ہٹانے کے لیے بڑی پُھرتی سے موم بتیاں جلائی تھیں تاکہ پلیٹ کی چمک غائب ہوسکے۔'' جان نے توقف کے بعد کہا۔ ''اب یہ بات میں بس تمہیں بتا رہا ہوں... اگر تم انجیلا سے مل کر یہ بتا دو کہ تمہیں اس کی اس کوشش کا علم ہوچکا ہے جو اس نے کل رات مجھے ہلاک کرنے کے لیے کی تھی، تو ممکن ہے شرم کے زیرِ اثر وہ مجھے طلاق دینے پر تیار ہوجائے۔ مگر میں یہ نہیں چاہوں گا کہ پولیس کو اس کا پتا چلے۔''

''وہ کیوں؟'' وکیل نے پوچھا۔ ''یہ بہرحال قتل کی کوشش...''

''اس لیے کہ انجیلا اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اس قدر کہ میری جان لینا چاہتی ہے۔ وہ ہر حال میں مجھے اپنا رکھنا چاہتی ہے اور... میں بھی اسے چاہتا ہوں... اور اب تو پہلے سے بھی زیادہ چاہتا ہوں۔ میں اس میں پولیس کو ملوث نہیں کرنا چاہتا۔''

بارلی نے اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بالآخر اس نے کہا۔ ''اگر تم اور انجیلا ایک دوسرے سے اتنی ہی محبت کرتے ہو تو پھر ساتھ کیوں نہیں رہ سکتے... اس طلاق کی کیا ضرورت ہے؟''

جان ماری اپنی کرسی سے اٹھ پڑا۔ اس نے وکیل کی سمت شرارت بھری نظروں سے دیکھا اور مسکرایا۔

''سبھی جانتے ہیں کہ میں عورتوں کا رسیا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''مگر عورتوں کا رسیا ہونا ایک الگ بات ہے اور احمق ہونا دوسری بات۔ میں احمق نہیں ہوں... کون کہہ سکتا ہے کہ دوسری بار بھی اس موقعے پر بجلی چلی جائے گی۔''

پہلا رنگ

وجہ فساد

کاشف زبیر

شامی ' تیمور' نوشی دادا ...اور فولاد خان ! جی ہاں آپ کے پسندیدہ کرداروں کا مسکراہٹیں بکھیرتا رنگ- لیکن اس بار دادا نے انہیں ایک آسیب زدہ عمارت کا مشن سونپا ہے-ذرا دیکھیے تو ...کہ آسیب ان سے ڈر کر بھاگا یا یہ آسیب سے مرعوب ہوئے !

شامی نے غور سے فولاد خان کو دیکھا جو اکتوبر کے آخر میں اپنی چوکی میں انگیٹھی جلائے بیٹھا تھا۔ ''خیریت فولاد خان... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''امارا طبیعت ایک دم ٹھیک اے۔'' اس نے منہ لٹکا کر کہا۔

''پھر یہ انگیٹھی.. ابھی تو اتنی سردی نہیں ہوئی ہے؟''

''ام کو سردی لگ رااے... ام نے روح دیکا اے۔''

''روح... تم نے روح دیکھی ہے؟'' شامی دنگ رہ گیا۔

''کس کی روح؟''

''امارے دادا شریف کی روح!''

''دادا شریف!'' شامی نے غور کیا۔ ''وہ پہلے سے شریف تھے یا روح بن کر شریف ہوئے؟''

''آپ مذاق فرماتا اے شامی صیب!'' فولاد خان نے دانت نکالے۔ ''ام احترام سے ان کو دادا شریف فرماتا اے... جیسے اوچ شریف اور ٹھٹھہ شریف۔''

شامی نے ان جگہوں کی شرافت کے بارے میں بحث سے گریز کیا۔ ''فولاد خان... اس سارے معاملے کا انگیٹھی سے کیا تعلق ہے؟''

''ام جب روح دیکھتا ہے، ام کو سردی لگتا اے۔''

''تم نے روح کب دیکھی؟''

''کل رات ام اپنے کوارٹر کا لیٹرین کے لیے جارا تھا۔ ادھر کھلے میں دادا شریف نظر آیا... ام عادت کے مطابق سلام کر کے اندر چلا گیا... وہ تو جب ام بیٹا تو ام کو یاد آیا، دادا شریف تو چار سال پہلے انتقال فرما چکا اے۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''جب ام فارغ مارغ او کر آیا تو دادا شریف غائب تھا۔''

''فولاد خان! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔''

''غلط فہمی!'' فولاد خان چمک کر بولا۔ ''غلط فہمی کا چھ فٹ قد... سات انچ کا مُوچ اور آٹھ فٹ کا پگڑی اوتا اے۔''

''اچھا یار! میں نے مان لیا وہ تمہارے دادا تھے... مگر یہ انگیٹھی کا ڈراما کب تک چلے گا؟''

''کل تک... ام جب بی روح دیکتا اے، ام کو دو دن سردی لگتا اے۔''

''یہ بتاؤ کہ دادا جان کو ہفتہ وار رپورٹ میں ہماری آمد و رفت کے اوقات کیا بتائے ہیں؟''

فولاد خان مسکرانے لگا۔ ''ام نے پکا کام کیا اے... ام نے سب اوقات دس بجے کر دیا اے۔''

''سارے دنوں کے اوقات؟'' شامی اچھل پڑا۔ ''احمق آدمی! پرسوں تو میں گھر سے نکلا ہی نہیں تھا... تم نے اس روز بھی یہی لکھ دیا؟''

فولاد خان نے سر کھجایا۔ ''ام بُھول گیا تھا۔''

''مروا دیا تم نے... اور میں نے جو پرچہ تم کو لکھ کر دیا تھا، اس کا کیا کیا؟''

''وہ ام نے غلطی سے آگ جلانے کے واسطے استعمال کر لیا۔'' فولاد خان ہچکچا کر بولا۔

''اب دیکھو، دادا جان میرا کیا حشر کرتے ہیں۔'' شامی نے بلبلا کر کہا۔ ''مگر ایک بات طے ہے، دادا جان سب سے پہلے مجھ پر مالی وار کریں گے۔ یعنی میرا وظیفہ بند کر دیں گے اور میں تمہاری قسط بند کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔'' شامی کے لہجے میں دھمکی آگئی تھی جس نے فولاد خان کو دہلا دیا۔

''ارے نئیں شامی صیب... ام نے نواب صیب کو ایک دم

ٹیک رپورٹ دیا اے... جو آپ نے فرمایا، وہی ام نے فرمایا۔''
شامی کی پریشانی دور ہوگئی لہٰذا اسے مذاق سوجھنے لگا۔
''میرا خیال ہے فولاد خان، تمہارا آخری وقت قریب ہے۔''
''وہ کیسے شامی صیب؟'' اس نے خفگی سے پوچھا۔
''دیکھو نا... تمہیں دادا شریف کی روح دکھائی دی۔ اس کا اشارہ سمجھو... جلد تم اپنے آبا و اجداد میں شامل ہو جاؤ گے۔''
''ام آبا و اجداد میں شامل اوگا... وہ کیسے؟''
''انتقال کر کے۔''
''ام فوت اوجائے گا، پر کیسے؟ ام ٹیک اے... ابی کوئی دوشنی بھی نئیں اے... جو اے... وہ بی دادا شریف کی میربانی سے اے۔''
''موت کا کیا ہے، ابھی فرشتہ اجل آجائے اور تم یونہی مسکراتے ہوئے فوت ہو جاؤ۔''
فولاد خان نے جھرجھری لی۔ ''ابی امارا فوت اونے کا کوئی ارادہ نئیں ہے۔''
''ارادہ تو کسی کا نہیں ہوتا ہے۔'' شامی نے سرد آہ بھری۔ ''مگر موت ارادہ نہیں دیکھتی۔''
''شامی صیب! آپ ام کو ڈراتا اے؟''
''نئیں دوست! خبردار کر رہا ہوں۔'' شامی نے کہا اور مسکراتے ہوئے اندر چلا گیا۔ اس وقت دس ہی بجے تھے۔ اس نے رات کا کھانا باہر کھایا تھا اس لیے فوراً ہی اس کی طبلی ہوگئی۔ تیمور کھانے کے بعد کمرے میں ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس نے نواب صاحب کی طبلی سے آگاہ کیا۔
''تو کہاں تھا؟'' تیمور نے ٹانگیں ہلاتے ہوئے پوچھا۔
''یار! ڈنر پر گیا تھا۔''
''کس کے ساتھ؟'' تیمور سیدھا ہو گیا۔
''نوشی کے ہمراہ!''
تیمور کا جوش و خروش ختم ہو گیا۔ ''یقیناً تیری جیب خالی ہے... تو اس بے چاری کو اسی وقت ڈنر پر لے جاتا ہے۔''
''درست فرمایا... گزشتہ دو ہفتے سے ٹینا کو چار مہنگے ترین ڈنر کرا کے میں کنگال ہو چکا ہوں۔ اس لیے مجبوراً نوشی کے ساتھ جانا پڑا۔''
''وہ لمبے منہ والی ٹینا، نوشی کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے۔'' تیمور نے ملامت کی۔ ''اور تو اس پر خرچ کر کے نوشی کے خرچے پر ڈنر کرتا ہے۔''
''گھر کی مرغی دال برابر!''
''اور یہ بات نوشی کو پتا چل گئی تو؟''
''تو وہ گھر کی مرغی نہیں رہے گی، کڑک ہو جائے گی۔''

شامی نے بے زاری سے کہا اور باہر جانے لگا۔ ''میں ذرا پیٹی بھگت کر آجاؤں۔''
نواب صاحب کمرا خاص میں موجود تھے اور کسی فکر میں تھے۔ شامی نے سلام کرنے کے بعد دونوں ہاتھ پیٹ پر باندھے۔ ''دادا حضور... عالی مقام... غلام حاضر ہے اور گوشالی کا منتظر ہے۔''
''ہم نے تمہیں نوشی کی کار سے اترتے دیکھ لیا تھا اس لیے گوشالی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں حیرت ہے۔''
''وہ تو مجھے بھی ہے۔''
نواب صاحب نے خفگی سے اسے دیکھا۔ ''ہمیں اس پر حیرت ہے کہ نوشی جیسی تہذیب یافتہ اور شائستہ لڑکی نے تم میں کیا دیکھا ہے؟''
''وہ جو آپ نہیں دیکھ سکتے۔'' شامی نے سرد آہ بھری۔ ''غلام طلبی کی وجہ جان سکتا ہے؟''
''بیٹھو۔'' نواب صاحب نے سر ہلایا۔ ''ایک مسئلہ ہے۔''
''میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' شامی مستعد ہو گیا۔
''ہمارے ایک دیرینہ دوست ہیں، راجا عزیز الدین... وہ گزشتہ تیس برس سے انگلینڈ میں مقیم ہیں۔ ان کی صاحب زادی مونا عزیز الدین کل اسلام آباد آرہی ہے۔''
شامی لڑکی کا سن کر اندر سے خوش ہوا مگر اس نے متانت سے کہا۔ ''اس سلسلے میں میرے بارے میں کیا حکم ہے؟''
''دراصل یہ لڑکی اپنے باپ کی ایک عمارت فروخت کرنے آرہی ہے جو مری شہر میں نہیں واقع ہے اور اس نے اس سلسلے میں ہماری مدد طلب کی ہے۔''
''لڑکی نے خود؟'' شامی نے غور کیا۔
نواب صاحب نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔ ''مسئلہ یہی ہے کہ لڑکی نے خود رابطہ کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ راجا عزیز الدین گزشتہ دو سال سے برین ہیمرج کا شکار ہیں اور کسی سے بات کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ اس لیے وہ خود آرہی ہے۔''
''آپ کو یقین ہے کہ وہ آپ کے دوست کی بیٹی ہے؟''
''ہاں، وہ اس معاملے میں جھوٹ نہیں بول سکتی۔ کل ہم امیگریشن سے سب معلوم کر لیں گے۔''
''تب آپ کو اس عمارت سے متعلق ملکیت کے بارے میں شک ہے؟''
''نہیں... کوئی بھی جعلی کاغذات سے ہمیں دھوکا نہیں دے سکتا۔''
''تب آپ اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں؟''

کوئی ایک رسالہ مفت حاصل کریں

ہمارے ادارے سے شائع ہونے والے سسپنس، پاکیزہ، جاسوسی یا سرگزشت کوئی ایک پرچہ سال بھر مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ تو آج ہی ''سرگزشت'' کا تازہ شمارہ نزدیک بک اسٹال سے حاصل کریں۔ عالمی معیار کا اردو میں شائع ہونے والا واحد ڈائجسٹ ہے جس میں کہانیوں کے علاوہ انتہائی اہم معلوماتی تحریریں بھی ہوتی ہیں، جسے اردو ادب کی ممتاز شخصیات بطور خاص مطالعہ کرتی ہیں۔

''یہ بات بھی ہے... مگر ہماری دلچسپی کی وجہ کچھ اور ہے۔ ہم اس عمارت کو خریدنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ مونا عزیز الدین نے ہمیں پیشکش کی ہے۔''
''تب میرے لیے کیا حکم ہے؟''
''گزشتہ دنوں ہم نے نظام دین کو وہاں بھیجا تھا۔ وہ اس کے بارے میں تفصیل لایا ہے۔ محل وقوع اچھا ہے اور عمارت بھی ساخت کے لحاظ سے مضبوط ہے۔''
''آپ اسے ذاتی استعمال کے لیے حاصل کر رہے ہیں یا کسی اور مقصد کے لیے؟''
''ہم یہاں ایک اعلیٰ درجے کا ہوٹل بنانا چاہتے ہیں۔ کاروبار ہے۔''
''میرے لیے کیا حکم ہے؟'' شامی نے ایک بار پھر استفسار کیا۔
لیکن اس روز نواب صاحب اسے ستانے کے موڈ میں تھے۔ ''نظام دین کی تحقیق کے مطابق سب اچھا ہے مگر ایک بات ہے۔''
''وہ کیا؟'' شامی نے بے تابی سے پوچھا۔
''برخوردار! اتنی بے صبری مناسب نہیں ہے... پوری بات سن لیں آپ۔'' نواب صاحب خفگی سے بولے۔
''نظام دین کا کہنا ہے، اسے عمارت کے بارے میں پتا چلا ہے کہ وہ آسیب زدہ ہے۔''
''اور آپ نے اس کی بات مان لی؟''
''بات نظام دین کی نہیں ہے۔ اس نے جو سنا، آکر ہمیں بتا دیا۔''
''آپ نے آسیب والی بات پر یقین کر لیا؟ ویران عمارتوں کے بارے میں اس قسم کی کہانیاں تو مشہور ہو ہی جاتی ہیں۔'' شامی نے اعتراض کیا۔
''نہیں... مگر ہم جاننا چاہتے ہیں کہ عمارت کے بارے میں اگر ایسی بات مشہور ہے تو کیوں مشہور ہے۔ ہم اس پر اتنا سرمایہ لگانے جا رہے ہیں۔ ہمیں اس جگہ کے بارے میں سب معلوم ہونا چاہیے۔''
شامی نے ایک بار پھر سرد آہ بھر کر پوچھا۔ ''میرے لیے کیا حکم ہے دادا حضور؟''
اس بار نواب صاحب کو اس پر ترس آگیا۔ ''ہم چاہتے ہیں مونا عزیز الدین کے ساتھ جا کر اس عمارت کا جائزہ لو اور اس سے وابستہ کہانیوں کی حقیقت جانو۔''
''میں دادا حضور!'' شامی اچھل پڑا۔ اس لیے نہیں کہ نواب اسے کسی لڑکی کے ساتھ بھیج رہے تھے... بلکہ وہ کھوج لگانے والی بات پر اچھلا تھا۔ ''دادا حضور! میں ایک غریب سا طالب علم ہوں اور شرلاک ہومز سے میرا کسی طرح کوئی تعلق نہیں بنتا۔''
نواب صاحب نے اسے افسوس سے دیکھا۔ ''تم عمران اور کرنل فریدی کا ذکر بھی کر سکتے تھے مگر تمہارے ذہن پر تو مغرب سوار ہے... یاد بھی آیا تو شرلاک ہومز!''
''چلیے، میں نہ عمران کی طرح احمق ہوں اور نہ ہی کرنل فریدی کی طرح سپر مین ہوں۔ میں کس طرح معلوم کر سکتا ہوں؟''
''تمہیں کوئی فوجی راز نہیں چرانا ہے اور نہ ہی کسی آسیب کا کھوج لگانا ہے۔ تمہیں ایک عمارت کے بارے میں معلوم کرنا ہے کہ اس کو آسیب زدہ کس وجہ سے قرار دیا جاتا ہے۔''
''میں سمجھ گیا۔'' شامی نے مسرت سے کہا۔ ''کیا مونا عزیز الدین میرے ساتھ جانے پر آمادہ ہو جائے گی؟''
''کیوں نہیں... ایک تو وہ انگلینڈ کی پروردہ ہے، دوسرے ہم تمہارے ساتھ تیمور اور فولاد خان کو بھی بھیجیں گے۔ فولاد خان تم سب کا محافظ ہوگا۔''
''تیمور اور فولاد خان بھی۔'' شامی کی خوشی مر گئی۔
''ہاں، ورنہ آپ کو کام کی طرف کون متوجہ کرے گا۔''
شامی نے جلد ہی اپنے صدمے پر قابو پا لیا۔ اس نے دوسرے معاملات پر سوچا۔ ''دادا جان! عمارت بالکل ویران ہے؟''
''نہیں، وہاں ایک چوکیدار ہے اور عمارت کے بعض حصے رہائش کے قابل بھی ہیں۔ تم وہاں جا کر رکو گے اور اطمینان سے پوری عمارت کا جائزہ لو گے۔''
''دادا جان! آپ بلاوجہ مجھ سے بدگمان ہیں... میں اب

اتنا بھی غیر ذمے دار نہیں ہوں۔" شامی نے جلدی سے کہا۔
"ہمیں بھی معلوم ہے۔ تم اس وقت تک ذمے دار رہتے ہو جب تک آس پاس کوئی لڑکی نہ ہو۔"
"مونا عزیز الدین... وقار ولا میں آئے گی؟"
"نہیں، وہ ہوٹل میں رکے گی۔ ہم نے پی سی میں اس کے لیے کمرا بک کرا دیا ہے۔ کل صبح نو بجے اس کی فلائٹ یہاں پہنچے گی۔"
"میں اسے ریسیو کرنے چلا جاؤں گا۔"
"عجلت نہیں برخوردار... یہ کام ہم نظام دین کو سونپ چکے ہیں... وہ کل رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائے گی۔ آپ اسے ہوٹل سے لے کر آئیں گے۔"
"چلیے، ایسا ہی سہی۔" شامی نے سرد آہ بھری اور دل میں سوچا۔ 'مری کے سفر میں اس خاتون سے بے تکلف ہونے کا موقع تو ملے گا۔'

☆☆☆

شامی تیار ہو کر شام چھ بجے ہی پی سی کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ اس نے تیمور کو اس معاملے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔ اسے خطرہ تھا کہ تیمور بھی اس کے ساتھ چل پڑے گا۔ اس نے پی سی کی لابی میں استقبالیہ سے مونا عزیز الدین کو کال کی۔
"میں شامیر بات کر رہا ہوں... نواب وقار الملک میرے دادا جان ہیں۔"
"جی شامیر صاحب!" دوسری طرف سے ایک نغمہ ریز آواز نے کہا۔ "لیکن آپ ذرا جلدی نہیں آ گئے؟"
"میرا خیال ہے کہ آپ کو تیار ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ ہمیں سات بجے تک وقار وِلا میں ہونا چاہیے۔"
"مجھے تو آٹھ بجے کا بتایا گیا تھا۔"
"جی... مگر میں نے سوچا کہ آپ کو وقار وِلا کے کچھ دلچسپ حصے دکھاؤں گا۔"
"سوری! مجھے کچھ کام ہیں، میں ساڑھے سات بجے سے پہلے نہیں آ سکوں گی۔" مونا نے معذرت کی۔ اس کا لہجہ کہیں کہیں چغلی کھاتا تھا کہ وہ انگلینڈ کی پروردہ ہے ورنہ وہ صاف اردو بول رہی تھی۔
"کوئی بات نہیں... میں لاؤنج میں انتظار کر لیتا ہوں۔"
"میں معذرت خواہ ہوں... اگر مصروفیت نہ ہوتی تو میں آپ کو کمرے میں بلا لیتی۔"
شامی سرد آہ بھر کر لاؤنج میں آ بیٹھا۔ وقت گزاری کے لیے اس نے ویٹر سے کافی طلب کی اور وہاں کی رونق کا جائزہ لینے لگا مگر کوئی خاص چہرہ نہیں تھا اس لیے اس نے ایک میگزین اٹھا لیا۔ مطالعے میں اسے وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا۔ اچانک اس نے ایک لڑکی کو اپنے قریب پایا۔ گلابی رنگت اور نازک سے نقوش والی لڑکی نے سیاہ رنگ کی شرٹ اور گرین رنگ کا ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ اس نے سیاہ چشمہ بھی پہن رکھا تھا۔ شامی کو متوجہ پا کر وہ مسکرائی۔ "مجھے مونا عزیز الدین کہتے ہیں۔"
"شامیر احمد... ویسے مجھے شامی بھی کہتے ہیں۔" شامی کھڑا ہو گیا۔ اس نے جیب سے ایک نوٹ نکال کر کافی کی پیالی تلے دبا دیا۔ "اب چلیں؟"
"ضرور... میں پھر معذرت..."
"اس کی ضرورت نہیں... غلطی میری تھی۔" شامی نے اس کی بات کاٹی۔
شامی کو جو کوفت ہوئی تھی، وہ مونا کو دیکھ کر دور ہو گئی تھی۔ وہ اس کے اندازے سے کہیں زیادہ حسین اور نوجوان تھی۔ شامی نے راستے میں اس سے بے تکلفی پیدا کر لی تھی۔ اس نے عزیز الدین کے ذکر سے اپنی بات شروع کی۔ "انکل کی طبیعت کیسی ہے؟"
"دو سال سے بیڈ پر ہیں... نہ بول سکتے ہیں، نہ ہل سکتے ہیں۔"
"بہت افسوس ہوا... سب کچھ آپ کو اکیلے دیکھنا پڑ رہا ہے۔"
"ہاں... نہ میرا بھائی ہے اور نہ کوئی بہن... پاپا کا بزنس بھی میں ہی دیکھتی ہوں۔"
"بزنس؟" شامی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"ہاں، وہاں ہمارا امپورٹ ایکسپورٹ کا ایک بزنس ہے... ہم پاکستان اور انڈیا سے مختلف چیزیں منگوا کر پورے یورپ کو سپلائی کرتے ہیں۔" مونا نے اسے اپنا بزنس کارڈ دیا جس پر اس کا نام لکھا تھا۔ فرم کا نام راجا انٹر پرائز تھا۔ پتا گلاسکو کا تھا۔
"آپ لندن میں نہیں رہتیں؟"
"تین سال پہلے تک لندن میں تھے۔ پھر مہنگائی اور کچھ دوسرے مسائل کی وجہ سے بزنس گلاسکو منتقل کر دیا... اور ظاہر ہے جہاں ہم وہاں بزنس۔"
"آپ کی اردو لاجواب ہے۔"
"میرے پاپا نے مجھے خاص طور سے سکھائی ہے۔ اسکول کے دور تک تو یہ حال تھا کہ میں گھر میں غلطی سے بھی کوئی لفظ انگریزی کا بول جاتی تھی تو مجھے سزا ملتی تھی۔"
"بس یہی حال یہاں کا بھی ہے۔

ہنسی۔ "غالباً آپ کا اشارہ نواب انکل کی طرف ہے۔"
"آپ کے اور مشاغل کیا ہیں؟"
"میں بزنس دیکھتی ہوں... فارغ اوقات میں میوزک ...۔ مجھے آؤٹ ڈور ایکٹیوٹیز کا شوق نہیں ہے۔ نیٹ ... کرتی ہوں۔"
"کوئی دوست...؟"
"نہیں... میں ذرا تنہائی پسند واقع ہوئی ہوں۔"
شامی دل میں خوش ہوا۔ "بس میری بھی یہی فطرت ... مجھے بھیڑ بھاڑ سے وحشت ہوتی ہے۔"
پھر شامی ذرا مبالغہ آرائی کے ساتھ اسے اپنے تعلیمی ...ج کے بارے میں بتانے لگا۔ مونا کے سامنے اسے خفت ...ہی تھی جو محض چوبیس برس کی عمر میں بزنس کی ڈگری لے کر ...کاروبار بھی چلا رہی تھی۔ پھر اس نے عمارت کے بارے ... پوچھا۔
"سچی بات ہے، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ ...نے مجھے اپنے تمام معاملات کا مختار بنا دیا تھا۔ میں نے ...مارت کے کاغذات دیکھے تھے۔ اس وقت میں نے توجہ نہیں ...تھی۔ بعد میں مجھے بزنس کے لیے سرمائے کی ضرورت ...س ہوئی اور آج کل حالات اچھے نہیں ہیں۔ اس لیے میں ...نے عمارت فروخت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"
"آپ اس کی مختار ہوں گی... لیکن اس وجہ سے یہاں ...پیچیدگی ہو سکتی ہے۔"
مونا مسکرائی۔ "اسی وجہ سے میں نے نواب انکل سے ...رابطہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے مجھے کسی ...قانونی مسئلے کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔"
'لڑکی ذہین ہے۔' شامی نے سوچا۔ "یہ تو ہے... آپ ...کاغذات پورے لائی ہیں؟"
"وہ سب میرے پاس ہیں۔" مونا نے کہا۔
"اس کے باوجود کہ دادا جان موجود ہیں، آپ کو ایک ...کرنا پڑے گا جو سارے قانونی معاملات دیکھے گا۔ دفتری ...ات سے وہی نمٹے گا۔"
"مجھے معلوم ہے۔" مونا نے سر ہلایا۔ "میری ایک ...نی دوست ہے، اس کے انکل یہاں وکیل ہیں۔ میں ...ان سے رابطہ کر لیا ہے۔ وہ کل مجھ سے مل کر کاغذات لے ...گے اور دو دن میں ساری کارروائی مکمل کر لیں گے۔"
"کیا آپ عمارت دیکھنا چاہیں گی؟"
"ظاہر ہے، میں عمارت دیکھوں گی... اس کے بعد کسی ...اسٹیٹ ایجنسی سے اس کا اسٹیمیٹ لگواؤں گی۔"

نواب صاحب مونا کے منتظر تھے۔ اسے کمرا خاص میں بلوانے کے بعد انہوں نے آنکھوں سے شامی کو رخصتی کا اشارہ کیا تو وہ بادل ناخواستہ باہر آ گیا۔ لان میں ٹہلتے ہوئے اس نے کسی ایسی ترکیب کے بارے میں سوچا کہ کم سے کم تیمور نہ جا سکے۔ وہ ضرور رنگ میں بھنگ ڈالتا۔ اچانک اس کے موبائل نے رنگ دی۔ نوشی کال کر رہی تھی۔
"آج کل اونچے اڑ رہے ہو... یہ لڑکی کون ہے؟"
"بس ہے ایک۔ لندن سے آئی ہے... ضرورتِ رشتہ کے سلسلے میں۔"
"شامی! ہوش میں رہو۔" نوشی غرائی۔
"میں بالکل ہوش میں ہوں۔"
"جلدی سے میرے پاس آؤ۔"
"سوری! میں کچھ مصروف ہوں... اس حسینہ کے ساتھ ڈنر بھی کرنا ہے اس لیے میں نہیں آ سکتا۔ البتہ تم چاہو تو آ جاؤ۔"
حسبِ توقع نوشی نے فون بند کر دیا۔ شامی مسکرایا۔ اسے نوشی کو چھیڑ کر ہمیشہ مزہ آتا تھا۔ اس نے فولاد خان کی چوکی کا رخ کیا۔ اس نے انگیٹھی بجھا دی تھی۔ یعنی اس کا بخار ختم ہو گیا تھا اور وہ حقے سے شغل کر رہا تھا۔ "شامی صیب! اب ام ٹیک اے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔
"افسوس دوست!" شامی نے دردناک لہجے میں کہا۔ "جلد تم ٹھیک نہیں رہو گے۔"
"کیوں صیب؟"
"دادا جان تمہیں ہمارے ساتھ ایک ایسی جگہ بھیج رہے ہیں جو کنفرم آسیب زدہ ہے... بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ بھوتوں کا ڈیرا ہے۔"
"نواب صیب..." فولاد خان نے مُردہ لہجے میں کہا۔ "وہ فرمائے گا تو ام جہنم میں بھی جائے گا۔"
"بس دوست سمجھ لو... دادا جان تمہیں ایسی جگہ ہی بھیج رہے ہیں۔" شامی نے سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے کہ تم کوئلے اور انگیٹھی ساتھ لے کر چلنا۔"
"ام اِدر سے زندہ واپس نئیں آئے گا؟"
"انشاء اللہ... میرا مطلب ہے اگر اللہ نے چاہا تو..." اس نے خلوص سے کہا۔
"شامی صیب! کوئی ایسا طریقہ نئیں او سکتا کہ نواب صیب ارادہ تبدیل فرما دے؟"
"تم جانتے ہو، دادا جان جب ایک فیصلہ کر لیں تو اس دنیا کی کوئی طاقت ان کا فیصلہ تبدیل نہیں کرا سکتی اور ویسے بھی

وہ تمہیں بہ طور محافظ بھیج رہے ہیں۔"

"پر امارا حفاظت کون کرے گا؟ ام خبیث ارواح سے ڈرتا اے۔"

"تم جانتے ہو، بد ارواح اور بھوتوں سے بچنے کے لیے تعویذ اور عملیات کا سہارا لیا جاتا ہے۔"

"امارے پاس زبردست بابا کا تعویذ اے۔"

"زبردست بابا... یہ کون ہے؟"

"امارا پیر صیب اے... آسیب اور جنوں پر زبردست اے... اس لیے زبردست بابا کیلا تا اے۔"

"جب تمہارے پاس زبردست بابا کا تعویذ ہے تو پھر کیا مسئلہ ہے؟"

"مسئلہ اے صیب!" فولاد خان ہچکچایا۔ "امارا تعویذ... ایکسپائر او گیا اے۔"

شامی بھونچکا رہ گیا۔ "تعویذ ایکسپائر ہو گیا ہے؟ تمہارا مطلب ہے، اس کی مدت استعمال گزر چکی ہے۔ یہ تعویذ ہے یا ملک شیک دودھ!"

"زبردست بابا... ٹیم کے لحاظ سے تعویذ عطا فرماتا اے۔ ام نے دو سال والا لیا... ابی ایک مائینہ پیلے ایکسپائر ہوا اے۔"

"مجھے دکھانا۔" شامی نے مطالبہ کیا۔

فولاد خان نے بازو سے بندھا تعویذ اتارا، اسے آنکھوں سے چوما اور موم جامے سے نکالا ئیہ کاغذ کا پیک تعویذ تھا... یعنی اسے کھولا نہیں جا سکتا تھا۔ اس پر واقعی ایک مہینے پہلے کی تاریخ تھی اور زعفران سے لکھی تھی۔

"فولاد خان! ایسا کرو، اس پر سے یہ صفر سات مٹا کر صفر نو کر دو... تعویذ کی مدت دو سال بڑھ جائے گی۔ اب بد ارواح کو کیا معلوم کہ تعویذ ایکسپائر ہو چکا ہے۔"

"ٹیک اے۔" فولاد خان نے غور کیا۔ "ام سرے سے تاریخ نہ مٹا دے... زبردست بابا لیف ٹیم والا تعویذ بی دیتا اے۔ ان پر تاریخ نہیں اوتا اے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے... اس طرح تمہارا تعویذ ہمیشہ کے لیے کار آمد ہو جائے گا۔"

"شامی صیب! آپ واقعی عقل مند اے۔" فولاد خان نے خوش ہو کر کہا۔

"بس ہمارے ساتھ رہو گے تو یونہی مزے کرو گے۔" شامی نے تفاخر سے کہا۔

لیکن جب وہ گھنٹی بجنے پر ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تو خود کو اول درجے کا احمق محسوس کیا کیونکہ کھانے کی میز پر نوشی بھی موجود تھی اور مونا سے آہستہ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ نواب صاحب بھی آ گئے تھے اس لیے کھانا لگا اور سب خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ شامی سے کھانا نہیں کھایا جا رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہی تھی کہ نوشی کیسے آئی اور اس نے اتنی جلدی مونا سے بے تکلفی کیسے پیدا کر لی تھی؟ مگر وہ فی الحال کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔ وہ کھانا ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا مگر کھانا ختم ہوتے ہی نوشی نے نواب صاحب سے کہا۔ "انکل! میں مونا کو اپنے ساتھ لے جاؤں... ہوٹل بھی میں ڈراپ کر دوں گی۔"

"یہ ہماری مہمان ہیں۔" شامی خفگی سے بولا۔

"میں نے انکل سے پوچھا ہے۔" نوشی نے بے نیازی سے کہا۔

"ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔" نواب صاحب بولے۔ "ویسے بھی نوشی اور قدوائی ہم سے الگ نہیں ہیں... ہم ان کو اپنے گھر کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔"

"انکل! یہ آپ کی محبت ہے۔" نوشی نے کہا اور شرارتی نظروں سے شامی کو دیکھا۔ "مگر کچھ لوگوں کو آپ کے دانش مندانہ فیصلوں پر ہمیشہ اعتراض رہتا ہے۔"

"ہم جانتے ہیں۔" نواب صاحب بولے۔ "ہم ان اعتراضات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔"

"تو ہمیں اجازت ہے؟" نوشی اٹھتے ہوئے بولی۔ وہ مونا کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

☆☆☆

"تم نے دیکھا... اپنی معصوم سی نوشی کی حرکت؟"

"کون سی حرکت؟" تیمور اَن جان بنا رہا۔

"یہی مونا کو لے جانے والی حرکت۔" شامی چراغ پا تھا۔

"اس میں حرکت کی کیا بات ہے؟ دونوں لڑکیاں ہیں... ان میں جلدی بے تکلفی ہو جاتی ہے اس لیے مونا اس کے ساتھ چلی گئی۔"

"نہیں... اس نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی ہے۔"

"چلو، اب تو اس نے یہ حرکت کر لی مگر اسے مونا کے آنے کے بارے میں کس نے بتایا؟"

"میں نے۔" شامی نے اعتراف کیا۔ "اس نے مونا کو میرے ساتھ آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ پھر مجھے کال کی۔"

"بیٹے! تم نے بھی شرافت سے کہاں بات کی ہوگی۔" تیمور اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ "ضرور کوئی تپانے والی بات کی ہوگی۔"

"وہ مجھے جانتی نہیں ہے، میرا نام شامی ہے۔"

"جانتی ہے تب ہی تو ایسی حرکتیں کر جاتی ہے۔"

شامی بے تابی سے کمرے کا چکر لگا رہا تھا۔ ”نہ جانے وہ میرے بارے میں اسے کیا کیا بتا رہی ہوگی۔“

”تیرا مطلب ہے، تیری اصلیت کھول رہی ہوگی؟“

”اصلیت!“ شامی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ ”وہ میرے خلاف ڈس انفارمیشن پھیلا رہی ہے۔“

”ابھی سے تو کیسے کہہ سکتا ہے میرے یار۔“

”میں نوشی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ اسے مجھ سے بدظن کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہوگی۔“

”یہ اس کا حق ہے۔ یاد رکھ! تو نے نوشی پر ڈورے ڈالے تھے، وہ تیری طرف نہیں آئی تھی۔ اب اس کا حق بنتا ہے کہ تجھے راہِ راست پر رکھے۔“

”ڈورے ڈالنے کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے خود کو ہمیشہ کے لیے اس کی غلامی میں دے دیا ہے۔“

”یار! کیوں بور کرتا ہے... لڑکی اور بس کے بارے میں ہمارے سابق حکمرانوں نے کیا فرمایا ہے۔ ایک کے جانے کا غم نہ کرو، دوسری آتی ہی ہوگی۔“

”وہ ان کے دیس میں آتی ہے... یہاں نہ تو بس آسانی سے ملتی ہے اور نہ لڑکی۔“ شامی بھنا کر بولا۔ ”دونوں کے لیے بہت دھکے کھانے پڑتے ہیں۔“

”جو تیرے نصیب میں ہے وہی کھائے گا۔“ تیمور نے قصہ مختصر کیا۔ ”اب ذرا اپنی زبان کو آرام دے۔ میرا پسندیدہ شو شروع ہونے والا ہے۔“

اس سے پہلے کہ شامی اس شو کے بارے میں کچھ ارشاد کرتا، انٹرکام کی بیل بجی۔ تیمور نے ریسیور کان سے لگایا پھر شامی کی طرف بڑھا دیا۔ ”تیری کال ہے۔“

دوسری طرف نظام دین تھا۔ ”نواب صاحب یاد فرما رہے ہیں اپنے کمرِ خاص میں۔“

”اس سے تو بہتر ہے موت کا فرشتہ مجھے یاد کرے۔“ اس نے بھنا کر سوچا اور منہ سے بولا۔ ”میں آرہا ہوں۔“

نواب صاحب بے حد سنجیدہ تھے۔ ”تم دل چھوٹا مت کرو۔“ انہوں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ”ہم نے خود اسے نوشی کے حوالے کیا ہے۔ ہم نے تصدیق کر لی ہے کہ وہ مونا عزیز الدین کے پاسپورٹ پر آئی ہے اور اسی نام سے ہوٹل میں مقیم ہے۔“

”یعنی کوئی گڑبڑ نہیں ہے؟“ شامی نے کہا پھر شکوہ کیا۔ ”لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ آپ اس کے سامنے میری بے عزتی فرماتے؟“

”برخوردار! اس وقت آپ کی بے عزتی نہیں ہوتی جب لڑکیاں آپ کو ڈنر کراتی ہیں اور بل ادا کرتی ہیں۔ وہ بھی ان ہوٹلوں میں جہاں سب جانتے ہیں کہ آپ ہمارے پوتے ہیں۔“ نواب صاحب نے طنز کیا تو شامی کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ اس نے کمزور سے لہجے میں وضاحت کی۔

”دادا جان... نوشی خود مجھے زبردستی لے گئی تھی۔“

”اور آپ اتنے بچے تھے کہ خالی جیب اس کے ساتھ چلے گئے۔“ نواب صاحب کو غصہ آگیا۔ ”ابھی تو آپ مونا کے ساتھ مری جائیں... جب آپ واپس آئیں گے تو اس بارے میں بات ہوگی۔“

شامی نے اس مہلت پر خدا کا شکر ادا کیا۔ ”کب روانہ ہونا ہے دادا جان؟“

”کل صبح نو بجے روانگی ہے اور کم سے کم دو دن رکنا ہوگا۔ آپ سب اسی لحاظ سے تیاری کر لیں۔“

شامی نے واپس آکر نوشی کو بے نقط سنانے کے لیے فون کیا مگر وہ کال ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ تیمور نے اس سے کہا۔ ”بے کار ہے، وہ بے وقوف نہیں ہے۔ اب تیاری کر اور سو جا۔“

”تو نے تیاری نہیں کرنی ہے؟“ شامی جھنجلا کر بولا۔

تیمور نے الماری پر رکھے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اپنی تیاری مکمل ہے۔“

☆☆☆

نواب صاحب نے اپنی شاہانہ مرسیڈیز ان کے حوالے کی تھی اور فولاد خان ڈرائیور تھا۔ انہوں نے اپنا سامان ڈکی میں رکھا۔ مونا کو پی سی سے لینا تھا مگر فولاد خان نے گیٹ سے نکل کر کار روک لی۔

”چلو... اب کس کا انتظار ہے؟“ شامی نے کہا۔

”نوشی بی بی کا۔“

شامی اچھل پڑا۔ ”نوشی... وہ کیوں؟“

”ام کو میں پتا... نوشی بی بی نے فرمایا اے۔“

”نوشی بی بی!“ شامی نے دانت پیسے۔ ”کوئی ضرورت نہیں ہے اسے لینے کی... چلو۔“

اسی لمحے نوشی کی سرخ ہنڈا اسپورٹس کار کوٹھی سے نکلی اور اس نے ہارن دیا۔ فولاد خان نے کار آگے بڑھا دی۔ شامی کا غصے سے برا حال ہوگیا۔ اس نے نوشی کے موبائل پر کال کی۔

”تم کس خوشی میں آرہی ہو؟“

”تم کس خوشی میں جا رہے ہو؟“

”مجھے دادا جان نے بھیجا ہے... ایک ضروری کام سے۔“

”اور مجھے میری فرینڈ مونا نے انوائٹ کیا ہے... تم کام کرنا، میں اس کو تفریح کرا دوں گی۔“

”نوشی! میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ تم کیوں جا رہی ہو۔“

”جب سمجھ رہے ہو تو بلاوجہ کال کیوں کر رہے ہو... پتا نہیں... حکومت نے سیلز ٹیکس ایکس فیصد کر دیا ہے۔“ نوشی نے معصومیت سے کہا۔

”نوشی! سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”تم سمجھانے کی کوشش کرو۔“

”دیکھو، وہ عمارت آسیب زدہ ہے۔“

”صرف میرے لیے... تم لوگوں کو آسیب سے کوئی خطرہ نہیں ہے؟“

شامی کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اس لیے اس نے دھمکی دے کر فون بند کر دیا۔ ”میں دیکھ لوں گا تمہیں نوشی بی بی!“

”تو دیکھتا تو رہتا ہے اسے۔“ تیمور نے اسے یاد دلایا۔

”یہ رنگ میں بھنگ بنتی جا رہی ہے۔“

”پہلے تو اسے رنگ سمجھتا تھا اور اب بھنگ قرار دے رہا ہے۔“ تیمور نے اسے ایک بار پھر یاد دلایا۔

”پہلے کی بات اور تھی۔“ شامی کھسیا کر بولا۔

”تیری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مونا، نوشی کی کار میں جائے گی۔“

تب نوشی ہی اس کے ساتھ چلی جائے... ہم کیوں... جا رہے ہیں؟“ شامی بھنا گیا۔

”تجھے بار بار یاد دلانا پڑتا ہے... تو اور میں مونا کے لیے نہیں دادا جان کی طرف سے سونپے گئے ایک کام کے سلسلے میں جا رہے ہیں۔“

”اوہ! میں بھول گیا تھا۔“ شامی کے حواس بحال ہونے لگے۔

”بہتر ہوگا، اسے یاد رکھ۔“

☆☆☆

نو بجے پی سی ہوٹل سے مونا کو لے کر وہ مری کی طرف روانہ ہوئے۔ اس روز موسم خراب تھا اور مری کے پہاڑ شروع ہوتے ہی بوندا باندی سے سابقہ پڑا تھا، اس وجہ سے رفتار سست کرنا پڑی تھی۔ وہ بارہ بجے مری پہنچے۔ شامی نے تجویز دی کہ پہلے کچھ کھا لیا جائے۔ سرما کا آغاز تھا اور بارش جاری تھی اس لیے آنے والے سیاح واپس جا رہے تھے اور مری ویران نظر آرہا تھا۔ ایک ریستوران میں انہوں نے دوپہر کا کھانا کھایا پھر وہ روانہ ہوئے۔

عمارت مری کے نواح میں ایک الگ سی پہاڑی پر تھی۔ اس تک جانے کا راستہ ایک قدرتی پل سے گزرتا تھا جس کے دونوں جانب گہری کھائی تھی۔ قدرتی پل صرف تیس چالیس فٹ طویل تھا مگر زمانے نے اس کی حالت مخدوش کر دی تھی۔ اس پر بنی پتھروں کی سڑک معدوم ہو چکی تھی اور... بظاہر راستہ خطرناک لگ رہا تھا۔ عمارت پہاڑی کے دوسرے رخ پر تھی اور یہاں سے صرف معمولی سی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ شامی نے راستے کا معائنہ کیا۔ ”یہ تو پلِ صراط سے کم نہیں ہے۔“

”کاریں یہاں نہیں چھوڑ سکتے؟“ تیمور نے سڑک کی طرف دیکھا پھر فولاد خان سے بولا۔ ”ذرا دیکھنا، یہ راستہ اس قابل ہے کہ اس پر سے کاریں گزر سکیں؟“

فولاد خان نے راستے کا معائنہ کیا اور واپس آکر رپورٹ دی۔ ”راستہ ٹیک اے صیب... پر آرام سے جانا اوگا... دونوں گاڑی ام لے جائے گا۔“

”تمہیں یقین ہے۔“ نوشی نے اسے گھورا۔ اسے اپنی گاڑی کی فکر لگ گئی تھی۔

”نوشی بی بی... ام نے ایسے ہی راستوں پر ڈرائیونگ سیکا اے۔“ فولاد خان نے برا مان کر کہا۔ اس نے راستے سے بعض پتھر ہٹا کر ان جگہوں پر جمائے جہاں گڑھے تھے۔ پھر اس نے مرسیڈیز اس پر سے گزار دی۔ وہ بھی دوسری طرف آئے۔ انہوں نے پہلی بار عمارت کو سامنے سے دیکھا تھا۔ پہاڑی کے دوسری طرف ایک بڑا قطعہ ہموار تھا۔ شاید اسے انسانی ہاتھوں نے ہموار کیا تھا۔ یہ کوئی سو گز لمبا اور تیس سے چالیس گز چوڑا حصہ تھا جو اٹلے ہلال کی صورت میں تھا۔ عمارت تقریباً ستر ضرب تیس گز کے رقبے پر تھی اور شروع میں ایک بڑا لان تھا جس میں گاڑیاں کھڑی کی گئیں۔ ان کی آمد محسوس کر کے عمارت کے عقبی حصے سے... جو پہاڑی کے کنارے تھا، ایک تقریباً پچاس برس کا صحت مند اور مضبوط شخص نمودار ہوا۔

”بی بی... صاحب لوگ؟“ اس نے ان کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”میں اس عمارت کی مالک ہوں۔“ مونا نے آگے آکر کہا۔ ”تم کون ہو؟“

”سلام بی بی!“ اس نے جلدی سے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ”میں یہاں کا چوکیدار رشید خان ہوں۔“

''تم بی خان اے؟'' فولاد خان خوش ہو کر بولا۔
''اوہ... میں وہ والا خان نہیں ہوں۔'' رشید خان نے رکھائی سے کہا۔ ''میں مقامی ہوں۔''
''اچا، ام سمجھا... تم بی پٹھان اے۔''
''بی بی صاحبہ! میں گزشتہ بیس سال سے یہاں کا چوکیدار ہوں۔ راجا عزیز الدین صاحب مجھے مقرر کر کے گئے تھے۔''
''تمہیں تنخواہ کیسے ملتی ہے؟'' مونا نے غور سے اسے دیکھا۔
''راجا صاحب ہر پانچ سال بعد نئی تنخواہ مقرر کر کے ایک اکاؤنٹ میں اتنی رقم ڈلوا جاتے تھے اور مجھے پانچ سال کے چیک دے جاتے تھے۔ چار سال پہلے انہوں نے کسی جاننے والے کے توسط سے اکاؤنٹ میں رقم ڈلوائی تھی اور مجھے چیک بھیجے تھے۔ ابھی میرے پاس ایک سال کے چیک ہیں۔''
''حیرت ہے، مجھے اس بارے میں نہیں معلوم تھا۔''
رشید خان کا چہرہ اتر گیا۔ ''بی بی... صاحب خیریت سے تو ہیں... دو سال سے مجھے ان کا خط بھی نہیں ملا۔ میں تو ہر دوسرے مہینے خط لکھتا ہوں۔''
''رشید خان! تین سال پہلے ہم نے شہر بدل لیا تھا اور دو سال سے پاپا فالج میں پڑے ہیں۔ بول بھی نہیں سکتے، اس لیے مجھے پتا نہیں چلا کہ یہاں ایک عمارت بھی پاپا کی ملکیت ہے۔''
''آیئے بی بی... میں عمارت کی پوری طرح دیکھ بھال نہیں کر سکتا... لیکن اس کے کچھ حصے میں نے صاف رکھے ہیں۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی مگر بوائلر گرم کرنا پڑے گا۔ گرم پانی اور کمروں میں حرارت ذرا دیر سے آئے گی۔''
''یہاں بوائلر روم ہے؟'' مونا نے حیرت سے کہا۔
''جی بی بی... یہ عمارت انگریزوں نے بنائی تھی۔ انہوں نے یہاں پانی اور بوائلر روم دونوں کا انتظام کیا تھا۔ بارش کا پانی جمع کرنے کے لیے زیر زمین بہت بڑا ٹینک ہے۔''
''یہ انگریزوں کے دور کی عمارت ہے۔'' شامی نے غور سے اس دو منزلہ عمارت کو دیکھا جس کے اوپر سرخ کھپریل کی چھت تھی۔ اس کے چاروں اطراف میں منڈیر سی بنی تھی جو بارش کے پانی کو روک کر کسی راستے سے زیر زمین ٹینک میں اتار دیتی تھی۔ عمارت پر گلابی رنگ کیا گیا تھا جو بری طرح جھڑ رہا تھا۔ البتہ دروازے، کھڑکیاں اور دیواریں سلامت تھیں۔ عمارت پتھر کے چوکور بلاکس سے بنی تھی اور طویل عرصہ گزرنے کے باوجود اس کی مضبوطی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ عمارت کے سامنے کا منظر ہوش رُبا حد تک خوب صورت تھا۔ درختوں سے ڈھکی تہ در تہ پہاڑیاں دور تک پھیلی تھیں حتیٰ کہ وہ جا کر برف پوش پہاڑوں سے مل جاتی تھیں۔ اس سارے منظر میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ ویسے بھی عمارت مری شہر کے آباد حصے سے ایک فاصلے پر تھی۔ عمارت کی اوپری منزل پر وسطی حصے میں ایک ٹیرس تھا جو شاید سامنے والی پہاڑیوں کے بہتر نظارے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس ٹیرس کے نیچے استقبالیہ حصہ تھا اور عمارت کا سامنے کا دروازہ بھی یہی تھا۔
رشید ان کو اندر لایا... سوائے فولاد خان کے جو باہر تھا۔ اس نے اندر آنے سے انکار کر دیا تھا۔ ''ام بار ٹیک اے... آپ جاؤ۔''
''فولاد خان... کسی آسیب نے تم پر حملہ کرنا ہوگا تو باہر بھی کر دے گا۔'' شامی نے اس سے آہستہ سے کہا۔
''ام کسی سے نئیں ڈرتا۔'' فولاد خان نے سینہ پُھلا کر کہا مگر اس کا رنگ سفید ہو گیا تھا۔
چوکیدار رشید خان نے چار کمرے صاف کر رکھے تھے۔ ان میں دو بیڈ رومز، ایک لاؤنج اور ایک ڈائننگ روم تھا۔ یہ چاروں کمرے عمارت کے آخری حصے میں تھے۔ خاص طور سے دونوں بیڈ رومز بالکل آخر میں تھے۔ عمارت میں بجلی تھی، اس کے لیے خاص طور سے لائن لی گئی تھی۔ تمام کمرے ہر قسم کے فرنیچر سے آراستہ تھے۔ رشید خان واقعی کمروں کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس حصے سے آگے چھوٹا سا باغ تھا اور پہاڑی کے سرے پر ایک ایک کمروں والے کوارٹرز بنے تھے۔ اس میں چوکیدار اور دوسرے ملازمین رہتے تھے مگر فی الحال صرف رشید خان رہ رہا تھا۔ ان کو کمرے دکھا کر وہ بوائلر میں آگ لگانے چلا گیا۔

☆☆☆

فولاد خان نوشی کی کار بھی لے آیا تھا۔ اس نے دونوں کار برابر روک دیں۔ یہ جگہ بالکل ویران اور خاموش تھی۔ دوپہر تک ہونے والی بارش کا اثر نمی سے محسوس ہو رہا تھا۔ فولاد خان نے سہمی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ جب اسے پتا چلا کہ یہ عمارت آسیبی ہے تو اسے یہ سچ مچ آسیبی لگنے لگی تھی۔ اس نے عمارت کے سامنے آخری سرے تک پہلے کنارے سے نیچے جھانکا۔ خاصی ترچھی ڈھلوان کی صورت میں یہ کنارہ گہری کھائی سا لگ رہا تھا۔ عمارت کے عقب میں پہاڑی کا بلند ہوتا حصہ تھا۔ یہ عمارت سے ذرا فاصلے پر تھا۔ فولاد خان گھوم کر عمارت کے عقبی حصے میں آیا۔ پہاڑی چند گز کے فاصلے سے اوپر جا رہی تھی اور اوپر جاتے ہوئے یہ عمارت سے مزید دور ہو گئی تھی۔ اوپر سے آنے والے بارش کے پانی کو عمارت میں آنے سے روکنے کے لیے پہاڑی کی جڑ کے

ساتھ ایک پختہ نالا تھا۔ پوری ڈھلوان جھاڑیوں اور چھوٹے درختوں سے بھری ہوئی تھی۔ سورج عمارت کے دوسری طرف چلا گیا تھا اس لیے یہاں سایہ تھا اور نچلے حصے میں کسی قدر تاریکی محسوس ہوتی تھی۔ عقبی حصے میں کھڑکیاں تھیں اور دو بند دروازے تھے جو وسط میں پاس پاس ہی تھے۔ فولاد خان نے حفاظت کے نقطۂ نظر سے اس حصے کو دیکھا۔ تمام کھڑکیاں فولادی سلاخوں سے بند تھیں اور دروازے بھی مضبوط لکڑی کے تھے۔ اس طرف سے کسی کا گھسنا محال تھا۔ فولاد خان پلٹا تھا کہ اسے کسی کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ یہ ایسی آواز تھی جیسے کوئی تکلیف کے عالم میں کراہ رہا ہو۔ فولاد خان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے چاروں طرف دیکھا مگر اسے کوئی دکھائی نہیں دیا۔
چند لمحے خاموش رہنے کے بعد آواز پھر آئی۔ اس بار فولاد خان نے اندازہ لگایا کہ آواز پہاڑی کی طرف سے آئی تھی۔ اس نے وہاں سے دوڑ لگائی اور گاڑیوں کے پاس آ کر دم لیا۔
''زبردست بابا کے تعویذ نے بچا لیا۔' فولاد خان نے خود پر قابو پاتے ہوئے سوچا۔
''ڈر گئے۔'' کسی نے بالکل پاس سے سرسراتے لہجے میں کہا اور فولاد خان بے ساختہ اچھل پڑا۔

☆☆☆

سب طویل سفر سے تھک گئے تھے اس لیے کچھ دیر آرام کا فیصلہ کیا گیا۔ کمروں میں آتش دان تھے مگر نمائشی... کیونکہ ان میں جلانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ویسے بھی عمارت میں گرمائش کا نظام تھا۔ ایک کمرے میں شامی اور تیمور تھے اور دوسرے میں مونا اور نوشی۔
''عمارت تو ٹھیک ٹھاک دکھائی دے رہی ہے۔'' تیمور نے شامی سے کہا۔
''بہ قول نظام دین کے، عمارت آسیب زدہ ہے۔'' شامی نے بتایا۔
''حالانکہ وہ خود بھوت ہے جو ہماری جانوں کو چمٹ گیا ہے۔''
شامی نے تائید کی۔ ''دادا جان کو ہمارے خلاف کرنے والا وہی ہے۔''
تیمور نے پینترا بدلا۔ ''ویسے ہمارے کرتوت بھی کم نہیں ہیں۔''
''اس عمر میں کس کے کرتوت ٹھیک ہوتے ہیں؟''
تیمور نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ''جوانی دیوانی ہوتی ہے... تُو ذرا زحمت کر اور کار سے ہمارے کمبل نکال لا۔''
شامی باہر آیا تو فولاد خان غائب تھا۔ وہ شاید کسی ضروری کام سے آس پاس گیا تھا۔ شامی کو شرارت سوجھی اور وہ دونوں کاروں کے درمیان میں چھپ گیا۔ چند منٹ بعد فولاد خان اسے بدحواسی کے عالم میں آتا دکھائی دیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات تھے اور اس کی سانس تیز تھی۔ شامی نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''ڈر گئے۔''
فولاد خان اچھل پڑا۔ اس کے منہ سے گھگیائی ہوئی آواز نکلی اور اس نے وہاں سے دوڑ لگانے کا ارادہ کیا تھا کہ شامی اس کے سامنے آ گیا۔ ''شامی صیب... آپ!'' اس نے خفگی سے کہا۔
''تم سچ مچ ڈر گئے؟'' شامی نے دانت نکالے۔
''ڈرنے والے پر لعنت!''
''اچھا یار، خفا مت ہو... ڈکی کھولو اور ہمارے کمبل نکال کر اندر لاؤ... بلکہ ایسا کرو، سارا سامان لے آؤ... اب ہم نے یہاں رکنا ہے۔''
''ام اور نئیں رکے گا... اِدر آسیب اے۔''
''تب تم کہاں جاؤ گے؟''
فولاد خان نے غور کیا۔ واقعی وہ کہاں جا سکتا تھا۔ اس نے بے بسی سے کہا۔ ''اچا ام اِدر رکے گا پر اندر نئیں آئے گا۔ ام اِدر کار میں سو جائے گا۔''
''سردی سے اکڑ جاؤ گے۔''
''ام پہاڑوں کا بیٹا اے... یہ سردی تو کوچ نئیں اے جو اُدر امارا وطن میں اوتا اے۔''
''تمہاری مرضی۔'' شامی نے اندر جاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

مونا اور نوشی سر جوڑے کسی زنانہ موضوع پر گفتگو کر رہی تھیں اور ہنس رہی تھیں۔ نوشی نے کہا۔ ''شامی بتا رہا تھا کہ یہ عمارت آسیب زدہ ہے۔''
''آسیب زدہ... نہیں، مجھے تو نہیں معلوم۔ شامی کو کس نے بتایا؟''
''پتا نہیں... شاید مجھے ڈرا رہا تھا۔''
''پلیز! ایسی باتیں مت کرو... مجھے ایسے گھروں سے ڈر لگتا ہے۔'' مونا نے جھرجھری لی۔ ''وہاں لندن میں ہماری گلی میں ایسا ایک گھر تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ آسیب زدہ ہے۔''
''اچھا... تم کبھی وہاں گئیں؟'' نوشی نے دلچسپی سے پوچھا۔
''اس گھر میں...'' مونا نے ایک جھرجھری اور لی۔

"جب مجھے اس بارے میں پتا چلا تو میں نے گلی کے اس سرے سے گزرنا چھوڑ دیا تھا۔ اگر مجھے اس طرف جانا بھی ہوتا تھا تو میں دوسرے سرے سے پورا چکر لگا کر جاتی تھی۔"

"مجھے تو بہت شوق ہے ایسی جگہیں دیکھنے کا۔" نوشی نے کہا۔ "مجھے پتا چل جائے کہ راولپنڈی یا اسلام آباد میں ایسی عمارتیں ہیں تو میں وہاں ضرور جاتی ہوں۔"

"یہ عمارت سچ مچ آسیب زدہ ہے؟" مونا کو فکر لگ گئی تھی۔

"کیا خیال ہے، ایک چکر نہ لگالیں؟ اوپر نیچے بہت بڑے رقبے پر پھیلی ہے۔ ممکن ہے، کسی ویران گوشے میں کسی بھوت سے ملاقات ہو جائے۔"

"پلیز! ایسی باتیں مت کرو ورنہ میں مری کے کسی ہوٹل میں جا کر رک جاؤں گی۔"

"اچھا بابا!" نوشی ہنسی۔ "ویسے مجھے معلوم نہیں تھا کہ اتنی حسین لڑکی بزدل ہوگی۔"

"جی نہیں، میں صرف اَن دیکھی چیزوں سے ڈرتی ہوں۔" اس نے خفگی سے کہا۔ "اور تعریف کا شکریہ... تم بھی کچھ کم نہیں ہو۔"

"شکریہ!" نوشی ہنسی۔ "میرا خیال ہے کہ میں ایک چکر لگا لیتی ہوں۔"

"میں اکیلی رہوں گی؟" مونا نے گھبرا کر کہا۔ "ہرگز نہیں۔"

"کیا خیال ہے، شامی کو بھیج دوں؟" نوشی شرارت سے بولی۔ "بے چارہ..."

مونا نے غور سے اسے دیکھا۔ "یہ شامی اور تمہارے درمیان کیا چکر ہے؟"

نوشی مونا کے سوال پر گھبرا گئی مگر پھر فوراً خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ "کوئی چکر نہیں ہے۔"

"نہیں، کوئی نہ کوئی بات ہے... ورنہ تم دونوں ایک دوسرے سے اتنے خفا کیوں رہتے ہو؟"

"کیونکہ ہم ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے۔"

"ایک دوسرے کے قریب رہنے والے مرد عورت میں ناپسندیدگی... پسند کا ایک روپ ہوتی ہے۔"

"خاصی تجربے کار لگتی ہو۔" نوشی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم آرام کرو، میں ذرا عمارت کا چکر لگا کر آتی ہوں۔ ڈر لگے تو تیمور اور شامی کے پاس چلی جانا۔"

"اب میں اتنی بھی خوف زدہ نہیں ہوں۔" مونا نے برا سا منہ بنایا مگر نوشی کے جانے کے بعد وہ کسی قدر خوف زدہ نظر آنے لگی تھی۔ اس نے اپنی شال اپنے گرد لپیٹ لی اور کھڑکی سے پردہ ہٹا دیا۔ اسی لمحے کوئی چیز دھڑام سے دروازے سے ٹکرائی اور مونا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

☆☆☆

نوشی نے صرف صدر دروازے سے یہاں تک کی عمارت دیکھی تھی جن کمروں میں وہ مقیم ہوئے تھے۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اوپر جانے اور تہ خانے میں اترنے کے لیے زینے کہاں تھے... مگر عمارت سادہ سی تھی۔ اسے امید تھی کہ راستے تلاش کرنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ آخر کے چار کمروں کے علاوہ باقی کمرے بند تھے۔ نوشی نے ان کے دروازے کھولنے کی کوشش کی مگر وہ مقفل تھے۔ ان کی چابیاں شاید رشید خان کے پاس تھیں مگر وہ خود کہاں تھا؟ نوشی کو یاد آیا کہ وہ تہ خانے میں بوا کر چلانے گیا تھا۔ صدر دروازے کے بعد عمارت کا بڑا حصہ تھا۔ باورچی خانہ اور بڑا ڈائننگ ہال بھی اسی حصے میں تھا۔ نوشی کا خیال تھا کہ وہ جس حصے میں تھے، وہ اصل میں مہمان خانہ تھا۔ اہلِ خانہ کے لیے بیڈ رومز اوپر والی منزل پر تھے۔ اس حصے میں ایک بڑا سا ہال نما کمرا تھا جو خالی اور گرد سے اَٹا ہوا تھا۔ اس سے آگے ایک گیلری میں دائیں بائیں چھ کمرے تھے اور یہ بھی بند تھے۔

نوشی واپس ہال کی طرف آنے کے لیے پلٹی تھی کہ دائیں طرف کے درمیانی کمرے کا دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کسی قدر کھل گیا۔ نوشی کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ ابھی اس نے دروازہ کھولنا چاہا تھا تو وہ بند نکلا تھا... اور اب خود بہ خود کھل گیا تھا۔ کھل جانے والے خلا سے تاریکی جھانک رہی تھی اور پھر اس تاریکی میں کوئی شے لہرائی۔ نوشی کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی اور وہ پلٹ کر اندھا دھند بھاگی تھی کہ کسی سے ٹکرا گئی۔ اس کے منہ سے دوسری چیخ نکلی اور پھر وہ لگاتار چیختی چلی گئی۔

☆☆☆

شامی اور تیمور چیخ کی آواز سن کر اچھل پڑے۔ آواز لڑکیوں کے کمرے سے آئی تھی۔ شامی دو منٹ پہلے ہی کمرے میں آیا تھا۔ "یہ تو مونا کی آواز لگ رہی ہے۔" اس نے تیمور سے کہا۔

"اب تو اس کی آواز چیخ میں بھی شناخت کر سکتا ہے۔" تیمور نے طنز کیا۔ "کیا نوشی نہیں چیخ سکتی؟"

"چل کر دیکھنا چاہیے یار۔" شامی دروازے کی طرف بڑھا۔

"یار! کوئی چھپکلی یا چوہا دیکھ لیا ہوگا۔ اس عمارت میں یہی چیزیں ہو سکتی ہیں۔" تیمور اس کے پیچھے آتے ہوئے بولا

مگر لڑکیوں کے کمرے کے سامنے فولاد خان شرمندہ سا کھڑا تھا۔ اس نے بیک وقت سارا سامان اٹھا رکھا تھا۔

"ام سے بیک دروازے پر لگ گیا۔" اس نے ندامت سے کہا۔ "اندر سے میم صیب نے چیخ مارا۔"

شامی نے دروازہ بجایا۔ "مونا... نوشی! تم لوگ ٹھیک ہو؟"

مونا نے دروازہ کھولا۔ "نوشی یہاں نہیں ہے... وہ باہر گئی ہے۔"

"باہر کہاں؟" شامی پریشان ہو کر بولا۔ "عمارت سے باہر؟"

"نہیں، عمارت دیکھنے گئی ہے۔ دروازے سے کوئی شے لگی تو میں ڈر گئی۔"

"وہ شے فولاد خان تھا۔" شامی نے بتایا۔

فولاد خان نے ان کا سامان ان کے حوالے کیا اور فوراً رخصت ہو گیا۔ وہ بھی ڈرا ہوا تھا۔

"نوشی کہاں جا سکتی ہے؟" شامی نے تشویش سے کہا۔

"یہ عمارت کب سے غیر آباد پڑی ہے۔ اسے یوں نہیں جانا چاہیے تھا۔"

"وہ بچی نہیں ہے جو کھو جائے گی۔" تیمور نے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنا بیگ اور کیمرا کیس اٹھا رکھا تھا۔ "آجائے گی ابھی۔"

"مجھے اکیلے ڈر لگ رہا ہے۔" مونا نے آہستہ سے کہا۔

شامی خوش ہو گیا۔ "کوئی بات نہیں... میں ہوں تمہارے پاس۔"

"ہمیں نوشی کو دیکھنا چاہیے۔" مونا بولی۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں... تم بھی آرہی ہو میرے ساتھ؟"

مونا نے سر ہلایا۔ انہوں نے سامان اپنے کمروں میں رکھا اور باہر آئے۔ ان کے حصے کے چار کمروں کے سوا باقی کمرے لاک تھے۔ "میرا خیال ہے... ان کی چابیاں رشید خان کے پاس ہیں... کل ان سارے کمروں کو دیکھیں گے۔"

"نوشی شاید دوسرے حصے میں ہے۔" شامی نے کہا۔ صدر دروازے کے پاس سے گزر کر وہ ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے۔ اس کے عقب میں باورچی خانہ تھا۔ یہاں کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے اس لیے نیم تاریکی تھی۔ مونا ڈر کر شامی کے پاس آگئی تھی۔ اچانک نوشی کی چیخ سنائی دی اور مونا ڈر کر شامی سے لپٹ گئی۔ اگرچہ شامی نوشی کی چیخ سے فکر مند ہوا تھا لیکن وہ اس موقعے کی خوش گواری کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ البتہ جب نوشی نے لگاتار چیخنا شروع کیا تو اسے بادلِ ناخواستہ آگے جانا پڑا۔

نوشی بڑے سے ہال نما کمرے کے آخری حصے میں گیلری کے سامنے کھڑی آنکھیں بند کر کے چلا رہی تھی اور اس کے سامنے رشید خان کھڑا تھا۔ شامی غصے سے لپکا۔ اس نے رشید خان کو ایک طرف دھکیلا اور نوشی کے ہاتھ پکڑ لیے۔ "نوشی! ہوش میں آؤ۔" اس نے اسے جھنجھوڑا۔ نوشی چونک کر اس سے لپٹ گئی۔ شامی نے غصے سے رشید خان کی طرف دیکھا۔ "تم نے اسے ڈرایا ہے۔"

"نہیں جی... میں تو خود ان کی چیخ سن کر آیا تھا۔" رشید خان جلدی سے بولا۔ "میں نیچے بوا کر چلا کر آرہا تھا۔"

"نوشی! کیا ہوا؟" شامی نے اس سے پوچھا۔

نوشی پہلے تو جھینپ کر اس سے الگ ہو گئی۔ "وہ ادھر... درمیان والے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور اندر کوئی تھا، میں نے دیکھا تھا۔"

"پر اس کا دروازہ تو بند رہتا ہے۔" رشید خان نے بے یقینی سے کہا۔ "میں خود بند رکھتا ہوں اور چابیاں میرے پاس ہی ہوتی ہیں۔"

"پھر نوشی نے دروازہ کیسے کھلا دیکھا؟" شامی نے اسے گھورا۔

"نہیں، دروازہ بند تھا۔" نوشی نے مداخلت کی۔ "میں نے خود دیکھا تھا مگر جب میں یہاں آئی تو پیچھے سے اس کے کھلنے کی آواز آئی تھی۔ میں نے دیکھا، اندر کوئی تھا۔ میں خوف زدہ ہو گئی اور جانے لگی تو رشید خان کو دیکھ کر ڈر گئی۔" نوشی کے لہجے میں ندامت تھی۔

"آپ نے مجھے دیکھا نہیں تھا بی بی۔" رشید خان نے دانت نکالے۔ "دیکھے بغیر ڈر گئی میں۔"

"اس کمرے میں کون ہے؟" شامی نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

اسی اثنا میں تیمور بھی وہاں آگیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ کمرے کو دیکھا جائے۔ رشید خان نے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بتایا کہ یہ کمرا خالی ہے۔ شامی نے کہا۔ "نہیں، پھر بھی اسے چیک کرنا ہے... نوشی نے جب دروازہ کھلا دیکھا تھا تو یہاں کوئی نہ کوئی تھا جس نے دروازہ کھولا تھا۔"

اس پر مونا نے عجیب سی نظروں سے شامی کی طرف دیکھا۔ رشید خان نے چابیوں کا ایک بڑا سا گچھا نکالا۔ اس سے مطلوبہ چابی تلاش کرنے میں اسے کچھ دیر لگی تھی۔ اس نے تالا کھولا اور دروازے کو دھکا دیا۔ کمرا اب نیم تاریک تھا کیونکہ کھڑکی سے روشنی اندر آرہی تھی۔ اس روشنی میں پورا

کمرا واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ کمرا بالکل خالی تھا۔ اس میں نہ تو فرنیچر تھا اور نہ ہی کوئی اور شے! تیمور نے چاروں طرف دیکھا۔ ''کمرا خالی ہے۔''

''لیکن میں نے کسی کو دیکھا تھا اور اس وقت کمرا اندر سے تاریک تھا۔'' نوشی نے اصرار کیا۔

''یہاں روشنی ہے۔'' تیمور نے نرمی سے کہا۔ ''ممکن ہے، تمہیں دھوکا ہوا ہو۔''

شامی نے رشید خان کی طرف دیکھا۔ ''میں نے سنا ہے... یہ عمارت آسیب زدہ ہے؟''

وہ ہچکچایا۔ ''صاحب... میں نے کچھ دیکھا نہیں ہے... مگر راتوں کو یہاں سے چلنے پھرنے اور بولنے کی آوازیں آتی ہیں مگر جب میں دیکھتا ہوں تو کوئی نہیں ہوتا۔''

مونا ڈر گئی تھی۔ ''پلیز! ایسی باتیں مت کرو... میں یہاں نہیں رہ سکتی۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' شامی بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس عمارت کی ویرانی سے فائدہ اٹھا کر جرائم پیشہ لوگ اسے استعمال کر رہے ہیں۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا صاحب۔'' رشید خان تیز لہجے میں بولا۔ ''رشید خان کے ہوتے کسی کی مجال نہیں ہے کہ ادھر آسکے۔ میں تمام دروازے بند رکھتا ہوں۔''

''ممکن ہے، کسی کے ہاتھ چابیاں لگ گئی ہوں اور وہ تمہاری بے خبری میں عمارت کو استعمال کرتا ہو۔'' تیمور نے اسے دیکھا۔ ''انسان ہر وقت تو چوکنا نہیں رہتا ہے۔''

رشید خان سوچ میں پڑ گیا۔ ''مجھے نہیں یاد کہ میں نے کبھی چابیاں بے پروائی سے کہیں رکھی ہوں۔''

''بھول چُوک ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے، کسی نے موقعے سے فائدہ اٹھا کر ڈپلیکیٹ بنالی ہو۔''

''پر صاحب... اس کمرے میں آنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ کھڑکی پر گرل ہے، ادھر سے کوئی نہیں آسکتا۔''

دس پندرہ منٹ بحث کے بعد بھی وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ وہ واپس کمروں میں آگئے۔ مخصوص پائپس سے ہوا گرمائش لیے کمروں میں آ رہی تھی اور اب درجۂ حرارت بہتر ہوا تھا۔ اس حصے میں دو واش رومز تھے اور ان میں بھی گرم پانی آنے لگا تھا۔ شام قریب تھی اور اس کے بعد سردی کی شدت میں اضافہ ہو جاتا۔ اکتوبر کے آخر تک مری میں رات کو درجۂ حرارت صفر کے آس پاس ہو جاتا ہے۔ عمارت کے صرف چار کمروں میں بلب وغیرہ لگے تھے، اس کے علاوہ بیرونی دروازے پر روشنی کا انتظام تھا... اس لیے عمارت کا مکمل معائنہ کل تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔

یہاں کھانا بنانے کا کوئی نظام نہیں تھا۔ رشید خان کے مطابق وہ اپنے لیے کچا پکا بنا لیا کرتا تھا۔ اس لیے طے پایا کہ مری جا کر کھایا جائے۔ وہاں کے بعض ریستوران سارا سال سروس دیا کرتے تھے۔ وہ تیار ہو کر باہر آئے اور فولاد خان کے ہمراہ روانہ ہو گئے۔ ایک معقول قسم کے ریستوران میں انہوں نے چائنیز کھایا اور پھر چائے پی۔ فولاد خان کو چینی کھانوں سے الرجی تھی اس لیے اس نے ایک اور ہوٹل میں جا کر گوشت کا سالن کھایا تھا۔ واپسی پر اس نے شامی اور تیمور سے کہا۔ ''ام رات بارا ای رکے گا۔''

''صبح تک قلفی جم جائے گی۔''

''بے شک... پر ام اندر نئیں جائے گا۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ام نے خود بلڈنگ کا پیچھے کسی کا کرانے کا آواز سنا اے۔''

مونا چونکی۔ ''کب؟''

''جب اِدر آیا... ام اس وقت دیکنے گیا کہ بلڈنگ پیچھے سے محافوز اے، تب ام نے سنا۔''

''تمہارا وہم ہو گا فولاد خان۔'' شامی جلدی سے بولا۔

''نئیں، امارا کان ٹِیک اے... ام نے صاف صاف سنا۔'' اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

''سنو، کیا ہم رات کسی ہوٹل میں نہیں رک سکتے؟'' مونا نے گھبرا کر کہا۔

''نہیں... ہم سب اسی عمارت میں رہیں گے۔'' شامی بولا۔ ''گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، ہمارے ساتھ فولاد خان ہے۔''

''جو خود گھبرایا ہوا ہے۔'' نوشی نے طنز کیا۔ ''یہ ہماری حفاظت کرے گا؟''

''بی بی... امارے او تے کوئی آپ کا بال بی بیکا نئیں کر سکتا۔''

''اگر واسطہ کسی روح سے نہ پڑا تو۔'' شامی ہنسا۔

''ام روح سے ڈرتا اے۔'' فولاد خان نے اعتراف کیا۔ ''کیونکہ ام روح کا کوچ نئیں بگاڑ سکتا۔ ام تو اسے فوت بھی نئیں کر سکتا... وہ پہلے سے فوت اوتا۔''

''پلیز! کیا تم لوگ کوئی اور بات نہیں کر سکتے؟''

فولاد خان نے ان لوگوں کو کار سے اتار کر پل صراط پار کیا اور وہ پیدل ہی عمارت تک گئے۔ بوائلر نے اتنی دیر میں پوری طرح کام شروع کر دیا تھا۔ کمرے اچھی طرح گرم ہو گئے۔ نوشی بھی شام والے تجربے کے بعد ڈر گئی تھی اور اندر جاتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ مونا کا ویسے ہی خوف سے بُرا حال تھا۔ تیمور نے ان سے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ اب تم دونوں جا کر سو جاؤ۔''

''اتنی جلدی... ابھی تو دس بجے ہیں۔'' نوشی نے گھڑی دیکھی۔

''چائے نہ پی جائے؟'' شامی بولا۔ ''رشید خان نے یہاں چائے بنانے کا تو انتظام کر رکھا ہو گا۔''

مہمان خانے کے ڈائننگ روم کے ساتھ ایک چھوٹا سا کچن تھا۔ مونا اور نوشی نے وہاں کا جائزہ لیا تو چائے کے ساتھ کافی بنانے کا مکمل سامان بھی پایا۔ طے کیا کہ کافی بنائی جائے۔ نوشی اپنے ساتھ ڈرائی فروٹ بھی لائی تھی۔ کافی کے ساتھ اس سے شغل کرتے اور گپ شپ کرتے ہوئے ان لوگوں کا خوف خاصی حد تک کم ہو گیا تھا۔ بارہ بجے مونا اور نوشی سونے کے لیے اپنے کمرے میں آگئیں۔ یہاں وکٹوریہ اسٹائل کا آبنوس سے بنا جہازی سائز ڈبل بیڈ تھا۔ انہوں نے اپنے کمبل نکالے۔ شب خوابی کا لباس کسی کے پاس نہیں تھا اس لیے صرف جیکٹ اتار کر لیٹ گئیں۔ تیز روشنیاں بجھا کر نائٹ بلب جلا لیا تھا۔

''تمہیں ڈر نہیں لگتا؟'' کچھ دیر بعد مونا نے سوال کیا۔

''لگتا ہے لیکن میں اسے خود پر طاری نہیں کرتی۔''

''رئیلی!'' مونا نے اس کی طرف کروٹ لی۔ ''اس وقت تو تم بُری طرح ڈر گئی تھیں۔''

''کیونکہ میں نے سچ مچ دروازہ کھلتے اور کسی کو اندر دیکھا تھا۔''

''مگر دروازہ لاک اور کمرا اندر سے خالی پایا گیا تھا؟''

''اس پر مجھے حیرت ہے مگر میں اسے اپنا وہم سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ یہ عمارت آسیب زدہ ہے؟'' مونا نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

''نہیں... لیکن ممکن ہے کہ وہ کوئی انسان ہو اور جس وقت میں بھاگتے ہوئے رشید سے ٹکرائی تھی، اس دوران کمرے میں موجود فرد نکل کر فرار ہو گیا ہو۔''

''فرار ہو کر وہ کہاں جا سکتا ہے؟''

''کسی اور کمرے میں... ہم نے صرف وہی کمرا دیکھا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے، اس کے پاس پوری عمارت کے دروازوں کی چابیاں ہیں۔'' مونا بولی اور اس نے جلدی سے اٹھ کر دروازے کو اندر سے بولٹ کر دیا۔ پہلے صرف بٹن دبا کر لاک کیا ہوا تھا اور کوئی بھی چابی کی مدد سے کھول سکتا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم زیادہ ہی خوف زدہ ہو۔ اگر اس عمارت میں چور اُچکے تھے تو وہ ہماری آمد کے بعد فرار ہو گئے ہوں گے۔''

''ممکن ہے۔'' مونا نے بے یقینی سے کہا۔ ''مجھے تو یہ معاملہ کچھ اور ہی لگتا ہے۔''

''مجھے نیند آ رہی ہے۔'' نوشی نے جماہی لی اور کمبل منہ تک کھینچ لیا۔

مونا بھی اپنی جگہ لیٹ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی سو گئی۔ رات کسی وقت اس کی آنکھ کھلی۔ اسے واش روم جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر جوتی پہنی اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ یہاں پر واش روم کمروں سے منسلک نہیں تھے، برابر میں ضرور تھے۔ وہ واش روم گئی۔ چند منٹ بعد وہ باہر آئی تو نیند اس پر غلبہ پا رہی تھی مگر گیلری کے بند بلب نے اسے چونکا دیا۔ ابھی یہ جل رہا تھا۔ اس نے خوف زدہ ہو کر جلدی سے کمرے میں جانا چاہا، اسی لمحے ایک ہاتھ اس کے منہ پر آ کر جم گیا۔ اس کی چیخ حلق میں گھٹ گئی اور چند لمحے میں اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

فولاد خان موٹا کمبل لیے مرسیڈیز کی عقبی نشست پر سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ سردی شدت کی تھی اور کار اندر سے بھی یخ بستہ ہو چکی تھی۔ اگر فولاد خان چاہتا تو انجن چلا کر کار کو اندر سے گرم کر سکتا تھا مگر وہ نوکری میں بے ایمانی کا قائل نہیں تھا، اپنا کام حتیٰ الامکان ایمان داری سے کرتا تھا۔ مرسیڈیز پیٹرول کے معاملے میں سفید ہاتھی سے کم نہیں تھی۔ محض انجن چلانے سے بھی ایک گھنٹے میں کئی لیٹر پیٹرول خرچ ہو جاتا۔ اس لیے فولاد خان پوری ایمان داری سے ٹھٹھر رہا تھا اور یہ گانا گا رہا تھا۔ ''آج کا رات بچے گا تو صبح دیکھے گا۔'' نہ جانے کب اسے نیند آگئی۔ رات کسی وقت اس کی آنکھ کھلی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی آنکھ کیوں کھلی تھی؟ وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اسے لگا کہ اس نے کوئی آواز سنی تھی۔ یہ آواز عمارت کی طرف سے آئی تھی۔

''اے خدا... ام کو بچانا۔'' اس نے زیر لب کہا اور اٹھ کر باہر دیکھنا چاہا لیکن شیشوں پر اتنا کہر جم گیا تھا کہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ فولاد خان نے زیر لب آیت الکرسی پڑھتے ہوئے دروازہ کھولا اور اپنا پستول نکال لیا۔ اس نے باہر دیکھا۔ عمارت کے سامنے والے حصے میں بلب جل رہا تھا جس سے سامنے والے حصے میں اتنی روشنی تھی کہ کوئی فولاد خان کی نظر سے نہیں بچ سکتا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا پھر آواز

کہاں سے آئی؟ اس نے ذہن پر زور ڈالا تو اسے یاد آیا۔ آواز کچھ ایسی تھی جیسے کسی نے دروازہ بند کیا ہو۔ سامنے سے کوئی باہر نہیں آیا... کوئی اندر گیا ہو تو الگ بات ہے۔ مگر اتنی رات گئے کون اندر جاتا؟ رشید خان اپنے کوارٹر میں تھا۔ وہ خود گیارہ بجے عمارت کا راؤنڈ لگا کر اندر چلا گیا تھا اور فولاد خان بھی اسی وقت سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ایک نظر پیچھے بھی دیکھ لینا چاہیے۔ اگرچہ اس وقت وہاں جاتے ہوئے اسے ڈر لگ رہا تھا مگر فرض... فرض تھا۔ فولاد خان کسی آسیب کے ہاتھوں فوت ہونے کے لیے تیار تھا مگر نمک حرامی کا طعنہ نہیں سن سکتا تھا۔

اس نے محتاط انداز سے دیوار کے کنارے سے عمارت کے عقبی حصے میں جھانکا، اس طرف بھی کوئی نہیں تھا۔ اس نے اکلوتے بلب کی روشنی میں پہاڑ کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی ہر شے ساکت تھی، کہیں کوئی نقل و حرکت نہیں تھی۔ اس نے آگے آکر عقبی حصے میں کھلنے والے دروازے دیکھے اور ان میں سے دوسرے دروازے کو کھلا پا کر چونک گیا۔ ابھی دن میں یہ دروازہ لاک تھا۔ کیا اس دروازے سے کوئی باہر آیا تھا... مگر کون؟ شامی اور تیمور اس وقت کیوں باہر آنے لگے اور آئے تھے تو کہاں گئے؟ فولاد خان نے اندر داخل ہو کر دروازہ بٹن سے لاک کر دیا۔ اس حصے میں تاریکی تھی، البتہ باہر کے بلب کی ہلکی سی روشنی آرہی تھی۔ فولاد خان مہمان خانے کے نزدیک گیلری میں تھا۔ وہ اندر کی طرف بڑھا۔ اندر والی گیلری جس میں دونوں کمرے تھے، وہاں بھی تاریکی تھی جبکہ رات کو یہاں بلب جل رہا تھا۔ فولاد خان شامی اور تیمور کے کمرے کی طرف بڑھا تھا کہ اس کے پیر تلے کوئی شے آئی۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ یہ سفید موتیوں کا ہار تھا اور فولاد خان نے اسے مونا کے گلے میں دیکھا تھا۔ اس نے ہار لے کر دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے؟" دوسری دستک پر اندر سے شامی نے پوچھا۔

"شامی صیب... ام اے۔" فولاد خان دبی زبان میں بولا۔

شامی نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ "فولاد خان! تم... خیریت ہے نا؟"

"صیب! میں سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک آواز سنا... جیسے دروازہ بند اوتا اے... ام اِدر پیچھے آیا، اِدر کا ایک دروازہ کُھلا اے... ام اندر آیا... اِدر گیلری کا لیٹ بند اے اور یہ آر اِدر پڑا اے۔"

شامی ہار دیکھ کر تشویش زدہ ہو گیا۔ "یہ تو مونا کا ہار ہے۔"

"ام بی یہی کہتا اے... مونا بی بی کا ہار اے۔"

شامی نے جلدی سے لڑکیوں والے کمرے پر دستک دی۔ تیسری زوردار دستک پر نوشی کی آنکھ کھلی، وہ ذرا پکی نیند سوتی تھی۔ مونا کو غائب پا کر وہ بھی چونک گئی۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ سامنے شامی اور فولاد خان کھڑے تھے۔

"شامی! مونا کہاں ہے؟"

"یہی تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں... مونا کہاں ہے؟"

"شاید واش روم میں ہے۔" نوشی بولی اور واش روم پر دستک دی۔ پھر اندر جھانکا۔ اس دوران میں شامی نے دوسرا واش روم بھی دیکھ لیا۔ وہاں بھی مونا نہیں تھی۔ ایک منٹ میں یہ واضح ہو گیا کہ مونا اس حصے میں نہیں تھی۔ تیمور سو رہا تھا، شامی نے اسے بھی اٹھا دیا۔ اس کی جھنجھلاہٹ مونا کے غائب ہونے کا سن کر غائب ہو گئی۔

"وہ کہاں ہے؟"

"اسی سوال کا جواب تو ہم تلاش کر رہے ہیں۔"

"تیمور صیب! بار کا دروازہ بھی کُھلا اے۔"

شامی نے وضاحت کی۔ "عقبی طرف کا دروازہ!"

"مونا کو اس وقت باہر جانے کی کیا ضرورت پیش آئی ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ اسے زبردستی لے جایا گیا ہے۔" شامی بولا۔ "اس کے گلے سے یہ ہار ادھر گیلری میں گر گیا اور یہاں کی روشنی بھی بند ہے۔ کیا تم دونوں میں سے کسی نے بند کی؟" اس سوال پر نوشی اور تیمور نے نفی میں سر ہلایا تو شامی نے بات جاری رکھی۔ "میں نے بھی بند نہیں کی۔ مونا بھی اس کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ اسے لے جانے والے نے زبردستی کی ہے جس کے نتیجے میں یہ ہار گر گیا۔"

"مگر کون اور کیوں؟"

"وہی جو مجھے ایک کمرے میں دکھائی دیا تھا۔" نوشی بولی۔

"یہاں کوئی ہے اور ہم سے چھپ رہا ہے۔ مونا کو تلاش کرو۔"

"فولاد خان، جا کر رشید کو لاؤ۔" شامی نے حکم دیا اور اندر جا کر بیگ سے اپنا پستول نکال لیا۔ پستول وہ نواب صاحب کی ہدایت پر لایا تھا۔ ان سب نے اپنے جوتے اور گرم کپڑے پہن لیے تھے۔ نوشی نے ان سے کہا۔

"پولیس کو نہ بلا لیا جائے؟"

"کیسے... یہاں فون نہیں ہے اور موبائل میں سگنل نہیں ہیں۔" تیمور نے نفی میں سر ہلایا۔ "آخر مونا کو کمرے سے باہر آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ممکن ہے، اسے کمرے سے اٹھایا گیا ہو۔"

نوشی نے انکار کیا۔ "کمرا اندر سے بولٹ تھا... وہ واش روم گئی تھی۔ صابن گیلا ہے اور فرش پر پانی ہے۔"

وہ باہر جانے والے عقبی دروازے کی طرف آئے۔ فولاد خان اسی دروازے سے باہر گیا تھا۔ شامی جانے لگا تو نوشی نے اسے روک لیا۔ "ابھی مت جاؤ... فولاد خان اور رشید کو آنے دو۔"

"پتا نہیں اب تک مونا کہاں ہو گی؟" شامی نے کہا۔ "تم دونوں رکو، میں جاتا ہوں۔"

☆☆☆

مونا کو ہوش آیا تو وہ ایک کمرے میں تھی اور یہاں فرش پر صرف ایک چٹائی تھی جس پر وہ بندھی پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ اور پیر ایک مخصوص انداز میں رسّی سے باندھے گئے تھے۔ رسیاں الگ الگ اس کے ہاتھوں اور پیروں میں اس طرح باندھی گئی تھیں کہ ان کی گرفت نرم تھی مگر وہ کسی صورت ان کی گرہیں نہیں کھول سکتی تھی۔ اس کے جسم پر پورا لباس تھا۔ کسی نے اس سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی تھی۔ دائیں طرف سے کنپٹی دُکھ رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ کسی نے اس کا منہ دبانے کے بعد اس کے سر پر ہاتھ مارا تھا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اسے خیال آیا کہ وہ شخص اندر کیسے آیا جبکہ سارے دروازے بند تھے۔ یہ کمرا اجنبی تھا۔ اس میں صرف ایک دروازہ تھا اور چھت پر لگا بلب جل رہا تھا۔

'کیا وہ عمارت کے کسی کمرے میں تھی۔' اس نے سوچا... اس صورت میں اس کی آواز کوئی نہ کوئی تو سنتا۔ اس نے چلّانے کے لیے منہ کھولا تھا کہ پتا چلا اس کے منہ پر ٹیپ چپکا ہے۔ اب وہ ناک سے غوں غاں کر سکتی تھی اور یہ آواز کمرے سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ کمرے کی دیواروں پر سفید رنگ تھا اور فرش پر سرخ اور سیاہ چوکور ٹائلیں لگی تھیں۔ یک لخت مونا مطمئن نظر آنے لگی تھی۔ اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور اطمینان سے چٹائی پر سر ٹکا دیا۔ اسے معلوم تھا کہ یہاں اسے لانے والے جلد یا بہ دیر اس سے ملنے ضرور آتے۔

☆☆☆

فولاد خان نے رشید کے کوارٹر کا دروازہ بجایا۔ "اور شید خاناں... بار آؤ... اِدر گڑبڑ اے رشید خاناں۔" فولاد خان نے اتنے زور و شور سے دروازہ بجایا کہ رشید خان مردہ بھی پڑا ہوتا تو باہر آجاتا مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ فولاد خان نے دو بار اور اسی طرح دروازہ بجایا اور جب کوئی جواب نہیں آیا تو اس نے آس پاس دیکھا پھر گھوم کر سامنے آیا۔ اسے رشید خان کاروں کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ فولاد خان اس کی طرف لپکا۔ "توم کدر اے... ام تو مارا دروازہ بجا کر آیا اے۔"

"میں عمارت کا چکر لگا کر آرہا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "روزانہ رات کو دو بار چکر لگاتا ہوں۔"

"ابی چلو تم کو بلایا اے۔"

"کیوں، خیریت؟"

"مونا بی بی اپنے کمرے سے غائب اے... اندر کدر بی نہیں اے۔"

"مونا بی بی غائب ہے... مگر کیسے؟"

"ام کو کیا پتا... ابھی چلو... صیب لوگ نے بلایا اے۔"

رشید خان اور فولاد خان سامنے والے دروازے سے اندر آئے۔ رشید نے چابی سے تالا کھول لیا تھا۔ تیمور اور نوشی عقبی دروازے کے پاس تھے۔ تیمور نے رشید سے پوچھا۔ "تم کہاں تھے... یہاں کوئی اندر آیا اور مونا کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔"

"پر کوئی اندر کیسے آیا؟" رشید پریشانی سے بولا۔

"یہ تم بتاؤ گے... یہاں کسی کے پاس عمارت کی چابیاں ہیں اور اس کے ذمے دار تم ہو۔ یاد رکھو اگر مونا نہ ملی تو تمہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا، وہ خود تم سے اگلوا لے گی۔"

"میرا قصور نہیں ہے صاحب!" رشید خان نے فریاد کی۔ "میں نے چابی کسی کو نہیں دی۔"

"تب تم خود ذمے دار ہو۔ فولاد خان! اسے بند کر دو۔"

"اے خبردار!" فولاد خان نے اتنی پھرتی سے پستول نکال کر رشید پر تانا تھا کہ اس کا جیب کی طرف بڑھتا ہاتھ رک گیا۔ فولاد خان غرّایا۔ "اپنا آت اوپر کرو... ورنہ ام سر میں گولی مارے گا۔"

"صاحب! یہ کیا کر رہے ہو... میں ادھر کا چوکیدار ہوں۔" رشید نے تیمور سے کہا مگر اس نے جواب دینے کے بجائے عقب سے آکر اس کے کُرتے کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔

"میرے پاس اس کا لائسنس ہے۔"

"ضرور ہو گا... لیکن تم نے ابھی اسے نکالنے کی کوشش کیوں کی؟" تیمور نے اس کی مزید تلاشی لی تو اس کے پاؤں سے بھی ایک پستول بندھا ہوا نکلا۔ "اور اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"صیب... یہی داؤس... مونا بی بی کو غائب کرنے کا ذمے دار اے... آپ اسے پولیس سے پہلے امارے آوالے کرو۔"

"تم کیا کرو گے؟"

"ام اس سے پوچے گا... مونا بی بی کدر اے... یہ بتائے گا۔"

"میں تم سے کمزور نہیں ہوں۔" رشید خان غرایا۔ وہ نہتا ہونے کے باوجود خوف زدہ نہیں تھا۔ "میرے قریب آئے تو پتا چل جائے گا۔"

"ام ابھی تو ماری اکڑ نکالتا اے۔" فولاد خان نے جوابی غراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ابھی نہیں... پہلے اسے کسی کمرے میں بند کرو۔" تیمور نے مداخلت کی۔ "اسے بعد میں دیکھیں گے... فی الحال تو مونا کو تلاش کرنا ہے۔"

"شامی ابھی تک نہیں آیا ہے۔" نوشی فکرمند ہو رہی تھی۔

فولاد خان نے رشید کو ایک کمرا کھول کر اس کے اندر دھکیل دیا اور دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔ تیمور بھی اب تک شامی کے نہ آنے سے فکرمند ہو گیا تھا۔ "فولاد خان! تم نوشی کے پاس رکو... میں شامی کو دیکھ کر آتا ہوں۔"

"جی نہیں۔" نوشی نے کہا۔ "اب کوئی اکیلے نہیں جائے گا ورنہ سب اسی طرح ایک ایک کر کے غائب ہوتے رہیں گے۔"

"تو کیا ہم سب مل کر مونا اور شامی کو تلاش کریں؟" تیمور نے جھنجھلا کر کہا۔

"عقل مندی اسی میں اے صیب۔" فولاد خان نے کہا۔ "سب ایک ساتھ او۔"

"تو پھر چلو عقل مندوں!" تیمور بولا۔ وہ عقبی دروازے سے باہر نکل گئے... یہ سوچے بغیر کہ وہ ایک فاش غلطی کر کے جا رہے ہیں۔ عمارت کا عقبی حصہ ویران تھا اور شامی کا دور تک پتا نہیں تھا۔

☆☆☆

شامی باہر نکلا۔ وہ بے حد محتاط تھا اور اس نے پستول بالکل تیار رکھا تھا۔ اگر کسی طرف سے اس پر حملہ ہوتا تو وہ ایک سیکنڈ میں گولی چلا سکتا تھا۔ اس نے عقبی پہاڑی کی طرف دیکھا۔ مونا کو لے جانے والے یا والوں نے عقبی دروازہ استعمال کیا تھا، اس کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔ ایک تو سامنے سے نکلنے کی صورت میں وہ فولاد خان کی نظروں میں آ سکتے تھے۔ دوسرے وہ اصل میں عقبی سمت میں ہی جانا چاہتے تھے اور عقب میں صرف یہ پہاڑی تھی۔ اگر وہ اس پہاڑی سے باہر سڑک کی طرف جاتے تو ان کو لازماً سامنے والے حصے سے گزرنا پڑتا۔

شامی نے محسوس کیا کہ اسے پہاڑی کا معائنہ ضرور کرنا چاہیے۔ سردی شدید تھی۔ شامی نے جیکٹ کے کالر اوپر کر لیے۔ اس نے پہاڑی پر چڑھنا شروع کیا۔ ڈھلوان خاصی تھی اور اسے جھاڑیوں اور پودوں کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔ اس نے دبی زبان میں پکارا۔ "مونا! تم کہاں ہو؟" کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے ایک بار پھر آواز دی۔ "مونا... کہاں ہو تم؟"

اس بار جواب میں ایک عجیب سی آواز آئی جیسے کوئی کراہا ہو۔ آواز ذرا اوپر سے آئی تھی۔ شامی اوپر جانے لگا۔ ایک جگہ رک کر اس نے پھر مونا کو پکارا تو جواب میں پھر وہی آواز آئی۔ اس بار یہ آواز قریب سے آئی تھی۔ شامی نے کھوج کی تو اسے ایک جھاڑی کے ساتھ تاریک خلا دکھائی دیا۔ یہ غار تھا۔ "اندر کوئی ہے؟" اس کے سوال پر وہ آواز مستقل آنے لگی۔ اندر تاریکی تھی۔ شامی نے اپنا موبائل نکالا جس میں ٹارچ بھی تھی۔ اسے روشن کر کے اس نے اندر جھانکا۔ یہ تنگ سا دہانہ تھا اور آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے جھاڑی سرکاتے ہوئے اندر قدم رکھا۔ اس موقعے پر اسے فولاد خان کی بات یاد آئی۔ اس نے بھی کسی آدمی کے کراہنے کی آواز سنی تھی اور اسے آسیب سمجھا تھا۔ شامی بہ مشکل اندر گیا۔ یہ محدود سا غار تھا۔ اسے فرش پر ایک جوان العمر آدمی پڑا دکھائی دیا۔ وہ بندھا ہوا تھا اور اس کے منہ پر ٹیپ چپکا تھا۔ وہ ناک سے آوازیں نکال کر متوجہ کر رہا تھا۔ اس نے شلوار قمیص پر گہرے نیلے رنگ کی اونی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ فرش پر سیدھا اور لمبا لیٹا ہوا تھا۔

"کون ہو تم؟" شامی نے پوچھا پھر اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اس نے جلدی سے اس کے منہ سے ٹیپ اتارا اور اپنا سوال دُہرایا۔ اس نے بے بسی سے شامی کی طرف دیکھا اور کچھ ایسی آوازیں نکالیں جو گونگے نکالتے ہیں۔ شامی نے جلدی سے پوچھا۔ "تم بول نہیں سکتے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور آوازیں نکالنا جاری رکھا پھر اس نے سر اٹھا کر اپنے بندھے ہاتھ پیروں کی طرف دیکھا۔ شامی نے سر ہلایا۔ "اچھا... میں سمجھ گیا۔ تمہارے ہاتھ پاؤں کھولتا ہوں۔"

نوجوان چہرے سے مقامی باشندہ لگ رہا تھا۔ شامی اس کے پاؤں سے بندھی رسّی کھولنے لگا۔ اسی لمحے نوجوان نے پھر زور و شور سے آوازیں نکالیں۔ شامی ان کا مطلب اس وقت سمجھا جب کوئی شے زور سے اس کے سر سے ٹکرائی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پھلجھڑیاں سی چھوٹیں... پھر ان پھلجھڑیوں سے سورج نکلا اور جا کر کھوپڑی کے عقبی حصے میں غروب ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی رات گہری ہو گئی۔

☆☆☆

مونا لیٹے لیٹے تھک گئی تھی۔ اچانک دروازہ ہلا۔ اسے ہوش میں آئے کم سے کم ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ اس کا جسم

سردی اور ایک ہی پوز میں ہونے کی وجہ سے سُن ہو رہا تھا۔ اس نے دروازہ ہلنے پر پُرامید نظروں سے دیکھا۔ دروازہ پھر ہلا اور ایک کرخت صورت جوان آدمی اندر آیا۔ اس کے نقوش کھڑے تھے اور ان سے سفاکی نمایاں تھی۔ اس نے پتلون اور ہائی نیک جرسی کے اوپر گرم جرسی پہن رکھی تھی۔ اس کے پیروں میں فل بوٹ تھے۔ اس نے مونا کی طرف غور سے دیکھا اور منہ پر چپکا ٹیپ اتارتے ہوئے کہا۔

"تم خوف زدہ نہیں لگ رہی ہو؟"

"مجھے کیوں خوف زدہ ہونا چاہیے؟" مونا نے الٹا سوال کیا۔

"کیونکہ تمہیں قتل کیا جا سکتا ہے، تم پر تشدد ہو سکتا ہے... تمہارے ساتھ اس سے بھی بڑھ کر کچھ ہو سکتا ہے۔" اس کے انداز میں معنی خیزی آ گئی تھی۔ "تم ایک خوب صورت لڑکی بھی ہو۔"

"سوال یہ ہے کہ تم یہ سب کیوں کرو گے؟"

"اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تمہارے ساتھ یہ سب ہو سکتا ہے۔"

"کون سی بات؟"

کرخت صورت شخص نے اس کے سامنے ایک فائل نکال کر رکھی۔ "تم اس پر سائن کرو گی۔"

"کیا ہے اس میں؟"

"اس فائل میں گفٹ ڈیڈ کے کاغذات ہیں۔ اس کے مطابق تم نے یہ عمارت مجھے گفٹ کر دی ہے۔"

"تم گفٹ کیوں کروا رہے ہو... براہِ راست اپنے نام پر کروا سکتے ہو؟"

"تم اس چکر میں نہ پڑو۔" وہ اب کچھ پریشان نظر آنے لگا تھا۔ اسے مونا کے پُراعتماد انداز نے فکرمند کر دیا تھا۔

"سنو... تمہارا تعلق یقیناً راجا قاسم علی سے ہے۔"

"تم کیسے جانتی ہو؟"

"اپنے رشتے داروں کو میں نہیں جانوں گی تو اور کون جانے گا؟ مجھے قاسم علی سے ایسی ہی توقع تھی۔ تم اس کے کیا لگتے ہو؟"

"اپنے باپ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "وہ بھائی کا حصہ مار کر بھاگ گیا تھا۔"

"میرا اندازہ درست ہے، تم قاسم علی کی اولاد ہو... تمہارے باپ نے اپنا حصہ پہلے ہی عیاشیوں میں اڑا دیا تھا اور میرے باپ کے حصے میں بس یہی عمارت آئی۔ تمہارا باپ اس پر نظریں جما کر بیٹھ گیا ہے۔"

"بابا کی بات مت کرو۔" اس نے کہا۔ "ان کو مرے چار سال ہو چکے ہیں۔"

"اوہ! تو قاسم علی مر گیا... تب تم کس حیثیت سے اس عمارت کی ملکیت چاہتے ہو؟"

"میں بھی اسی خاندان کا فرد ہوں... مجھے اس عمارت میں اپنا حصہ چاہیے۔"

"حصہ... تم تو پوری عمارت پر قبضہ چاہتے ہو۔"

"میں اسے فروخت کر کے تمہارا حصہ تمہارے حوالے کر دوں گا۔ اب تم جلدی سے اس فائل پر سائن کر دو۔"

مونا نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "کیا تم صرف اس عمارت کی ملکیت حاصل کرنے کے لیے یہ سب کر رہے ہو؟"

"تو اور کس لیے یہ چکر چلایا ہے؟"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں اسلام آباد آ رہی ہوں؟"

وہ مسکرایا۔ "تم بھول رہی ہو، ہمارے اور رشتے دار بھی انگلینڈ میں ہیں... مجھے ایک ایک پل کی خبر ملتی ہے۔ جیسے ہی تم انگلینڈ سے روانہ ہوئیں... مجھے اطلاع مل گئی تھی۔"

"تمہارے سیٹ اپ سے لگ رہا ہے کہ تم یہاں میرے منتظر تھے۔"

"یہ تو کامن سینس کی بات ہے۔ مجھے علم تھا کہ تم لازمی طور پر یہاں آؤ گی۔"

مونا نے اردگرد دیکھا۔ "میں عمارت میں ہوں یا کہیں اور ہوں؟"

"لگتا ہے، تم باتوں میں وقت گزاری کر رہی ہو۔" اس نے کہا۔ "تم اس فائل پر سائن کر رہی ہو یا نہیں؟"

"سائن کیسے کروں... بندھے ہاتھ سے؟" مونا نے معصومیت سے پوچھا۔

"میں تمہارے ہاتھ کھول رہا ہوں مگر کوئی شرارت مت کرنا... تم میرا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔"

"میں بے بس لڑکی تمہارا کیا بگاڑ سکتی ہوں؟"

کرخت صورت شخص نے اسے کھول دیا مگر صرف ہاتھ کھولے تھے۔ اس نے ایک بال پین مونا کی طرف پھینکا۔ "جلدی سے سائن کرو۔"

مونا نے فائل لی اور اسے کھول کر دیکھنے لگی۔ پھر اس نے فائل ایک طرف رکھ دی۔ یہ دیکھ کر کرخت صورت شخص نے اپنی جیکٹ سے پستول نکال لیا۔ وہ بہت چوکنا نظر آ رہا تھا۔ "سائن کرو۔" وہ غرایا۔

"تم مجھ سے ڈرے ہوئے لگ رہے ہو۔"

''میں کسی سے نہیں ڈرتا۔'' وہ بولا۔

''میں سوچنا چاہتی ہوں۔''

''تو سوچ لو۔''

''اونہوں... ایسے نہیں... تم سر پر سوار رہے تو میں کیسے سوچوں گی؟ کچھ دیر کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ آخر یہ میرے لیے زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔''

خلاف توقع وہ شخص مان گیا۔ ''ٹھیک ہے... میں ایک گھنٹے بعد آؤں گا۔ اس وقت تک فائل پر سائن ہو جانے چاہئیں۔''

اس کے جاتے ہی مونا نے جلدی سے اپنے پاؤں بھی کھولے۔ اس نے دروازہ چیک کیا، وہ باہر سے بند تھا۔ اس کے بعد اس نے کمرے کا معائنہ کیا۔ وہ سیدھے ہاتھ کے کونے کی طرف بڑھی۔ اس نے ٹائلوں کا جائزہ لیا۔ پھر ان کو پن کی نوک سے بجا کر دیکھنے لگی۔ ایک جگہ یوں آواز آئی جیسے ٹائل کے نیچے خلا ہو۔ مونا نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

☆☆☆

تیمور، نوشی اور فولاد خان باہر آئے۔ تیمور نے زور سے شامی کو پکارا۔ ''شامی... کہاں ہو؟''

''صیب! اتنی زور سے نئیں۔'' فولاد خان دبے لہجے میں بولا۔ ''اِدر دشمن اے... وہ بی سن لے گا۔''

''ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔'' نوشی بولی۔ اس کے پاس رشید خان سے حاصل شدہ ننھا سا پستول تھا جبکہ تیمور کے پاس ریوالور تھا۔ فولاد خان کے پاس اپنا پستول تھا۔ گویا سب مسلح تھے۔ ''ہمیں ذرا پھیل کر مگر ایک دوسرے کی نظروں میں رہ کر مونا اور شامی کو تلاش کرنا چاہیے۔''

وہ دائیں بائیں پھیل گئے۔ فولاد خان پہاڑی کی طرف جانے سے ہچکچا رہا تھا۔ اس نے کل اس جگہ پُراسرار سی آواز سنی تھی مگر تیمور کا حکم تھا۔ اس نے بادل ناخواستہ پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ نوشی عمارت کے دائیں طرف گئی تھی جس طرف رشید کا کوارٹر تھا اور تیمور بائیں جانب! نوشی نے عمارت کے کونے سے جھانکا۔ اچانک اسے لگا جیسے کوئی لپک کر دوسرے کونے کی آڑ میں چلا گیا تھا۔ اس طرف کون تھا؟ اس نے پلٹ کر فولاد خان اور تیمور کی طرف دیکھا، دونوں اپنی جگہ موجود تھے۔ ویسے بھی ان میں سے کوئی اتنی جلدی گھوم کر سامنے والے حصے کی طرف نہیں جا سکتا تھا اور نہ ہی انہیں نوشی کی طرف سے چھپنے کی ضرورت تھی۔

''فولاد خان!'' نوشی نے اسے آواز دی۔

فولاد خان اوپر گن تان لے رہا تھا۔ اسے شبہ ہوا تھا۔ اس نے ویسی ہی آواز سنی تھی جیسے پہلے سن کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اسی لمحے اسے نوشی کی آواز سنائی دی۔ وہ بے تابی سے اسے نیچے آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ وہ نیچے آیا۔ تیمور بھی آ گیا تھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''اس طرف کوئی ہے۔ میں نے اسے عمارت کے سامنے والے حصے کی طرف جاتے دیکھا ہے۔'' نوشی نے آہستہ سے بتایا۔

فولاد خان اس طرف لپکا، باقی سب اس کے پیچھے تھے۔ اس نے عمارت کے کونے سے دیکھا۔ ''اِدر تو کوئی نئیں اے نوشی بی بی۔''

''فولاد خان! تم گاڑیوں کی طرف دیکھو... میں اور نوشی پیچھے سے چکر لگا کر آتے ہیں۔'' تیمور نے کہا اور نوشی کو لے کر عمارت کے عقبی حصے کی طرف گیا۔ اس طرح رائونڈ لگانے سے کوئی ان کی نظروں سے بچ نہیں سکتا تھا۔ نوشی نے گزرتے ہوئے اس دروازے کو چیک کیا جس سے وہ باہر آئے تھے۔ وہ اندر سے بند تھا۔ اس نے تیمور کو بتایا۔

''یہ دروازہ اندر سے بند ہے۔''

''میرے خدا!'' تیمور کے منہ سے نکلا اور وہ تیزی سے بھاگا۔ عمارت کے لان میں فولاد خان دونوں گاڑیوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ ان کو بھاگتے دیکھ کر وہ چونکا۔ تیمور سامنے والے دروازے سے عمارت کے اندر داخل ہوا اور اس کمرے کی طرف لپکا جس میں رشید بند تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور رشید غائب تھا۔

''لعنت ہو۔'' تیمور نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''یہ ہم نے کیا حماقت کی۔''

نوشی نے دروازے کے تالے کی طرف دیکھا۔ ''ہمیں خیال ہی نہیں آیا کہ اسے اندر سے صرف ایک بٹن دبا کر کھولا جا سکتا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ تم نے رشید کو دیکھا ہو گا۔ وہ عقبی دروازہ بند کر کے سامنے سے نکلا اور اپنے کوارٹر کی طرف جا رہا تھا۔ تمہیں دیکھ کر واپس آ گیا۔''

''پر اب کدر اے؟'' فولاد خان نے سوال اٹھایا۔ وہ چوکنا ہو گئے۔

''وہ پھر عقبی راستے سے نکل گیا ہو گا۔'' نوشی نے خیال ظاہر کیا۔

''درست کہا۔ فولاد خان! اس کا کوارٹر چیک کرو اور نوشی! تم میرے ساتھ آؤ۔ ہم نے اس وقت پوری عمارت چیک کرنی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہاں کوئی نہ کوئی خفیہ

گوشہ ہے۔''

فولاد خان کے جانے کے بعد انہوں نے عمارت میں آمد و رفت کے تینوں راستے بند کر دیے تھے۔ ان کو اندر سے بولٹ کر دیا تھا تاکہ کوئی چابی سے کھول کر بھی اندر نہ آ سکے۔ فولاد خان کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ رشید کو تلاش کرے اور وہ مل جائے تو اسے لے کر عمارت کے سامنے والے دروازے پر موجود رہے۔ تیمور اور نوشی نے مہمان خانے سے آغاز کیا۔ تیمور اپنے ساتھ ایک طاقتور ٹارچ بھی لایا تھا جو اس نے کمروں کا معائنہ کرنے کے لیے ساتھ لے لی تھی۔ کچن اور ڈائننگ ہال سے گزر کر وہ دوسرے حصے میں آ گئے۔ یہاں چھ کمرے تھے۔ انہوں نے باری باری کمرے دیکھے۔ نوشی چابی سے تالا کھول رہی تھی۔ ان کمروں میں بھی کوئی نہیں تھا اور یہ خالی تھے۔

وہ واپس ڈائننگ ہال میں آئے۔ اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں یہیں تھیں۔ وہ اوپر جا رہے تھے کہ سیڑھیوں کے نیچے ایک دروازہ دکھائی دیا۔ یہ چھوٹا سا دروازہ تھا اور دیوار کے ہم رنگ تھا، اس لیے بادی النظر میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ نوشی نے اس کی طرف توجہ دلائی۔ ''یہ دروازہ کس لیے ہے؟''

''یہ تو تہ خانے میں جانے والا دروازہ لگتا ہے۔'' تیمور نے غور کیا۔

''پہلے اسے نہ دیکھ لیں۔''

تیمور ہچکچایا۔ ''او کے... اندر چلو۔''

وہ دروازہ کھول کر اندر اترے۔ سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ ایک وسیع تہ خانے میں کھڑے تھے۔ یہ عمارت کے کل رقبے کے ایک تہائی کے برابر تھا۔ ایک طرف بوائلر اور بھٹی تھی، اس کے ساتھ پانی گرم کرنے والا حصہ تھا اور اس کے پائپ تھے۔ یہاں نمی تھی۔ ایک طرف کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ تہ خانے میں بس یہی کچھ تھا۔ وہ واپس اوپر آنے لگے۔ تیمور نے دروازہ کھولنا چاہا تو وہ بند نکلا۔

''اسے کس نے بند کر دیا؟'' تیمور نے گھبرا کر کہا۔

☆☆☆

شامی کو لگ رہا تھا کہ اس کے سر میں گھنگھرو بج رہے ہیں اور یہ نہایت اذیت ناک قسم کے گھنگھرو تھے جو سر میں چبھ رہے تھے۔ اس نے بہ مشکل آنکھیں کھولیں۔ اس کے اندر کوئی رہ رہ کر خبردار کر رہا تھا کہ اٹھ جا... اگر اب نہ اٹھا تو پھر قیامت کے دن ہی آنکھ کھلے گی۔ اس نے ارد گرد دیکھا۔ وہاں گھور تاریکی تھی اور اس سے بھی زیادہ بری بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور منہ پر ٹیپ لگا تھا۔ ایک قسم کی جاناتی مہک بتا رہی تھی کہ وہ اسی غار میں پڑا ہے۔ اس نے کروٹ لی تو اس کا جسم گونگے شخص سے ٹکرایا۔ اس نے بھی ناک سے آواز نکالی یعنی اس کا منہ بھی بند کیا جا چکا تھا۔ شامی کا پستول اور موبائل غائب تھا۔

'بُرے پھنسے برخوردار... مگر ان لوگوں کا مقصد کیا ہے؟' شامی نے سوچا وہ ہاتھ ہلا کر اندازہ کر رہا تھا کہ اس کی گرفت کتنی سخت ہے۔ جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ ازخود آزاد نہیں ہو سکتا۔ اچانک اسے لگا جیسے غار کے باہر سے کوئی آواز آئی ہے۔ شامی نے ساکت ہو کر کان لگائے تو اسے معلوم ہوا کہ کوئی پہاڑی پر چل رہا ہے۔ وہ ناک سے آواز نکال کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اسے ناک سے آواز نکالنے کی زیادہ مشق نہیں تھی۔ اس لیے نکلنے والی آواز دھیمی سی تھی۔ اس موقعے پر گونگا شخص لیٹا تھا۔ اسے ناک سے آواز نکالنے کی خاصی مشق تھی۔ شامی نے اسے پاؤں مارا کہ وہ آواز نکالے مگر وہ ساکت لیٹا رہا۔ اب باہر سے واضح چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر شامی نے فولاد خان کی آواز سنی۔

''ام ابی آتا اے نوشی بی بی!''

شامی تڑپ کر رہ گیا مگر بے بسی سے فولاد خان کے واپس جانے کی آواز سننے کے سوا کچھ نہیں کر سکا تھا۔

☆☆☆

یہ دو افراد تھے جو عمارت کے ڈائننگ روم میں موجود تھے۔ ایک نے کہا۔ ''یہ تو اچھا ہوا کہ میں اندر تھا۔ میں نے ایک عورت اور مرد کو تہ خانے میں بند کر دیا ہے۔''

''کہیں وہ خفیہ راستے سے واقف نہ ہو جائیں۔'' دوسرے نے خدشہ ظاہر کیا۔

''ان کا باپ بھی نہیں ہو سکتا۔ تم نے کیا کیا؟''

''ایک گونگے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ میں نے اسے بھی گونگے کے پاس لٹا دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور اس کا پستول لے آیا۔''

''ان کا ڈرائیور کہاں ہے؟''

''وہ مجھے نظر نہیں آیا۔''

''مجھے بھی دکھائی نہیں دیا۔''

''اسے تلاش کرو... مجھے سب سے خطرناک شخص وہی لگ رہا ہے۔'' دوسرے نے کہا۔ ''کیا خیال ہے، لڑکی سائن کر دے گی؟''

پہلا مسکرایا۔ ''تم جانتے ہو کہ سائن کرانا اصل مقصد نہیں ہے۔''

''آخری شخص کو تلاش کرو۔ ہمیں صبح سے پہلے یہاں

سے نکلنا ہے۔"

☆☆☆

آخری شخص یعنی فولاد خان اس وقت چوٹی کے سب سے اوپری حصے میں موجود تھا اور وہاں سے نیچے عمارت کا معائنہ کرر ہا تھا۔ باہر نکلنے کے بعد اس نے پہلے رشید خان کے کوارٹر کا جائزہ لیا تھا۔ اس موقعے پر اس کے اندر ایک جنگجو بیدار ہو گیا تھا۔ گھات لگا کر چالیں چلنا اس نے اوائلِ جوانی میں سیکھ لیا تھا۔ البتہ شہری زندگی کی تن آسانی نے اسے زنگ لگا دیا تھا۔ آج حالات نے اس زنگ کو صاف کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے رشید کو غائب پایا تو اس نے خود سے کہا۔ "فولاد خاناں... کیوں پاگل کا ماقق اِدر اُدر باگتا اے... شیر کا چال چلو۔"

اور شیر کی چال چلنے کے لیے اس نے ایک مشکل راستہ اختیار کیا۔ وہ کسی کی نظروں سے بچنے کے لیے کوارٹر کے عقب سے پہاڑی پر چڑھا اور کسی نہ کسی طرح اوپر جا پہنچا... اور اس وقت جھاڑیوں کے درمیان چھپ کر نیچے کی نگرانی کرر ہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جو بھی یہ چکر چلا رہا تھا، جلد یا بہ دیر اس کے سامنے آجائے گا۔ وہ بالکل ساکت اور خاموش تھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ اس کی نظر عقب کی طرف کھلنے والے دروازوں پر مرکوز تھی۔

کوئی نصف گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور ایک سایہ باہر آیا۔ فولاد خان نے غور سے دیکھا۔ وہ نہ تو تیمور تھا اور نہ ہی نوشی ہو سکتی تھی۔ وہ رشید بھی نہیں تھا کیونکہ وہ خاصا طویل قامت تھا۔ وہ پہاڑی کی طرف آیا اور ایک جھاڑی کے عقب میں آکر غائب ہو گیا۔ فولاد خان نے نظروں پر زور دیا۔ وہ شخص اب وہاں نہیں تھا، اس جگہ کوئی خفیہ راستہ یا جگہ تھی جس میں وہ غائب ہو گیا تھا۔ فولاد خان نے دس منٹ انتظار کیا اور پھر اتر کر نیچے آیا۔ اس نے جگہ پوری طرح اپنی نظر میں رکھی تھی اس لیے اسے یقین تھا کہ وہ بالکل درست جگہ آیا ہے۔ اس جگہ جھاڑیاں تھیں۔ فولاد خان کسی محتاط گوریلے کی طرح بالکل خاموشی سے حرکت کرر ہا تھا۔ اس نے بنا آہٹ کے جھاڑیاں ٹٹولنا شروع کیں۔ ایک جھاڑی ذرا زیادہ ہی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے اسے ہلایا تو ایک طرف سوراخ نمودار ہوا۔ فولاد خان نے اس میں جھانکا۔ یہ چار فٹ قطر کا سوراخ تھا۔ یہ راستہ پختہ تھا اور ظاہر ہے ایک دو دن کا نہیں بنا تھا۔ فولاد خان کو یقین ہو گیا کہ رشید خان سازش میں شریک ہے، ورنہ اس راستے کو اس کے علم میں لائے بغیر استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے۔

فولاد خان اندر اتر گیا۔ یہ سرنگ نما راستہ گھومتا ہوا نیچے جانے لگا۔ ذرا دیر بعد فولاد خان فرش پر کھڑا تھا۔ اس کے سامنے ایک گیلری تھی جس کے خاتمے پر ایک دیوار تھی۔ یہاں بلب روشن تھا۔ ذرا آگے آنے پر فولاد خان کو بائیں طرف دروازہ دکھائی دیا۔ وہ دروازے کے پاس آیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ مگر اندر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ اس نے دروازے کو دھکیلا، وہ کھُلا ہوا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس میں ایک میز پر ایک ٹی وی رکھا تھا اور اس کے ساتھ ایک وی سی آر یا ڈی وی ڈی جیسی کوئی شے رکھی تھی۔ حیرت کی بات تھی کہ ٹی وی اسکرین پر مونا دکھائی دے رہی تھی اور وہ کسی سے باتیں کرر ہی تھی۔ اس کا مقابل نظر نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

مونا پھولی ہوئی سانس کے ساتھ چٹائی پر بیٹھی تھی کہ اس کا کزن آگیا۔ اس نے کڑی نظروں سے مونا کو گھورا۔ "تم نے سائن نہیں کیے؟"

"سوال یہ ہے کہ میں نے سائن کر دیے تو مجھے کیا ملے گا؟ میں تمہاری زبان پر تو اعتماد نہیں کر سکتی۔"

کزن کرخت انداز میں مسکرایا۔ "بھروسا تو تمہیں کرنا ہو گا... ورنہ تم کن حالات سے گزر سکتی ہو، اس کا تمہیں بھی اندازہ ہو گا۔ بہتر ہے کہ بُرا وقت آنے سے پہلے فائل پر سائن کر دو۔"

"میں نے دیکھا ہے، گفٹ ڈیڈ پرانی تاریخ کا ہے اور اس وقت میں انگلینڈ میں تھی۔"

"کیا تم انگلینڈ میں اس پر دستخط نہیں کر سکتی تھیں؟"

"گواہ والے سائن بھی نہیں ہیں۔"

وہ جھنجھلا گیا۔ "تم ان چکروں میں مت پڑو... سائن کرو۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم سائن ہو جانے کے بعد مجھے جانے دو گے؟"

"تمہیں دو دن یہاں رہنا ہو گا جب تک گفٹ ڈیڈ کی کارروائی مکمل نہیں ہو جاتی۔"

"اور اس کے بعد تم مجھے جانے دو گے؟"

"ظاہر ہے، میں نے تمہارا اچار تو نہیں ڈالنا ہے۔"

مونا سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے فائل اٹھائی اور اس کے مطلوبہ صفحات پر سائن کر دیے۔ اس نے فائل اپنے کزن کی طرف پھینکی۔ "لو... میں نے سائن کر دیے ہیں۔"

"شکریہ! اب تم دو دن یہاں آرام سے رہو۔"

"اس خالی کمرے میں؟" مونا نے چاروں طرف دیکھا۔

"نہیں، میں نے پی سی میں تمہارے لیے کمرا بک کرا دیا ہے۔" وہ الٹے قدموں دروازے کی طرف جاتے ہوئے

"تم دو دن وہاں آرام سے رہنا۔"

جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، اسے پشت سے دھکا لگا منہ کے بل فرش پر آن گرا۔

☆☆☆

شامی سوچ رہا تھا کہ اس بار بُرے پھنسے۔ سب سے بات یہ تھی کہ وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ دشمن کون ہے اور ان کے پیچھے پڑ گیا ہے؟ شامی کو کسی حد تک اندازہ تھا چکر مونا اور اس عمارت کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ اس نے ر پھر رسی ڈھیلی کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔ نے کروٹ لی اور گونگے کی طرف دیکھا۔ وہ اسے نظر نہیں تھا مگر اس کے ناک سے سانس لینے کی آواز آرہی تھی۔ نے لڑھک کر گونگے کی طرف پشت کی اور اپنے ے ہاتھ سے اس کے ہاتھ ٹٹولنے لگا۔ گونگے کے ہاتھ منے کر کے باندھے گئے تھے۔ شامی اس کا ہاتھ تلاش کر رسی کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی گرہ بھی بے حد تھی مگر شامی کے ہاتھ میں آرہی تھی۔

اس سے پہلے شامی نے کبھی بندھے ہاتھوں سے کسی ے کے بندھے ہاتھ کھولنے کا تجربہ نہیں کیا تھا اس لیے ہم بے حد مشکل لگ رہا تھا۔ اس نے سوچا، یہاں سے بچ تو اس قسم کے کاموں کی مشق ضرور کرے گا۔ اس نے رہ لگایا کہ گرہیں ایک خاص انداز سے باندھی گئی ہیں اور پر گرہ ہے۔ اسے کھولنا آسان نہیں تھا۔ گونگے نے ازہ لگایا کہ وہ اس کی رسی کھولنا چاہ رہا ہے۔ اس نے شامی طرف کروٹ لے لی۔ اس سے شامی کا کام آسان ہو گیا نصف گھنٹے کی جان توڑ کوشش کے بعد وہ گرہیں کھولنے کامیاب ہو گیا۔ سخت سردی کے باوجود وہ پسینے میں شرابور گیا تھا۔ گونگے نے اٹھ کر اپنے ہاتھ سے رسی نکالنے کی شش شروع کی۔ شاید بندھے رہنے سے اس کے ہاتھ سن گئے تھے۔ بالآخر گونگے نے اپنے ہاتھ آزاد کرا لیے۔ اس بعد اس نے پاؤں بھی کھولے۔

"شکر ہے۔" شامی نے اسے آزاد محسوس کر کے ان کا سانس لیا مگر اگلے ہی لمحے وہ ہکا بکا رہ گیا... کیونکہ اچانک اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا غار سے نکل گیا۔ شامی اسے ہی دل میں آوازیں دیتا اور بُرا بھلا کہتا رہ گیا۔

☆☆☆

نوشی اور تیمور فکر مند تھے۔ کسی نے ان کو تہ خانے میں بند یا تھا۔ دروازہ بے حد مضبوط تھا۔ اسے توڑنا ممکن نہیں تھا۔ دوبارہ نیچے آگئے۔ تیمور نے سوئچ بورڈ تلاش کر کے اس کے بٹن دبائے تو تہ خانے میں دو عدد ٹیوب لائٹس جل اٹھیں۔ اب تہ خانہ واضح نظر آرہا تھا۔ تیمور نے چاروں طرف دیکھا۔

"عام طور سے اتنے بڑے تہ خانے میں باہر سے براہِ راست اندر آنے کا کوئی راستہ ہوتا ہے۔" تیمور نے کہا۔ "تا کہ سامان لایا جا سکے۔"

"یہاں کوئی اور دروازہ نہیں ہے۔" نوشی نے چاروں طرف دیکھا۔ "مجھے لگ رہا ہے کہ اس عمارت سے کوئی مسئلہ وابستہ ہے۔ مونا نے ہمیں پوری بات نہیں بتائی ہے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ سب سے پہلے وہی غائب ہوئی ہے۔"

"ممکن ہے، اس عمارت میں کوئی خزانہ یا قیمتی شے ہو۔" نوشی نے قیاس آرائی کی۔

"میرا خیال ہے کہ تم کنگ سولومن مائنز قسم کی فلمیں زیادہ دیکھنے لگی ہو۔" تیمور نے ملائمت سے کہا۔

"نہیں، مجھے ایسے ہی خیال آگیا تھا۔" نوشی خفت سے بولی۔

تیمور دیواروں کو دیکھنے لگا۔ آخر اسے ایک جگہ دیوار میں الگ سے بلاک لگے محسوس ہوئے، آؤٹ لائن واضح تھی۔

"شاید یہ دروازہ تھا اور کسی وجہ سے بند کر دیا گیا۔"

"شاید اسے توڑنا بھی ناممکن ہے۔" نوشی نے دیوار کو پستول کے دستے سے بجایا۔ "یہ ٹھوس ہے۔"

"ہاں، ہمارے پاس اوزار نہیں ہیں۔"

"آخر کسی نے ہمیں اس تہ خانے میں کیوں بند کیا ہے؟"

تیمور نے نوشی کی طرف یوں دیکھا جیسے اسے اس قسم کے احمقانہ سوال کی توقع نہیں تھی۔ "ظاہر ہے کہ ہم یہاں سے نہ نکل سکیں اور ان کے کام میں مداخلت نہ کریں۔"

نوشی نے نفی میں سر ہلایا۔ "بند کرنے والے کو بھی معلوم ہے کہ ہمارے پاس ہتھیار ہیں۔ ہم دروازہ توڑ کر نکل سکتے ہیں۔ ہمیں ہمیشہ کے لیے بند کرنا ممکن نہیں ہے۔"

"پھر کیا مقصد ہو سکتا ہے؟" تیمور نے حیرانی سے کہا۔ "یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی۔"

"ہاں، یہ بات سب سے پہلے تم مردوں کے دماغ میں آنی چاہیے... غلطی سے میرے ذہن میں آگئی۔" نوشی نے طنز کیا۔

"خیر، اب ایسی بات نہیں ہے۔" تیمور کھسیا گیا۔ "یہ بتاؤ کہ دروازہ کیوں بند کیا ہے؟"

"تا کہ جب ہم اسے توڑنے کے لیے فائر کریں تو اسے خبر ہو جائے۔"

"کبھی کبھی تم واقعی عقل مندی کی باتیں کر جاتی ہو۔" تیمور نے اوپر کی طرف لپکتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

رشید خان کی شخصیت اس وقت بالکل بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے مسکینی کے بجائے ایک قسم کی سنجیدگی تھی جیسے اس صورتِ حال کا ذمے دار وہی ہو۔ اس نے مونا کے کزن کے جانے کے بعد عمارت کے مہمان خانے کا رخ کیا۔ اسے معلوم تھا کہ مونا کس کمرے میں ٹھہری تھی۔ وہ سیدھا اس کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں دو عدد بیگ رکھے تھے۔ اس نے ایک بیگ کھولا... اس میں سوائے کپڑوں اور ایک ہینڈ بیگ کے کچھ نہیں تھا۔ ہینڈ بیگ میں رقم اور ایک موبائل، ڈرائیونگ لائسنس اور شناختی کارڈ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس نے بیگ دیکھ کر واپس اندر رکھا اور زپ بند کر دی۔ دوسرے بیگ کی زپ نمبروں والے تالے سے بند تھی۔ رشید نے زور لگا کر زپ کا ہک تالے سے نکال دیا۔ اس میں بھی کپڑے اور ایک عدد ہینڈ بیگ تھا۔ اس میں پاسپورٹ، برٹش ڈرائیونگ لائسنس اور ایک ڈیجیٹل ڈائری تھی۔ رشید نے اسے آن کیا مگر اس نے پاس ورڈ مانگ لیا۔

"لعنت ہو۔" رشید خان نے زیرِ لب کہا۔ اس نے سارا سامان پھر سے ویسے ہی رکھ دیا۔

اچانک گولیاں چلنے کی آواز نے اسے چونکایا اور وہ اٹھ کر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ اس نے سامنے والے دروازے کا رخ کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نوشی اور تیمور کو تہ خانے سے نکلنے میں کچھ دیر لگے گی، اس دوران میں وہ باہر نکل جائے گا۔ اس نے بے آواز دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔ عین اسی وقت تیمور اور نوشی اپنے کمروں کی طرف جا رہے تھے۔ رشید خان مسکرایا۔ اس کا خیال تھا کہ مونا نے کاغذات پر دستخط کر دیے ہوں گے۔ وہ اپنے کوارٹر کی طرف سے جانے لگا کہ اچانک کوئی عمارت کے کونے سے نکل کر اس سے ٹکرایا۔ رشید خان نیچے گرا اور پھر اس شخص کو دیکھ کر اچھل پڑا۔ یہ گونگا تھا جسے باندھ کر پہاڑی کھوہ میں ڈال رکھا تھا اور وہ اسے آزاد نظر آ رہا تھا۔

"تم!" رشید خان کے منہ سے نکلا۔ گونگا اسے دیکھ کر چوکڑیاں بھرتا ہوا عمارت کے دوسرے حصے کی طرف بھاگا۔ جب تک رشید خان سنبھل کر اس کے پیچھے جاتا، وہ گاڑیوں سے بھی آگے نکل گیا تھا۔ رشید خان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا ورنہ وہ اسے گولی مارنے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ گونگے کی رفتار اتنی تیز تھی کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے قدرتی پل عبور کر کے سڑک کی طرف تاریکی میں غائب ہو گیا تھا۔ رشید خان واپس آیا پھر اس کے ذہن میں ایک خیال اور آیا۔ غار میں گونگا اکیلا نہیں تھا۔ شامی کو بھی وہاں باندھ کر ڈالا تھا۔ گونگا آزاد ہوا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ شامی بھی آزاد ہو گیا ہے۔ "لعنت ہو!" اس کے منہ سے نکلا اور وہ پہاڑی کی طرف دوڑا۔ اس وقت اسے پروا نہیں تھی کہ کوئی اسے دیکھ سکتا ہے۔ معاملہ خراب ہو رہا تھا۔ بہت ساری چیزیں ان کی توقع کے مطابق نہیں ہوئی تھیں مگر انہوں نے اصل مقصد میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ رشید خان کے خیال میں اب ان کو وہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ وہ جھاڑی ہٹا کر عمارت کے نیچے جانے والے راستے میں گھسا۔

☆☆☆

فولاد خان نے مونا کے کزن کی کمر پر پاؤں رکھا اور بولا۔ "اٹھامت... ورنہ ام سر میں گولی مارے گا۔"

"فولاد خان!" مونا بے تابی سے بولی۔ "شاباش!"

فولاد خان کا سینہ پھول گیا۔ "امارے اوتے آپ کا کوئی کوچ نئیں بگاڑ سکتا۔"

مونا نے جلدی سے فائل اٹھا لی۔ فولاد خان ایک لمحے کے لیے مونا کی طرف متوجہ ہوا تھا کہ اس کے کزن نے اچانک کروٹ لی۔ فولاد خان لڑکھڑا کر پیچھے ہوا۔ رہی سہی کسر اس نے فولاد خان کے پاؤں پر لات مار کر پوری کر دی۔ فولاد خان دھڑام سے فرش پر گرا اور اس کا سر فرش سے ٹکرایا۔ ایک گونجتی ہوئی آواز آئی اور پستول فولاد خان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ مونا کا کزن تڑپ کر اٹھا۔ مونا پستول کی طرف لپکی۔ کرخت صورت شخص نے اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر اس کے ہاتھ میں صرف مونا کی قمیص کی آستین آئی تھی۔ "چر" کی آواز کے ساتھ آستین اس کے ہاتھ میں رہ گئی تھی اور مونا پستول پر جا گری۔ اس سے پہلے کہ وہ پستول اٹھاتی، مونا کا کزن اس پر جا گرا۔ اس کے سخت جسم اور وزن تلے نرم و نازک مونا پس کر رہ گئی۔ اس نے کراہ کر اسے گالی دی۔

"حرامزادی..." وہ غرایا۔ "اب تجھے بتاتا ہوں۔"

پستول مونا کے جسم تلے دب گیا تھا اور اس کا کزن اسے نکالنے کا موقع نہیں دے رہا تھا اور اپنے جسم کا پورا دباؤ اس پر ڈال رہا تھا۔ شاید اس معاملے میں اس کی نفسانیت بھی کارفرما تھی۔ اسے لذت مل رہی تھی اور اس لذت کے چکر میں وہ فولاد خان کو بھول گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ پکا بے ہوش ہو چکا ہے مگر فولاد خان ہوش میں آ گیا تھا اور اسے مونا کو پیٹتے دیکھ کر اس کا پٹھان خون کھول اٹھا تھا۔ اس نے اٹھ کر اس کے

اپنے بھاری جوتے سے زوردار ٹھوکر رسید کی۔ وہ کراہ کر رہ گیا اور دوسری ٹھوکر نے اسے ہوش و حواس سے بے گانہ کر دیا۔ اگرچہ وہ طاقت اور مضبوطی میں فولاد خان سے کسی طرح کم نہیں تھا مگر فولاد خان نے جوش میں اتنی قوت سے ٹھوکریں ماری تھیں کہ وہ حواس میں نہ رہ سکا۔ اس کی طرف سے اطمینان ہونے کے بعد فولاد خان نے لپک کر مونا کو اٹھایا۔ "بی بی... آپ ٹھیک اے۔"

فولاد خان نے اس کا دودھیا اور میدے کی طرح نرم بازو پکڑا تھا۔ ایک لمحے کو وہ بوکھلا گیا تھا۔ مونا نے مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ خود کو الّو محسوس کرنے لگا۔ "شکریہ فولاد خان!" مونا نے لوچ دار آواز میں کہا اور اس کی آنکھیں نشیلی ہو گئیں۔ "تم نے مجھے بچا لیا۔"

"ام نے اپنا فرض ادا کیا۔" فولاد خان نے تھوک نگل کر اور جلدی سے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ "ابی اِدر سے نکلو... پتا نہیں اس داؤس کا اور کتنا آدمی اے۔"

"یہ میرے سگے چچا کا لڑکا ہے۔" مونا نے اپنے کزن کی طرف اشارہ کیا۔

فولاد خان اچھل پڑا۔ "تمارے سگے چاچا کا لڑکا؟"

"ہاں، یہ زبردستی... مجھ سے اس عمارت کے کاغذات پر دستخط کرانا چاہتا تھا۔"

"داؤس، ام اسے دیک لے گا۔" فولاد خان غرایا۔ "ابی بے ہوش ہے، جب جاگے گا تب دیکھے گا۔"

"اسے چھوڑو... یہاں سے نکلو۔" مونا نے کہا اور فولاد خان کا ہاتھ تھام کر باہر لپکی۔ فولاد خان اس کے ساتھ کچے دھاگے سے بندھا چلا گیا۔ دوسرے کمرے میں آتے ہی مونا ٹھٹک گئی۔ وہاں رکھے ٹی وی اور اس کے ساتھ رکھی مشین کو دیکھ کر چونک گئی۔ اسکرین پر اس کمرے کا منظر تھا جس میں وہ کچھ دیر پہلے تھی اور فرش پر پڑا اس کا کزن صاف نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر یہ سب دیکھتی رہی پھر وہ سمجھ گئی۔ اس نے غصے سے ٹی وی کے ساتھ منسلک مشین کھینچی اور اسے اٹھا کر دیوار سے مارا۔ وہ بکھر کر زمین پر گر گئی۔ "فولاد خان! اسے چکنا چور کر دو۔" مونا نے اسے حکم دیا۔

فولاد خان نے جوتے سے مار کر مشین کو بالکل ہی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور پھر مونا سے پوچھا۔ "یہ کیا اے بی بی؟"

مگر مونا کسی سوچ میں گم تھی۔ وہ پریشان دکھائی دے رہی تھی، اس نے اپنے قید خانے میں واپس جا کر دروازے کے اوپر دیکھا تو یہاں اسے شیشے کے گلوب میں لگا کیمرے کا لینس نظر آ گیا۔ ان لوگوں نے چالاکی سے کام لیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ انہوں نے سب دیکھ لیا ہو گا۔ یہ خیال ہی پریشان کن تھا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ اسے جو کرنا تھا، ابھی کرنا تھا۔ اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس نے فولاد خان سے کہا۔ "اسے اٹھا کر باہر لے چلو۔" اس نے اپنے بے ہوش کزن کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں بی بی صیب؟"

"سوال مت کرو۔" مونا جھنجھلا گئی۔ "بس اسے لے جاؤ۔"

فولاد خان نے اسے شانے پر اٹھا لیا۔ "بار جانے کا راستہ تنگ اے۔"

"گھسیٹ کر لے جاؤ اور میرا انتظار کرنا... سمجھ گئے؟"

"سچی بات اے، ام نئیں سمجھا... بس جیسا آپ فرماؤ۔" فولاد خان نے کہا اور اسے لے کر باہر چلا گیا۔

☆☆☆

تیمور اور نوشی اپنے کمروں کی طرف آئے۔ اس طرف کوئی نہیں تھا۔ "وہ ادھر نہیں آیا۔" تیمور بولا۔

"نہیں... آیا تھا۔" نوشی نے اپنا بیگ دیکھا۔ "اس نے ہمارے سامان کی تلاشی لی ہے۔ یہ دیکھو، مونا کا بیگ لاک ٹوٹا ہوا ہے۔"

"آخر ان لوگوں کا مقصد کیا ہے؟"

"یہ تو جب مونا ملے گی تب پتا چلے گا۔"

"یہ سب غائب کہاں ہیں، جو عمارت سے باہر جاتا ہے، غائب ہو جاتا ہے۔" تیمور بولا۔ "کیا خیال ہے... ہم بھی باہر چل کر دیکھیں؟"

"اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ اس سارے چکر کا تعلق اسی عمارت سے ہے۔" نوشی بولی۔

"یہ بھی تمہارے ذہن میں آیا ہے۔" تیمور نے طنز کیا۔ "مجھے تو گاڑیوں کی فکر ہے۔"

"اور مجھے فولاد خان کی فکر ہے۔ وہ اب تک کیوں نہیں آیا؟"

تیمور نے گہری سانس لی۔ "نوشی بی بی! اگر گاڑیوں کو کچھ ہوا تو ہم یہاں سے نکل بھی نہیں سکتے... اس لیے پہلے گاڑی..."

"اور فولاد خان؟"

"وہ بھی وہیں ہو گا جہاں باقی ہیں۔"

☆☆☆

فولاد خان اس وزنی شخص کو گھسیٹتا اور اسے زیرِ لب سناتا ہوا سرنگ کے دہانے تک لایا۔ پھر اسے نکالنے سے پہلے وہ خود باہر نکلا اور جیسے ہی اس نے سر نکالا، رشید خان نے اس

کے سر پر ضرب لگائی اور وہ بہ زبان پشتو ادب لطیف فرماتا ہوا ڈھیر ہوگیا۔ رشید نے پتھر پھینکا اور فولاد خان کی تلاشی لی مگر اس کے پاس سے کوئی ہتھیار نہیں نکلا۔ اس کا پستول مونا کے پاس تھا۔ رشید نے اسے اندر کھینچا پھر مونا کے کزن کو دیکھا۔ وہ کراہ رہا تھا۔ رشید نے اس کے گال تھپتھپائے۔

''شہزاد! ہوش میں آؤ۔''

اس کی کوششوں سے شہزاد جلد ہوش میں آگیا اور اس نے رشید کو جلدی سے خود پر گزرنے والے حالات سنائے۔

''وہ کتیا اندر ہے۔'' شہزاد نے اپنا سر دبایا۔ ''اس نے خفیہ خانہ کھول لیا تھا۔ سب ریکارڈ ہوگیا ہے۔''

''تم نے چیک کیا؟'' رشید نے چونک کر اسے دیکھا۔

''نہیں، سائن کرانے کے چکر میں نہیں دیکھ سکا۔''

''مونا کے پاس کوئی ہتھیار ہے؟''

''اس کے پاس تھا۔''

''اس کے پاس تو نہیں ہے۔'' رشید نے بتایا۔ ''یقیناً مونا کے پاس ہوگا۔''

وہ محتاط انداز میں خفیہ تہ خانے کی طرف بڑھے۔ جب ٹی وی والے کمرے میں پہنچے تو وہاں ریکارڈر کو ٹکڑوں کی صورت میں دیکھ کر پاگل ہوگئے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ رشید خان نے چالاکی دکھائی۔ اس نے فوری طور پر دروازے کو باہر سے بند کردیا۔ اب مونا اندر قید ہوگئی تھی۔

''بند رہنے دو اس کو۔'' شہزاد غرایا۔ اس نے میز کے نیچے سے ایک بیگ نکالا جو ایسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس میں سے ایک رائفل کے ٹکڑے نکلے جنہیں جوڑ کر اس نے ایک لمبی سی رائفل بنالی۔ ''آؤ... پہلے ان لوگوں سے نمٹتے ہیں پھر اسے بھی دیکھ لیں گے۔''

رشید مسکرایا۔ ''ہاں، اس بند کمرے سے کہاں جائے گی۔''

☆☆☆

شامی نے کروٹ لی اور غار ٹٹولنے لگا۔ اس نے کئی فلموں میں دیکھا تھا کہ ہیرو بندھے ہونے کے باوجود اپنے قریب کوئی نہ کوئی نوکیلی اور تیز دھار چیز تلاش کرلیتا تھا اور اس کی مدد سے اپنے ہاتھ کھول دیتا ہے مگر غار میں ایسی کوئی شے نہیں تھی۔ اس نے ٹی پار کروٹیں لیں۔ کوئی شے اس کی پتلون کی جیب میں چبھ رہی تھی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اس کی جیب میں ایک ناخن تراش ہے اور اس میں چاقو لگا ہے۔ چاقو اگرچہ اتنا تیز نہیں تھا مگر اس سے رسّی کاٹنے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح ناخن تراش جیب سے نکالا، اس کا چاقو کھولا اور اس کی دھار رسّی پر رگڑنے لگا۔ بندھے ہاتھوں سے یہ کام حد سے زیادہ دشوار تھا۔ واحد امید کی کرن یہ تھی کہ رسّی سوتی تھی اور آہستہ آہستہ کٹ رہی تھی۔ ہر دس منٹ بعد وہ آرام کرتا تھا اور پھر رسّی کاٹنے کی کوشش شروع کردیتا تھا۔

اچانک رسّی ڈھیلی ہوئی تو شامی خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے جلدی سے رسّی اتار پھینکی۔ اس کے بعد پیروں کی رسّی بھی کھول دی۔ اس نے رسّیاں کھول کر پہلے غار سے باہر جھانکا۔ اسے ڈھلوان اور عمارت کی طرف کوئی دکھائی نہیں دیا تھا۔ ابھی وہ باہر نکلا ہی تھا کہ اچانک نیچے ڈھلوان پر دو سائے جیسے زمین سے اگ آئے۔ شامی پھرتی سے ایک جھاڑی کی آڑ میں نہ ہوگیا ہوتا تو وہ اسے دیکھ لیتے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بڑی سی رائفل تھی۔ شامی نے رشید کی آواز سنی۔

''وہ عمارت میں ہوں گے۔''

''تمہیں یقین ہے کہ چوکیدار فرار ہوگیا ہے؟'' دوسرے نے پوچھا۔ ''وہ واپس نہ آگیا ہو؟''

''نہیں... وہ جس طرح بھاگا تھا، اس نے اپنے گھر پہنچ کر ہی دم لیا ہوگا۔ ویسے بھی ہم صبح سے پہلے نکل جائیں گے۔'' رشید بولا۔

''اور اس سے پہلے پولیس آگئی تو؟''

''نہیں آئے گی۔ یہاں کا ایس ایچ او میری مٹھی میں ہے۔''

وہ ڈھلوان سے اترے اور عقبی راستے سے عمارت کے اندر چلے گئے۔

شامی حیران تھا کہ وہ اچانک ہی ڈھلوان پر کہاں سے اگ آئے تھے؟ وہ چھپتا ہوا اس طرف بڑھا اور اس جگہ سے جھاڑیاں ہٹائیں تو اسے سرنگ کا دہانہ دکھائی دیا۔ ذرا سے تذبذب کے بعد وہ اندر داخل ہوا اور فوراً ہی کسی چیز سے ٹھوکر کھائی۔ یہ کسی کا جسم تھا۔ شامی نے ہاتھ سے ٹٹولا اور فولاد خان کی مونچھوں سے اسے شناخت کرلیا۔ وہ بے ہوش تھا۔ اس کی سانس اور نبض باقاعدگی سے چل رہی تھی۔ یعنی اسے خطرہ نہیں تھا۔ شامی نے اس کا پستول تلاش کیا جو غائب تھا۔ ذرا آگے سے روشنی آرہی تھی۔ شامی آگے بڑھا۔ ذرا دیر میں وہ ٹی وی والے کمرے میں تھا۔ اس میں ایک دروازہ اور تھا جو باہر سے بند تھا۔ شامی نے جیسے ہی اس کا ہینڈل گھمایا، اندر سے فائر ہوا اور گولی شامی کے پاس سے گزر گئی۔ وہ بال بال بچا تھا۔

''لاحول ولاقوۃ۔'' وہ ہڑبڑا کر پیچھے ہوا۔

''شامی!'' اندر سے مونا کی حیرت میں ڈوبی آواز آئی۔ ''یہ تم ہو؟''

''نہیں، میرا بھوت ہے.. میں تو مر چکا ہوں۔'' اس نے بھنا کر کہا۔ مونا اندر سے نکل کر اس سے لپٹ گئی۔

''تھینکس گاڈ... یہ تم ہو ورنہ میں سمجھ رہی تھی کہ میرا آخری وقت آگیا ہے۔''

''وہ دونوں عمارت میں گئے ہیں۔'' شامی نے اسے آگاہ کیا۔ ''فولاد خان سرنگ میں بے ہوش پڑا ہے۔''

''دوسرا کون ہے؟'' مونا چونکی۔

''رشید خان... اور پہلا کون ہے؟''

''میرا کزن... میرے چچا کا لڑکا... وہ مجھ سے عمارت کی ملکیت کے کاغذات سائن کروانا چاہتا تھا۔''

''تو یہ مقصد ہے ان لوگوں کا۔'' شامی نے سر ہلایا۔ ''آؤ، باہر چلیں۔''

☆☆☆

نوشی اور تیمور کاروں کے پاس تھے اور ان کو یہاں کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تیمور نے دونوں کاریں دیکھی تھیں، ان میں کوئی نہیں تھا۔ اچانک عمارت کی چھت سے تیز روشنی پھوٹی۔ اوپر پاؤنڈری وال کے ساتھ تیز لائٹس لگی تھیں اور کسی نے وہ جلا دی تھیں۔ نوشی اور تیمور پھرتی سے دونوں کاروں کے درمیان دبک گئے۔ ان کو روشنیوں کے عقب میں کسی کی حرکت کا احساس ہوا تھا۔

''اوپر کوئی ہے۔'' نوشی بولی۔

''ہاں... لیکن یہ روشنی ہی ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ اوپر لائٹس بھی لگی ہیں۔''

''وہ مسلح ہوسکتا ہے۔''

''میرے خیال میں ایک سے زیادہ آدمی ہیں۔''

''سنو، یہ لائٹس ہم دونوں کو تلاش کرنے کے لیے آن کی گئی ہیں۔ باقی لوگ تو ان کے قابو میں ہیں۔'' نوشی نے کہا۔

''تب بہتر ہے کہ ہم ان کی نظروں سے دور رہیں۔'' تیمور نے کہا۔ ''یہ ہمیشہ تو اوپر نہیں رہیں گے۔''

☆☆☆

فولاد خان نے دوسری بار ہوش میں آکر اپنا سر تھاما۔ اس نے موٹی اونی ٹوپی نہ پہنی ہوتی تو اس کا سر پھٹ جاتا۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ جیب سے نسوار نکال کر اس کی چٹکی منہ میں رکھی تو اس کے حواس تیزی سے بحال ہونے لگے۔ اس نے سرنگ سے باہر دیکھا۔ اسی لمحے عمارت کے اوپر تیز روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ فولاد خان نے ایک سرکو اوپر سے جھانکتے دیکھا اور جیسے ہی وہ غائب ہوا، فولاد خان لپکتا ہوا عمارت کے نیچے آگیا۔ اس نے عقبی دروازہ دیکھا... وہ بند تھا۔ اس نے دوسرا دروازہ دیکھا۔ خوش قسمتی سے وہ کھلا تھا۔ فولاد خان اندر گھسا۔ اسے یقین تھا کہ اوپر موجود لوگ مسلح ہوں گے اور خالی ہاتھ ان کے سامنے جانا آبیل مجھے مار والی بات ہوتی۔

فولاد خان کسی ہتھیار کی تلاش میں تھا۔ مرسیڈیز کی عقبی نشست کے نیچے اس کی شاٹ گن بھی مگر اس تک جانا ناممکن تھا۔ اوپر موجود افراد نے روشنیاں ہی اس لیے آن کی تھیں تاکہ ان میں سے کوئی بھی فرار نہ ہوسکے۔ آخر فولاد خان کو لوہے کی ایک سلاخ مل گئی۔ اسے لے کر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اس دوران میں وہ محتاط رہا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کوئی سیڑھیوں پر ہوگا۔ چھت پر کھلنے والا دروازہ فولاد کا تھا۔ اس نے احتیاط سے کھلی جھری سے جھانکا۔ اسے مونا کا چچازاد ایک لمبی سی رائفل لیے چھت سے نیچے نگرانی کرتا نظر آیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کسی کا نشانہ لے رہا ہو۔ اچانک اس نے چونک کر لبلبی پر انگلی رکھی تو فولاد خان نے اسے دور سے سلاخ پھینک کر ماری۔ سلاخ اس کے شانے سے لگی اور اسی لمحے فضا ایک دھماکے سے گونج اٹھی۔

☆☆☆

مونا اور شامی سرنگ کے اس حصے میں آئے جہاں فولاد خان پڑا تھا مگر وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ شامی پریشان ہوگیا۔

''فولاد خان یہاں تھا... وہ کہاں گیا؟''

''میرا خیال ہے کہ اسے ہوش آگیا ہوگا اور وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔'' مونا نے خیال ظاہر کیا۔

''ہمیں بھی اس جگہ سے بلکہ اس عمارت سے نکل جانا چاہیے۔'' شامی بولا۔ اس نے باہر جھانکا تو اسے خاصی روشنی دکھائی دی۔ اس نے اوپر دیکھا جہاں ایک تیز روشنی والا بلب روشن تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ چھت پر کوئی ہے۔ وہاں تیز روشنیاں جل رہی ہیں۔''

''وہ ہمیں فرار ہونے سے روکنا چاہتے ہیں۔''

شامی باہر نکلا۔ اس نے مونا کا ہاتھ پکڑا اور دونوں تیزی سے بھاگ کر عمارت کے نیچے پہنچ گئے۔ مونا نے سرگوشی کی۔

''اب کیا کرنا ہے؟''

''کاروں تک جانا ہے۔''

''اور باقی لوگ؟''

''میرا خیال ہے کہ تیمور بھی یہی کرے گا۔'' شامی بولا۔ اس نے ایک دروازہ چیک کیا۔ ''یہ بند ہے۔''

''یہ بھی بند ہے۔'' مونا نے دوسرا دروازہ چیک کیا۔ ''اب ہمیں گھوم کر سامنے سے جانا پڑے گا۔''

وہ عمارت کے ساتھ ساتھ لان کی طرف بڑھے پھر اسی

طرح سامنے والے کونے پر آئے۔ کاریں یہاں سے صرف بیس گز دور تھیں۔ ''ہمیں بھاگ کر جانا ہوگا۔ ان کے پاس ہتھیار ہیں... رائفل بھی ہے۔''

''رائفل!'' مونا متفکر ہوگئی۔ ''وہ گولی چلا دے گا۔''

''مگر ہم یہاں بھی کھڑے نہیں رہ سکتے... وہ ادھر بھی آسکتے ہیں۔''

شامی نے مونا کو راضی کرلیا کہ وہ کاروں تک پہنچ گئے تو ان کے بچ نکلنے کے امکانات تھے۔ مونا نے سر ہلایا۔

''اوکے... جیسے ہی تم کہو گے، میں بھاگ کھڑی ہوں گی۔''

شامی نے ایک دو... تین کہہ کر دوڑ لگا دی۔ ان کا رخ کاروں کی طرف تھا۔ قریب پہنچتے پر ان کو تیمور دکھائی دیا جو بے تابی سے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ پتا نہیں وہ ان کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کررہا تھا یا آنے سے منع کررہا تھا۔ بہرحال، اب شامی اور مونا درمیان میں تھے، واپس نہیں جاسکتے تھے۔ اسی لمحے فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ شامی کو جھٹکا لگا اور وہ نیچے جا گرا۔

☆☆☆

فولاد خان نے سوچے سمجھے بغیر شہزاد کو لوہے کی سلاخ کھینچ ماری تھی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کردیا تھا کہ وہ اس کے صاحبوں میں سے کسی کو گولی مارنے جارہا ہے۔ اس نے یہ کام بے ساختہ کردیا۔ سلاخ شہزاد کے شانے پر لگی اور اس کا ہاتھ ہل گیا تھا مگر اس نے گولی چلا دی تھی۔ گولی چلتے ہی ایک نسوانی چیخ گونجی تو فولاد خان کا خون کھولنے لگا اور وہ رائفل کی پروا کیے بغیر شہزاد کی طرف بڑھا۔

''داؤس... خنزیر کا بچہ... ام تومارا خون پی جائے گا۔''

سلاخ خاصی زور سے لگی تھی۔ شہزاد نے رائفل گھماتے ہوئے فائر کیا مگر گولی فولاد خان سے خاصے فاصلے سے گزر گئی۔ ''رک جاؤ...''

''ام تم کو قتل کر کے رکے گا۔'' فولاد خان نے پیش قدمی جاری رکھی۔

شہزاد نے کوشش کر کے رائفل سیدھی کی اور فولاد خان کا نشانہ لیتے ہوئے مسکرایا۔ ''تو پھر جہنم میں جاؤ۔'' فضا ایک اور دھماکے سے گونج اٹھی۔

☆☆☆

شامی نیچے گرا تو نوشی نے دہل کر چیخ ماری۔ اس سے پہلے کہ تیمور اسے روکتا، وہ تڑپ کر کاروں کے درمیان سے بھاگی۔ دوسری طرف مونا نے اپنی رفتار تیز کی اور کاروں کی اوٹ میں آگئی۔ نوشی نے شامی کو اٹھایا۔ ''شامی... تم ٹھیک ہونا؟''

''ہاں... ہاں۔'' شامی نے سر جھٹکا۔ ''تم کیوں وہاں سے نکلیں؟''

''تم چلو۔'' نوشی نے اسے کھینچا۔ اسی لمحے ایک فائر اور ہوا اور تیمور دوڑتا ہوا آیا۔

''کیا یہیں فوت ہونے کا ارادہ ہے... چلو۔''

شامی نے مڑ کر دیکھا۔ شہزاد اب رائفل سمیت چھت پر کسی کی طرف متوجہ تھا۔ پھر اسے فولاد خان کی مدھم سی آواز آئی۔ شہزاد نے رائفل شانے سے لگائی تو بے ساختہ شامی کا دل دھڑکا۔ فولاد خان خطرے میں تھا۔ اس نے پستول نکال لیا۔ شہزاد دیوار سے ٹکا اس طرح کھڑا تھا کہ اس کا کمر سے اوپر کا جسم نمایاں تھا۔ شامی نے گھوڑا کھینچتے ہوئے اس کے جسم کا نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ گولی شہزاد کے شانے پر لگی تھی۔ وہ اچھلا اور زمین پر گر گیا۔ خون کا فوارہ اچھل کر نیچے تک آیا۔

''وہ مارا۔'' شامی چلّایا۔ ''تیمور! میرے ساتھ آؤ۔''

''تم دونوں یہاں رکو۔'' تیمور نے شامی کے پیچھے لپکتے ہوئے مونا اور نوشی سے کہا۔

''میں بھی آرہی ہوں۔'' نوشی نے ضدی لہجے میں کہا۔ ''میرے پاس پستول ہے۔ میں تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں۔''

تیمور نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''ہاں آجاؤ... تمہیں دیکھے بغیر وہ ہتھیار نہیں ڈال سکتے۔''

وہ سامنے کی طرف سے اندر گھسے اور عین اس وقت انہوں نے رشید خان کو سیڑھیوں پر جالیا جب وہ عقبی دروازے سے فرار ہونے کی کوشش کررہا تھا۔ ''خبردار! بھاگنا مت ورنہ گولی ماردوں گا۔'' شامی غرایا۔ اپنے سامنے تین مسلح افراد دیکھ کر رشید خان کی حالت خراب ہوگئی تھی۔

''خدا کے لیے مجھے جانے دو۔ میں غریب آدمی ہوں... میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔'' اس نے گڑگڑا کر کہا۔

''غریب کے بچے!'' تیمور نے اس کے بال پکڑ کر کھینچے تو وہ کھنچے چلے آئے... جبکہ رشید اپنی جگہ کھڑا تھا۔ وہ ہکّا بکّا رہ گئے۔ رشید کا چہرہ بالوں سمیت تیمور کے ہاتھ میں تھا اور ان کے سامنے ایک تیس بتیس برس کا نوجوان کھڑا تھا۔ ''تم کون ہو؟'' شامی نے پوچھا۔ ''یہ کیا چکر ہے؟''

''چکر کا بھی پتا چل جائے گا... پہلے فولاد خان کو دیکھو۔''

''اس آدمی سے تو بچ کر بھاگا ہوں۔'' رشید... یا وہ جو کوئی بھی تھا، اس نے فریاد کی۔ ''وہ مجھے مار ڈالتا۔''

شامی نے اس کی تلاشی لی اور اسے اوپر چلنے کا حکم دیا۔ ''کوئی چالاکی مت دکھانا ورنہ تمہارے جسم میں کم سے کم تین سوراخ ہوں گے۔''

چھت پر ایک اور دلچسپ منظر ان کا منتظر تھا۔ فولاد خان

دیوار سے ٹکے بیٹھے شہزاد کے سامنے رائفل رکھی ہوئی تھی ...سے کہہ رہا تھا، اگر اس نے رائفل اٹھالی تو وہ اس کی ورنہ خنجر مار کر اس کا ہاتھ کاٹ دے گا اور شہزاد باوجود ترغیب ...اس کام کے لیے تیار نہیں تھا۔ فولاد خان اسے اکسا رہا ''ام کو امارا فوت ماں کا قسم... اگر تو م نے ریفل اوٹالیا تو خنجر تمیں مارے گا۔''

ان کو دیکھتے ہی شہزاد چلّایا۔ ''خدا کے لیے... مجھے اس ...کل سے بچاؤ۔''

''یہ پاگل نہیں ہے۔'' شامی کو شرارت سوجھی۔ ''بس ...عادت سے مجبور ہے۔ رات سونے سے پہلے کسی کو قتل نہ کرے تو اسے نیند نہیں آتی۔''

''ام اس کو قتل کرے گا۔'' فولاد خان نے ضدی لہجے میں کہا۔

رشید خان کو دیکھ کر شہزاد حیران ہوگیا تھا۔ اس نے اسے کپڑوں سے شناخت کرلیا تھا۔ ''تم رشید خان ہو؟''

''ہاں، بس دو حصوں میں ہوگیا ہے اس کا منہ... یہ ...دیا۔'' تیمور نے چہرہ اس کی طرف پھینک دیا۔ ''اب تم بتاؤ ...کہ اصل کہانی کیا ہے۔''

''تم مجھ سے کچھ معلوم نہیں کرسکتے۔'' شہزاد بولا۔ اس نے اپنا زخم ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔

''ایسا چیلنج مت کرو... ہم نے تمہیں فولاد خان کے حوالے کردیا تو تم ایک منٹ میں بول اٹھو گے۔'' شامی نے کہا۔ ''مگر جلدی کیا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ پولیس کو بلا لینا چاہیے۔'' نوشی بولی۔

''اس کے لیے شہر تک جانا ہوگا۔''

''اس کا ضرورت نئیں اے۔'' فولاد خان بولا۔ ''ادر ...ڑ پر جاؤ تو موبائل کا سگنل آجاتا اے۔''

''پولیس کو کال کی جاسکتی ہے۔''

''سنو، ایسا مت کرو۔'' رشید بولا۔ ''ہمیں پولیس کے حوالے مت کرو... اس کے بدلے ہم تمہیں ایک خزانے کا...''

''چپ کرو حرامزادے۔'' شہزاد غرایا۔ ''ایک لفظ منہ سے نکالا تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''یار! ان کو پولیس کے حوالے کردو۔'' شامی نے کہا۔

''تم لوگ میری بات تو سن لو۔'' رشید گڑگڑایا۔

''تو پھر بولا حرامزادے۔'' شہزاد چنگھاڑا اور اس نے فولاد خان کی پروا کیے بغیر رائفل اٹھالی۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا ہنگامہ ہوا۔ فولاد خان نے کسی طرح رائفل اس سے چھین لی۔ تیمور، رشید خان کو نیچے لے آیا اور اس نے ایک سنسنی خیز انکشاف کیا۔ اسے سنتے ہی انہوں نے مونا کو تلاش کیا مگر وہ غائب تھی۔ وہی نہیں بلکہ اس کے کمرے سے اس کا سامان بھی غائب تھا۔ ''نکل گئی الّو بنا کے۔'' شامی نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا۔

''اچھا... بتانے کی ضرورت ہے؟'' نوشی نے طنز کیا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ میں الّو ہوں... میرے پیچھے کار سے نکل کر کیوں بھاگی آئی تھیں؟''

''غلطی ہوگئی۔'' نوشی نے جل بھن کر کہا اور دونوں میں زوردار جھڑپ شروع ہوگئی۔

☆☆☆

نواب صاحب برہم تھے۔ ان کی کشادہ پیشانی پر پھڑکتی رگ اس کی نشاندہی کررہی تھی۔ ''آخر یہ کیا مسئلہ ہے؟ ہم جو کام بھی آپ دونوں کے سپرد کرتے ہیں بالآخر وہ پولیس کیس بن جاتا ہے۔''

''دادا حضور! اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟'' شامی نے فریاد کی۔ ''اس آفت کی پرکالہ کو آپ نے ہی ہمارے ساتھ بھیجا تھا۔ میں نے تو کبھی اسے خواب میں بھی نہیں دیکھا۔''

''جی دادا جان۔'' تیمور نے اس کی تائید کی۔ ''اس نے ہمیں بے وقوف بنایا اور اپنا کام کر کے نکل گئی۔ اس نے تو آپ کو بھی... میرا مطلب ہے کہ آپ بھی اس کی اصلیت نہ جان سکے۔''

''ہم اس معاملے کی نہیں، عمارت کی بات کررہے ہیں۔'' نواب صاحب نے پاؤں پٹخے۔ ''وہ ہمیں بہرصورت چاہیے۔''

''دادا جان! ہم نے کوشش کی تھی۔ ویسے وہ عمارت مجھے بھی پسند آئی ہے۔ اس میں شان دار قسم کا ہوٹل کھل سکتا ہے۔''

''مگر وہ ہمیں نہیں مل سکی۔''

''ہم مجبور تھے دادا جان... حالات ہی ایسے پیش آئے۔''

ذرا دیر میں نواب صاحب کا غصہ کم ہوا۔ ''ہمیں شروع سے سب بتاؤ۔''

''دادا جان! یہ ذرا طویل داستان ہے اور آپ کا وقت...''

''تم ہمارے وقت کی فکر مت کرو۔'' نواب صاحب نے بات کاٹی۔ ''تم ہمیں سب بتاؤ۔''

☆☆☆

اس کہانی کا آغاز راجا عبدالرحمٰن سے ہوا تھا۔ وہ مری کا رہنے والا تھا اور محض بارہ سال کی عمر میں ایک انگریز، کلائڈ واکر کے پاس ملازم ہوگیا تھا۔ کلائڈ اس کی محنت اور ایمان داری سے خوش تھا۔ اس نے عبدالرحمٰن کو اپنا خاص ملازم بنا

لیا۔ کلائڈ واکر جواہرات کا کاروبار کرتا تھا۔ وہ شمالی علاقے اور وسط ایشیا سے قیمتی پتھر منگوا کر یورپ بھیجتا تھا اور اس نے اپنی رہائش مری میں رکھی تھی۔ یہ عالی شان عمارت اسی نے بنوائی تھی اور یہ پہاڑی بھی اس کی ملکیت تھی۔ بیس سال کی عمر میں عبدالرحمٰن اس کے ساتھ سفر پر جانے لگا تھا اور جواہرات لے کر آتا تھا۔ اس کے چار سال بعد پاکستان بن گیا۔ کلائڈ واکر نے برطانیہ جانے کی نسبت یہاں ٹھہرنا پسند کیا تھا۔ ایک سال بعد نامعلوم افراد نے اسے قتل کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ ان سے خوف زدہ ہو کر کلائڈ واکر نے برطانیہ کو ترجیح دی۔ اس نے جانے سے پہلے یہ عمارت اور اپنا کاروبار عبدالرحمٰن کو سونپ دیا تھا مگر اسے برطانیہ پہنچنا نصیب نہیں ہوا اور اسے راستے میں بحری جہاز میں کسی نے قتل کر دیا۔ اس کا کوئی والی وارث نہیں تھا اس لیے یہ سب عبدالرحمٰن کو مل گیا۔ عمارت اور کاروبار اس کی قانونی ملکیت نہیں تھا مگر اس نے چکر چلا کر سب کچھ اپنے نام کروالیا۔

عبدالرحمٰن کسی حد تک پڑھا لکھا بھی تھا۔ اتفاق سے کلائڈ واکر اپنی ذاتی ڈائری بھول گیا تھا۔ جب عبدالرحمٰن نے سب کچھ اپنے نام پر کروالیا تو ایک دن اسے ڈائری کا خیال آیا۔ اس نے ڈائری دیکھی مگر اس میں تحریر انگریزی میں تھی اور اسے انگریزی زبان صرف بولنے کی حد تک آتی تھی۔ اس نے ڈائری سنبھال کر رکھ لی۔ اس کا خیال تھا کہ اس ڈائری میں واکر کے کاروباری راز تھے۔ وہ اسے کسی کو نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے بیٹوں کو انگریزی پڑھوائے گا اور ان کی مدد سے ڈائری کے راز معلوم کرے گا۔

قاسم علی بڑا تھا مگر اسے تعلیم سے خاص دلچسپی نہیں تھی جبکہ عزیزالدین تعلیم کے معاملے میں تیز تھا۔ اس نے پرائمری کے بعد مری کانوینٹ سے پڑھا تھا۔ اس کی انگریزی شروع سے اچھی تھی جبکہ قاسم علی نے پرائمری کے بعد پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ جب عزیزالدین نے اسکول کی تعلیم مکمل کرلی تو باپ نے اسے ڈائری دی۔

''عزیزالدین... مجھے یہ ڈائری پڑھ کر سناؤ۔''

چالاک عزیزالدین نے جب ڈائری دیکھی تو سمجھ گیا، اس میں بہت ساری کام کی باتیں تھیں۔ اس نے باپ سے کہا کہ ڈائری سمجھنا آسان نہیں ہے، وہ آرام سے پڑھ کر اسے جاننے کی کوشش کرے گا۔ باپ نے اسے ڈائری دے دی۔ عبدالرحمٰن نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بیٹا اسے دھوکا دے گا۔ اس نے ڈائری اپنے قبضے میں کرلی اور باپ سے کہہ دیا کہ کوئی اس کے کمرے سے چرا کر لے گیا ہے۔ عبدالرحمٰن نے غصے کا اظہار کیا مگر وہ بیٹے کو اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا۔ کوئی تیس سال پہلے عبدالرحمٰن کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا۔ اس وقت عزیزالدین یونیورسٹی میں تھا۔ اس نے بھائی سے کہا کہ وہ شہر والی کوٹھی لے لے اور اسے مری والی عمارت دے دے۔ قاسم علی خوش ہو گیا۔ اسلام آباد والی کوٹھی کہیں زیادہ قیمتی تھی۔ باقی اثاثے دونوں بھائیوں نے برابر برابر تقسیم کر لیے تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد عزیزالدین انگلینڈ چلا گیا اور وہاں اس نے نہ صرف شادی کرلی بلکہ ایک بڑا کاروبار بھی کرلیا۔ قاسم حیران تھا... کیونکہ اس کے پاس اتنی دولت نہیں تھی کہ اتنا بڑا کاروبار کر سکتا۔ بہرحال، اس نے اس معاملے پر اتنا غور نہیں کیا۔

جاتے ہوئے عزیزالدین نے عمارت میں بعض تبدیلیاں کرائی تھیں اور اس نے تہ خانے میں آنے والا راستہ بہ ظاہر بند کروا دیا تھا۔ اس نے ایک بااعتماد شخص کو عمارت کا نگراں مقرر کیا اور اسے سختی سے ہدایت کی کہ عمارت کو کبھی ویران نہ چھوڑے۔ عزیزالدین کی نواب صاحب سے ملاقاتیں رہی تھیں پھر وہ انگلینڈ چلا گیا۔ وہاں سے وہ دو تین بار آیا تھا اور ہر بار اس نے نواب صاحب سے ملاقات ضرور کی تھی۔ سال میں ایک آدھ بار اس کا خط بھی آجاتا تھا۔ اس لیے جب اس کی لڑکی مونا نے پاکستان آکر نواب صاحب سے مدد کی درخواست کی تو وہ انکار نہ کر سکے۔ عمارت کا سن کر انہوں نے خود دلچسپی لی تھی اور شامی اور تیمور کو بھیجا کہ اگر عمارت اچھی حالت میں ہے تو وہ اسے خریدنے کو تیار ہیں۔

عزیزالدین نے ڈائری کا راز سب سے چھپایا تھا اور اپنی اکلوتی بیٹی کو بھی اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔ تین سال پہلے جب اسے فالج ہوا اور تمام چیزیں مونا کو سنبھالنی پڑیں، تب اس کے ہاتھ واکر کی ڈائری آئی اور اسے علم ہوا کہ اس کا باپ اس سے کتنا بڑا راز چھپائے بیٹھا تھا۔ واکر نے عمارت کے تہ خانے میں ایک خاص زمین دوز تجوری بنوائی تھی اور اسے خاص قسم کے حفاظتی نظام سے آراستہ کیا تھا۔ تجوری نمبرز سے کھلتی تھی اور غلط نمبر دبانے کی صورت میں تجوری میں رکھا آتش گیر مادہ پھٹ جاتا اور سب تباہ ہو جاتا۔ ڈائری میں نمبر بھی تھا جس سے تجوری کھلتی اور اس کی جگہ کی نشان دہی بھی کی گئی تھی۔

تجوری میں واکر کے خریدے نایاب اقسام کے ہیرے اور جواہرات تھے۔ انہی جواہرات میں سے کچھ فروخت کر کے عزیزالدین نے انگلینڈ میں جا کر کاروبار کیا تھا۔ اس نے سارے جواہرات نہیں نکالے تھے۔ اس نے کچھ جواہر لیے تھے پھر درمیان میں دو بار اس نے اور بھی جواہرات نکالے۔

ب بھی تجوری میں خاصی تعداد میں قیمتی جواہرات موجود ۔ یہ بات صرف عزیزالدین جانتا تھا۔ اس نے تہ خانے ہر سے آنے والا راستہ بند کرا کے پہاڑی سے خفیہ تہ نے تک جانے کا ایک راستہ بنوایا تھا اور اسے جھاڑیوں کی سے کیموفلاج کرا دیا تھا۔ اگر یہ راستہ کسی کے علم میں آجاتا وہ تہ خانے تک جا پہنچتا، تب بھی تجوری تک رسائی ممکن ں تھی۔

ان دنوں کاروباری حالات اچھے نہیں تھے اور مونا کو سرمائے کی ضرورت تھی، لہٰذا اس نے پاکستان آکر باقی ہرات نکالنے اور عمارت کو فروخت کرنے کا فیصلہ کیا مگر کو علم نہیں تھا کہ عزیزالدین کا پی اے شاہنواز اس راز سے ف ہو گیا تھا۔ اس نے بھی ڈائری پڑھ لی تھی مگر وہ نمبر نہیں ن سکا تھا۔ عزیزالدین نے کلائڈ کی ڈائری سے نمبر مٹا کر وہ مبر اپنی ذاتی ڈائری میں لکھ لیا تھا۔ اس لیے شاہنواز تجوری ک رسائی سے قاصر تھا۔ وہ موقعے کا منتظر رہا کہ کب مونا کستان جاتی ہے اور وہ بھی اس کے پیچھے جا کر جواہرات حاصل کرلے۔ اسے جلد یہ موقع مل گیا۔ یہاں آکر اس نے ہک میک اپ سے چہرہ بدلا اور قاسم علی کے بیٹے شہزاد سے یہ کیا اور اسے عمارت کی ملکیت حاصل کرنے کا جھانسا دیا ر جب شہزاد اس جھانسے میں نہیں آیا تو مجبوراً شاہنواز نے ے تجوری اور جواہرات کے بارے میں بتا دیا۔ اپنے چچا کی لاکی کا جان کر شہزاد کا خون کھول اٹھا اور وہ شاہنواز کا ساتھ ینے کو تیار ہو گیا۔

شاہنواز نے پلاننگ کی۔ جیسے ہی اسے مونا اور دوسروں کے مری آنے کی اطلاع ملی، اس نے فوری طور پر چوکیدار کی بدلے لی۔ یہ گونگا نوجوان اس شخص کا بیٹا تھا جسے عزیزالدین نے عمارت کا چوکیدار بنایا تھا۔ اس نے گونگے کو ایک غار میں ندھ کر ڈال دیا اور شاہنواز نے اس کی جگہ لے لی۔ انہوں خفیہ تہ خانے میں کیمرا لگایا اور مونا کو لے جا کر وہاں ڈال ۔ مقصد یہ تھا کہ وہ تجوری کھول کر جواہرات نکالے یا نہ لے، وہ تجوری کا نمبر ضرور دیکھ لیں۔ ان کا منصوبہ کسی حد کامیاب رہا تھا مگر اس کے بعد سب گڑبڑ ہوتا چلا گیا۔ طور سے فولاد خان کے جنگجو پن نے ان کا منصوبہ بیٹ کر دیا تھا۔

یہ ساری معلومات پولیس نے حاصل کی تھیں۔ شاہنواز نوی شہری تھا، اس لیے امکان یہی تھا کہ وہ رہا کر دیا ئے گا البتہ زخمی شہزاد پوری طرح پولیس کی گرفت میں آگیا ۔ اس کے ہاتھوں کے نشانات رائفل پر آگئے تھے۔ یہ رائفل نہ صرف بغیر لائسنس بلکہ ممنوعہ بور کی تھی۔ اس نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا تھا اور اب پولیس مونا کی تلاش میں تھی مگر وہ اسی روز ایک فلائٹ سے واپس انگلینڈ جا چکی تھی اور اس کا پورا امکان تھا کہ وہ تجوری کے جواہرات بھی لے گئی ہو گی۔ پولیس نے تجوری دریافت کرلی تھی مگر اسے کھولنے کی جرأت کس میں تھی؟ یہ خودکش دھماکا بھی کہلا سکتا تھا۔

''اس سارے معاملے میں ہمیں کیا ملا؟'' کہانی ختم ہونے کے بعد شامی نے مایوسی سے کہا۔

''سوائے دھکوں کے۔'' تیمور نے اس کی تائید کی۔

''اور مرتے مرتے الگ بچے۔''

''فولاد خان انعام کا مستحق ہے۔'' نواب صاحب بولے۔ ''اس نے بروقت جرأت نہ کی ہوتی تو آج ہم ایک پوتے سے محروم ہو سکتے تھے۔''

فولاد خان دس ہزار روپے پا کر بے حد خوش تھا۔ اس کا ارادہ عنقریب شادی کرنے کا تھا اور اس نے لڑکی کے باپ سے بات بھی کرلی تھی۔ بس اس کی طلب کردہ رقم پوری کرنی تھی۔

☆☆☆

اس واقعے کے تیسرے دن شامی کے موبائل پر باہر سے کال آئی۔ ''مسٹر شامی!''

''بات کر رہا ہوں۔''

''میں مونا عزیزالدین...''

''تم؟'' شامی چلّایا۔ ''تم نے ہمیں مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔''

''میں معذرت خواہ ہوں اور تمہاری بہت احسان مند بھی ہوں۔ سچ کہوں تو یہ حالات میرے ذہن میں بھی نہیں تھے کہ کوئی ایسی بات ہو جائے گی۔''

''اور تم خاموشی سے چلی گئیں؟''

''مجھے ڈر تھا کہ پولیس ان معاملات میں مجھے ملوث کر کے روک نہ لے... اس لیے میں نکل گئی۔''

''چلو، میں نے مان لیا... اب بتاؤ کس لیے فون کیا ہے؟''

''میں عمارت کے کاغذات بھیج رہی ہوں... اگر نواب صاحب اسے گستاخی نہ سمجھیں تو یہ میری طرف سے ان کے لیے تحفہ ہے۔''

''داداجان کسی قیمت پر تمہارا تحفہ قبول نہیں کریں گے۔''

''تب تم ان سے کہنا کہ اس کی جو مناسب قیمت سمجھیں... مجھے بھجوا دیں۔'' مونا نے کہا اور فون بند کر دیا۔

شامی نے منہ بنایا۔ داداجان کو عمارت مل گئی... مجھے کیا ملا؟

⌘

میچ فکسنگ

سلیم فاروقی

ایک کرائم رپورٹر کی سرگردانی - اس کا کرکٹر دوست ، سٹے بازوں کے نرغے میں بلیک میل ہورہاتھا- کرکٹر کی فیملی کو بچانے کے لیے اس نے خود ہی کچھ کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر انکشافات اور ہنگامہ خیزیوں کا ایک نیا سلسلہ چل نکلا!

میں اس وقت جم میں تھا جب عرفان میرے پاس آیا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح مسکراہٹ تھی۔ میں اسے دیکھ کر خوش ہوگیا کیونکہ میں خود بھی اس سے ملنا چاہ رہا تھا۔

''تمہارے پاس اگر ٹائم ہے تو صرف دس منٹ انتظار کرلو۔'' میں نے اپنے پھولے ہوئے سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''اور اگر ٹائم نہ ہو تو؟'' اس نے نیم سنجیدگی سے کہا۔

''تو پھر... مجھے مجبوراً اپنی ایکسر سائز ادھوری چھوڑنا پڑے گی۔'' میں نے یوں کہا جیسے ایکسر سائز چھوڑ کر میں لاکھوں روپے کا نقصان کرلوں گا۔

''تم بھی کیا یاد کرو گے۔'' عرفان نے کہا۔ ''ابھی دس کے بجائے بیس منٹ لے لو لیکن پھر میں تمہیں کم از کم دو گھنٹے تک اپنے ساتھ رکھوں گا۔''

''او کے ڈن!'' میں نے ہنس کر کہا اور ایک مرتبہ پھر ایکسر سائز میں مصروف ہوگیا۔

یہ شہر کا خاصا معروف اور مہنگا جم تھا۔ یہاں ایکسر سائز کی جدید ترین مشینری کے ساتھ ساتھ فزیوتھراپسٹ اور ڈائٹ کیشن کا بندوبست بھی تھا۔ دو وسیع و عریض ہال تھے جن میں جونیئرز اور سینئرز کے لیے ایکسر سائز مشینیں لگائی گئی تھیں۔ جم میں اس وقت بھی بہت سے لڑکے اور لڑکیاں ایکسر سائز میں مصروف تھے۔ ہال میں لگے ہوئے پوشیدہ اسپیکرز سے فاسٹ بیٹ کا میوزک چل رہا تھا۔ اس میوزک سے گویا ایکسر سائز کرنے والوں میں کچھ زیادہ ہی جوش و خروش پیدا ہوجاتا ہے۔

''آٹھ منٹ گزر چکے ہیں۔'' عرفان نے کہا۔ پھر ہنس کر بولا۔ ''یار، وکی! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تو نے یہ جو ''ماچو مین'' ٹائپ باڈی بنائی ہے آخر اس کا فائدہ کیا ہے؟ ایکسر سائز تو میں بھی کرتا ہوں لیکن خود کو مسٹر یونیورس بنانے کے لیے نہیں بلکہ اپنا اسٹیمنا بنانے کے لیے اور خود کو فارم میں رکھنے کے لیے کرتا ہوں۔''

''یہ تیری ضرورت ہے۔'' میں نے ایکسر سائز کرتے ہوئے کہا۔ ''اور میرا شوق ہے۔''

''تیرے شوق بھی عجیب ہیں۔'' عرفان نے ہنس کر کہا۔ ''تُو جرنلسٹ ہے، کیا اخبار میں جاب کرنے کے لیے مسٹر یونیورس ہونا ضروری ہے؟''

''چل یار، تُو ایکسر سائز نہیں کرنے دے گا۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ عرفان بھی میرے ساتھ ساتھ ڈریسنگ روم میں آگیا۔ میں نے تولیے سے جسم خشک کر کے کپڑے بدلے، ایکسر سائز کا لباس اور تولیا لاکر میں رکھا اور عرفان کے ساتھ باہر نکل آیا۔

''پہلے تو تُو مجھے کسی اچھے ریسٹورنٹ میں کافی پلا۔'' میں نے کہا۔ ''ایکسر سائز کے بعد مجھے بھوک بھی لگتی ہے۔ کچھ ہلکا پھلکا کھانے کو بھی منگوا لینا۔''

عرفان اور میں نے اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک ایک ساتھ تعلیم حاصل کی تھی۔ اگر دیکھا جائے تو اس وقت وہی میرا واحد دوست تھا۔ یوں تو بے شمار لوگوں سے میری دوستی تھی لیکن دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا۔ عرفان کو بچپن سے کرکٹ کا کریز تھا۔ وہ مئی، جون کی جھلسا دینے والی گرمیوں میں بھی میچ کھیلتا تھا۔ وہ خاصا وجیہہ اور خوب رو تھا لیکن تپتی ہوئی دوپہروں نے اس کی سرخ و سفید رنگت کو تانبے کی طرح جھلسا دیا تھا۔

اس کے برعکس مجھے ورکنگ جرنلسٹ بننے کا شوق تھا۔ میں نے یونیورسٹی سے ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کرنے کے بعد چھوٹا سا ایک انگلش اخبار جوائن کرلیا تھا۔

اب یہ بھی اتفاق تھا کہ اس اخبار کو ایک کرائم رپورٹر کی ضرورت تھی۔ مجھے کرائم رپورٹنگ ہی کا شوق تھا۔ میں نے دو مہینے میں اخبار کو ایسی زبردست اور سنسنی خیز خبریں دیں کہ اخبار کے مالک رضی صاحب نے خوش ہوکر میری سیلری میں دو ہزار روپے کا اضافہ کردیا۔

فارغ وقت میں عموماً جم اور پریس کلب میں گزارتا تھا۔ جلد ہی اخباری حلقوں میں میری ایک شناخت بن گئی۔ کئی اخبارات نے مجھے جاب کی آفرز کیں لیکن اب میری منزل کوئی بڑا اخبار یا ٹی وی چینل تھا۔

پھر میری یہ خواہش بھی پوری ہوگئی۔ ایک بڑے نجی ٹی وی چینل نے مجھے بہت شان دار پیکیج کی آفر کی تو میں نے اسے فوراً قبول کرلیا۔ یہ قول عرفان کے میرے شوق بھی عجیب تھے۔ مجھے شکار کا شوق تھا، اچھی نسل کے کتے پالنے کا جنون تھا اور ایکسر سائز کیے بغیر مجھے سکون نہیں ملتا تھا۔

عرفان کی محنت بھی بالآخر رنگ لائی اور اسے قومی کرکٹ ٹیم میں سلیکٹ کرلیا گیا۔ اس دن خوشی اس سے چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ اس نے اپنے چند خاص دوستوں اور کزنز کو شہر کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹریٹ دی تھی۔ مجھے تو اس نے بہ طور خاص بلایا تھا۔ بہ طور خاص اس لیے کہ میں ان دنوں اتنا مصروف تھا کہ سوشل لائف تقریباً منقطع ہوگئی تھی۔

بہ مشکل تمام میں نے ڈنر کے لیے وقت نکالا تھا۔

عرفان سے میرے گھریلو تعلقات تھے لیکن جب سے میں نے اخبار جوائن کیا تھا، اس کے گھر جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ہم دونوں باہر ہی مل لیا کرتے تھے۔ کبھی عرفان میرے آفس آجاتا اور کبھی میں اس کے کلب چلا جاتا۔

قومی ٹیم میں سلیکشن کے لیے وہ ان دنوں بہت محنت کر رہا تھا۔

مہمانوں میں گنتی کے چند ہی لوگ تھے۔ ان میں دو عرفان کے کزنز تھے، دو کرکٹر تھے، ایک اس کے کلب کے کوچ حامد صاحب تھے اور میں تھا۔

مجھے دیکھتے ہی عرفان کی ممانے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ ''وکی! آج برسوں بعد تمہاری شکل نظر آئی ہے۔ تم کیا پرائم منسٹر آف پاکستان سے بھی زیادہ مصروف ہو؟''

''یہ بات نہیں ہے آنٹی!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اصل میں میرے ٹائمنگ بہت گڑبڑ ہیں۔ مجھے کام کرتے ہوئے اکثر دو تو بج ہی جاتے ہیں۔'' یہ کہتے کہتے میری نظر ایک انتہائی حسین چہرے پر پڑی۔ لڑکی بلا کی حسین تھی، اس کی رنگت سرخ و سفید اور بال براؤن تھے۔ اس نے جدید فیشن کا ٹراؤزر اور چست قمیص پہن رکھی تھی۔

ایک لمحے کو تو میں پلکیں جھپکانا بھی بھول گیا۔ وہ بھی بہت پُرشوق انداز میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھتے ہی مجھے جھٹکا سا لگا۔ وہ بالکل عرفان کی طرح تھیں۔ مجھے ایک دم یاد آگیا کہ یہ عرفان کی چھوٹی بہن سمیرا ہے۔

''کہاں کھو گئے وکی؟'' آنٹی نے مجھے چونکا دیا۔

''وہ... انکل نظر نہیں آرہے ہیں؟'' میں نے جلدی سے بات بنائی۔

''وہ تو بیٹا بزنس ٹرپ پر ملائیشیا گئے ہوئے ہیں۔'' آنٹی نے کہا پھر ہنس کر بولیں۔ ''اسے پہچانے؟'' ان کا اشارہ سمیرا کی طرف تھا۔

''میری یادداشت کمزور نہیں ہے آنٹی!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں بھلا حمیرا کو نہیں پہچانوں گا۔'' میں نے جان بوجھ کر سمیرا سے بڑی بہن کا نام لیا۔ ''اس کی شادی تو یادگار تھی۔ کیسی زبردست بارش ہوئی تھی۔''

میری بات پر سمیرا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے حسن کی طرح اس کی ہنسی بھی مترنم تھی۔

''یادداشت کا یہ عالم ہے اور کرائم رپورٹر بنے پھرتے ہو؟'' عرفان نے ہنس کر کہا۔ وہ نہ جانے کس وقت وہاں آگیا تھا۔

''صرف کرائم رپورٹر نہیں، چیف کرائم رپورٹر'' میں نے گردن اکڑانے کی کوشش کی۔

''تو چیف کرائم رپورٹر صاحب! آپ کا حافظہ بہت کمزور ہوگیا ہے۔'' سمیرا نے اپنی ہنستی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں سمیرا ہوں۔ حمیرا باجی اور عابد بھائی تو ابھی آنے والے ہیں۔''

''تت... تم... سمیرا ہو... وہ سوکھی سڑی، کالی اور بات بات پر رونے والی لڑکی؟''

''یہاں پھر آپ مار کھا گئے۔ آپ نے ہماری ملازمہ کی بیٹی کو دیکھا ہوگا۔''

تھوڑی دیر بعد حمیرا اور اس کا شوہر عابد بھی آگیا۔ ڈنر بہت خوش ذائقہ تھا یا پھر سمیرا کی موجودگی میں مجھے لگ رہا تھا۔ وہ بھی سارا وقت مجھے ہی دیکھتی رہی۔

اس دن کے بعد سے میں نے کوشش کی کہ عرفان کے گھر نہ جاؤں۔ عرفان میرا بہت اچھا اور مخلص دوست تھا۔ ممکن ہے وہ اس بات کو پسند نہ کرتا اور ہماری دوستی میں دراڑ پڑ جاتی لیکن اس کے بعد یکے بعد دیگرے ایسے واقعات ہوئے کہ مجھے عرفان کے گھر جانا پڑا۔ آنٹی کو شدید ہارٹ اٹیک ہوا، پھر حمیرا کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ دونوں دفعہ مجھے روزانہ اسپتال جانا پڑا اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں سمیرا کی محبت میں گرفتار ہوتا چلا گیا۔

ابھی تک ہم دونوں میں سے کسی نے بھی اظہار نہیں کیا تھا لیکن آنکھوں کی زبان میں سب کچھ ہوگیا تھا۔ میں نے بھی یہ سوچ کر خود کو قائل کرلیا تھا کہ میں سمیرا سے فلرٹ نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ عرفان بھلا شادی پہ کیوں اعتراض کرے گا بلکہ آنٹی تو اشاروں کنایوں میں مجھ سے کہہ بھی چکی تھیں کہ انہیں مجھ جیسا داماد چاہیے۔

پھر عرفان مختلف میچز کے سلسلے میں کبھی شہر سے اور کبھی ملک سے باہر رہنے لگا۔ اس کی غیر موجودگی میں، میں ہی اس کے گھر والوں کی بھی دیکھ بھال کرتا تھا۔

اس کے گھر زیادہ جانے سے سمیرا سے قربت کچھ اور بڑھ گئی۔ انکل اور آنٹی دقیانوسی خیالات کے مالک نہیں تھے اس لیے انہوں نے کبھی ہمارے میل جول پر اعتراض نہیں کیا۔ سمیرا اکثر میرے ساتھ باہر بھی چلی جاتی تھی۔ اتنی زیادہ قربت کے باوجود حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ابھی تک ہم دونوں میں سے کسی نے بھی کھل کر اظہار نہیں کیا تھا۔

میں لڑکیوں کے معاملے میں کورا نہیں تھا۔ کالج اور یونیورسٹی کے دور میں میری بہت سی گرل فرینڈز رہ چکی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک یہی سمجھتی تھی کہ میں شادی اسی سے کروں

میرے پاس مجھے دار باتوں کی کمی کبھی نہیں تھی اور نہ ہی ایسا پارسا تھا لیکن نہ جانے کیوں میں سمیرا سے اس موضوع پر بات کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو میں اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے کی صورت میں نہ جانے میرے دل پر کیا گزرتی؟

عرفان نے کرکٹ ٹیم میں اپنا ایک مقام بنالیا تھا۔ ٹیم اس کی شمولیت ہی کامیابی کی ضمانت تھی۔ کرکٹ کے یقین یہ کہتے تھے کہ عرفان پچ پر چپک جاتا ہے اور اگر پہلے بن اور وہ احتیاط سے کھیلے تو پھر اسے آؤٹ کرنا ناممکن ی انتہائی مشکل ضرور تھا۔

وہ مجھے جم سے سی سائیڈ کی طرف لے گیا۔ میں نے بھی فون کردیا تھا کہ آج میں نہیں آسکوں گا۔ مجھے یقین تھا میرا اسسٹنٹ سجاد سب کچھ بہت خوبی سے سنبھال لے گا۔

ہم نے سی سائیڈ کے ایک ریسٹورنٹ میں ڈنر کیا پھر دیر تک اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی یادیں تازہ کرتے رہے۔

''یار! میں اگلے ہفتے انڈیا جارہا ہوں۔'' عرفان نے اچانک کہا۔ ''وہاں سے تیرے لیے کیا لاؤں؟'' یہ اس کا معمول کا سوال تھا۔ وہ جب بھی بیرونِ ملک میچ کھیلنے جاتا تھا میرے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لے کر آتا تھا۔

''وہاں ایسی کیا خاص چیز ملتی ہے؟'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''ہاں ہو سکے تو کوئی انڈین دوشیزہ لے آنا۔ سنا ہے انڈیا کی لڑکیاں بہت زبردست ہوتی ہیں۔''

اس بات پر ہم دونوں ہنسنے لگے۔ پھر وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''یار وکی! انڈیا کی ون ڈے اور ٹیسٹ سیریز بہت اہم ہے۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوگا کہ ورلڈ کپ میں ہماری کارکردگی کیا ہوگی؟''

''ارے یار، ورلڈ کپ میں تو ابھی پورا ڈیڑھ سال ہے۔ تجھے ابھی سے اس کی فکر ہے؟''

''ابھی سے؟'' وہ ہنس کر بولا۔ ''مجھے تو اس وقت سے ورلڈ کپ کی فکر ہے جب ہم گزشتہ ورلڈ کپ ہارے تھے۔ میں ٹیم میں نہیں تھا لیکن بہرحال پاکستان کو شکست ہوئی تھی۔''

''ارے یار، آج کل کیسا کھیل اور کہاں کا کھیل؟'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''سارے فیصلے تو میچ فکسنگ کے ذریعے پہلے ہی ہوجاتے ہیں۔ تو خوامخواہ اتنی محنت کرتا ہے۔''

''کچھ پلیئرز پر یہ الزام ضرور ہے لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔'' ''میں آج کل میچ فکسنگ کے موضوع پر کام کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تو جانتا ہے کہ میں ٹھوس ثبوت ملنے پر کسی کے ساتھ بھی رعایت نہیں کرتا۔''

''جانتا ہوں یار!'' عرفان ہنس کر بولا۔ ''پچھلے دنوں تو جو بینک اسکینڈل منظرِ عام پر لایا ہے، اس نے ہمارے کئی سیاست دانوں کا مستقبل تاریک کردیا ہے۔''

''میری ایک بات اور سن لے عرفان!'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اگر کبھی اس سلسلے میں تیرا نام بھی آیا تو میں دوستی اور تعلقات نبھانے کے بجائے اپنا فرض نبھاؤں گا۔''

''وکی... تو... مجھے ایسا سمجھتا ہے؟'' عرفان نے افسردگی سے پوچھا۔ ''کیا میں ایسی حرکت کرسکتا ہوں؟''

''ارے تو یہ بات دل پر لے گیا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں نے صرف مثال دی ہے کہ جب میں تیرا لحاظ نہیں کرسکتا تو پھر کسی کا بھی نہیں کرسکتا۔ چاہے وہ ملک کا کوئی اسٹار بیٹسمین ہو یا پھر کرکٹ بورڈ کا کوئی اعلیٰ عہدے دار!'' پھر میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بیٹسمین صاحب، آپ دو کے بجائے میرے پورے ساڑھے تین گھنٹے لے چکے ہیں۔ کیا خیال ہے اب چلیں یا پھر رات یہیں ساحل پر گزارنے کا ارادہ ہے؟''

میں وہاں عرفان ہی کی گاڑی میں آیا تھا۔ میری گاڑی جم کے پارکنگ لاٹ میں تھی۔ عرفان نے مجھے وہاں ڈراپ کرتے ہوئے کہا۔ ''وکی! میں بارہ تاریخ کی رات کی فلائٹ سے جاؤں گا۔ اگر ممکن ہو تو مجھ سے ملاقات کرلینا۔''

پانچ ون ڈے میچز کی سیریز میں سے پاکستان دو میچ

جیت چکا تھا اور اس کا سہرا بجا طور پر عرفان کے سر تھا۔ مجھے عرفان کا بیٹنگ اسٹائل پسند تھا اس لیے میں کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر اس کا میچ دیکھ لیا کرتا تھا۔

تیسرا ون ڈے پاکستان ہار گیا۔ عرفان ہمیشہ ون ڈاؤن کی پوزیشن پر کھیلتا تھا لیکن مجھے اس میچ میں وہ اسپارک نظر نہیں آیا جو عرفان کی شناخت تھا۔ نہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی نہ اس کی بیٹنگ میں وہ جان تھی۔

میرے ساتھ ساتھ آنٹی، انکل اور سمیرا بھی فکرمند ہو گئے۔ میچ میں عرفان کے گھر میں دیکھ رہا تھا۔

ایک شاٹ پر سمیرا نے کہا۔ ''عرفان بھائی یہ کیا کر رہے ہیں؟ بہترین کور ڈرائیو شاٹ تھا، یہ تو سیدھا سادہ فور تھا۔ عرفان بھائی کی طبیعت تو خراب نہیں ہے۔''

''وکی بیٹا، تم ٹیلی فون کر کے معلوم کرو کہ عرفان خیریت سے تو ہے؟''

''آنٹی! اس وقت عرفان پچ پر ہے۔ اسے کال کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میں ٹیم کے منیجر سے بات کرتا ہوں۔'' میں نے کہا اور اپنا سیل فون نکال لیا۔

منیجر صاحب نے کہا۔ ''میچ سے پہلے تو عرفان بالکل فٹ تھا۔ مجھے بھی لگ رہا ہے کہ اس کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے۔'' اسی وقت ایک بال پر انتہائی بھونڈا شاٹ کھیلتے ہوئے عرفان کیچ آؤٹ ہو گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے سکس مارنے کی کوشش کی ہو لیکن بال بہت آسانی سے انڈیا کے فیلڈر نے پکڑ لی۔

عرفان نے ہیلمٹ اتارا اور افسردگی سے پویلین کی طرف چل دیا۔

ٹیم کے منیجر صاحب اب بھی آن لائن تھے۔ انہوں نے بے ساختہ کہا۔ ''دیکھا آپ نے، یہ عرفان نے کس قسم کا شاٹ کھیلا ہے۔ میں آپ سے بعد میں بات کرتا ہوں۔'' انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے اتنی دیر انتظار کیا کہ عرفان ڈریسنگ روم تک پہنچ جائے اور اپنا سیل فون آن کر لے۔ میں اس دوران میں بے دلی سے میچ دیکھتا رہا۔ عرفان کے بعد آنے والا کھلاڑی ناصر بھی بہت اچھا بیٹسمین تھا لیکن وہ دوسرے ہی اوور میں آؤٹ ہو گیا۔

میں نے سیل فون نکال کر عرفان کا نمبر پنچ کیا لیکن اس کا سیل فون ابھی تک بند تھا۔ پھر میں وقفے وقفے سے اس کا نمبر ٹرائی کرتا رہا لیکن وہ مسلسل آف تھا۔

''آنٹی، غیر ذمے داری کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ یہ عرفان اپنا سیل فون آن کیوں نہیں کرتا؟''

''عرفان بھائی صدمے میں ہوں گے۔'' سمیرا نے کہا۔ ''انڈیا کے خلاف پہلی دفعہ کسی میچ میں وہ صرف نو رنز بنا کر آؤٹ ہوئے ہیں۔ انہیں سیل فون کا خیال بھی نہیں آیا ہو گا۔''

سمیرا کی بات میں وزن تھا۔ واقعی عرفان جیسا اسٹار بیٹسمین جس سے ٹیم کو توقعات وابستہ ہوں لیکن وہ صرف نو رنز بنا کر پویلین کی طرف لوٹ آئے، وہ واقعی شاک کی حالت میں ہو گا۔ جب ہم لوگوں کو اتنا صدمہ تھا تو عرفان کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی۔ خیر سیریز اب بھی ہمارے ہاتھ میں تھی۔ ہمیں وہ سیریز جیتنے کے لیے صرف ایک میچ جیتنا تھا جبکہ انڈیا کو آئندہ تمام میچ جیت کر سیریز میں کامیابی حاصل کرنا تھی۔

میری طبیعت مکدر ہو گئی تھی۔ میں نے بقیہ میچ دیکھنے کی ضرورت بھی نہ سمجھی کیونکہ عرفان کے بعد یکے بعد دیگرے ہمارے دو کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے اور اسکور صرف ستاون رنز تھا۔ میں جلد ہی وہاں سے اٹھ گیا۔

شام کو آفس میں معلوم ہوا کہ پاکستان یہ میچ بہت بری طرح یعنی چھ وکٹوں سے ہار گیا ہے۔

آفس آنے کے بعد بلکہ دوسرے دن بھی میں عرفان سے مسلسل رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن ہر مرتبہ اس کا سیل فون آف ملا۔

میں نے تنگ آ کر ایک مرتبہ پھر ٹیم کے منیجر سے رابطہ کیا اور ان سے عرفان کے بارے میں پوچھا۔

''عرفان بالکل ٹھیک ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''بس میچ کے دوران میں اسے چکر سے آ گئے تھے اس لیے وہ کھیل نہ سکا۔''

''کیا آپ عرفان سے میری بات کرا سکتے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''اس وقت تو ممکن نہیں ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''عرفان اس وقت اپنے ہوٹل میں ہو گا۔ میں وہاں سے تقریباً پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہوں۔''

''اس کا سیل فون بھی آف ہے ورنہ...''

''ہاں!'' انہوں نے میری بات کاٹ دی۔ ''عرفان کا سیل فون کہیں گم ہو گیا ہے۔''

''آپ پلیز اتنی زحمت کریں کہ اس تک میرا میسج پہنچا دیں۔ اس سے کہیں کہ وہ پہلی فرصت میں سیل فون خرید لے یا پھر اپنے گھر والوں سے رابطہ ہی کر لے۔ اس کے گھر والے اس کی طرف سے بہت فکرمند ہیں۔''

''آپ فکر مت کریں۔'' انہوں نے کہا۔ ''میں آج ہی

سے کہہ دوں گا کہ وہ اپنے گھر والوں سے CONTACT لے۔''

''تھینک یو ویری مچ سر!'' میں نے کہا اور سلسلہ منقطع دیا۔

منیجر صاحب مجھے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ اسپورٹس ی ٹاک شوز میں وہ شرکت کر چکے تھے۔ یوں بھی رپورٹر حیثیت سے ملک بھر میں میرا نام شیطان کی طرح مشہور میں ایک سیاسی ٹاک شو کی میزبانی بھی کرتا تھا۔ اس لیے مجھے پہچانتے بھی تھے۔

اس دن میں کافی دیر تک بلکہ رات گئے عرفان کی کال کا ر کرتا رہا لیکن اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔

اپنے کام سے فارغ ہو کر میں عرفان کے گھر پہنچا تو خلافِ معمول سناٹا تھا۔ برآمدے کی صرف ایک لائٹ رہی تھی۔ باقی پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ وہ لوگ اچانک کہاں چلے گئے؟ صبح تو آنٹی کا کوئی ایسا پروگرام نہیں تھا۔ اس سے زیادہ حیرت بات یہ تھی کہ گھر کے دونوں ملازمین بھی موجود نہیں تھے۔ نہ ہے، آنٹی نے اچانک کہیں جانے کا پروگرام بنا لیا ہو اور مین کو چھٹی دے دی ہو۔ میں نے ان کی غیر موجودگی کا ہی ایک جواز گھڑ لیا۔

پورے گھر کا جائزہ لینے کے بعد جب میں گیٹ پر پہنچا تو یدار موجود تھا۔

اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے میں نے پوچھا۔ غلام حسین! یہ گھر کے لوگ اچانک کہاں چلے گئے؟''

''صاحب! وہ بیگم صاحبہ کا دو بھائی آیا تھا دوپہر میں۔ کی بیٹی کا شادی ہے۔ وہ بیگم صاحبہ، صاحب اور چھوٹی بی بی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔''

''بیگم صاحبہ کے بھائی؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

جہاں تک مجھے علم تھا آنٹی کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ ان کے رے نزدیکی رشتے داروں کو بھی میں جانتا تھا۔ ان میں کوئی ایسا نہیں تھا جس کی بیٹی کی شادی ہو۔ میری چھٹی حس خطرے کی نشان دہی کر رہی تھی۔

''صاحب اپنی گاڑی میں گئے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں صاحب! اور عرفان صاحب کا گاڑی تو گیراج ہے۔ وہ لوگ صاحب اور بیگم صاحبہ کو اپنی گاڑی میں لے ہیں۔''

یہ مزید حیرت کی بات تھی۔ انکل کو اگر ایمرجنسی میں جانا پڑ گیا تھا تو وہ اپنی گاڑی کیوں نہیں لے کر گئے؟ پھر ان کے ایسے کون سے قریبی رشتے دار پیدا ہو گئے جو انہیں اتنی ایمرجنسی میں لے گئے؟

''بیگم صاحبہ کے بھائیوں کا حلیہ کیسا تھا، میرا مطلب ہے کہ وہ دیکھنے میں کیسے لگ رہے تھے؟ اور گاڑی کون سی تھی؟''

''صاحب جی، وہ تو بہت بڑے لوگ لگ رہے تھے۔ وہ آپ جیسی گاڑی میں آئے تھے۔ انہوں نے مجھے پانچ سو روپے بخشش بھی دی تھی۔''

میرے پاس ان دنوں لینڈ کروزر تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ لینڈ کروزر میں آئے تھے۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عرفان کے گھر والے اتنی ایمرجنسی میں کہاں چلے گئے۔

میں ان ہی خیالات میں الجھا ہوا گاڑی میں بیٹھا اور سیل فون پر سمیرا کا نمبر ملایا۔ لیکن اس کے سیل فون سے کوئی رسپانس نہیں آ رہا تھا۔ دوسری طرف مسلسل بیل بج رہی تھی لیکن سمیرا فون ریسیو نہیں کر رہی تھی۔

میں نے آنٹی کا نمبر ڈائل کیا۔ ان کا سیل فون آف تھا۔ میری گھبراہٹ اور فکرمندی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

میں نے انکل کا نمبر ٹرائی کیا لیکن وہ بھی بند تھا۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس پورے گھرانے کے ساتھ کوئی نہ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ ابھی تک یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ حادثے یا واقعے کی نوعیت کیا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنا سیل فون نکالا لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ اب میں کسے کال کروں جس سے ان لوگوں کے بارے میں معلوم ہو سکے۔ کیا میں پولیس کو انفارم کروں؟ ایک امکان یہ بھی تھا کہ وہ لوگ واقعی اپنے کسی ایسے رشتے دار کے ساتھ گئے ہوں جسے میں نہ جانتا ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ میں ان کے ہر قریبی رشتے دار کو اچھی طرح جانتا تھا لیکن بعض اوقات ایسے دور پرے کے رشتے دار بھی نکل آتے ہیں جو برسوں سے رابطے میں نہیں ہوتے۔ میرے پاس عرفان کے کسی قریبی رشتے دار کا سیل نمبر بھی نہیں تھا کہ میں انہی سے کنفرم کر لیتا۔ میں نے گھبرا کر ڈی آئی جی کرائم کا نمبر پنچ کیا اور انہیں کال کرنے ہی والا تھا کہ میرے موبائل فون پر کسی کا میسج موصول ہوا۔

میسج بھیجنے والا میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔

میں نے میسج پڑھنا شروع کیا۔ ''وکی! میں بہت مشکل میں ہوں۔ کچھ لوگوں نے مجھے جان بوجھ کر میچ ہارنے کی ہدایت کی ہے۔ انہوں نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے ان کی ہدایت پر عمل نہ کیا تو وہ میرے پورے خاندان کو ختم کر

دیں گے۔ انہوں نے امی، ابو، سمیرا، حمیرا باجی اور عابد بھائی کو یرغمال بنالیا ہے۔ یہ دھمکی تو انہوں نے مجھے تیسرے ہی میچ میں دی تھی لیکن میرا ارادہ تھا کہ میں میچ کے بعد ٹیلی فون کے ذریعے تمہیں ان کی دھمکیوں سے آگاہ کردوں گا اسی لیے میں نے تیسرا میچ بہت بے دلی سے کھیلا۔ پھر مجھے اتنا موقع ہی نہیں ملا اگر زندگی رہی تو تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔ یہ میسج بھی میں نے بہت مشکل سے کرایا ہے۔ عرفان۔"

اس کا میسج پڑھ کر میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ عرفان کے خاندان کا اغوا کسی چھوٹے موٹے آدمی یا جرائم پیشہ گروپ کا کام نہیں تھا۔ عرفان انٹرنیشنل فیم کا آدمی تھا۔ اس کے گھر والوں کے اغوا سے پورے شہر کی پولیس حرکت میں آسکتی تھی۔

میں نے گاڑی کا رخ اپنے آفس کی طرف موڑ دیا، پھر کچھ دور آ کر مجھے احساس ہوا کہ میں آفس میں کام نہیں کر سکوں گا۔ میں پُرسکون ہو کر اس پورے معاملے پر غور کرنا چاہتا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے گاڑی اپنے گھر کی طرف گھمالی۔

گھر میں داخل ہو کر میں سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ امی اور ابو لاؤنج ہی میں بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر حیرت سے امی نے کہا۔ "کیا بات ہے وکی! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ آج اتنی جلدی گھر کیسے آگئے؟"

"میں ٹھیک ہوں امی، بس سر میں ذرا درد ہے۔ میں اپنے کمرے میں جارہا ہوں۔ مجھے ایک کپ کافی بھجوادیں۔" یہ کہہ کر میں تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سلسلے میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ایک طرف کرکٹ گراؤنڈ میں پاکستان کی عزت کا سوال تھا، دوسری طرف عرفان کے گھر والوں کی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی تھیں۔

اچانک مجھے اس شخص کا خیال آیا جس نے مجھے میسج کیا تھا۔ میں نے سوچا، اس کو شاید مزید کچھ معلوم ہو، کوئی ایسی بات جو میسج کرتے وقت اس کے ذہن سے نکل گئی ہو۔ ممکن ہے عرفان نے اس سے کچھ اور بھی کہا ہو؟

میں نے سیل فون نکالا تو امی کافی کا کپ لے کر خود ہی میرے کمرے میں آگئیں۔

"امی! آپ نے کیوں تکلیف کی، زینت کہاں گئی؟" زینت ہماری ملازمہ کا نام تھا۔

"وہ اس وقت دوسرے کاموں میں مصروف ہے۔" امی نے کہا پھر غور سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں۔ "کیا بات ہے وکی! تم مجھے کچھ زیادہ ہی پریشان لگ رہے ہو؟ کیا آفس میں کسی سے جھگڑا ہوا ہے یا کوئی اور بات ہے؟"

"کچھ بھی نہیں ہے امی، میں نے کہا نا کہ میرے سر میں شدید درد ہے۔ کوئی پین کلر ہو تو مجھے دے دیں۔" میرے سر میں واقعی درد تھا۔

امی نے مزید کچھ نہیں پوچھا۔ میرے بیڈ کے سائیڈ کی ایک دراز سے انہوں نے سردرد کی ایک ٹیبلٹ مجھے دے دی اور بولیں۔ "اب تم کپڑے بدلو اور آرام کرو۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئیں۔

میں نے ٹیبلٹ پانی کے ساتھ نگلی اور سیل فون اٹھا کر میسج کرنے والے کا نمبر دیکھنے لگا۔ پھر میں نے اس نمبر پر کال کر دی۔ دوسری ہی بیل پر کسی نے فون ریسیو کرلیا۔

"ہیلو!" میں نے کہا۔ "میں وقار الحسن بول رہا ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے آپ کا ایک میسج موصول ہوا ہے، اسی سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔"

"میں ارشد ہوں۔ کراچی ہی میں رہتا ہوں اور میچ دیکھنے انڈیا آیا ہوا ہوں۔"

"ارشد صاحب! عرفان نے آپ کو یہ سب کچھ کب بتایا۔ کیا آپ کی تفصیلی بات ہوئی ہے؟"

"بات کرنے کی نوبت کہاں آئی وقار صاحب!" ارشد نے کہا۔ "آج ریسٹ ڈے تھا۔ میں نے بہت کوشش کے بعد اسی ہوٹل میں کمرا لیا ہے جہاں پاکستان کی ٹیم ٹھہری ہوئی ہے۔ آج دوپہر لنچ کے موقعے پر پاکستانی ٹیم کے تقریباً تمام پلیئرز بھی موجود تھے مگر عام آدمی کو ان کے قریب بھی نہیں جانے دیا جارہا تھا۔ وہاں ہوٹل کے ساتھ تو انڈیا کی پولیس کی سیکیورٹی بھی بہت سخت ہے۔ لنچ کے بعد لفٹ کی طرف جاتے ہوئے آخر کچھ نوجوانوں کو کھلاڑیوں سے آٹوگراف لینے کا موقع مل ہی گیا۔ میں نے اپنی آٹوگراف بک آگے بڑھاتے ہوئے عرفان صاحب سے کہا۔ سر! میں آپ کا بہت زبردست فین ہوں اور پاکستان سے خاص طور پر آپ کا میچ دیکھنے انڈیا آیا ہوں۔"

عرفان صاحب نے ایک نظر مجھے دیکھا اور میری آٹوگراف بک لیتے ہوئے زیرِلب کہا۔ "میرا ایک کام کریں گے آپ؟"

انہوں نے یہ بات اتنی دھیمی آواز میں کہی تھی کہ میں بھی بہ مشکل سن سکا لیکن سمجھ گیا کہ کوئی ایسی بات ہے جو وہ دوسروں سے چھپا رہے ہیں۔ میں نے بھی آہستہ سے ہنس کر کہا۔ "مجھے خوشی ہوگی سر! آپ حکم کریں۔"

انہوں نے آٹوگراف بک پر سائن کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو ایک پرچہ دے رہا ہوں۔ آپ وہ میسج پاکستان میں میرے ایک دوست کو کر دیں۔ اس کا نام اور نمبر بھی اس میں ہے۔ آٹوگراف بک کے ساتھ انہوں نے تہ کیا ہوا ایک پرچہ بھی اس کے ساتھ ہی میرے ہاتھ میں دے دیا پھر وہ دوسرے لوگوں کو آٹوگراف دینے لگے۔"

"کیا اس پرچے میں صرف اتنا ہی لکھا تھا جتنا آپ نے مجھے بتایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وقار صاحب! اس پرچے میں تو اور بھی بہت کچھ تھا۔ میں تو آپ کو کال کرنے والا تھا لیکن میرے سیل کا کریڈٹ ختم ہو گیا تھا۔ ہوٹل میں اتفاق سے میرے نیٹ ورک کا واؤچر موجود نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ فوری طور پر آپ کو میسج ہی کر دوں۔"

"اس پرچے میں اور کیا تھا؟" میں اس شخص کی فضول باتوں اور تفصیل سے جھنجلا گیا تھا لیکن میں نے اسے اس کا احساس نہیں ہونے دیا۔

"انہوں نے لکھا تھا کہ کسی پاکستانی پارٹی نے اس میچ پر کروڑوں ڈالرز کی شرط لگا رکھی ہے۔ پاکستان کی ہار کی صورت میں اس پارٹی کو کروڑوں ڈالرز ملیں گے۔ پہلے انہوں نے عرفان صاحب کو خاصی بڑی رقم کی آفر کی تھی کہ وہ جان بوجھ کر اچھا نہ کھیلیں۔ عرفان صاحب نے ان کے آدمی کو بری طرح جھڑک دیا۔ یہ اس میچ سے پہلے کی بات ہے جو پاکستان ہار گیا تھا۔ شام کو ان کے آدمی پھر آئے اور عرفان کو دھمکی دی کہ اگر تم نے میچ میں اچھی کارکردگی دکھائی تو پاکستان میں تمہاری بہن اغوا کرلی جائے گی۔ ہمارے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور اب اپنا سیل فون ہمیں دے دو۔ یہ کہہ کر ان میں سے ایک آدمی نے گن نکال لی اور کہا۔ اب تم چوبیس گھنٹے ہمارے آدمیوں کی نگرانی میں رہو گے۔ اپنے کسی بھی ساتھی سے اس کا تذکرہ نہیں کرو گے۔ گھر سے رابطہ بھی نہیں رکھو گے۔ اول تو تمہیں یہاں سے کال کرنے ہی نہیں دی جائے گی۔ اگر تم نے خود یا کسی اور کے ذریعے رابطہ کر بھی لیا تو ہمیں فوراً معلوم ہو جائے گا۔ اس صورت میں بھی تمہاری بہن کو اغوا کرلیا جائے گا۔ تمہارے گھر کا پی ٹی سی ایل نمبر آبزرویشن پر ہے۔ تمہارے گھر کے دوسرے افراد کے سیل فونز بھی ٹریک پر ہیں۔ انڈیا سے کال ہوتے ہی وہاں ہمارے آدمیوں کو منٹوں میں خبر ہو جائے گی اس لیے کل کا میچ ذرا سوچ سمجھ کر کھیلنا۔"

"پھر... پھر ان لوگوں نے عرفان سے دوبارہ رابطہ کیا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہاں، وہ میچ ختم ہونے کے بعد پھر عرفان کے پاس آئے تھے۔ ان میں سے ایک بولا۔ تم نے آج ہماری مرضی کا کھیل کھیلا، بس اسی طرح کھیلتے رہو۔ تم نے ہماری آفر ٹھکرا دی ہے لیکن اس کے باوجود ہم تمہیں وہ رقم انعام میں دیں گے۔ پھر انہوں نے ہوٹل کے ایک ویٹر سے سیل فون لے کر اپنے والد سے بات کی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ان لوگوں میں سے ایک آدمی آگیا اور بھنا کر بولا۔ عرفان صاحب! آپ نے ہماری بات پر عمل نہیں کیا۔ آپ کے گھر کے تمام افراد کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ اگر آپ نے اس بات کا تذکرہ کسی سے کیا یا میڈیا کو بھنک بھی پڑ گئی تو آپ کے والدین کو تو ہلاک کر دیں گے۔ رہی آپ کی بہن تو وہ خاصی خوب صورت لڑکی ہے۔ اس کے اچھے دام مل جائیں گے۔ حیرت ہے، آپ کو ابھی تک ہماری طاقت اور پہنچ کا اندازہ نہیں ہوا۔ کیا یہی بات کافی نہیں ہے کہ ہم آزادی سے آپ کے کمرے میں آجاتے ہیں حالانکہ ہوٹل کے باہر اور خاص طور پر اس فلور پر سیکیورٹی بہت سخت ہے۔ یہاں غیر متعلقہ شخص تو دور کی بات ہے، آپ کا کوئی رشتے دار بھی شناخت کے سو مراحل سے گزرنے کے بعد آئے گا۔ ہاں، بس آپ کو اب دونوں میچ ہارنا ہیں۔"

"میں نے اگر اچھی بیٹنگ نہیں کی تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ پاکستان یہ میچ ہار ہی جائے گا۔"

"آپ کوئی فکر مت کریں، ہم نے اس کا بندوبست کر لیا ہے۔ یہ کہہ کر وہ آدمی چلا گیا۔ شاید اس کے بعد ہی عرفان صاحب نے ہوٹل کے پیڈ پر یہ تمام تفصیلات لکھی تھیں کہ موقع ملا تو یہ پرچہ کسی کے حوالے کر دوں گا۔"

"تھینک یو ویری مچ ارشد صاحب!" میں نے کہا۔

"اٹس او کے سر! عرفان صاحب کے ساتھ ساتھ میں آپ کا بھی فین ہوں۔ مجھے آپ کے کام آکر خوشی ہوگی۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں اپنے پسندیدہ کھلاڑی کے دوست اور ملک کے ایک معروف جرنلسٹ سے بات کر رہا ہوں۔"

"فی الحال یہ بات اپنی ذات تک ہی محدود رکھیے گا۔ ابھی میچ میں تین دن ہیں۔ پاکستان اگر دوسرا میچ بھی ہار جائے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فیصلہ کن تو آخری میچ ہوگا۔" ویسے میں آپ سے رابطے میں رہوں گا۔ پھر میں نے اس کا ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کیا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ عرفان کے گھر والوں کی تلاش کہاں سے شروع کروں؟

فوری طور پر مجھے عامر کا خیال آیا۔ وہ ہمارے چینل کا اسپورٹس رپورٹر تھا اور میچ کی کوریج کے لیے انڈیا گیا ہوا تھا۔

میں نے سیل فون سے اس کا نمبر نکالا لیکن ڈائل کرنے سے پہلے اپنا ارادہ بدل دیا۔

عامر کے لیے تو یہ ایکس کلوسو نیوز (EXCLUSIVE) ہوتی۔ اسے کچھ بھی بتانے کا مطلب یہ تھا کہ اس خبر کا پوری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹ دیا جائے۔ پھر پاکستان میچ ہارتا یا جیتتا، اس کے ساتھ ساتھ عرفان کے خاندان کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ میرا دل بار بار یہی گواہی دے رہا تھا کہ یہ کسی چھوٹے موٹے جرائم پیشہ آدمی کا کام نہیں ہے بلکہ اس میں کوئی بین الاقوامی گروپ ملوث ہے جو کروڑوں ڈالرز کی شرطیں لگا رہا ہے۔ جو لوگ اتنی دیدہ دلیری سے عرفان کے گھر والوں کو اغوا کر سکتے تھے، وہ ان کی جان بھی لے سکتے تھے۔

سوچ سوچ کر میرا ذہن شل ہو گیا، پھر اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے دو مہینے پہلے میچ فکسنگ پر ایک فیچر کے لیے کچھ کام کیا تھا لیکن پھر میں دوسری مصروفیات میں الجھ گیا۔ یہ سوچ کر ہی میرے ذہن میں جھماکا ہوا تھا۔ مجھے ناظر کا خیال آیا تھا جو میچز کے سلسلے میں شرطیں لگواتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ ایک بکر تھا۔ وہ بہت چھوٹی چھوٹی شرطیں لگاتا تھا لیکن اس تالاب کی مچھلی ہونے کے ناتے وہ ان مگرمچھوں سے بھی واقف ہو گا جو بڑے پیمانے پر شرطیں لگاتے تھے۔

پہلے میں نے اسے کال کرنے کا فیصلہ کیا پھر یہ سوچا کہ اگر اسے کچھ معلوم بھی ہوا تو وہ ٹیلی فون پر ہرگز نہیں بتائے گا۔ مجھے اس سے خود ہی ملنا پڑے گا۔ میں نے اس کا نمبر ملا لیا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟

میری کال کے جواب میں وہ چہکا۔ ''زہے نصیب! وقار صاحب آج آپ نے مجھ ناچیز کو کیسے یاد کر لیا؟''

''یار! میں سوچ رہا ہوں کہ اس دفعہ میں بھی قسمت آزمائی کر لوں۔ ممکن ہے میں جیت ہی جاؤں۔''

''وقار صاحب! کیا آپ سیریس ہیں یا پھر میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟'' ناظر نے الجھ کر پوچھا۔

''ارے بھئی، میں بالکل سیریس ہوں لیکن ایک بات کا دھیان رکھنا۔ میں چیٹنگ بالکل پسند نہیں کرتا ہوں۔''

''اگر آپ سیریس ہیں تو مجھے بتائیں، آپ کس ٹیم پر اور کتنے کا بیٹ لگانا چاہتے ہیں؟'' ناظر نے پوچھا۔

''یار! میں یہ سب کچھ تمہیں ٹیلی فون پر نہیں بتا سکتا۔'' میں نے کہا۔ ''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''زہے نصیب!'' ناظر ہنس کر بولا۔ میری باتوں سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں واقعی سیریس ہوں۔ ''آپ چاہیں تو آج ہی مجھ سے مل لیں۔''

''آج نہیں بلکہ میں ابھی تم سے ملنا چاہ رہا ہوں لیکن ملاقات تمہارے ٹھکانے پر نہیں ہو گی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم حسن اسکوائر پر آ جاؤ۔ میں وہاں سے تمہیں پک کر لوں گا۔ اپنی گاڑی تم سوک سینٹر کے پارکنگ لاٹ میں پارک کر دینا۔''

''وقار صاحب!'' ناظر نے کہا۔ ''کہیں یہ کوئی چکر تو نہیں ہے؟'' ناظر پھر الجھ گیا۔

''ارے یار! کوئی چکر نہیں ہے ورنہ تمہارے خلاف میرے پاس اب بھی اتنے ثبوت ہیں کہ میں تمہیں کم از کم تین سال کے لیے تو جیل بھجوا ہی سکتا ہوں۔'' میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔ اس کے خلاف میرے پاس کوئی بھی ایسا ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے، میں آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔'' ناظر نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

میں حسن اسکوائر پر پانچ منٹ پہلے ہی پہنچ گیا۔ ناظر بھی ٹھیک وقت پر وہاں آ گیا۔ میں نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور گلشن اقبال کے ایک اچھے ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ وہاں اس وقت زیادہ رش نہیں تھا۔

''وقار صاحب! اتنا تو مجھے یقین ہے کہ آپ نے مجھے کسی بھی ٹیم پر شرط لگانے کو نہیں بلایا ہے۔'' ناظر نے کہا، وہ اتنا احمق تھا نہیں جتنا نظر آتا تھا۔ احمق آدمی کا اس فیلڈ میں گزارہ بھی نہیں ہو سکتا۔

''میں سیریس ہوں ناظر!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اور پاکستانی ٹیم پر بیٹ لگانا چاہتا ہوں۔''

''پاکستانی ٹیم پر سوں تک فیورٹ تھی لیکن اب انڈیا کا بھاؤ بڑھ گیا ہے۔''

''کچھ بھی ہو، میں پاکستانی ٹیم پر دس لاکھ روپے لگانا چاہتا ہوں۔''

''دس لاکھ!'' ناظر چونک کر بولا۔ ''اگر پاکستان جیت گیا تو آپ کو پچاس لاکھ ملیں گے ورنہ آپ کی یہ رقم بھی ڈوب جائے گی۔''

''کوئی بات نہیں، آدمی رسک لے تو بڑا لے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''پھر تمہارے ہوتے ہوئے میری رقم کیسے ڈوب سکتی ہے۔''

''اس دھندے میں دوستی اور تعلقات نہیں چلتے وقار صاحب!'' ناظر نے کہا۔ ''اور میں تو معمولی سا بکی ہوں۔ مجھے تو صرف کمیشن ملتا ہے۔ اصل رقم تو کہیں اور جائے گی۔''

''کہیں اور کہاں؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا

اور یہ ظاہر کرنے کو اپنی جیب سے چیک بک نکال لی جیسے میں شرط لگانے پر آمادہ ہوں۔

''وقار صاحب! ہمارے دھندے میں چیک نہیں چلتا۔'' اس نے کہا۔ ''سوری! لیکن میں مجبور ہوں۔ میں تو درمیانی آدمی ہوں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں کل تمہیں کیش بھی دے دوں گا۔ بینک ٹائم ختم ہو گیا ہے ورنہ کیش آج ہی دے دیتا۔ اے ٹی ایم سے اتنی بڑی رقم نکل نہیں سکتی، ہاں تم نے بتایا نہیں کہ اس بزنس کے پیچھے اصل میں کون ہے؟''

''میں تو صرف شہباز کو جانتا ہوں۔'' ناظر نے کہا۔ ''وہ بھی ان لوگوں کا کارندہ ہے جو یہ کاروبار کرتے ہیں۔ اس آدمی سے شاید وہ بھی واقف نہ ہو۔''

''ویسے ہمارے ملک میں کتنی پارٹیز یہ دھندا کر رہی ہیں؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا لیکن میرے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ اور میرا سرسری انداز دیکھ کر بولا۔ ''چھوٹے موٹے لوگ تو کئی ہیں لیکن بڑی صرف دو پارٹیاں ہیں۔ ایک پارٹی وہ ہے جس کے لیے میں کام کرتا ہوں اور دوسری پارٹی کا بکی سہیل ہے۔''

''تمہارے پاس سہیل کا سیل نمبر ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''دیکھتا ہوں وہ کیا بھاؤ بتاتا ہے۔ ویسے تم فکر مت کرو ڈیل میں تم ہی سے کروں گا۔'' پھر میں نے اپنا والٹ نکالا اور پانچ ہزار روپے اس کے سامنے رکھتا ہوا بولا۔ ''یہ میری طرف سے ٹوکن منی سمجھ لو۔''

پانچ ہزار لے کر وہ بالکل مطمئن ہو گیا اور اس نے مجھے سہیل کا نمبر لکھوا دیا۔ میں نے اس سے شہباز کا سیل نمبر بھی لے لیا۔ اس کا نمبر دیتے ہوئے وہ کچھ ہچکچایا لیکن میں نے پھر اسے دھمکی دی تو وہ راہِ راست پر آ گیا۔

ریسٹورنٹ سے باہر نکل کر میں نے اسے حسن اسکوائر پر چھوڑا۔ اس کے پاس گاڑی نہیں بلکہ بائیک تھی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں کل کیش کے لیے اس سے کسی وقت رابطہ کروں گا۔

اسے رخصت کرنے کے بعد میں نے سہیل کو ٹیلی فون کیا اور اس سے بھی شرط لگانے کی بات کی۔ میں نے اسے اپنا اصل نام نہیں بتایا اور اس سے کہا کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس نے خوشی خوشی مجھے اپنے ٹھکانے کا ایڈریس بتا دیا۔

میں ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر صدر پہنچ گیا کیونکہ صدر ہی کی ایک بلڈنگ میں سہیل کا آفس تھا۔ آفس کیا چھوٹا سا ایک کمرا تھا جس میں بہ مشکل تمام چھوٹی اسٹیل کی ایک ٹیبل اور دو کرسیاں ہی سما سکتی تھیں۔ البتہ اس نے اپنے چھوٹے سے کمرے کو بھی خوب آراستہ کر رکھا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ بری طرح چونک اٹھا اور بولا۔ ''وقار صاحب! اگر آپ یہاں کسی خبر کی تلاش میں آئے ہیں تو آپ کو مایوسی ہو گی۔ آپ نے زحمت کیوں کی۔ مجھ سے کوئی کام تھا، حکم کرتے، میں حاضر ہو جاتا۔''

''میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ وہ دبلا پتلا، لمبا، مذاق قسم کا آدمی تھا لیکن اعلیٰ لباس اور خوشبو کا شوقین تھا اس لیے مجھے اس چھوٹی سی بلڈنگ میں بھی اس کے آفس میں بیٹھنا ناگوار نہیں گزر رہا تھا۔

''وہ دراصل، ابھی ایک کلائنٹ آنے والا ہے۔ میں اس سے نمٹ کر آپ کے پاس آ جاؤں گا۔ مجھے بتائیں میں کہاں آؤں؟''

''کسی کلائنٹ کے چکر میں مت رہنا، ابھی تمہیں میں نے ہی ٹیلی فون کیا تھا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''آ... آپ... میچ پر... شرط لگانا چاہتے ہیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کیوں، میں کوئی فرشتہ ہوں۔ میں اپنے چینل کا کرائم اینڈ پولیٹیکل انوسٹی گیٹر ہوں۔ تم کیا سمجھتے ہو، یہ ٹھاٹ باٹ میں اپنی معمولی تنخواہ میں کرتا ہوں۔''

پھر میں نے اسے بھی دس لاکھ روپے انڈین ٹیم پر لگانے کو کہا اور اس سے بھی اسی قسم کی گفتگو کی جیسی میں ناظر سے کر چکا تھا۔

''ہم تو درمیانی لوگ ہوتے ہیں وقار صاحب!'' سہیل نے تلخی سے کہا۔ ''اصل سرمایہ تو کسی اور ہی کی تجوری میں جاتا ہے۔''

''میں اس تجوری والے کا نام ہی تو جاننا چاہ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''وہ بہت بڑا بدمعاش ہے بلکہ یہ سمجھ لیں کہ وہ انڈر ورلڈ کا کنگ ہے۔ وہ نہ صرف دوسرے ناجائز کاروبار کرتا ہے بلکہ اغوا اور قتل بھی کرتا ہے... آپ تو کرائم رپورٹر ہیں، مجھ سے زیادہ جانتے ہوں گے۔''

''میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔''

''آپ نے کریم خان کا نام سنا ہے؟''

''کے کے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں وہ کے کے، کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اصل مال تو اس کے پاس پہنچتا ہے، میں تو صرف بکی ہوں۔''

''کیا کے کے میچ فکسنگ کی حد تک بھی جا سکتا ہے؟''

میں نے پوچھا۔

''اس کا سرمایہ داؤ پر لگا ہو تو وہ کسی حد تک بھی جا سکتا ہے۔'' سہیل نے کہا۔ پھر ہنس کر بولا۔ ''اب میں سمجھا۔ آپ کو شرط ورط نہیں لگانا تھی بلکہ کے کے، کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے ہیں؟ لیکن اس میں میرا نام کہیں نہ آئے۔''

''تم بھی اپنی زبان بند رکھنا کہ تم سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ یہ بات کسی کو بھی نہیں بتانا۔'' میں نے والٹ نکال کر اسے پیسے دینا چاہے تو اس نے انکار کر دیا اور بولا۔ ''وقار صاحب! یہ میں آپ سے نہیں لوں گا۔ بس مجھے کسی مصیبت میں مت پھنسا دیجیے گا۔''

وہاں سے رخصت ہو کر میں پھر بے مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ سہیل کی باتوں سے مجھے شبہ تو ہو گیا تھا کہ اس سارے واقعے کے پیچھے کے کے کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا مگر میں اس پر بغیر کسی ثبوت کے ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ پولیس کے اعلیٰ افسران سے اس کے تعلقات تھے۔ وہ بادشاہوں کی طرح ڈیفنس کے ایک بنگلے میں رہتا تھا۔

اس وقت مجھے اپنے ایک دوست ایس پی درانی کا خیال آیا۔ درانی ان دنوں سکھر میں تھا لیکن اس نے بتایا تھا کہ اس کا ٹرانسفر کراچی ہونے والا ہے۔ میرے پاس درانی کا سیل نمبر موجود تھا۔

میں نے گاڑی ایک جگہ روک کر سیل فون نکالا اور درانی کا نمبر ملا لیا۔

''زندہ ہیں آپ؟'' درانی کی چہکتی ہوئی آواز آئی۔ ''بہت دنوں بعد کہیں میرا خیال آیا۔''

''اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔ ''تم تو شاید کسی قبر سے بول رہے ہو جہاں صرف ان کمنگ کالز کی سہولت ہے۔ ویسے تم ہو کہاں؟''

''یار! میں پچھلے کچھ دن سے کراچی میں ہوں۔ میرا ٹرانسفر کراچی ہو گیا ہے۔ اصل میں میرا سیل فون گم ہو گیا تھا۔ اس میں تمہارا نمبر بھی تھا۔ اب...''

''اچھا، یہ بتاؤ ابھی تم کہاں ہو؟ میں ابھی تم سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''خیریت تو ہے؟'' وہ فکرمندی سے بولا۔

''باقی باتیں ملاقات پر ہوں گی۔ بس یہ سمجھ لو کہ خیریت نہیں ہے۔''

''تو پھر میں ابھی تمہارے گھر آ جاتا ہوں۔'' درانی نے کہا۔

''میں اس وقت گھر پر نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم ایسا کرو، پی سی کے مین گیٹ پر مجھ سے ملو۔ میں دس منٹ میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔''

''او کے، میں آ رہا ہوں۔'' درانی نے کہا۔

درانی ایسا پولیس آفیسر تھا جس پر میں اعتماد کر سکتا تھا۔ عرفان کی طرح وہ بھی کالج اور یونیورسٹی میں میرے ساتھ پڑھا تھا لیکن اس سے تعلقات کی نوعیت وہ نہیں تھی جو عرفان سے تھی۔

میں پی سی کے گیٹ پر پہنچا تو درانی کی پولیس جیپ پہلے سے وہاں موجود تھی۔ میری گاڑی دیکھ کر وہ جیپ سے اتر کر میرے پاس آ گیا۔

''ارے یار! میں نے تمہیں بلایا تھا، یہ فوج لے کر آنے کی کیا ضرورت تھی۔'' میں نے اس کے گارڈز کی طرف اشارہ کیا۔ ''اب گاڑی میں بیٹھو، ہم اسی ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں کچھ دیر بیٹھیں گے۔''

درانی نے اپنے گارڈز کو کچھ ہدایات دیں پھر وہ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں گاڑی ہوٹل کے مین انٹرنس کی طرف لے گیا۔

☆☆☆

''یار! یہ تو بہت پریشانی کی بات ہے۔'' درانی نے کہا۔ ریسٹورنٹ کے خنک ماحول میں خوشبو رچی ہوئی تھی لیکن مجھے اس وقت کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ یہ وہی ریسٹورنٹ تھا جہاں میں اکثر سمیرا کے ساتھ آتا تھا۔

''تم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہو؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''کریم خان لاکھ کرمنل سہی۔'' درانی نے کہا۔ ''لیکن ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔ وہ ٹرانسپورٹر ہے اور طارق روڈ کی ایک مہنگی مارکیٹ کا مالک ہے۔ اس کی آڑ میں وہ تمام غیر قانونی کام کرتا ہے۔ ہم...''

''یار! یہ سب کچھ میں بھی جانتا ہوں۔'' میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ''اور کرائم رپورٹر کی حیثیت سے تم سے کچھ زیادہ ہی جانتا ہوں۔ میں نے پوچھا ہے کہ تم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہو؟''

''وقار!'' درانی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''عرفان میرا بھی دوست ہے۔ میں سرکاری حیثیت میں رہ کر تو فی الحال کچھ نہیں کر سکتا لیکن غیر سرکاری طور پر کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے؟''

''کے کے کو اٹھانا ہے۔'' میں نے یوں کہا جیسے کے کے راستہ بھٹکا ہوا کوئی بچہ ہو۔

''وھاٹ ڈو یو مین؟'' درانی نے کہا۔ ''تمہارا مطلب

ہے کہ...''

''ہاں میرا یہی مطلب ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں اس پر تمرڈ ڈگری استعمال کروں گا تو وہ سب کچھ اگل دے گا۔ دوسروں پر حکم چلانے والے بدمعاش اندر سے بہت کمزور ہوتے ہیں۔''

''تم جانتے ہو کہ اس کے بنگلے پر کتنے گارڈز ہوتے ہیں اور وہ باہر نکلتا ہے تو...''

''میں سب جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن وہ کسی ملک کا پرائم منسٹر یا پریذیڈنٹ نہیں ہے کہ اسے اٹھانا ناممکن نہ ہو۔ یوں تو کسی ملک کے سربراہ کو اٹھانا بھی ناممکن نہیں ہوتا، ہاں مشکل ضرور ہوتا ہے۔ ویسے تم اگر خوف زدہ ہو تو اس بات کو یہیں ختم کر دو، میں ان معاملات سے خود بھی نمٹ سکتا ہوں۔''

''میں خوف زدہ؟'' درانی نے برا مان کر کہا۔ ''یاد ہے کالج لائف میں ہم نے کے کے، کے بدمعاشوں کو سیدھا کر دیا تھا۔ ایک لڑائی میں تو میرے جسم پر...''

''چاقو کے گیارہ زخم آئے تھے۔'' میں نے ہنس کر اس کا جملہ پورا کر دیا۔

''ٹھیک ہے، پھر میں آج ہی اسے اٹھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔'' درانی نے کہا۔ ''زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا۔ میری جاب ہی جائے گی نا۔'' پھر اس نے سیل فون نکالا اور کسی سے رابطہ کرنے لگا۔ ''ہاں اسد! کہاں ہو؟... ہاں کام تو ہے لیکن اس وقت میں ایس پی کی حیثیت سے نہیں بلکہ احتشام درانی کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں۔ معاملہ بالکل غیر سرکاری ہے۔ تم ابھی پی سی آ جاؤ۔ میں یہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

''یہ اسد کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''قابلِ اعتماد آدمی تو ہے نا؟''

''یہ اے ایس پی ہے۔ جیکب آباد میں بھی میرے ساتھ تھا۔ ہم نے وہاں ڈاکوؤں کے خلاف کئی کامیاب آپریشن کیے ہیں۔ آدمی بہت جی دار ہے اور تم یوں سمجھو کہ جیسے تمہیں مجھ پر اعتماد ہے، اسی طرح مجھے اس پر اعتماد ہے۔ یہ مر جائے گا لیکن اپنی زبان نہیں کھولے گا۔''

میں نے سوچا جب تک اسد آئے، میں بھی اپنے انڈر ورلڈ رابطوں کو چیک کر لوں۔ انڈر ورلڈ میں کئی ایسے لوگ تھے جنہیں میں نے بچایا تھا۔ اصل میں ان معاملات میں ان کا قصور بھی نہیں تھا۔ وہ لوگ اس وقت سے میرے گویا مرید تھے۔ ان میں سے دو تو کے کے، کے آدمی تھے، بقیہ تین دوسرے گینگس سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے انہیں بھی شارٹ لسٹ کیا اور ان میں سے صرف جان محمد کا انتخاب کیا جو جانو کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے کھاتے میں بارہ مرڈر، ڈکیتی اور اغوا برائے تاوان کی ستائیس وارداتیں، اسلحے کی غیر قانونی اسمگلنگ کے کیسز تھے لیکن پولیس کے پاس اب تک اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ پولیس ایسے لوگوں کے خلاف ثبوت کیوں اکٹھے نہیں کرتی۔

میں نے درانی سے ہی سوال کیا تو وہ تلخی سے بولا۔ ''پاکستان کی پولیس دنیا کی کسی بھی پولیس سے ذہانت میں کم نہیں ہے لیکن جب پولیس کے اعلیٰ افسران کے گھروں پر بھاری رقوم کے بھتے پہنچ جائیں، تھانہ انچارجز کو ہر ہفتے خطیر رقم دی جائے تو پولیس کو اپنی آمدنی پر لات مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر پولیس ان لوگوں کے خلاف سیریس ایکشن لے تو دو دن کے اندر اندر یہ سب سلاخوں کے پیچھے نظر آئیں۔''

میں نے جانو سے کہا تھا کہ میں بعد میں کال کر کے اسے بلا لوں گا۔ میں درانی کی موجودگی میں اسے بلانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ درانی اور اسد کو دیکھ کر بدک جاتا اور یہی سمجھتا کہ میں اسے پھانسنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

تھوڑی دیر بعد اسد وہاں پہنچ گیا۔ وہ کسرتی جسم کا دراز قد اور وجیہہ نوجوان تھا۔ اس سے ہاتھ ملاتے وقت مجھے احساس ہوا کہ اس کے بازوؤں میں خاصی قوت ہے۔ وہ بہت پُرتپاک انداز میں مجھ سے ملا۔

درانی نے آہستہ آہستہ اسے بھی صورتِ حال سے آگاہ کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ کے کے کو آج ہی اٹھانا ہے۔

''او کے باس!'' اسد نے بہت خوش دلی سے کہا۔ ''میں اسے آج ہی اٹھالوں گا لیکن یہ تو بتائیں کہ اسے لانا کہاں ہے؟''

''یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم اپنی پلاننگ تو کر لو۔ تم فکر مت کرو وقار!'' درانی نے کہا۔ ''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی تھوڑی دیر بعد میری ایک ضروری میٹنگ ہے۔ میں آدھے گھنٹے بعد تم سے ملتا ہوں۔ اس وقت تک میں اور اسد کے کے کو اٹھانے کا کوئی پلان بھی بنا لیں گے۔''

ان کے رخصت ہونے کے بعد میں نے جانو کو کال کی اور اسے بھی پی سی بلا لیا۔ خلافِ توقع وہ دس منٹ سے بھی کم وقت میں وہاں پہنچ گیا۔

جانو کا تعلق لیاری کے علاقے سے تھا۔ اپنے رنگ روپ اور بالوں کی وجہ سے وہ نیگرو لگتا تھا۔ وہ اپنے اس رنگ اور حلیے سے فائدہ بھی اٹھاتا تھا۔ اس نے بہت روانی سے انگلش بولنا سیکھ لی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ سیدھا میرے پاس آیا اور بولا۔
''صاحب جی! آپ بہت زیادہ پریشان ہیں؟''
''جانو! مجھے تم سے بہت ضروری کام ہے۔''
''حکم کرو سر جی!'' جانو نے کہا۔ ''جانو احسان فراموش نہیں ہے۔''
''تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟'' میں نے اسے کریدا۔
''آپ بولو تو میں آپ کے لیے کسی کو گولی بھی مار سکتا ہوں۔'' جانو نے سنجیدگی سے کہا۔ ''کسی لڑکی کا چکر ہے تو اسے اٹھا بھی سکتا ہوں۔''
''تم مجھے اتنا گھٹیا مت سمجھو۔'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''کہ میں تم سے لڑکیاں اٹھواؤں گا۔''
''میرا یہ مطلب نہیں تھا صاحب!'' جانو نے کہا۔ ''میں نے تو صرف ایک مثال دی تھی۔'' اس کی آواز کچھ بلند ہوگئی۔
میں نے آہستہ سے کہا۔ ''تم آہستہ بولو اور انگلش میں بات کرو۔'' وہ میری بات سمجھ گیا۔ میں نے کچھ توقف کے بعد کہا کہ کسی کو اٹھانا تو ضرور ہے لیکن لڑکی کو نہیں بلکہ ایک خطرناک آدمی کو۔
''اس کا نام بتاؤ، میں ابھی ایک گھنٹے میں اسے آپ کے قدموں میں لاکر ڈال دوں گا۔'' میری ہدایت کے مطابق اس نے یہ جملہ آہستگی سے انگلش میں ادا کیا۔ اصل میں جانو کے طبقے کے لوگ بڑے ہوٹلوں میں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے میں نے اسے انگلش بولنے کی ہدایت کی تھی تاکہ وہاں کے ویٹر اور دوسرے لوگ اسے غیر ملکی سمجھیں۔
''کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اس آدمی کا نام سن کر ابھی تمہارے غبارے کی ہوا نکل جائے گی۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
''آپ نام بولو صاحب!'' جانو نے کہا۔ ''جانو پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہے۔''
''اس کا نام ہے کے کے!''
میری بات سن کر جانو بری طرح چونک اٹھا۔ ''کے کے... کریم خان؟'' اس نے پوچھا۔
''بس، سارے دعوے دھرے رہ گئے۔ کے کے کا نام ہی سن کر تمہارے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
''یہ بات نہیں ہے وقار صاحب!'' جانو نے کہا۔ ''میں یہ کام بھی کر دوں گا لیکن اس میں کچھ وقت لگے گا۔''
''اور وقت ہی تو میرے پاس نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔
''میں آج ہر صورت میں اسے اٹھانا چاہتا ہوں۔''
جانو نے کچھ دیر سوچا، پھر بولا۔ ''صاحب! اگر اجازت ہو تو میں اس کیس میں علی نواز کو بھی ساتھ لے لوں؟''
''علی نواز!'' میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''وہ تو کے کے کا خاص آدمی ہے۔''
''کے کے سے زیادہ وہ میرا آدمی ہے۔ دو دن پہلے ایک سلسلے میں کے کے نے اس کی بہت بے عزتی کی ہے، وہ بھی دوسرے لوگوں کے سامنے۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اب کے کے کے لیے کام نہیں کرے گا۔ وہ تو مجھ سے کہہ رہا تھا کہ مجھے اپنے باس سے ملوا دو مگر میں دو دن بہت مصروف تھا۔ آج میرا ارادہ تھا کہ اسے باس کے پاس لے جاؤں گا۔''
''میں نے سنا ہے کہ انڈر ورلڈ میں وفاداریاں تبدیل کرنے کی سزا موت ہے؟'' میں نے کہا۔
''آپ نے ٹھیک سنا ہے لیکن علی نواز تو خود موت کا ہرکارہ ہے۔ وہ کے کے، کے گینگ سے الگ ہو گیا تو اس کا سنبھلنا مشکل ہو جائے گا۔''
''تم اس پر کتنا اعتماد کرتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔
''خود سے بھی زیادہ وقار صاحب!'' جانو نے کہا۔ ''علی نواز میرے برے وقتوں کا ساتھی ہے۔ ہم نے ایک ساتھ فاقے بھی کیے ہیں اور جیلیں بھی کاٹی ہیں۔ وہ کے کے، کے گھر کے اندرونی حالات سے بھی واقف ہے اور وہ کس وقت باہر جاتا ہے، علی نواز یہ بھی جانتا ہے۔ آپ کہیں تو میں اسے بلا لوں؟''
''وہ اس کام کا کیا معاوضہ لے گا؟'' میں نے پوچھا۔
''وقار صاحب! آپ مجھے گالی تو مت دیں۔ میں آپ سے معاوضہ لوں گا؟ آپ نے مجھے ایسے کیسوں سے بچایا ہے جن میں مجھے کم از کم دس سال کی سزا تو لازمی ہوتی اور ہمیشہ یہ افسوس رہتا کہ میں نے بے گناہ جیل کاٹی ہے۔''
''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم علی نواز کو بلا لو۔''
میں اس وقت جلدی بازی میں فیصلے کر رہا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی فیصلہ میرے گلے بھی پڑ سکتا تھا اور عرفان کی فیملی کو نقصان بھی پہنچ سکتا تھا لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔
جان محمد نے سیل فون نکالا اور علی نواز سے بات کرنے لگا۔ پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''علی نواز آدھے گھنٹے میں یہاں پہنچ رہا ہے۔''
میں نے جان محمد کے لیے کافی منگوائی تھی۔ ہم کافی پی کر

فارغ ہوئے ہی تھے کہ درانی اور اسد آ گئے۔ وہ دونوں اس وقت سادہ لباس میں تھے۔
جانو شاید درانی کو جانتا تھا۔ وہ اسے دور سے دیکھ کر ہی چونک اٹھا اور بولا۔ ''وقار صاحب! اگر مجھے گرفتاری کرنا تھا تو یہ ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ خدا کی قسم آپ حکم کرتے تو میں خود۔ گرفتاری پیش کر دیتا۔ میں جانتا ہوں کہ اسلحے کی اسمگلنگ میں میرا نام ہے۔ آپ کہتے تو میں خود ہی ثبوت بھی فراہم کر دیتا ورنہ پولیس کی تو جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ جانو کو ہاتھ بھی لگائے۔''
''اپنی بکواس ہی کیے جاؤ گے یا میری بات بھی سنو گے؟'' میں نے کہا۔ ''درانی میرا دوست ہے اور وہ بھی غیر سرکاری طور پر اسی سلسلے میں میری مدد کر رہا ہے۔''
''معاف کرنا صاحب!'' جانو نے کہا۔ ''میں کچھ زیادہ ہی بول گیا۔''
اسی وقت درانی اور اسد وہاں پہنچ گئے۔ جانو کو دیکھ کر اسد اور درانی دونوں چونکے مگر انہوں نے اپنے چہروں کے تاثرات پر قابو پا لیا۔
میں نے جانو سے ان کا تعارف کرایا اور بتایا جانو اور اس کا ایک ساتھی علی نواز بھی اس کیس میں ہماری مدد کریں گے۔ ''ہاں تم بتاؤ تم نے کیا پلاننگ کی ہے؟'' میں نے درانی سے پوچھا۔
''کے کے کو ہم باہر ہی گھیر سکتے ہیں۔ اس کے گھر میں تو نہ صرف گارڈز کی ایک فوج ہے بلکہ انتہائی خوف ناک کتے بھی ہیں۔''
''یہ بات تو میں بھی جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اب کیا اس کے گھر سے نکلنے کا انتظار کرو گے؟''
''ہم انتظار نہیں کریں گے بلکہ اسے گھر سے نکالنا ہو گا۔'' اسد نے کہا۔
''تم اس کے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دو گے اور وہ بھاگا چلا آئے گا؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
''ہم اس کے گھر کے اردگرد دھماکے کریں گے۔ اس کے گارڈز صورت حال معلوم کرنے کے لیے باہر نکلیں گے۔ ہمارے پاس اس وقت پولیس کی جیپ ہو گی۔ میں ان سے کہوں گا کہ میں نے کسی آدمی کو بنگلے میں گھستے دیکھا ہے۔ میں اسے تلاش کرنا چاہتا ہوں۔''
''دھماکا سنتے ہی کے کے فوراً پولیس اسٹیشن کال کرے گا اور پولیس کی گاڑیاں چند منٹ میں اس کے گھر کے سامنے پہنچ جائیں گی۔'' میں نے کہا۔
''اس سے کیا فرق پڑے گا۔'' اسد نے کہا۔ ''پولیس والے مجھے شکل سے نہ سہی لیکن وردی سے پہچان جائیں گے، میں ان سے بھی یہی کہوں گا کہ میں نے یہاں سے گزرتے ہوئے دھماکے کی آواز سنی اور ایک آدمی کو اندر گھستے بھی دیکھا ہے۔ میں اسے تلاش کرنے جا رہا ہوں۔ زیادہ بھیڑ بھاڑ کی ضرورت نہیں ہے۔ تم لوگ واپس جاؤ۔ اسے تلاش کرنے کے لیے کے کے، کے گارڈز اور میں کافی ہوں۔''
''کے کے، اس بات پر کبھی یقین نہیں کرے گا کہ اس کے بنگلے میں کوئی گھسا ہے۔ اول تو وہاں گھسنے کا کوئی راستہ ہی نہیں ہے اور کوئی جان پر کھیل کر گھس بھی گیا تو اس کے کتے لمحوں میں اس کی نکا بوٹی کر دیں گے۔'' جانو نے کہا۔
اس وقت علی نواز بھی پہنچ گیا۔ وہ چالیس بیالیس سال کا درمیانے قد اور مضبوط جسامت کا آدمی تھا۔ اس کی رنگت گندمی تھی۔ اس کے چہرے سے بالکل اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کسی جرائم پیشہ گینگ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے بہترین تراش کا شلوار سوٹ اور قیمتی واسکٹ پہن رکھی تھی۔ پیروں میں بہت قیمتی اور جدید سینڈل تھے اور وہ اپنی چال ڈھال سے کوئی خوش حال بزنس مین یا زمیندار لگ رہا تھا۔
درانی کو دیکھ کر وہ بھی چونکا لیکن جانو نے فوراً اس کا شبہ رفع کر دیا۔ پھر اس نے ہمارا تعارف کرانا چاہا تو علی نواز نے کہا۔ ''میں وقار صاحب اور ایس پی صاحب کو تو جانتا ہوں۔ یہ تیسرے صاحب میرے لیے اجنبی ہیں۔''
''یہ اے ایس پی اسد صاحب ہیں۔'' جانو نے کہا۔ ''یہ بہترین کمانڈو ہیں۔'' پھر اس نے تفصیل سے علی نواز کو بتایا کہ ہم یہاں کیوں اکٹھے ہوئے ہیں۔
جانو کی بات سن کر علی نواز مسکرایا۔ ''بس اتنی سی بات! کے کے کو اٹھانا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ میں اس کے بنگلے میں آزادی سے جا سکتا ہوں۔ اس کے سب گارڈز مجھے پہچانتے ہیں۔ البتہ کتوں کا مسئلہ ہو گا۔'' وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ ''میرے پاس اس کا حل بھی ہے۔ اس نے گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''ابھی کے کے سونے کے لیے نہیں گیا ہو گا۔''
اس نے جیب سے سیل فون نکالا تو میں نے پوچھا۔ ''کسے کال کر رہے ہو علی نواز! اب مزید اس کیس میں کسی کو شامل مت کرنا۔''
''آپ فکر مت کریں صاحب!'' علی نواز نے کہا۔ ''جو لوگ آپ نے یہاں بلائے ہیں وہ بھی زیادہ ہیں۔ یہ کام تو صرف میں اور جانو بھی کر سکتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے سیل فون

پر نمبر ملایا اور بولا۔ ”السلام علیکم باس!... اس وقت میں نے بہت خاص کام سے ٹیلی فون کیا ہے باس! میں نے اس ماڈل گرل کو اٹھالیا ہے... وہی کریم کے اشتہار والی... جی ہاں وہی۔“

وہ خاموش ہو کر دوسری طرف کی بات سنتا رہا۔

پھر بولا۔ ”لیکن باس وہ پیسے بہت زیادہ مانگ رہی ہے... اچھا ٹھیک ہے لیکن اس کی ایک شرط اور بھی ہے... وہ آپ کے بنگلے پر نہیں آنا چاہتی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا لیکن وہ مانتی ہی نہیں۔ آپ کہیں تو میں اسے زبردستی اٹھا لاؤں؟... ہاں یہ تو ہے، زبردستی میں سارا مزہ غارت ہو جاتا ہے... اس کا بنگلہ ڈیفنس میں ہے باس... آج ہی... بلکہ ابھی باس، علی نواز کچا کام نہیں کرتا۔ میں نے اسے کچھ رقم ایڈوانس بھی دے دی تھی۔ میں جانتا تھا کہ جو چیز آپ کو پسند آجائے، آپ اسے حاصل ضرور کرتے ہیں... اسے تیار ہونے میں کم سے کم آدھا گھنٹا تو لگے گا... میں خود آپ کو لینے آجاؤں گا باس!“ پھر شاید دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ علی نواز نے اپنا سیل فون جیب میں رکھ لیا۔

”یہ تو بہت آسانی سے راضی ہو گیا۔“ اسد نے کہا۔

”اب یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔“ علی نواز نے کہا۔ ”اس کے ساتھ گارڈز کی ایک ڈبل کیبن ڈاٹسن بھی ہوتی ہے۔ اس کا ڈرائیور بھی گارڈ ہے اور اس کے ساتھ گاڑی میں ایک گن مین بھی ہوتا ہے۔ گن مین کو تو میں روک دوں گا کیونکہ گاڑی میں اتنی جگہ نہیں ہوتی ہے۔ کے کے گاڑی کی پچھلی نشست پر اکیلا ہی بیٹھتا ہے یا پھر کوئی لڑکی ساتھ ہو تو اور بات ہے۔ اب آپ لوگ یہ سوچو کہ ڈیفنس کے کس بنگلے میں اسے لے جائیں گے اور اس کے گارڈز کی گاڑی کو روکنا بھی آپ لوگوں کی ذمے داری ہے۔ انہیں اس طرح روکنا ہے کہ کے کے کو معلوم نہ ہو ورنہ وہ اپنا پروگرام کینسل کر کے واپس چلا جائے گا۔“

”گارڈز کو روکنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ اسد نے کہا۔ ”اب سوچنا یہ ہے کہ کے کے کو ڈیفنس کے کس بنگلے میں لے جانا چاہیے؟“

”جو کچھ سوچنا ہے، جلدی سوچیں۔“ علی نواز نے کہا۔ ”وہ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد مجھے کال کرے گا۔“

”ہم اسے ڈیفنس لے کر ہی نہیں جائیں گے۔“ درانی نے کہا۔ ”اسد اس کے گارڈز کی گاڑی کو روکے گا۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں کے کے کی گاڑی کو رکنے کا اشارہ کروں گا۔ میرے ساتھ وقار بھی ہوگا۔ بس پھر کے کے پر قابو پانا مشکل نہیں ہوگا۔“

”آئیڈیا تو اچھا ہے۔“ علی نواز نے کہا۔ ”لیکن اس میں رسک ہے۔ خطرہ بھانپتے ہی اس کا ڈرائیور فائرنگ شروع کر دے گا۔ کے کے خود بھی بہت زبردست فائٹر اور نشانے باز ہے۔ وہ بھی فائرنگ کر سکتا ہے۔ اس کی گاڑی چلتا پھرتا اسلحہ خانہ ہے۔“

”یہ رسک تو ہمیں لینا ہی پڑے گا۔“ اسد نے کہا۔

”آپ لوگ مجھے بھول رہے ہیں۔“ جانو نے کہا۔ ”میں اسد صاحب کے ساتھ رہوں یا درانی صاحب کے ساتھ؟“

”تم اسد کے ساتھ رہنا۔“ میں نے کہا۔ ”کے کے، کے ساتھ دوسری گاڑی میں چھ گارڈز ہوتے ہیں۔ انہیں اکیلا اسد تو نہیں روک سکے گا۔“

”پھر یہ پروگرام فائنل ہے؟“ علی نواز نے کہا۔ ”اگر کچھ تیاری کرنا ہو تو کر لیں، ابھی ہمارے پاس پندرہ منٹ ہیں۔“

”ہماری تیاری مکمل ہے۔“ درانی نے کہا۔ ”رائفل اور دوسرے ہتھیار تو وقار بھی چلا سکتا ہے۔ میری گاڑی میں بھی خاصے ہتھیار موجود ہیں۔“

”میں بھی تیار ہوں۔“ اسد نے کہا۔ ”میرے پاس ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ اسموک بم بھی ہیں۔ ہم اسموک بم مار کے گارڈز کا راستہ مسدود کر سکتے ہیں۔“

☆☆☆

رات خنک اور تاریک تھی۔ درانی اور اسد کی گاڑیاں کے کے، کے بنگلے سے مناسب فاصلے پر کھڑی تھیں۔ علی نواز بنگلے میں جا چکا تھا۔ اندر سے کتوں کی غراہٹ اور بھونکنے کی آوازیں وہاں تک آرہی تھیں۔ بنگلے کے گیٹ پر بھی دو مستعد گارڈز تھے اور ایک معروف سیکیورٹی ایجنسی کا مونوگرام بھی نظر آرہا تھا کیونکہ بنگلے کے گیٹ پر روشنی ہو رہی تھی۔

پانچ منٹ بعد بنگلے کا گیٹ کھلا اور جدید ماڈل کی مرسیڈیز برآمد ہوئی۔ پسنجر سیٹ پر علی نواز بیٹھا تھا۔ اس کی اطلاع کے عین مطابق عقبی نشست پر صرف کے کے ہو سکتا تھا کیونکہ گیٹ پر ہونے والی روشنی میں مجھے عقبی نشست پر ایک ہی آدمی دکھائی دیا تھا۔

گاڑی کے پیچھے پیچھے ڈاٹسن کی ایک ڈبل کیبن پک اپ بھی تھی۔ اس میں چھ گارڈز موجود تھے۔

گاڑیاں ہمارے سامنے سے گزریں تو ہماری گاڑیاں بھی حرکت میں آگئیں۔ درانی نے اسد کو آن لائن رہنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ اس کا سیل فون آن تھا اور ہمیں سب کچھ سنائی دے رہا تھا۔ درانی کا سیل فون میرے ہاتھ میں تھا۔ اس کا اسپیکر فون آن تھا۔

”ہم مرسیڈیز کو اوورٹیک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ درانی نے کہا۔ ”تم گارڈز کی گاڑی کو کسی مناسب جگہ پر روک لو۔“

”او کے باس!“ اسد نے کہا۔

درانی نے اسپیڈ بڑھائی۔ اس کی ہارڈ ٹاپ جیپ کا انجن بہت طاقتور تھا۔ یوں بھی مرسیڈیز بہت زیادہ رفتار سے نہیں جا رہی تھی۔ جلد ہی درانی نے اسے اوورٹیک کر لیا۔

میری نظریں مسلسل پیچھے کی طرف تھیں۔ مرسیڈیز کے پیچھے پیچھے ابھی تک گارڈز کی گاڑی بھی آرہی تھی۔

اچانک میں نے اسد کی جیپ کو دیکھا۔ اس نے بہت مہارت سے گارڈز کی گاڑی کو اوورٹیک کیا تھا اور اب وہ مرسیڈیز اور گارڈز کی گاڑی کے درمیان آگئی تھی۔

پھر دو کلومیٹر تک ہماری گاڑیاں اسی طرح چلتی رہیں۔ خیابانِ حافظ پر پہنچ کر ٹریفک نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔

اچانک اسد نے ایمرجنسی میں بریک لگا دیے۔ نتیجے کے طور پر اس کے پیچھے آنے والی گارڈز کی ڈبل ویگن پک اپ اس کی جیپ سے ٹکرا گئی۔

میں نے اسد کو بھنا کر گاڑی سے اترتے دیکھا۔ دھماکے کی آواز سن کر مرسیڈیز کے ڈرائیور نے بھی گاڑی کی رفتار کم کر کے اسے سڑک کے کنارے روک دیا۔

درانی نے رانگ سائیڈ سے یوٹرن لیا اور بہت تیزی سے مرسیڈیز کے پاس پہنچ گیا۔ اسد اور گارڈز میں ابھی تک تلخ کلامی جاری تھی۔ کے کے فکرمندی سے پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ ان کی گاڑی ایک لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑی تھی اس لیے مجھے اس میں بیٹھے ہوئے افراد صاف نظر آرہے تھے۔

درانی جیپ سے اتر کر اسد کی طرف بڑھا اور تحکمانہ انداز میں بولا۔ ”کیا پرابلم ہے آفیسر؟“

”سر! انہوں نے اچانک ہی بریک لگا دیے تھے۔“ گارڈز میں سے ایک بولا۔ اس کے شانے پر کلاشنکوف لٹک رہی تھی۔

”بریک تو تمہاری گاڑی میں بھی ہوں گے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”پھر تم اتنا فاصلہ رکھ کر ڈرائیونگ کیا کرو کہ گاڑی پر کنٹرول رکھ سکو۔ اور تم الٹا پولیس کے ایک افسر کو دھمکیاں دے رہے ہو؟“

”سر! میں نے صرف یہ کہا ہے کہ میں کے کے صاحب کا گارڈ ہوں۔ وہ آگے مرسیڈیز میں جا رہے ہیں۔ مجھے روکنے کی کوشش کرو گے تو نقصان میں رہو گے۔“

”کہاں ہیں کے کے صاحب؟“ میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر واقعی تمہاری بات سچ ہے تو میں خود ان سے معافی مانگ لوں گا۔“

”وہ آگے کچھ فاصلے پر جو مرسیڈیز کھڑی ہے، کے کے صاحب اس میں ہیں۔“ گارڈ نے جواب دیا۔

”تم ان لوگوں کو روکے رکھو آفیسر!“ درانی نے اسد کو حکم دیا۔ ”میں کے کے صاحب سے بات کرتا ہوں۔ اگر یہ لوگ واقعی ان کے گارڈز ہیں تو انہیں چھوڑ دینا۔ غلط بیانی کی صورت میں ان سب کو گرفتار کر لینا۔“ یہ کہہ کر وہ مرسیڈیز کی طرف بڑھ گیا۔

اس وقت تک مرسیڈیز سے علی نواز اتر چکا تھا۔ شاید وہ کے کے ہی کے کہنے پر اترا تھا اور اب صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے ہماری طرف آرہا تھا۔

”کیا بات ہے ایس پی صاحب؟“ علی نواز نے ناگواری سے پوچھا۔ ”آپ نے ہمارے گارڈز کو کیوں روکا ہے؟“

”میں صرف کے کے صاحب سے بات کروں گا۔“ درانی نے کہا۔ ”کیا وہ گاڑی میں موجود ہیں؟“

”وہ اگر موجود نہ ہوتے تو ان کے گارڈز یہاں تفریحاً گشت نہ کرتے پھرتے۔“ نواز نے کہا۔ ہم دونوں مرسیڈیز کی طرف بڑھ گئے۔

درانی کو دیکھ کر کے کے نے اپنی جانب کا شیشہ نیچے اتار لیا تھا۔ وہ باوقار انداز میں بولا۔ ”کیا بات ہے کپتان صاحب، اب تم جیسے چھوٹے موٹے پولیس افسر بھی مجھ سے یعنی کے کے سے پوچھ گچھ کریں گے؟“

”زحمت کی معذرت چاہتا ہوں سر!“ درانی نے ادب سے کہا۔ ”لیکن آپ کے گارڈز نے پولیس کی ایک جیپ کو پشت سے ہٹ کر دیا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ آپ کے گارڈز ہیں۔ میں صرف یہی تصدیق کرنے آیا تھا کہ وہ واقعی آپ کے گارڈز ہیں یا نہیں؟“

”وہ میرے ہی گارڈز ہیں۔“ کے کے نے نخوت سے کہا۔ ”ہاں، تمہارا کتنا نقصان ہوا ہے؟“

”نقصان تو حکومت کا ہوا ہے سر!“ درانی نے کہا۔

یہ کہتے ہوئے میں نے کن انکھیوں سے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک بار بھی ہماری بات چیت میں مداخلت نہیں کی تھی۔ البتہ وہ بہت مستعد بیٹھا تھا۔

”پھر بھی پولیس کا جتنا نقصان ہوا ہے مجھے بل بھجوا دینا یا اپنی گاڑی کو میری ورکشاپ میں بھجوا دینا۔ اور اب مجھے دیر ہو رہی ہے اس لیے میرا راستہ چھوڑ دو۔“

”اسی وقت اچانک میں ڈرائیور کی طرف گیا اور جھٹکے

سے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول لیا۔ ڈرائیور نے چونک کر مجھے دیکھا لیکن اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی میں نے اس کی کنپٹی پر زوردار گھونسا رسید کر دیا۔

اسی وقت درانی بھی ایکشن میں آ گیا۔ اس نے جھکے جھکے کے کے کی کھوپڑی سہلا دی۔

مرسیڈیز اور گارڈز کی گاڑی کے بیچ میں پولیس کی جیپ حائل تھی۔ پھر وہ لوگ بھی مطمئن ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئے تھے کہ ابھی دونوں پولیس والے معافی مانگ کر انہیں جانے کی اجازت دے دیں گے۔ اس لیے وہ یہ تماشا نہیں دیکھ سکے یا انہوں نے دیکھا بھی ہوگا تو ان کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا۔

میں نے ڈرائیور کو پیچھے کی طرف دھکیلا اور پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ علی نواز بھی مرسیڈیز کی عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ درانی متوازن چال سے اپنی جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے جھٹکے سے مرسیڈیز آگے بڑھائی اور اسے طوفانی رفتار سے اڑانے لگا۔ میں نے دیکھا، اسد نے گارڈز کی گاڑی کا راستہ بھی چھوڑ دیا تھا۔

میں نے آگے جا کر گاڑی کو اچانک دائیں طرف ٹرن کر لیا اور مختلف اسٹریٹس سے ہوتا ہوا سلطان مسجد کے نزدیک آ نکلا۔ گارڈز کی گاڑی کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

میں نے علی نواز سے کہا۔ ”ذرا ڈرائیور اور صاحب کی ایک مرتبہ پھر خاطر کر دو۔ یہ ہوش میں آنے والے ہوں گے۔“

”آپ فکر مت کریں۔“ علی نواز نے کہا۔ ”میں ان کا ابھی بندوبست کیے دیتا ہوں۔“ پھر اس نے ڈرائیور کے گلے میں پڑا ہوا مفلر نکال کر اس کے دو حصے کیے اور انہیں ڈرائیور اور کے کے کی آنکھوں پر مضبوطی سے باندھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ان دونوں کی کھوپڑی ایک مرتبہ پھر بچے تلے انداز میں سہلا دی۔

”اب گاڑی کو نارتھ کراچی کی طرف لے چلیں۔“ علی نواز نے کہا۔ ”وہاں میرا ایک مخصوص ٹھکانا ہے جس سے کوئی واقف نہیں ہے۔“

”نہیں، اسد اور درانی سے گلشن اقبال کی بات ہوئی تھی۔ وہ اس بنگلے پر ہمارا انتظار کریں گے۔ وہ بنگلہ بھی ہر طرح سے محفوظ ہے۔“

”تو پھر وہیں چلیں۔“

میں گاڑی طوفانی رفتار سے دوڑاتا ہوا گلشن اقبال پہنچا۔ اسد اور درانی ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ میں نے اتر کر بنگلے کا گیٹ کھولا اور مرسیڈیز کو سیدھا گیراج میں لے گیا۔

ہم گاڑی سے اترے ہی تھے کہ اسد اور درانی بھی پہنچ گئے۔

ان کی مدد سے میں نے کے کے اور ڈرائیور کو الگ الگ بیڈ رومز میں منتقل کر دیا لیکن اس سے پہلے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔

اسد اور درانی دونوں ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ علی نواز فوری طور پر کے کے، کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بھی ڈرائنگ روم میں بھیج دیا۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد کے کے کو ہوش آ گیا۔ وہ خاصا باوقار شخص تھا۔ آواز میں بھی تحکم تھا اور انداز میں بھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے پہلے اردگرد کا جائزہ لیا۔ پھر بے اختیار اٹھنے کی کوشش کی لیکن ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔

پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی، وہ شاید مجھے پہچانتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولا۔ ”تم!... یہ حرکت تمہاری ہے؟ شاید تم اپنی زندگی سے بے زار ہو گئے ہو؟“

”ہاں، میں اپنی زندگی سے بے زار ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بتاؤ اس وقت انڈیا اور پاکستان کا جو میچ ہو رہا ہے اس میں تمہارا کتنا سرمایہ انوالو ہے؟“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ”اچھا، اب میں سمجھا۔“ وہ سنبھل کر بولا۔ ”شاید تم نے پاکستان پر بھاری رقم لگا دی ہے اور اب ٹیم کی کارکردگی کی وجہ سے پریشان ہو۔ کتنی رقم لگائی ہے تم نے؟“

”میری رقم کو چھوڑو۔“ میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”تم اپنی رقم کی فکر کرو۔“

”ارے یار! اس کھیل میں فائدہ اور نقصان تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ جب نقصان برداشت نہیں کر سکتے ہو تو بیٹ لگاتے ہی کیوں ہو؟ تم نے شاید چند لاکھ لگائے ہوں گے یا چند ہزار، میرا تو کروڑوں کا نقصان ہو جائے گا۔“

”اگر پاکستان جیت گیا تو؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”تم نے کیا پہلی دفعہ بیٹ لگائی ہے؟“ وہ آہنی اعصاب کا مالک تھا۔ اس حالت میں ہونے کے باوجود وہ مجھ سے اس لہجے میں بات کر رہا تھا جیسے کسی بچے سے ہم کلام ہے۔

”ہاں، کچھ لوگوں کے کہنے میں آ کر میں نے پہلی دفعہ یہ غلطی کی ہے اور پاکستان پر دس لاکھ روپے لگائے ہیں۔“

”تب تو پھر تم اپنے ان دس لاکھ کو بھول جاؤ۔ جانتے ہو میرا کتنا نقصان ہوگا، پورے ڈیڑھ سو کروڑ روپے یعنی ڈیڑھ ارب روپے کا؟ میرا فیورٹ بھی پاکستان تھا۔“

”تم تو اپنا نقصان دوسری طرح سے پورا کر لو گے۔ تم

نے تو انڈیا پر بھی بیٹ لگائی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

وہ یوں ہنسا جیسے کسی بچے نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ ”تم تو بالکل ہی احمق ہو، کچھ جانتے ہی نہیں ہو۔ بڑی بڑی پارٹیز کسی ایک ٹیم پر بیٹ لگاتی ہیں؟ ان کے بکی صرف اسی ٹیم کے لیے لوگوں کو ترغیب دیتے ہیں۔ کچھ بکی ایسے بھی ہوتے ہیں جو دونوں طرف کے لیے کام کرتے ہیں لیکن میں ایسے بکی بالکل برداشت نہیں کرتا۔ ویسے تم فکر مت کرو۔ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ تم واحد رپورٹر ہو جس نے آج تک کسی بھی معاملے میں مجھے بلیک میل نہیں کیا ہے۔ اپنے نقصان کے باوجود میں تمہارے دس لاکھ واپس کر دوں گا۔“

”یہ تو تم ابھی کہہ رہے ہو۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یہاں سے باہر جاتے ہی تم نہ صرف اپنے الفاظ سے پھر جاؤ گے بلکہ مجھے مارنے کے لیے کسی پیشہ ور قاتل کو بھی پیچھے لگا دو گے۔“

”کریم خان اپنے الفاظ کا دھنی ہے بچے!“ اس نے پُرغرور انداز میں کہا۔ ”میں زبانی کروڑوں روپے کے سودے کرتا ہوں۔ ہمارے پیشے میں بے ایمانی بھی نہایت ایمان داری سے کی جاتی ہے۔ تم نے جذبات میں آ کر یہ حرکت کر ڈالی ہے، میں تمہیں معاف کر دوں گا اور کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کرے گا۔“

”زیادہ بڑی بڑی اور اصولوں کی باتیں مت کرو کے کے!“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تم لوگ تو شرطیں لگانے کے بعد میچ بھی فکس کرا دیتے ہو۔ پلیئرز کو بڑی بڑی رقموں کی آفر کرتے ہو، وہ اگر نہ مانیں تو دھونس، دھاندلی اور دھمکی کے ذریعے انہیں مجبور کرتے ہو۔ انتہا تو یہ ہے کہ ان کے گھر والوں تک کو نہیں بخشتے، انہیں بھی اغوا کرا لیتے ہو۔“

”میں میچ فکسنگ ضرور کرتا ہوں۔“ کے کے نے تحمل سے کہا۔ ”کھلاڑیوں کو خریدتا بھی ہوں لیکن کسی بھی دھونس، دھاندلی اور دھمکی کے ذریعے نہیں بلکہ صرف پیسے کے ذریعے۔ میچ فکسنگ کے بے شمار طریقے ہیں برخوردار۔ ٹیم کے منیجر، کوچ، اچھے کھلاڑیوں اور امپائرنگ کو خریدا جاتا ہے۔ ان میں سے بیشتر لوگ بک جاتے ہیں۔ ہاں پاکستان اور انڈیا کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس سلسلے میں صرف امپائرز ہی خریدے جا سکتے ہیں۔ کھلاڑی اور ٹیم سے متعلق کوئی بھی فرد مشکل ہی سے میچ ہارنے پر راضی ہوتا ہے۔“

”تو تم نے امپائرز کو خریدا ہے؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”سچ پوچھو تو میں نے اس دفعہ میچ فکسنگ کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ ہماری ٹیم بہترین فارم میں ہے۔ اس کے لیے کسی کو خریدنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اس لیے اس کا بھاؤ بھی کم تھا۔ جیتنے کی صورت میں مجھے اتنا فائدہ نہیں ہوتا جتنا ہارنے کی صورت میں نقصان ہوگا۔“

میں عجیب کشمکش کا شکار ہو گیا۔ اگر کے کے سچ بول رہا تھا تو عرفان کی نیلی کے اغوا سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ پھر... پھر یہ کام کون کر سکتا تھا؟

”تم کس سوچ میں پڑ گئے؟“ کے کے یہ غور میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”معاملہ وہ نہیں ہے جو تم مجھے بتا رہے ہو۔ بات کچھ اور ہے۔ دس لاکھ کی رقم بہت ہوتی ہے لیکن تم جیسے آدمی کے لیے یہ اتنا بڑا نقصان نہیں ہے۔ تمہارا باپ کروڑپتی بزنس مین ہے۔ تم دس لاکھ کے لیے اتنے پاپڑ نہیں بیل سکتے بلکہ مجھے تو شبہ ہے کہ تم نے پیسے لگائے بھی ہیں یا نہیں۔ اگر لگائے ہیں تو مجھے اس بکی کا نام بتاؤ۔ ابھی معلوم ہو جائے گا۔“

”میں نے ناظر کے ذریعے رقم لگائی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں، ناظر میرا بکی ہے۔“ کے کے نے سوچ کر کہا۔ ”لیکن میرا خیال ہے کہ معاملہ رقم کا نہیں ہے۔ تم نے ایک پلاننگ کے تحت مجھے اغوا کیا ہے اور علی نواز بھی آستین کا سانپ ثابت ہوا۔ میں اس پر اندھا اعتماد کرتا تھا۔ اب میں کم سے کم اسے تو نہیں چھوڑوں گا۔“

”تم یہاں سے نکلو گے تو کسی کو چھوڑو یا پکڑو گے۔“ میں نے اسے دھمکی دینے کی خاطر کہا۔

”مجھے کون روکے گا؟“ اس نے تلخ لہجے میں پوچھا۔ ”تم یا وہ دو ٹکے کے پولیس آفیسرز جنہوں نے تمہارے ساتھ مل کر یہ ڈراما اسٹیج کیا تھا۔ میں اگر اب تک قانون سے بچا ہوا ہوں تو یہ سب یونہی نہیں ہے برخوردار! اس کے لیے بہت زیادہ عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے تم یہاں کتنی دیر روک سکو گے؟ زیادہ سے زیادہ چوبیس گھنٹے۔ میری گمشدگی کا علم ہوتے ہی میرے آدمی پورے شہر کو بلے کا ڈھیر بنا دیں گے۔ یہ کوئی فلمی ڈائیلاگ نہیں ہے بلکہ حقیقت میں ایسا ہی ہوگا اور میں جانتا ہوں تم ایسا نہیں چاہو گے۔“

”اس سے بھی تمہارے آدمیوں کو فائدہ کیا ہوگا؟“ میں نے کہا۔ ”میں تمہیں چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا ہوں۔“

”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔ کریم خان کو موت سے دھمکا رہے ہو؟“ اس کے لہجے میں پھر نخوت آ گئی۔ ”مجھے اگر موت کا خوف ہوتا تو میں آج کے کے نہیں ہوتا بلکہ کسی سیٹھ کے بنگلے پر چوکیداری کر رہا ہوتا یا پھر فروٹ منڈی میں آڑھتی کا کام

کرتا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے کہ تم محض دس لاکھ روپے کی خاطر یہ کام کررہے ہو، صرف دس لاکھ روپے کے لیے؟''

''بات دس لاکھ کی نہیں ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''بلکہ ایک پورے خاندان کی زندگی کی ہے۔''

میری بات سن کر وہ بری طرح چونک اٹھا۔ ''کس خاندان کی بات کررہے ہو تم؟'' کے کے نے پوچھا۔ ''اور اس بیٹ میں کوئی خاندان کیسے انوالو ہوگیا؟''

مجھے اس کی باتوں سے اب تک اندازہ ہوگیا تھا کہ عرفان کے خاندان کے اغوا میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ وہ کھرا آدمی تھا اور اپنے لب و لہجے سے بھی سچا اور کھرا لگ رہا تھا۔ کرائم رپورٹر اور پوسٹیکل انویسٹی گیٹر کی حیثیت سے میں بے شمار لوگوں سے مل چکا تھا۔ مجھے کسی حد تک لوگوں کے چہرے پڑھنے اور ان کے لہجے پرکھنے کی سمجھ بوجھ بھی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ جرائم پیشہ ضرور تھا لیکن نہ جانے کیوں اس پر اعتماد کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔

''تم کیا سوچنے لگے؟'' اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ''تم نے بتایا نہیں کہ کس کے خاندان کی زندگی کو خطرہ ہے؟''

میں نے طویل سانس لیا اور بولا۔ ''میں آپ پر کس حد تک اعتماد کرسکتا ہوں؟''

''کسی حد تک بھی نہیں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''بات اگر میری ساکھ اور مفاد کے خلاف ہوئی تو تم مجھ سے کسی اعتماد کی توقع مت رکھو۔''

''بات آپ کے فائدے ہی کی ہے۔'' میں نے پہلی دفعہ اسے ''آپ'' کہہ کر مخاطب کیا۔

''تو پھر تم مجھ پر آنکھیں بند کرکے اعتماد کرسکتے ہو۔ کریم خان اپنی بات کا دھنی ہے۔''

میں نے اسے سب کچھ سچ سچ بتانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس سلسلے میں وہی میری مدد کرسکتا تھا۔ پھر میں نے اسے تفصیل سے سب کچھ بتادیا۔

''یہ کام جونی کا ہوسکتا ہے۔ وہ خود بھی کسی دوسرے کا آلۂ کار ہے۔ اس کی آڑ میں یہ کام کوئی اور ہی کرتا ہے۔ میں اس شخص کا پتا بھی لگا لیتا لیکن میرے اپنے ہی بکھیڑے کیا کم ہیں۔ خیر، میں دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہوں۔''

میں نے اس کے ہاتھ پاؤں کھولے تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ''اس علی نواز کی اتنی جرأت کہ وہ مجھ پر ہاتھ اٹھائے۔''

''کے کے صاحب! آپ سے ایک ریکوئسٹ اور بھی ہے۔ علی نواز سے جو غلطی ہوئی ہے اس کی معافی میں آپ سے مانگتا ہوں۔ پلیز! اسے اور ان دونوں پولیس افسروں کو بھی معاف کردیں۔ یہ سب کچھ انہوں نے میرے کہنے پر ہی کیا ہے۔ اصل میں میرا ذہن بالکل مفلوج ہوکر رہ گیا تھا۔ مجھے اس صورتِ حال میں کچھ بھائی نہیں دیا۔''

''ویسے تم خاصے جی دار نوجوان ہو۔'' اس نے توصیفی انداز میں کہا۔ ''تم صرف قلم ہی کے نہیں عملی میدان کے بھی دھنی ہو۔ میں علی نواز کو معاف کردوں گا لیکن اس سے کہنا کہ آئندہ مجھے اس کی شکل نظر نہ آئے ورنہ دنیا کی کوئی طاقت اسے مجھ سے نہیں بچا سکے گی۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''جہاں تک ان پولیس افسروں کا سوال ہے، انہیں میں قصوروار نہیں سمجھتا۔ ویسے میرا اندازہ ہے کہ وہ دونوں پولیس افسر اور آستین کا وہ سانپ علی نواز یہاں موجود ہیں۔ علی نواز سے کہو کہ یہاں سے دفع ہوجائے۔ ممکن ہے اس کی شکل دیکھ کر میں اپنے وعدے پر قائم نہ رہ سکوں۔''

''آپ اس کمرے میں آرام کریں۔'' میں نے کہا۔ ''میں علی نواز کو یہاں سے رخصت کرکے آتا ہوں۔''

میں جانے لگا تو کے کے نے کہا۔ ''تم واقعی سچے اور کھرے آدمی ہو۔ صرف میرے الفاظ پر بھروسا کرکے نہ صرف مجھے آزاد کردیا بلکہ یوں چھوڑ کر بھی جارہے ہو۔''

''کے کے صاحب! میں نے بھی کافی عرصے بھانت بھانت کے لوگوں کو پرکھنے میں گزارا ہے۔ مجھے آپ کے لہجے میں سچائی محسوس ہوئی تو میں نے آپ پر اعتماد کرلیا۔ کبھی کبھی انسان اپنے اندازوں سے مار بھی کھا جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس وقت بھی سچے ہوں گے کیونکہ میں نے یا کسی نے بھی آپ کی تلاشی نہیں لی تھی لیکن مجھے اس کے ساتھ ہی یہ بھی یقین ہے کہ آپ بھی سچے اور کھرے آدمی ہیں۔'' یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

کے کے جرائم کی دنیا کا بادشاہ تھا۔ اس کی نظروں میں قانون ایک کھلونا تھا اور قانون نافذ کرنے والے اس کے تنخواہ دار تھے۔ اسے یوں کھلا چھوڑ کر میں نے بہت بڑا رسک لیا تھا لیکن میرا یہ رسک ہی میرے کام آیا۔ وہ مجھ سے مزید متاثر ہوگیا۔

''کیا رہا؟'' مجھے دیکھتے ہی درانی نے پوچھا۔

''بازی پلٹ گئی یار!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''کے کے اس میں انوالو نہیں ہے۔'' پھر میں نے ان لوگوں کو تفصیل سے اپنی اور کے کے کی گفتگو کا ایک ایک لفظ بتادیا۔

''میرا خیال ہے کہ اب واقعی مجھے چلنا چاہیے۔'' علی نواز نے کہا۔ ''یا پھر آپ مجھے اجازت دیں تو میں صرف ایک گولی اس کے بھیجے میں اتار دوں؟''

''اس کی اجازت تو میں تمہیں نہیں دے سکتا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم اس سے بعد میں اپنا حساب بے باق کر لینا۔ فی الحال تو اس نے تمہاری زندگی کی ضمانت دے دی ہے۔''

علی نواز کچھ دیر پُرخیال انداز میں مجھے دیکھتا رہا پھر جانو سے بولا۔ ''جانو! میں ابھی تو جارہا ہوں لیکن مجھے امید ہے کہ آئندہ اگر مجھے تیری ضرورت پڑی تو تو پیٹھ نہیں دکھائے گا۔''

''جانو یاروں کا یار ہے علی نواز!'' جانو نے کہا۔ ''تیرے لیے تو جان بھی حاضر ہے بلکہ میں بھی تیرے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ کے کے کو ابھی تک میرے بارے میں علم نہیں ہے۔ وہ مجھے یہاں دیکھ کر بھڑک بھی سکتا ہے۔'' پھر جانو نے مجھ سے بہت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا، اسد اور درانی سے ملا اور بولا۔ ''وقار صاحب! اگر آئندہ بھی کبھی مجھ ناچیز کی ضرورت پڑے تو میں حاضر ہوجاؤں گا۔''

وہ دونوں وہاں سے رخصت ہوگئے تو میں کے کے کے پاس گیا اور اس سے کہا۔ ''اب آپ میرے ساتھ ڈرائنگ روم میں چل سکتے ہیں۔''

''میرا ڈرائیور کہاں ہے؟'' کے کے نے پوچھا۔ ''کیا تم لوگوں نے اسے مار دیا؟''

''نہیں، وہ بھی یہیں موجود ہے۔ میں اسے کھول کر لاتا ہوں۔''

''کھولنے سے پہلے اس کی اچھی طرح تلاشی لے لینا۔'' کے کے نے کہا۔ ''ورنہ وہ موقع ملتے ہی تم پر وار کردے گا۔''

میں کے کے کو ڈرائنگ روم میں لایا۔ اسے دیکھ کر اسد اور درانی کھڑے ہوگئے۔ میں نے اسد سے کہا کہ کے کے صاحب کے ڈرائیور کو بھی لے آؤ لیکن پہلے اچھی طرح اس کی تلاشی لے لینا۔

کے کے نے جیب پر ہاتھ مارا اور بولا۔ ''میرا سیل فون شاید تم لوگوں کے پاس ہے؟''

''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے آپ کا سیل فون ضرور اپنے قبضے میں کرلیا تھا۔'' میں نے اس کا سیل فون نکال کر اس کے حوالے کردیا۔

اس نے سیل فون لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ تم نے اسے آف کردیا تھا ورنہ میرے آدمی دو گھنٹے میں میرا سراغ لگا لیتے۔ اس میں ایسی ڈیوائس موجود ہے جو لوکیشن فائنڈر کا کام بھی کرتی ہے۔ موبائل اگر آف ہو تو بھی وہ ڈیوائس کام کرتی رہتی ہے لیکن اس صورت میں اس کے سگنل بہت ویک ہوتے ہیں پھر میرے آدمیوں کو تلاش میں چوبیس سے لے کر تیس گھنٹے تک لگ سکتے تھے۔''

اس نے سیل فون آن کیا اور مختلف جگہ کالز کرتا رہا۔ پھر اس کے سیل فون پر کسی کی کال موصول ہوئی۔ کے کے نے اسکرین پر نام دیکھا اور غرا کر بولا۔ ''تم لوگ بالکل غیر ذمے دار ہوتے جارہے ہو۔ تمہیں میں اس لیے بھاری تنخواہیں دیتا ہوں کہ جب وقت پڑے تو تم غائب ہوجاؤ... کسی صفائی کی ضرورت نہیں ہے۔'' کے کے غرایا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ''ہاں نادر خان... تم نے جونی کے ساتھ بہت عرصہ کام کیا ہے۔ آج کل وہ کس کے لیے کام کررہا ہے؟ اچھا معلوم کرو کہ اس وقت جونی ہے کہاں؟... کب تک... ٹھیک ہے، میں تمہاری کال کا انتظار کررہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

''کے کے صاحب! میں چاہتا ہوں کہ میچ شروع ہونے سے پہلے عرفان کی فیملی ہمیں مل جائے ورنہ عرفان صحیح طرح سے...''

''تم فکر مت کرو۔ مجھے تم سے زیادہ فکر ہے۔ تم تو یقیناً مجھ سے بلف کررہے ہو لیکن میرا واقعی کروڑوں روپیا انوالو ہے۔ میں نے جونی کا پتا لگانے کو کہا ہے۔ نادر خان ابھی آدھے گھنٹے میں اس کا سراغ لگالے گا۔''

اسی وقت اسد، کے کے، کے ڈرائیور کو لے آیا۔ وہ حیرت سے پلکیں جھپکا جھپکا کر ہمیں دیکھ رہا تھا۔

''تم سب نکلے ہو۔'' کے کے تحکمانہ انداز میں بولا۔ ''میں نے تم لوگوں کو آزمانے کے لیے یہ ڈراما اسٹیج کیا تھا۔ تم سبھی اس میں ناکام رہے۔''

''باس! میرے سر پر کوئی اچانک ہی آگیا تھا۔ میں تو آپ کی اور پولیس افسر کی باتیں سن رہا تھا۔''

''احمق ہو تم!'' کے کے غرایا۔ ''تم نے اپنی طرف کا شیشہ کیوں اتارا تھا؟ تم جانتے ہو کہ میری گاڑی بلٹ پروف ہے۔ کوئی لاکھ کوشش کرلیتا لیکن وہ تم پر قابو نہیں پاسکتا تھا۔''

''غلطی ہوگئی باس!'' ڈرائیور گھگیا کر بولا۔ ''مجھے معاف کردیں۔ آئندہ غلطی نہیں ہوگی۔''

''اب زیادہ واویلا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' کے کے نے کہا۔ ''گاڑی کی ڈکی میں کھانے کی ایک باسکٹ، بوتل اور گلاس موجود ہیں۔ وہ نکال کر لے آؤ۔ یہاں تو شاید کچھ کھانے کو نہیں ہوگا۔''

''آپ کا اندازہ غلط ہے۔'' درانی نے کہا۔ ''یہاں کھانے کی ہر چیز موجود ہے۔ فریج میں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں ہیں۔ آپ کہیں تو میں آپ کے لیے کافی بنوا دوں؟''

''کیا یہاں کوئی ملازم بھی ہے؟'' کے کے نے حیرت سے پوچھا۔

''ملازم تو نہیں ہے لیکن یہ اسد بہت اچھی کافی بناتا ہے۔''

''ہاں، ایک کپ اگر اچھی سی کافی مل جائے تو سر کا درد کچھ ٹھیک ہو جائے۔ اگر کوئی پین کلر مل جائے تو وہ بھی لے آؤ۔'' کے کے کافی پی کر فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

''ہاں نادر خان، کیا خبر ہے؟... اچھا... تم نے تو بہت پھرتی دکھائی۔ اسے وہیں لے جاؤ، میں بھی ابھی پہنچ رہا ہوں۔'' کال منقطع کر کے اس نے کہا۔ ''نادر خان نے نہ صرف جونی کا پتا لگا لیا ہے بلکہ اس کے ایک آدمی کو اٹھا بھی لیا ہے۔ یہاں سے ہم وہیں چلیں گے۔''

''کے کے صاحب!'' میں نے کہا۔ ''وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے۔ ہمارے پاس صرف دو دن ہیں۔ پاکستان اگر کل کا میچ بھی ہار گیا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن فائنل میں ہمیں ہر صورت میں میچ جیتنا ہوگا۔''

''فکر مت کرو، دو دن بہت ہوتے ہیں۔'' کے کے نے کہا۔ ''نادر خان نے جونی کے کسی خاص آدمی کو اٹھایا ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں جونی کا سراغ مل جائے گا۔ تم اگر چاہو تو میرے ساتھ چلو ورنہ میں اور میرے آدمی اس سے خود ہی پوچھ گچھ کر لیں گے۔ ہاں، وہاں پولیس کی موجودگی ضروری نہیں ہوگی۔''

''ہم خود بھی وہاں جانا نہیں چاہیں گے۔'' درانی نے کہا۔ ''ہمیں وقار سے انفارمیشن مل جائے گی۔''

کے کے نے ڈرائیور سے کہا۔ ''یہ بوتل اور گلاس دوبارہ گاڑی کی ڈکی میں رکھ دو۔ میں اس وقت یہاں سے جا رہا ہوں۔''

''جو حکم باس!'' ڈرائیور نے بوتل، گلاس اور کھانے کی باسکٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''کے کے صاحب!'' آپ کی ڈکی میں کھانے کی باسکٹ کی موجودگی سمجھ میں نہیں آئی۔''

''میں عموماً کال گرلز کو گھر ہی پر بلاتا ہوں۔'' کے کے نے صاف گوئی سے کہا۔ ''لیکن علی نواز نے جس کال گرل کا حوالہ دیا تھا، وہ کسی بھی طرح قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ جب اس نے کہا کہ وہ مان گئی ہے تو میں فوراً تیار ہو گیا۔ میں کھانے پینے کی چیزیں باہر بھی اپنی ہی استعمال کرتا ہوں۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خدشہ بھی تھا کہ ممکن ہے کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ ممکن ہے، وہ کال گرل مجھے کھانے کی کسی چیز میں بے ہوشی کی کوئی دوا ملا کر کھلا دے۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کال گرل کے بجائے میرا واسطہ تم جیسے خوں خوار لوگوں سے پڑے گا۔''

اسد اور درانی پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے۔ ڈرائیور نے سامان گاڑی میں رکھ دیا تو کے کے بھی جانے کو تیار ہو گیا۔

ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے میرے لیے کوئی ٹریپ نہ ہو۔ کے کے وہاں جا کر مجھے قید کر دے اور کہے کہ میں نے ہی عرفان کی فیملی کو اغوا کیا ہے۔ لیکن پھر خود ہی میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ کے کے کو اگر یہی سب کچھ کرنا ہوتا تو وہ اسد اور درانی کے جانے کے بعد کر سکتا تھا۔ میرے مقابلے میں وہ دو آدمی تھے اور دونوں مسلح تھے۔ وہ تو مجھے وہیں مار کر ڈال سکتے تھے۔ میں نے کے کے، کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر کے کے کا ڈرائیور ہی تھا۔ میں پسنجر سیٹ پر بیٹھنے لگا تو کے کے نے کہا۔ ''وقار! تم بھی میرے ساتھ ہی بیٹھ جاؤ۔ تمہاری باتوں اور جی داری نے میرا دل جیت لیا ہے۔ آج سے تم میرے دوستوں میں شامل ہو۔ اب میں تمہارے دوستوں کی لسٹ میں ہوں یا نہیں، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن تم بہر حال میرے دوست ہو۔''

ڈرائیور نے بنگلے کے گیٹ سے گاڑی باہر نکالی اور اتر کر گیٹ دوبارہ بند کیا تو کے کے چونک کر بولا۔ ''گویا ہم اس وقت گلشن اقبال کے بلاک فائیو میں ہیں۔ میں اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ ہم ڈیفنس میں ہیں۔''

پھر اس کا ڈرائیور بہت برق رفتاری سے ڈیفنس پہنچا اور سیدھا کے کے، کے بنگلے پر پہنچ کر رکا۔ کے کے کی گاڑی دیکھ کر گارڈز نے پھرتی سے گیٹ کھول دیا۔ اندر کتوں کی خوف ناک غراہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر کسی نے سخت آواز میں کتوں کو ڈانٹا تو وہ ایک دم خاموش ہو گئے۔

گاڑی پورچ میں رکی تو ایک باوردی گارڈ نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔ دوسرے گارڈ نے دوسرا دروازہ میرے لیے کھول دیا۔ گاڑی سے اتر کر کے کے کے برآمدے میں داخل ہوا اور وسیع و عریض لاؤنج سے گزرتا ہوا ایک بیڈ روم میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ جو گارڈز چل رہے تھے، وہ بیڈ روم کے باہر ہی ٹھہر گئے۔ وہ خاصا آراستہ بیڈ روم تھا۔

اس نے بیڈ روم میں پہنچ کر الماری کھولی اور اس میں سے بوتل نکال کر دوبارہ بیڈ کی طرف آ گیا۔ گلاس میز پر موجود تھا۔ پھر اس نے بیڈ روم فریج میں سے آئس کیوبز نکالے اور دو گلاس سیدھے کر لیے۔

''میں اس وقت آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔'' میں نے کہا۔ مجھے اس کے اطمینان پر غصہ آ رہا تھا کہ میری جان پر بنی ہوئی تھی اور اسے پینے پلانے کی سوجھ رہی تھی۔

اس نے اپنے لیے ایک لارج پیگ بنایا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ میں اس دوران میں اضطراب سے پہلو بدلتا رہا۔

وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ ''وقار! اتنے پریشان مت ہو۔ نادر خان نے جونی کے رائٹ ہینڈ کو پکڑ لیا ہے۔ وہ اس سے اگلوانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں یہاں بیٹھ کر وقت ضائع نہیں کر رہا ہوں بلکہ نادر خان کا انتظار کر رہا ہوں۔ ویسے بھی اس کیتے کے بچے علی نواز نے میرے سر پر اتنی زور سے ضرب لگائی تھی کہ پین کلر لینے کے باوجود میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ وہسکی کے ایک دو پیگ پی کر ذرا میری حالت کچھ سنبھلے گی۔''

اس نے پہلا پیگ ہی ختم کیا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ کے کے نے آہستہ سے کہا۔ ''آ جاؤ!''

دوسرے ہی لمحے کمرے میں ایک لحیم شحیم شخص داخل ہوا۔ اس کا قد مجھ سے بھی دو انچ زیادہ ہی ہوگا اور وزن مجھ سے دگنا تو ضرور ہوگا۔ اس نے جینز اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ شانے پر کلاشنکوف لٹک رہی تھی۔

''ہاں نادر خان! کیا خبر ہے۔ اس مردود نے کچھ بتایا؟''

''وہ بہت سخت جان ہے باس۔'' نادر خان نے کہا۔ ''ابھی تک اس نے زبان نہیں کھولی۔ میں اس پر زیادہ تشدد اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ وہ کہیں مر ہی نہ جائے۔''

''اسے مرنا نہیں چاہیے نادر خان!'' کے کے نے کہا۔ ''چلو، میں دیکھتا ہوں کہ اس میں کتنا دم خم ہے۔'' کے کے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھ سے بولا۔ ''چاہو تو تم بھی چل سکتے ہو۔''

میں کے کے، کے ساتھ ایک اور بیڈ روم میں گیا۔ اس کے باتھ روم میں ایک الماری تھی جس میں تہ خانے کا خفیہ راستہ تھا۔ ہم اس راستے سے گزر کر ایک زینے پر پہنچے اور زینہ طے کر کے ایک کشادہ کمرے میں پہنچ گئے۔ کمرے میں گھٹن کا احساس بالکل نہیں تھا۔

وہاں کسرتی جسم اور مضبوط ہاتھ پیروں کا ایک شخص موجود تھا۔ اس کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس پر دل کھول کر تشدد کیا گیا ہے لیکن وہ آدمی خاصا جان دار تھا کہ اب تک ہوش میں تھا۔ نادر خان نے اسے کرسی سے باندھ رکھا تھا۔ اس کے چہرے سے خون ٹپک رہا تھا۔ ہونٹ پھٹ گئے تھے اور لباس بھی پھٹا ہوا تھا۔

''نام کیا ہے اس کا؟'' کے کے نے نادر خان سے پوچھا۔

اس کا نام غلام رسول ہے باس! یہ بہت مشکل سے ہاتھ آیا ہے۔''

''ہاں تو غلام رسول!'' کے کے نے بہت اطمینان سے نرم لہجے میں پوچھا۔ ''اپنی زبان کھولو گے یا پھر میں نادر خان کو دوبارہ زبان کھلوانے کا حکم دوں۔''

''ایک نادر خان کیا... دس نادر خان بھی ہوں تو غلام رسول کی زبان نہیں کھلوا سکتے۔ میں مر تو سکتا ہوں لیکن زبان نہیں کھول سکتا۔''

''اچھا!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور کے کے سے کہا۔ ''اگر آپ کی اجازت ہو تو ایک کوشش میں بھی کر لوں۔ ویسے تو ہمیں جونی کے بارے میں معلوم ہو ہی جائے گا لیکن یہ بے چارہ خوامخواہ اپنی جان سے جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے کے کے کو آنکھ سے اشارہ کیا کہ میں اسے محض دھمکی دے رہا ہوں۔ پھر میں نے کے کے سے کہا۔ ''میں اسے سوچنے کا ایک موقع دینا چاہتا ہوں۔ اتنی دیر میں، میں ایک سگریٹ پی لوں۔''

میں سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ بس غلام رسول کو نفسیاتی طور پر خوف زدہ کرنے کے لیے یہ کہا تھا۔ میں نے جیب پر ہاتھ مارا اور بولا۔ ''شٹ، سگریٹ تو ختم ہو گئے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' کے کے نے کہا۔ ''میں ابھی سگریٹ منگوائے دیتا ہوں۔'' اس نے نادر خان کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً وہاں سے چلا گیا اور چند منٹ میں وہ سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر لے کر آ گیا۔ میں یہ سب غلام رسول کو نفسیاتی طور پر خوف زدہ کرنے کے لیے کر رہا تھا۔

''تم ایک چھوڑ پورا پیکٹ پی لو لیکن میری زبان نہیں کھلوا سکتے۔'' غلام رسول نے کہا۔ ''تم تو خیر چیز ہی کیا ہو۔ جب اس کے کے کا وہ ایکسپرٹ نادر خان میری زبان نہیں کھلوا سکا تو تم کیا کھلواؤ گے۔''

''نادر خان!'' میں نے کہا۔ ''یہاں ہیٹنگ راڈ تو ہو گی؟''

''ہیٹنگ راڈ؟'' نادر خان نے پوچھا۔

''ارے یار، وہ راڈ جس سے پانی گرم کرتے ہیں۔''

''ہاں، وہ تو مل جائے گی۔'' نادر خان نے کہا۔

''وہ راڈ لے آؤ اور ڈرل مشین اور بڑا ہیمر مل جائے تو وہ بھی لیتے آنا۔''

''کوئی ٹوپ اور ٹینک بھی منگوا لو۔'' غلام رسول نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”اس کی ضرورت پڑی تو وہ بھی آجائے گا۔“ میں نے کہا۔
کے کے مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ یہ رپورٹر جو اپنے قلم سے ہتھیار کا کام لیتا ہے، ڈرل مشین، ہتھوڑے اور ہیٹنگ راڈ سے کیا کام لے گا؟

میں اس دوران میں سگریٹ سلگا چکا تھا۔ میں نے سگریٹ کے دو تین گہرے گہرے کش لیے اور ٹہلتا ہوا غلام رسول کی پشت پر پہنچ گیا۔

”ہاں غلام رسول!“ میں نے کہا۔ ”اب بھی سوچ لو‘ جونی کا پتا بتاؤ گے یا نہیں؟“

”اب میں کچھ نہیں بولوں گا۔“ غلام رسول نے جھنجلا کر کہا۔

میں نے اچانک پشت سے اس کا سر پکڑا اور سگریٹ کا جلتا ہوا سرا اس کے کان میں ڈال کر اسے اندر رگڑ کر بجھا دیا۔

غلام رسول کے حلق سے ایک بھیانک چیخ برآمد ہوئی۔ وہ بری طرح سر جھٹکنے لگا۔ اس کے ہاتھ پیر اسٹیل کی ایک فکس کرسی سے بندھے ہوئے تھے۔ صرف وہ سر ہی ہلا سکتا تھا۔

”بولو گے یا پھر میں دوسرا سگریٹ سلگاؤں؟“ میں نے کہا۔

غلام رسول نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

میں نے پیکٹ سے دوسرا سگریٹ نکالا۔ اسے سلگایا اور اس کے دو تین گہرے گہرے کش لے کر غلام رسول کی طرف دیکھا۔ اتنی دیر میں پہلی بار مجھے اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں دکھائی دیں۔

میں ایک مرتبہ پھر اس کی پشت پر پہنچ گیا اور بولا۔ ”بتاتے ہو یا تمہارے دوسرے کان کو بھی ایش ٹرے کے طور پر استعمال کروں۔“

وہ خاموشی سے کے کے کو دیکھتا رہا۔ مجھے تو وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر ایک مرتبہ پھر اس کا سر پکڑ لیا۔ اس مرتبہ جلتا ہوا سگریٹ اس کے دوسرے کان میں کچھ اور اندر کی طرف لے جا کر رگڑ دیا۔

اس کے حلق سے ذبح ہوتے ہوئے بکرے جیسی آواز برآمد ہوئی اور وہ بری طرح سر جھٹکنے لگا۔ سردی کے باوجود اس کا چہرہ پسینے میں تر ہو گیا۔

”بتاؤ غلام رسول ورنہ میں یہ عمل بار بار دُہراؤں گا۔ تم نے پھر بھی زبان نہ کھولی تو میں سگریٹ تمہاری آنکھ میں بجھاؤں گا۔ پھر ڈرل مشین سے تمہارے دونوں گھٹنے ناکارہ کر کے، ہتھوڑے سے تمہارے پیروں کے دونوں پنجے توڑ کر تمہیں کوڑے کے کسی ڈھیر پر پھینک دوں گا۔ اس حالت میں تم کسی کام کے نہیں رہو گے اور تمہاری بقیہ عمر بھیک مانگتے گزرے گی۔“

میں اس مرتبہ سامنے آگیا اور پیکٹ سے ایک نیا سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔

”میں اس مرتبہ یہ سگریٹ تمہاری آنکھ میں بجھاؤں گا۔“ میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ سگریٹ کے دو تین کش لینے کے بعد ایک مرتبہ پھر غلام رسول کا سر مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میں نے سگریٹ اس کی آنکھ کے قریب کیا ہی تھی کہ وہ بے اختیار بول اٹھا۔ ”بتاتا ہوں... بتاتا ہوں۔“

”اب بہت دیر ہو چکی ہے غلام رسول۔“ میں نے کہا۔ ”تم بتاؤ یا نہ بتاؤ۔ میں تمہاری آنکھ میں سگریٹ تو ضرور بجھاؤں گا۔“

”وقار! اسے ایک موقع دے دو۔“ کے کے نے کہا۔ ”تمہیں تو لوگوں کے کانوں اور آنکھوں میں سگریٹ بجھانے کا جنون ہے۔“ وہ آدمی خاصے ذہین تھے اور مجرموں کی نفسیات سے بھی واقف تھے۔ انہوں نے سگریٹ بجھانے کو میرا جنون بنا دیا۔

کے کے کے کہنے پر میں رک گیا۔ وہ اگر نہ بھی روکتا تو میں کسی نہ کسی بہانے سے رک جاتا۔ مجھے لوگوں کے چہرے مسخ کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میں نے سگریٹ پیچھے ہٹا کر کہا۔

”ہاں، بولو... جونی اس وقت کہاں ہو گا؟“

”جونی... اس وقت سی ویو کے ایک اپارٹمنٹ میں ہو گا۔ وہاں وہ اپنی گرل فرینڈ سے ملنے جاتا ہے اور رات وہیں گزارتا ہے۔“

”ایڈریس بتاؤ۔“ میں نے کہا اور اپنی جیب سے پاکٹ ڈائری اور پین نکال لیا۔ رپورٹر کی حیثیت سے یہ چیزیں ہمیشہ میرے پاس ہوتی تھیں۔

اس نے کلفٹن کے ایک فلیٹ کا تفصیلی پتا لکھوایا۔

”اگر تمہارا بتایا ہوا پتا غلط نکلا تو پھر میں کے کے صاحب کی بات بھی نہیں مانوں گا۔ اس کے بعد زندگی بھر کی معذوری اور بھیک تمہارا مقدر ہو گی۔“ میں نے کہا اور کے کے صاحب کے پیچھے پیچھے تہ خانے سے باہر آگیا۔

”خدا کی پناہ!“ کے کے صاحب نے حیرت سے کہا۔ ”تم جیسا ورکنگ جرنلسٹ اتنا سفاک بھی ہو سکتا ہے؟“ ان کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

”جب جرنلسٹ کی جان پر بن جائے تو وہ اس سے بھی زیادہ سفاک ہو جاتا ہے کے کے صاحب!“ میں نے کہا۔ ”اس وقت میری جان پر بنی ہوئی ہے۔“

”تم نے تشدد کے یہ طریقے کہاں سے سیکھے؟“ کے کے

...لہجے میں ابھی تک حیرت تھی۔

”شاید آپ کو علم نہ ہو کہ میں شوقیہ کہانیاں بھی لکھتا رہا ...ہوں اور اب بھی جب وقت ملتا ہے، کہانیاں لکھتا ہوں۔ کہانی ...پڑھنے والے تو آپ کو تھرڈ ڈگری کے ایسے ایسے طریقے بتائیں ...گے کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔ البتہ پریکٹیکلی میں نے اپنا ...لکھا ہوا یہ طریقہ پہلی دفعہ آزمایا ہے۔“

”نادر خان!“ بیڈ روم میں داخل ہونے سے پہلے کے ...کے نے نادر خان کو آواز دی۔

وہ بھاگتا ہوا تہ خانے سے برآمد ہوا۔ شاید وہ میری مطلوبہ ...ہیٹنگ راڈ، ہیمر اور ڈرل مشین لے کر تہ خانے میں گیا تھا۔

کے کے نے اسے میرا لکھا ہوا ایڈریس لکھواتے ہوئے ...کہا۔ ”غلام رسول نے زبان کھول دی ہے۔ جونی اس فلیٹ پر ...موجود ہے۔ تم کم سے کم تین آدمیوں کو لے کر وہاں جاؤ اور اس ...حرام زادے کو اٹھا لاؤ۔ بہت احتیاط سے جانا۔ جونی چیتے سے ...بھی زیادہ پھرتیلا اور مکار ہے۔ اسے اگر بھنک بھی مل گئی تو وہ ...غائب ہو جائے گا۔ پھر ہمیں اس کا سراغ بھی نہیں ملے گا۔“

”اگر آپ کہیں تو نادر خان کے ساتھ میں بھی چلا ...جاؤں؟“ میں نے کہا۔ ”وہاں نہ جانے کیا صورتِ حال ہو۔“

”جاؤ لیکن بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔“ پھر وہ ...ٹھٹک کر بولے۔ ”تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟“

”میں کرائم رپورٹر ہوں کے کے صاحب!“ میں نے کہا۔ ...”میرے بے شمار دشمن بھی ہیں۔ میں کبھی ہتھیار کے بغیر باہر ...نہیں نکلتا۔“ میں نے انہیں جدید ساخت کا ایک جرمن پستول ...دکھایا۔ ”میرے پاس نہ صرف اس کا لائسنس ہے بلکہ ہوم ...منسٹری سے CARRY کرنے کی پرمیشن بھی لی ہے۔“

”وش یو گڈ لک۔“ پھر وہ نادر خان سے مخاطب ہوا۔ ...”تم اپنے ساتھ قاسم، ساجد اور رحمت علی کو لے جاؤ۔ میرے ...گارڈ دس آدمیوں پر اکیلے ہی بھاری ہیں۔“ آخری جملہ اس ...نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

...نادر خان کے پاس جدید ماڈل کی پجیرو تھی لیکن میں ...نے اسے مشورہ دیا کہ اس موقعے پر ہمیں ڈبل کیبن پک اپ ...استعمال کرنا چاہیے۔

”رات کا وقت ہے صاحب!“ نادر خان نے کہا۔ ...”راستے میں دس جگہ پولیس والے روکتے ہیں۔ آج کل ...حالات بھی بہت خراب ہیں۔“

”تم پولیس کی فکر مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ...ان کو میں ہینڈل کر لوں گا۔“

”وقار ٹھیک کہہ رہا ہے نادر خان! یہ میڈیا کا آدمی ہے۔ اس کا کارڈ دیکھنے سے پہلے پولیس والے اسے پہچان کر ہی چھوڑ دیں گے۔“

ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو اسٹیئرنگ نادر خان کے ہاتھ میں تھا۔ میں پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کیبن میں نادر خان کے تینوں آدمی بیٹھ گئے۔

”ویسے یہ گاڑی بھی چلتا پھرتا اسلحہ خانہ ہے۔“ نادر خان نے کہا۔ ”اگر پولیس نے تلاشی لے لی تو ہم سب بے موت مارے جائیں گے۔“

”پولیس مجھے دیکھ کر ہی اس طرف کا رخ نہیں کرے گی، اب ذرا اسپیڈ بڑھا دو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“

نادر خان نے گاڑی کی رفتار ایک دم بڑھا دی اور وہ بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح روانہ ہو گئی۔

”اس اسپیڈ پر اگر کسی ٹریفک سارجنٹ نے روک لیا تو آپ ہی اس سے نمٹیے گا۔“ نادر خان نے کہا۔

”ارے یار! تمہیں تو پولیس فوبیا ہو گیا ہے۔ میں نے کہا نا کہ جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں، پولیس اور ٹریفک سارجنٹ سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“

غلام رسول نے فلیٹ کا ایڈریس مکمل طور پر لکھوایا تھا۔ پھر بھی اسے تلاش کرنے میں ہمارے دس منٹ ضائع ہو گئے۔

میں نے اس بلڈنگ سے کافی پہلے گاڑی رکوا لی پھر مجھے خیال آیا کہ بلڈنگ کے باہر بہت سی گاڑیاں پارک ہیں۔

میں نے نادر خان کو ہدایت دی کہ گاڑی کو بلڈنگ کے مین گیٹ کے بالکل نزدیک روکنا، وہاں دوسری کئی گاڑیاں پارک ہیں۔ کوئی ہماری گاڑی پر شبہ بھی نہیں کرے گا۔

میں دوسرے گارڈز سے مخاطب ہوا۔ ”تم لوگ ابھی گاڑی میں ہی بیٹھنا۔“

نادر خان نے گاڑی اس بلڈنگ کے سامنے دوسری گاڑیوں کے ساتھ پارک کر دی۔

بلڈنگ کے سیکورٹی گارڈ بھی بہت چاق و چوبند نظر آرہے تھے۔ ان سے نمٹنا بھی ایک مسئلہ تھا۔ ان میں سے ایک گارڈ تو گیٹ کے نزدیک واقع کمرے میں تھا لیکن دوسرا مین گیٹ کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ میں نے چند لمحے غور کیا پھر نادر خان کو اترنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں گاڑی سے اتر کر گیٹ کی طرف بڑھے۔ مجھے اس فلیٹ کا نمبر یاد تھا جس میں ہمیں جانا تھا۔

میں بہت اعتماد سے آگے بڑھا اور یوں اندر کی طرف چلا جیسے وہاں اکثر جاتا رہتا ہوں۔

گارڈ نے مجھے روکنے کی کوشش کی اور پوچھا۔ ”ہاں

صاحب، کس فلیٹ میں جائیں گے؟''

''ایف 412 میں جاؤں گا۔ کیا تمہیں ہر دفعہ بتانا پڑے گا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔ گارڈ مجھے روکتا ہی رہ گیا لیکن وہ میرے پُراعتماد اور اکھڑ لہجے سے کچھ سہم بھی گیا تھا۔ ایسی بلڈنگز کے گارڈ عموماً نیم خواندہ یا بالکل اَن پڑھ ہوتے ہیں۔ وہ آنے والوں سے زیادہ جرح بھی نہیں کرتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی تھوڑی سی کمزوری دکھائے تو وہ شیر ہو جاتے ہیں اور اس سے باقاعدہ سوال جواب شروع کر دیتے ہیں۔ میرے پیچھے پیچھے نادر خان بھی آ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''سر! اگر آپ کہیں تو میں گاڑی میں آپ کا انتظار کروں؟'' یہ بات اس نے گارڈ کو سنانے کے لیے کہی تھی۔ اس کا لہجہ بہت مؤدبانہ تھا۔

''نہیں، تم بھی میرے ساتھ آؤ۔'' میں بھی ایک دم ''سر'' بن گیا۔ گارڈ ہماری بات چیت سے مزید محتاط ہو گیا۔ اس نے میرے بارے میں نہ جانے کیا رائے قائم کی ہو۔ وہ مجھے کوئی بڑا افسر سمجھا ہوگا یا پولیس کا کوئی آدمی سمجھا ہوگا پھر اس نے مجھ سے یا نادر خان سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کی۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ ایف 412 کس طرف ہوگا۔ میں آگے بڑھا تو گارڈ نے خود ہی بتایا کہ آگے جا کر دائیں طرف دو نمبر لفٹ سے آپ اوپر چلے جائیں۔

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے اکھڑ لہجے میں کہا۔ مجھے خدشہ یہ تھا کہ گارڈ انٹرکام پر ایف 412 میں موجود جونی سے رابطہ نہ کر لے۔ اگر ایسا ہوتا تو جونی چوکنا ہو جاتا۔

اس وقت میں نے نادر خان کے آدمیوں کو گاڑی سے اترتے دیکھا۔ ان سے یہی طے تھا کہ ہمارے بلڈنگ میں داخلے کے بعد وہ گارڈ... کو باتوں میں الجھائیں گے اور اس سے الٹے سیدھے سوال کریں گے۔

میں تیزی سے لفٹ کی طرف بڑھا۔ لفٹ بھی اس وقت نیچے ہی موجود تھی۔ میں اور نادر خان لفٹ میں سوار ہو گئے اور ہم نے چار نمبر فلور کا بٹن دبا دیا۔ لفٹ میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں نے گن نکال کر اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لی۔

لفٹ سے اترنے کے بعد ہم اپارٹمنٹس کے نمبر دیکھتے ہوئے آگے بڑھے اور مطلوبہ فلیٹ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ میں نے نادر خان کو ایک طرف کر دیا اور خود دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اندر سے آنے والا دروازے میں لگے ہوئے ہول کے ذریعے باہر کا جائزہ ضرور لیتا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔

فوراً ہی اندر سے ایسی آوازیں آئیں جیسے کسی نے بلند آواز میں آنے والے کو گالی دی ہو۔ پھر ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ''کون ہے؟'' بولنے والی کی آواز میں خمار سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ نشے میں ہے۔

''پولیس!'' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''دروازہ کھولو۔''

''میں یہاں اکیلی رہتی ہوں۔'' اندر سے آنے والی آواز کافی واضح ہو گئی تھی۔ شاید پولیس کا نام سنتے ہی اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔

''گھبراؤ مت۔'' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''ہمیں ضابطے کی کچھ کارروائی کرنا ہے۔ تمہاری ایک دوست کے بارے میں کچھ پوچھ گچھ کرنا ہے۔''

''میری دوست!'' وہ بڑبڑائی۔ ''میری کون سی دوست؟''

''وہ بھی کلفٹن ہی میں رہتی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اس کا مرڈر ہو گیا ہے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ہمیں تم سے صرف شناخت کرانا ہے۔ دروازہ کھولو اور وقت ضائع مت کرو۔''

''اچھا ایک منٹ ٹھہریں۔'' وہ مری مری آواز میں بولی۔ مرڈر کا نام سن کر اس کی آواز میں لرزش پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے قدموں کی آہٹ سے اندازہ ہوا کہ وہ بہت تیزی سے اندر گئی ہے۔ پھر ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں وہ واپس آ گئی اور دروازہ کھول دیا۔

وہ تیس پینتیس سال کی پُرکشش عورت تھی بلکہ اپنے لباس اور رکھ رکھاؤ سے لڑکی ہی لگتی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی میں اور نادر خان اندر داخل ہو گئے۔ وہ ہمیں ڈرائنگ روم کی طرف لے گئی۔ میں نے نادر خان سے کہا۔ ''تم یہیں دروازے کے پاس ٹھہرو۔ رات گئے اس خاتون کو پریشان کرنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

''اوکے سر!'' نادر خان نے مؤدب انداز میں کہا۔

میرے منہ سے اپنے لیے خاتون اور ہمدردی کے الفاظ سن کر اس کی جان میں جان آئی۔ میں نے نادر خان کو دروازے کے پاس اس لیے چھوڑا تھا کہ اگر اس دوران میں جونی وہاں سے نکلنے کی کوشش کرے تو کامیاب نہ ہو سکے۔

''سر! آپ کیا لیں گے۔ ہارڈ یا سافٹ ڈرنک؟'' روبی نے بہت ادا سے پوچھا۔ وہ حیرت اور صدمے کے ابتدائی جھٹکے سے سنبھل گئی تھی اور اس کا پیشہ ورانہ اعتماد لوٹ آیا تھا۔

''میں ڈیوٹی کے دوران کبھی نہیں پیتا۔'' میں نے یوں کہا جیسے ڈیوٹی کے بعد تو میں سارا وقت پینے پلانے ہی میں گزارتا ہوں۔

میں نے اچانک اس سے پوچھا۔ ''تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا کہ تم اس فلیٹ میں اکیلی ہو؟''

''میں نے جھوٹ نہیں کہا سر!'' روبی نے پلکیں جھپکا کر کہا۔ ''میں اس فلیٹ میں بالکل اکیلی رہتی ہوں۔ پھر اس نے ایک ملٹی نیشنل فرم کا نام لے کر کہا کہ میں اس میں جاب کرتی ہوں۔''

''جونی کہاں ہے؟'' میں نے اچانک پوچھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس کے چہرے پر کسی نے تھپڑ مار دیا ہو۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا۔

''جو... جونی... وہ تو... یہاں...''

''گھبراؤ مت!'' میں نے کہا۔ ''ہم جانتے ہیں کہ وہ یہاں موجود ہے۔ مرڈر کے سلسلے میں اس کا نام لیا جا رہا ہے۔ اگر وہ یہاں موجود ہوا تو معاملہ صاف ہو جائے گا ورنہ وہ بری طرح پھنس جائے گا۔''

''جونی... اندر بیڈ روم میں ہے۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں اسے بلاتی ہوں۔''

''تم زحمت نہ کرو۔'' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''میں خود اس سے مل لوں گا۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل آیا۔ اس اپارٹمنٹ میں دو بیڈ روم تھے۔ اس میں سے ایک میں روشنی ہو رہی تھی۔

میں نے باہر نکل کر لابی میں کھڑے ہوئے نادر خان کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور خود بہت اعتماد سے اس بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا جس میں روشنی ہو رہی تھی۔

بیڈ پر ایک شخص نیم دراز تھا اس کے ہاتھ میں بھی شراب کا گلاس تھا اور وہ بہت اطمینان سے شراب کے گھونٹ لے رہا تھا۔ وہ چالیس، بیالیس سال کے درمیان رہا ہوگا۔ اس نے اس وقت صرف بنیان پہن رکھی تھی۔ اس کی شرٹ نزدیکی صوفے پر پڑی تھی۔ بیڈ کے سائیڈ ریک پر اس کی گن بھی رکھی تھی۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا خاصا مضبوط آدمی تھا۔ اس کے سینے اور کندھوں پر بے تحاشا بال تھے۔

''کون ہو تم اور منہ اٹھائے میرے بیڈ روم میں کیوں آئے؟'' اس نے ناگواری سے کہا۔ روبی نے اسے یقیناً بتایا ہوگا کہ باہر پولیس آئی ہے۔ اس کے لہجے کے اعتماد سے لگ رہا تھا کہ پولیس کی اس کی نظروں میں کوئی اہمیت اور وقعت نہیں ہے۔

''مسٹر جونی؟'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''میں جونی ہوں یا البرٹ!'' وہ غرا کر بولا۔ ''لیکن تم لوگوں میں اتنے مینرز تو ہونا چاہئیں کہ کسی کے بیڈ روم میں یوں نہیں گھسنا چاہیے۔'' وہ کرخت لہجے میں بولا۔

''میں نے ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں کی، سمجھے۔'' میں نے کہا۔ ''تم اتنا بھڑک کیوں رہے ہو؟'' میرا لہجہ بھی کرخت ہو گیا۔ ''اور تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''تم اپنے کام سے کام رکھو۔'' جونی نے حقارت سے کہا۔ ''روبی سے جو کچھ پوچھنا ہے، پوچھو اور یہاں سے نکلو۔''

''روبی نے تو کہا تھا کہ وہ یہاں اکیلی رہتی ہے۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تو پھر؟'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''پھر یہ کہ تمہاری یہاں موجودگی کیا معنی رکھتی ہے؟''

''کیا روبی سے ملنے کوئی نہیں آ سکتا؟'' اس نے مجھے گھورا۔ ''اور تمہارا تعلق کس پولیس اسٹیشن سے ہے، تمہارا رینک کیا ہے؟''

''یہ سب تمہیں پولیس اسٹیشن جا کر ہی معلوم ہوگا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

گن کے ساتھ ہی اس کا سیل فون بھی رکھا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سیل فون اٹھانے کی کوشش کی لیکن میں نے ڈپٹ کر کہا۔ ''نہیں جونی! اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی گن نکال لی۔

ایک لمحے کو تو جونی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ''تم روبی سے پوچھ گچھ کرنے آئے تھے۔ تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟''

''ہمیں روبی سے نہیں بلکہ تم سے کام ہے۔'' میں نے کہا۔

اس کا سارا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا، پھر بولا۔ ''لیکن تمہارا تعلق پولیس سے تو نہیں لگتا۔''

میرا تعلق پولیس سے ہے یا رینجرز سے۔'' میں نے کہا۔ ''تھانے تو تمہیں چلنا ہی پڑے گا۔''

''کیا تم مجھے اریسٹ کر رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی تو نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اگر تم نے اسی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تو تمہیں اریسٹ بھی کرنا پڑے گا۔ اس لیے شرافت سے ہمارے ساتھ چلو۔ اگر تم بے قصور ہوئے تو پوچھ گچھ کے بعد تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ معاملہ ایک مرڈر کا ہے۔''

''مرڈر؟'' اس نے تھوک نگل کر کہا۔ ''میرا کسی مرڈر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''میں نے کب کہا کہ تمہارا کوئی تعلق ہے۔ ہمیں تم سے صرف شناخت کرانا ہے۔ ہمیں شبہ ہے کہ مرنے والا تمہارا ساتھی تھا۔''

''میرا ساتھی؟'' وہ الجھ کر بولا۔ ''میرا ایسا کون سا ساتھی

ہے جسے قتل کر دیا گیا ہے؟'' وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔

''اب کیا سارے سوال جواب یہیں کرو گے؟'' میں نے سخت لہجے میں کہا اور آگے بڑھ کر اس کا پسٹل اور موبائل فون اٹھا لیا۔

''اب تم شرٹ پہنو اور شرافت سے ہمارے ساتھ چلو۔'' پھر میں نادر خان سے مخاطب ہوا۔ ''پہلے اس کی اچھی طرح تلاشی لے لو۔ ممکن ہے اس کے پاس کوئی اور ہتھیار بھی ہو۔ میں خون خرابا نہیں چاہتا ہوں۔''

نادر خان نے کہا۔ ''او کے باس!'' اور آگے بڑھ کر جونی کی تفصیلی تلاشی لے ڈالی۔ کمبل کے اندر دائیں جانب ایک گن اور موجود تھی۔ نادر خان نے وہ بھی اپنے قبضے میں کر لی۔

''چلو اب دیر مت کرو۔'' میں نے کہا۔

''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تمہارا تعلق پولیس سے ہے؟'' جونی نے سخت لہجے میں کہا لیکن اس کا لہجہ اب کھوکھلا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر زناٹے کا ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ ''تجھے ثبوت بھی مل جائے گا۔ اب زیادہ سوال کرے گا تو تھانے لے جا کر تیرا وہ حشر کروں گا کہ زندگی بھر سوال کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔''

''چلو کس پولیس اسٹیشن چلنا ہے۔ کراچی کا ایسا کوئی پولیس اسٹیشن نہیں ہے جہاں جونی کو زیادہ دیر روکا جا سکے۔'' اس نے سنبھل کر کہا۔

روبی کے سامنے اپنی تذلیل سے وہ خاصا شرمندہ ہو گیا تھا۔ اس نے روبی کے سامنے نہ جانے کیا کیا ڈینگیں ماری ہوں گی۔

اس نے شرٹ پہنی، خاموشی سے جوتے پہنے اور ہمارے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔

''مجھے ایک فون تو کرنے دو۔'' اس نے اس مرتبہ نرم لہجے میں کہا۔

''پولیس اسٹیشن پہنچ کر تم ایک نہیں دس ٹیلی فون کرنا۔'' میں نے کہا۔

''میرے کس ساتھی کا مرڈر ہو گیا ہے؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

''غلام رسول کو جانتے ہو؟'' میں نے اچانک کہا۔

''کیا ہوا غلام رسول کو؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے کسی نے فائرنگ کر کے اسے شدید زخمی کر دیا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے تمہارا نام لیا کہ تمہیں اس کے زخمی ہونے سے مطلع کر دیا جائے۔ تمہارا سیل فون شاید آف ہے۔ ہم نے اس پر کئی دفعہ ٹرائی کیا، پھر غلام رسول کے کہنے پر یہاں چلے آئے۔''

میں نے اس کا سیل فون اٹھاتے ہی اسے آف کر دیا تھا۔

''میرا سیل فون تو آف نہیں تھا۔ کسی بھی وقت کوئی اہم کال آ سکتی ہے۔ میں اپنا سیل فون کبھی بند نہیں کرتا۔''

میں نے جیب سے اس کا سیل فون نکالا اور بولا۔ ''یہ تو اس وقت بھی آف ہے۔''

''شاید میں نے ہی غلطی سے کر دیا ہو۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''غلام رسول کی حالت اب کیسی ہے؟ وہ کس اسپتال میں ہے؟''

''غلام رسول اب بالکل ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ اسپتال کے کسی بیڈ پر نہیں بلکہ مردہ خانے میں ہے۔''

''تو کیا غلام رسول مر گیا؟'' اس کی آواز میں وحشت تھی۔

''اگر وہ نہ مرتا تو شاید ہم لوگ یہاں اس وقت نہیں آتے بلکہ صبح ہونے کا انتظار کرتے۔'' میں نے کہا۔

جونی ایک دم برسوں کا مریض نظر آنے لگا۔ اس کی ساری اکڑ رخصت ہو گئی اور چہرے پر نحوست برسنے لگی۔

''میں جانتا ہوں اس پر کس نے حملہ کیا ہوگا۔'' جونی نے دانت پیس کر کہا۔ ''میں ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔''

''یہ کام پولیس کا ہے۔'' میں نے اس مرتبہ نرم لہجے میں کہا۔ ''تم چل کر اسے صرف شناخت کر لو۔ ممکن ہے وہ غلام رسول نہ ہو کوئی اور ہی ہو۔''

جونی آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا ہمارے ساتھ فلیٹ سے باہر آ گیا۔ اگر میں اسے غلام رسول کی فرضی موت کے بارے میں نہیں بتاتا تو شاید وہ اتنی آسانی سے ہمارے ساتھ چلنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اپنے ساتھی کی موت کے بارے میں سن کر اس کا ذہن شاید مفلوج ہو گیا تھا۔ اسی لیے اس نے دھیان نہیں دیا کہ ہم نے اسے پولیس کی گاڑی میں سوار کیا ہے یا کسی عام گاڑی میں۔

نادر خان کے ساتھیوں میں سے ایک پک اپ کے پچھلے حصے میں بیٹھ گیا۔ جونی کو ہم نے پک اپ کے عقبی کیبن میں دو آدمیوں کے درمیان بٹھا دیا۔

نادر خان اسٹیئرنگ پر بیٹھا اور گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

کچھ دور چلنے کے بعد جونی نے کہا۔ ''تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔ پولیس اسٹیشن تو دوسری طرف ہے۔''

''ہمارا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا اور گن کا دستہ جونی کے سر پر رسید کر دیا۔ دوسرے ہی

لمحے وہ ناک آؤٹ ہو گیا اور اس نے نادر خان کے ایک گارڈ کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔

نادر خان آناً فاناً کے کے کے بنگلے پر پہنچا اور بے ہوشی کی حالت میں جونی کو تہ خانے کے ایک دوسرے کمرے میں شفٹ کروا گیا۔ اس کمرے میں ایک بیڈ بھی موجود تھا۔ نادر خان نے ایک رسّی لے کر اس سے جونی کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیے۔ اس کا ایک سرا اس نے بیڈ سے بھی باندھ دیا تاکہ جونی اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکے۔

اسے کمرے میں بند کر کے ہم باہر نکلے تو لابی میں کے کے نظر آیا۔ اس نے ہنس کر کہا۔ ''ویل ڈن وقار! تم تو واقعی بہت پروفیشنل آدمی ہو۔ میری مانو تو تم یہ رپورٹنگ وغیرہ چھوڑ کر میرے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ تم نے ایک گھنٹے کے اندر اندر جونی کو بھی اٹھا لیا۔''

''مجھے اگر یہی کام کرنا ہوگا تو میں کسی کے ساتھ شامل ہونا پسند نہیں کروں گا بلکہ دوسروں کو اپنے ساتھ شامل کروں گا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''ارے! میں تو مذاق کر رہا تھا۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''ابھی ہمارے پاس دو دن ہیں اس عرصے میں تو میں دنیا کے دوسرے سرے سے بھی عرفان کی فیملی کو بازیاب کرا لاتا ہوں۔''

''ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ عرفان کی فیملی کہاں ہے؟'' میں نے کہا۔ ''وہ لوگ واقعی جونی کے قبضے میں ہیں یا ہمیں کہیں اور دوڑ لگانی پڑے گی۔''

''تم بے فکر ہو جاؤ۔ ملک میں میرے علاوہ یہی لوگ ہیں جو کرکٹ پر بیٹ لگاتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ بڑے پیمانے پر۔ اب اگر عرفان کی فیملی میرے پاس نہیں ہے تو وہ یقیناً ان لوگوں کے پاس ہو گی۔ تم ایسا کرو کہ کچھ دیر آرام کر لو۔ اب صبح ہونے میں تھوڑی ہی دیر رہ گئی ہے۔ ایسا کرو، تم اپنے گھر جا کر آرام کر لو۔ تمہارے گھر والے بھی تمہاری طرف سے فکر مند ہوں گے۔ میری گاڑی لے جاؤ۔''

''ہاں، میں سوچ رہا ہوں کہ کچھ دیر آرام کر ہی لوں۔'' میں نے کہا اور تہ خانے سے باہر آ گیا۔

کے کے نے مجھے اپنی گاڑی کی چابی دے دی اور کہا۔ ''تم بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ صبح تک جونی سب کچھ اگل دے گا۔ تب تو میں بھی تمہارے طریقے سیکھ گیا ہوں۔'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد میرا جسم بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔ میں باہر نکلا تو کتوں نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ فوراً ہی کسی نے کتوں کو ڈانٹا۔ وہ شاید کتوں کا رکھوالا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی کتے ایک دم خاموش ہو گئے۔ میں گاڑی میں بیٹھا تو مجھے بے پناہ تھکن کا احساس ہوا۔ سارا دن بھاگ دوڑ میں گزر گیا تھا اور اب ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے گیٹ سے باہر نکالی اور اس کا رخ اپنے گھر کی طرف کر دیا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ آخر کے کے نے مجھے اصرار کر کے گھر کیوں بھیجا؟ اسے کب سے میرے گھر والوں کی اتنی فکر ہو گئی۔ گھر سے تو میں دو دو دن غائب رہتا تھا۔ امی اور ابو بھی اب عادی ہو گئے تھے۔ میرا کام ہی ایسا تھا۔ پولیس والوں کی طرح رپورٹر بھی چوبیس گھنٹے کا ملازم ہوتا ہے۔ آج کل تو ملک کے حالات ایسے تھے کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی مصروفیت، کوئی نہ کوئی اسائنمنٹ موجود رہتا تھا۔ پھر کے کے نے مجھے کیوں مجبور کیا کہ میں وہاں سے چلا جاؤں؟ میں جتنا اس بات پر غور کر رہا تھا، اتنا ہی شبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ کیا میں نے کے کے کو پہچاننے میں غلطی کی تھی، کیا میں اس کی لچھے دار باتوں اور باوقار شخصیت سے دھوکا کھا گیا تھا۔ کہیں وہی تو اس سارے معاملے میں ملوث نہیں ہے؟ اگر ایسا تھا تو میں نے وہاں سے آ کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ میں جتنا اس بات پر غور کرتا گیا، میرا شبہ بڑھتا گیا۔ میں نے سوچا کہ مجھے ایک مرتبہ پھر کے کے، کے بنگلے میں جانا چاہیے۔ اس کی گاڑی دیکھ کر گارڈز مجھے آسانی سے اندر جانے دیں گے۔ یوں بھی ابھی میں ان کے سامنے ہی تو کے کے کی گاڑی لے کر نکلا تھا۔

میں ابھی واپس جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ میرے عقب سے کوئی گاڑی نکل کر سامنے آ گئی۔ وہ پولیس کی جیپ تھی۔ پھر فوراً ہی جیپ میں سے اسد، درانی اور علی نواز باہر نکلے۔

میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''تم لوگ یہاں؟'' میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

''تم کیا سمجھتے ہو، ہم تمہاری طرف سے بالکل غافل ہو جاتے۔ ہم تو شروع سے تمہارے پیچھے ہیں۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کے کے پر بالکل اعتبار نہیں ہے۔''

''شبہ کرنے کی کوئی وجہ تو ہو گی؟'' میں نے کہا۔

''شبہ کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی ہے لیکن دل پھر بھی ماننے کو تیار نہیں ہے کہ کے کے جیسا آدمی اتنا شریف، سچا اور کھرا ہو سکتا ہے۔ تم نہ جانے کیسے اس کی لچھے دار باتوں میں آ گئے۔'' پھر درانی چونک کر بولا۔ ''اس وقت تم کہاں جا رہے ہو؟''

میں نے بتایا کہ اس وقت تو میں گھر ہی جا رہا تھا تا کہ کچھ دیر آرام کرلوں۔

''علی نواز نے ہمیں اس کے بارے میں ایسی باتیں بتائی ہیں کہ تم بھی سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ ویسے تم یہاں کھڑے ہوئے کیا کر رہے تھے؟''

میں نے اسے اپنے خدشے سے آگاہ کر دیا اور کہا۔ ''میں واپس کے کے، کے بنگلے کی طرف جانے کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ مجھے خود بھی حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے مجھے جوتی سے بات کیوں نہیں کرنے دی۔ اسے میرے آرام کا اتنا خیال کیوں آ گیا۔ پھر آرام کا اتنا ہی خیال تھا تو وہ مجھے وہیں آرام کرنے کو کہہ سکتا تھا۔ اس نے اصرار کر کے مجھے نہ صرف اپنے بنگلے سے بھیجا بلکہ اپنی گاڑی بھی دے دی۔''

''یہ گاڑی کے کے کی ہے؟'' درانی چونک کر بولا۔

''ہاں، یہ اسی کی مرسیڈیز ہے۔ مجھے اندھیرے میں خیال ہی نہیں آیا۔ تم یہ گاڑی فوری طور پر چھوڑ دو۔''

''لیکن کیوں، اس گاڑی میں آخر کیا ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''کے کے جیسے لوگوں کا کوئی کام بھی علت سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ تمہیں کوئی اور گاڑی بھی دے سکتا تھا پھر اپنی ہی گاڑی کیوں دی؟ یہ اس کی مخصوص گاڑی ہے اور دنیا جانتی ہے کہ یہ خصوصی مرسیڈیز اس نے اپنے لیے امپورٹ کی ہے۔''

''ذرا اس کی چابی مجھے دو۔'' علی نواز نے کہا۔

میں نے گاڑی کی چابیاں اس کے حوالے کر دیں۔ اس نے ڈکی کھولی تو اس کے منہ سے حیرت بھری آواز نکلی اور وہ بولا۔ ''یہ... یہ کون ہے؟''

ڈکی کھلنے سے گاڑی کی ڈکی میں بھی روشنی ہو گئی تھی۔ قیمتی گاڑیوں میں ڈکی میں بھی روشنی کے لیے بلب موجود ہوتے ہیں۔

میں جھپٹ کر گاڑی کے پاس پہنچا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ اس میں غلام رسول کی مڑی تڑی لاش پڑی تھی۔ میرا سر بری طرح چکرانے لگا۔ یہ کے کے آخر کیا چکر چلا رہا تھا؟

''گاڑی یہیں چھوڑو اور ہماری گاڑی میں آ جاؤ۔'' درانی نے کہا۔ ''ہاں، پہلے کوئی کپڑا لے کر گاڑی کا ہر وہ حصہ صاف کر دو جہاں جہاں تمہارے فنگر پرنٹس ہو سکتے ہیں۔''

میں نے اس گاڑی کے صرف دروازے، اسٹیئرنگ اور گیئر وغیرہ کو ہاتھ لگایا تھا۔ میں نے دروازہ، اسٹیئرنگ، پسنجر سیٹ والا دروازہ اور عقبی سیٹ کا دروازہ اور سیٹ بھی اچھی طرح صاف کر دی۔ پھر درانی کے ساتھ جیپ میں سوار ہو گیا۔

''گاڑی کو واپس کے کے ہاؤس لے چلو۔'' میں نے کہا۔

''کیوں؟'' درانی نے حیرت سے کہا۔

''کے کے نے مجھے وہاں سے ہٹایا ہے تو وہیں کوئی ایسی بات ہے جو مجھے نہیں جاننا چاہیے؟''

''ہم لوگ اس وقت سے تمہارے پیچھے ہیں جب تم گلشن والے بنگلے سے کے کے کی گاڑی میں نکلے تھے۔ وہاں کافی دیر بعد تم پھر باہر نکلے اور کلفٹن کی طرف روانہ ہو گئے۔''

''تم لوگ مسلسل اس بنگلے کی نگرانی کر رہے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم نے ایک لمحے کے لیے بھی اس بنگلے کی نگرانی ترک نہیں کی۔'' درانی نے کہا۔

''پھر تم نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ ان کا ایک آدمی کسی کو لے کر آیا تھا؟''

''ان کا کوئی آدمی گھر سے باہر نہیں نکلا۔'' درانی نے یہ انکشاف کر کے میرے سر پر گویا ٹھرسید کر دیا۔

''لیکن ان کا آدمی نادر خان باہر نکلا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اور وہ اس شخص کو کہیں سے اٹھا کر لایا تھا جس کی لاش گاڑی کی ڈکی میں موجود ہے۔''

''نادر خان کی پرچھائیں بھی باہر نہیں نکلی۔'' علی نواز نے کہا۔ ''میں نادر خان کو اندھیرے میں بھی پہچان سکتا ہوں۔ وہاں گیٹ پر تو اچھی خاصی روشنی ہوتی ہے۔ یہ رشید تو خود ہی وہاں پہنچا تھا۔''

''رشید، کون رشید؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''وہی جس کی لاش گاڑی کی ڈکی میں موجود ہے۔''

''لیکن اس کا نام تو غلام رسول ہے۔ اس نے خود مجھے اپنا نام بتایا تھا۔'' میں نے کہا۔

''یہ بھی کے کے کی کوئی چال ہی ہو سکتی ہے۔'' علی نواز نے کہا۔ ''میری طرح رشید بھی معتوب تھا۔ کے کے ان لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرتا جو اس کے سامنے سر اٹھا کر بات کرتے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ کے کے ہی... نہیں... میں یہ بات نہیں مان سکتا۔'' میں نے ہیجانی انداز میں کہا۔

''تم کے کے کو کب سے جانتے ہو؟'' درانی نے کہا۔

''ایسا لگ رہا ہے جیسے تم اس کے ساتھ کھیل کر جوان ہوئے ہو اور اسے بچپن سے جانتے ہو۔ اس نے اپنی لچھے دار باتوں سے تمہیں بے وقوف بنا دیا اور تم بن گئے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ عرفان کی قتیلی یا تو کے کے، کے بنگلے میں ہے یا پھر وہ اس بارے میں جانتا ضرور ہے۔''